


# قصص القرآن

حضرت مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی



إِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ
بے شبہ یہ بیان حق ہے

# قصص القرآن

## حصہ سوم

جس میں انبیاء علیہم السلام کے سوانح حیات کے علاوہ باقی قصص قرآنی، اصحاب الجنۃ، اصحاب القریہ، حضرت لقمان رضی اللہ عنہ، اصحاب سبت، اصحاب الرس، بیت المقدس اور یہود، ذو القرنین، سدِ سکندری، اصحاب الکہف و الرقیم، سبا اور سیلِ عرم، اصحاب الاخدود اور اصحاب الفیل وغیرہ کی مکمل اور محققانہ تفسیر و تشریح کی گئی ہے۔

تالیف

مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی





# فہرست مضامین قصص القرآن جلد سوم


| مضمون | صفحہ | مضمون | صفحہ | مضمون | صفحہ |
|---|---|---|---|---|---|
| اصحاب الجنۃ | ۱۳ | واقعہ | ۲۶ | حکمت لقمان | ۴۷ |
| سورۃ القلم اور اصحاب الجنۃ | " | واقعہ سے متعلق اقوال | ۳۰ | مواعظ | ۴۸ |
| واقعہ سے متعلق اقوال | ۱۴ | نقد و تبصرہ | ۳۱ | اصحاب سبت | ۵۰ |
| تشریح | ۱۵ | رحمٰن | ۳۴ | قرآن عزیز اور اصحاب سبت | " |
| موعظت | ۱۶ | موعظت | " | سبت اور اس کی حرمت | " |
| مومن و کافر | ۱۸ | حضرت لقمان رضی اللہ عنہ | ۳۶ | واقعہ کی تفصیلات | ۵۳ |
| سورۂ کہف اور مومن و کافر | | لقمانؑ | " | تعیین مقام | ۵۸ |
| کا واقعہ | " | قرآن عزیز اور حضرت لقمانؑ | ۳۹ | زمانۂ حادثہ | " |
| واقعہ کی تشریح | ۲۰ | نبوت یا حکمت | ۴۱ | چند تفسیری حقائق | ۶۰ |
| بصائر | ۲۳ | چند تفسیری مطالب | " | حقیقت مسخ | ۶۱ |
| اصحاب القریہ | | حسن خلق | ۴۴ | حضرت ابن عباسؓ اور | |
| یا اصحاب یٰسین | ۲۶ | تواضع | ۴۵ | عکرمہؒ کا مکالمہ | ۶۹ |
| اصحاب قریہ اور قرآن عزیز | " | کبر و غرور | " | مسخ شدہ اقوام کا انجام دنیوی | ۷۱ |

| | |
|---|---|
| بصائر | ۷۱ |
| **اصحابُ الرس** | ۷۶ |
| رس | ″ |
| قرآنِ عزیز اور اصحاب الرس | ″ |
| اصحاب الرس ؟ | ۷۷ |
| قولِ فیصل | ۸۲ |
| موعظت | ۸۳ |
| بیتُ المقدس اور یہود | ۸۴ |
| تمہید | ″ |
| بیتُ المقدس | ۸۶ |
| شرارتِ یہود کا پہلا دور | ۹۵ |
| غلامی سے نجات | ۱۰۰ |
| شرارتِ یہود کا دوسرا دور | ۱۰۸ |
| حضرت یحییٰ علیہ السلام کا قتل | ۱۰۹ |
| پاداشِ عمل | ۱۱۰ |
| تیسرا زریں موقع اور یہود کی رُوگردانی | ۱۱۲ |
| ابدی ذلت اور خسران | ۱۱۳ |
| بصائر | ۱۱۴ |
| **ذوالقرنین** | ۱۱۶ |
| تمہید | ″ |
| زیرِ بحث مسائل اور علماء اسلام | ۱۱۶ |
| ذوالقرنین ؟ | ۱۲۱ |
| ذوالقرنین سے متعلق سوال کی نوعیت | ″ |
| ذوالقرنین اور سکندر مقدونی | ۱۲۳ |
| ذوالقرنین اور اذواءِ یمن | ۱۲۵ |
| استدراک: کیا ذوالقرنین سکندر مقدونی ہے ؟ | ″ |
| مُسلم | ۱۲۷ |
| جوزیفس | ۱۲۹ |
| یروشلم اور سکندر | ۱۳۱ |
| علمائے سلف کی رائے | ″ |
| خدا کا مسیح ؟ | ۱۳۲ |
| سکندر مشرک تھا | ۱۳۶ |
| سکندر کا ظلم و جبر | ۱۳۷ |
| سکندر کا مغرب کی طرف اقدام | ۱۳۹ |
| متاخرین کی رائے | ۱۴۷ |
| یہود و قریش اور انتخابِ سوالات | ۱۴۸ |
| ذوالقرنین اور انبیاء بنی اسرائیل کی پیشگوئیاں | ۱۵۱ |
| خورس اور تاریخی شواہد | ۱۵۶ |
| مغربی مہم | ۱۵۸ |
| مشرقی مہم | ۱۵۹ |
| تیسری شمالی مہم | ″ |
| فتح بابل | ۱۶۰ |
| خورس کا مذہب | ۱۶۲ |
| ایرانِ قدیم کا مذہب | ۱۶۶ |
| ایران اور مذہبِ زردشت | ۱۶۷ |
| ذوالقرنین اور قرآنِ عزیز | ۱۷۱ |
| **یاجوج و ماجوج** | ۱۸۰ |
| سد | ۱۹۵ |
| یاجوج و ماجوج کا خروج | ۲۰۸ |
| کیا ذوالقرنین نبی تھے ؟ | ۲۳۲ |
| بصائر | ۲۳۵ |
| **اصحابُ الکہف والرقیم** | ۲۳۸ |
| قرآنِ عزیز اور اصحاب الکہف والرقیم | ″ |
| کہف و رقیم | ۲۴۲ |

| | | | | | |
|---|---|---|---|---|---|
| واقعہ | ۲۴۹ | جنتان عن یمین وشمال | ۲۹۴ | چند تفسیری نکات | ۳۳۶ |
| واقعہ کی تاریخی حیثیت | ۲۵۱ | اہلِ سبا اور خدا کی نافرمانی | ۲۹۶ | بصائر وعبر | ۳۴۲ |
| تفسیری حقائق | ۲۵۴ | سیلِ عرم | ۲۹۷ | **اصحاب الفیل** | ۳۴۵ |
| نتائج وعبر | ۲۶۹ | پہلی سزا | ″ | حبش | ″ |
| **سبا اور سیل عرم** | ۲۷۴ | دوسری سزا | ۳۰۲ | حکومت | ۳۴۶ |
| تمہید | ″ | چند تاریخی مباحث | ۳۰۸ | نجاشی | ″ |
| سبا؟ | ۲۷۵ | چند تفسیری مباحث | ۳۱۱ | مذہب وتمدن | ″ |
| نام یا لقب | ۲۸۲ | نتائج وعبر | ۳۱۵ | حبش ویمن کی کشمکش | ۳۴۷ |
| زمانۂ حکومت | ۲۸۳ | **اصحاب الاخدود** | ۳۱۷ | ابرہۃ الاشرم | ۳۴۸ |
| سبا اور طبقاتِ حکومت | ″ | **یا قوم تبع** | | القلیس | ۳۴۹ |
| مکاربِ سبا اور ملوکِ سبا | ۲۸۷ | اخدود؟ | ″ | اصحاب الفیل | ″ |
| وسعتِ حکومت | ″ | اصحابِ اخدود اور قرآن حکیم | ″ | قرآن اور اصحاب الفیل | ۳۵۴ |
| طرزِ حکومت | ۲۸۸ | واقعہ کی تفصیلات | ۳۱۹ | سورۂ فیل اور بعض | ۳۵۹ |
| سبا کی عمارات | ۲۸۹ | انتقاد | ۳۲۸ | دیگر تفسیریں | |
| سبا کا تمدن | ″ | تبع | ۳۳۳ | چند تشریحی مطالب | ۳۸۶ |
| سدِ مآرب | ۲۹۱ | عرب کی دو حکایتیں | ۳۳۴ | بصائر وعبر | ۳۸۸ |






# پیش لفظ

الحمد للہ العلی الاکبر، والصلوٰۃ والسلام علیٰ محمدن المبعوث
الی الاسود والاحمر وعلیٰ اٰلہٖ واصحابہ الذین ھم ھداۃ الدین الازھر ؛

قصص القرآن کی تالیف کے وقت یہ خیال تھا کہ اِس موضوع سے عہدہ برآ ہونے کے لیے چند سو صفحات کا ایک جزء کافی ہوگا لیکن اس وادی میں قدم رکھنے کے بعد میدان کی وسعت نے اِس خیال میں انقلاب پیدا کر دیا اور رہوارِ قلم جس قدر آگے بڑھتا گیا میدانِ موضوع وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا، تاہم تیسرے جزء پر اِس موضوع کو مکمل کر دینے کا حتمی ارادہ تھا مگر سعیِ بلیغ کے باوجود ناکام رہا اور اِس تیسری جلد پر بھی حدِ تکمیل کو نہ پہنچ سکا اور چوتھی جلد کے اضافہ پر مجبور ہونا پڑا جو عنقریب ان شاء اللہ ہدیۂ ناظرین ہوگی۔

قصص القرآن کا یہ تیسرا حصہ ہدیۂ ناظرین ہے، پہلے اور دوسرے حصہ کی افادیت اور قدیم و جدید علمی طبقوں میں ان کی مقبولیت، خدائے برتر کا وہ فضل و کرم ہے جس کے اظہارِ شکر کے لیے میرے قلب و زبان دونوں قاصر ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ قصص القرآن کی اس جدید ترتیب و تدوین کے ساتھ اہلِ علم کا شغف مصنف کی محنت و کاوش کا نتیجہ نہیں بلکہ قرآنِ عزیز کی برکت و عظمت کا ثمرہ ہے۔ مسلمانوں کا کلامِ الٰہی کے ساتھ والہانہ ذوق اگر اس محنت کو مفید اور پسندیدہ سمجھتا اور اس

کاوش کو بہ نظرِ استحسان دیکھتا ہے تو فالحمد للہ علےٰ ذٰلک وَذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ وَاللّٰہُ ذُوالْفَضْلِ الْعَظِیْمِ۔

قَصَصُ الْقُرْآن کے اس تیسرے جزء میں وہ تمام تاریخی واقعات سپردِ قلم ہوئے ہیں جو انبیاء علیہم السلام کی سیرتِ طیبہ اور اُن کی رشد و ہدایت کے سلسلہ میں قرآنِ عزیز نے عبرت و بصیرت اور پند و موعظت کے لیے بیان کئے ہیں۔

ان میں بعض وہ واقعات ہیں جن کے متعلق حریف اہلِ قلم خصوصاً متعصب مستشرقینِ یورپ "اِنْ ھُوَ اِلَّآ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ" کہہ کر اُن کو بے سروپا داستان اور غیر تاریخی قصے ظاہر کرتے ہیں۔

اس لیے اُن کے علی الرّغم صحیح اور مستند اسلامی و غیر اسلامی تاریخی نقول کی روشنی میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ قرآنِ عزیز کے بیان کردہ یہ وقائع تاریخی حقائق ہیں اور ان کا انکار علمی حقائق کا انکار ہے۔ اس سلسلہ میں ذوالقرنین، اصحابُ الکہف والرقیم، اصحابُ الرّس اور اصحابُ الفیل کے واقعات خصوصی حیثیت رکھتے ہیں۔

قرآنِ عزیز تاریخ کی کتاب نہیں ہے بلکہ ہدایتِ ثقلین کے لیے معاد و معاش کا مکمل نظام اور دین و دنیا کی رشد و ہدایت کا قانونِ کامل ہے اس لیے اس نے قوموں کے عروج و زوال اور مبدء و انجام سے متعلق اسی قدر حصہ بیان کیا ہے جو اس مقصدِ "تذکیر" و "موعظت" کے لیے مناسب تھا لیکن جب ایک تاریخِ عالم کا طالبِ علم ان قوموں کی تاریخ کا مکمل مطالعہ کرتا یا صفحاتِ عالم پر اُن کے آثار و نشانات کو دیکھتا اور پڑھتا ہے تو اس کو بے ساختہ یہ اقرار کرنا ہوتا ہے کہ قرآن نے ان اقوام کے متعلق جو کچھ بھی کہا ہے سرتاسر حقیقت اور ان کی حیاتِ ماضی کا صحیح مرقع ہے۔

اور ان میں بعض واقعات وہ بھی ہیں جو درحقیقت ایک "مثال" کی حیثیت رکھتے ہیں یعنی قرآن نے اُن کو صرف اس لیے بیان کیا ہے کہ موعظت و نصیحت کی جس نوع کا ذکر کیا جارہا ہے

اس کے قبول کرنے اور نہ کرنے والوں کی یہ "مثال" ہے اور ظاہر ہے کہ "مثال" کے لیے واقعہ کا پیش آنا ضروری نہیں ہے، اگرچہ وہ واقعہ کی شکل میں ہی کیوں نہ پیش کی جائے اور یہ حقیقت کسی بھی زبان کے فصیح و بلیغ ادیب سے مستور نہیں ہے اور وہ جانتا ہے کہ مثال کا یہ طریقہ موعظت و نصیحت کے لیے کس درجہ مفید اور دل نشین ہوتا ہے؟ مگر بعض مفسرین نے ان واقعات کو بھی ماضی میں ہو گزرے واقعات کے سلسلہ میں منسلک کر دیا ہے۔ لہٰذا ہم نے ایسے مواقع پر یہ واضح کر دینا ضروری سمجھا کہ اس واقعہ کی حقیقت ایک "مثال" سے زیادہ نہیں ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص اس کو واقعاتِ ماضی کی ہی ایک کڑی سمجھتا ہے تب بھی ان واقعات کو واقعات تسلیم کر لینے میں نہ کسی اچنبھی بات کو تسلیم کرنا لازم آتا ہے اور نہ ایسے واقعات کا غیر تاریخی ہونا ان کے "مثال" بننے میں حارج ہو سکتا ہے۔ مثلاً "مومن و کافر" یا "اصحاب الجنۃ۔ باغ والوں کا واقعہ۔ کہ قرآن کا مقصد اُن کے بیان کرنے سے صرف حسبِ حال ایک "مثال" دینا ہے خواہ وہ ماضی میں گزرا واقعہ ہو یا نہ ہو۔

قصص القرآن کے دوسرے اجزاء کی طرح اس جزء میں بھی واقعات کے تاریخی حقائق مطالب کو روشنی میں لانے کے علاوہ ان سے متعلق تفسیری و حدیثی مباحث" اور "تحقیقی مباحث" پر بھی سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور ساتھ ہی ان سے حاصل شدہ نتائج و ثمرات کو "بصائر و عبر" اور "مواعظ و بصائر" کے مختلف عنوانات سے بیان کیا گیا ہے کہ ان واقعات کے بیان کرنے کا حقیقی مقصدِ قرآنی "عبرت و بصیرت" رہی ہے۔

موضوعِ کتاب سے متعلق واقعات کو اس طرح زیرِ بحث لانے سے آپ کو یہ حقیقت جگہ جگہ اُبھری ہوئی نظر آئے گی کہ مستشرقینِ یورپ نے کہ جن کی ریسرچ اور فلسفۂ تاریخ کی موشگافیوں سے ہم بہت جلد مرعوب ہو جاتے ہیں، کس طرح فلسفۂ تاریخ کے نام پر اپنے مخالف واقعات کو غیر تاریخی ظاہر کرنے اور اپنے موافق واقعات کے غیر تاریخی پہلوؤں کو کس طرح تاریخی حیثیت دینے کی سعی کی ہے اور پھر اس زہرِ ہلاہل کو کس خوبصورتی سے "تریاق" کی شکل میں پیش کیا ہے؟

اِن اہم خصوصیات کے علاوہ اپنے دوسرے اجزاء و مجلّدات کی طرح یہ جلد بھی حسبِ ذیل خصوصیات کی حامل ہے :-

① کتاب میں واقعات کی اساس و بنیاد قرآنِ عزیز کو بنایا گیا ہے اور صحیح احادیث و مُستند تاریخی واقعات سے اُن کی توضیح و تشریح کی گئی ہے۔

② کتبِ عہدِ قدیم اور قرآنِ عزیز کے "یقین محکم" کے درمیان جس جگہ تعارض نظر آتا ہے، تو یا روشن دلائل و براہین کے ذریعہ دونوں کے درمیان تطبیق دے دی گئی ہے اور یا پھر قرآنِ عزیز کی صداقت کو واضح براہین اور مسکت دلائل کے ساتھ ثابت کیا گیا ہے۔

③ اسرائیلی روایات کی خرافت اور معاندین کے اعتراضات کی بطالت کو حقائق کی روشنی میں ظاہر کر دیا گیا ہے۔

④ تفسیری، حدیثی اور تاریخی مسائل اور اُن سے متعلق مباحث و اشکالات پر بحث و نظر کے بعد سلفِ صالحین کے مسلکِ قدیم کے مطابق ان کی تحقیق اور ان کا حل پیش کیا گیا ہے

⑤ واقعہ کا ذکر قرآن میں کتنی جگہ ہوا ہے اس کو دورانِ بحث میں بیان کر دیا گیا ہے۔

مصنّف کو اِن خصوصیات کے متعلق کس حد تک کامیابی نصیب ہوئی اس کا فیصلہ اصحابِ نظر اور اہلِ ذوق کی صوابدید پر ہے۔ وما توفیقی اِلّا باللّٰہ وھو حسبی و نعم الوکیل۔

خادمِ ملت

محمد حفظ الرحمٰن صدیقی سیوہاروی

شعبان ۱۳۶۳ھ

ڈسٹرکٹ جیل مرادآباد

# دیباچہ

## طبعِ دوم

جلد سوم کا پہلا ایڈیشن جس وقت نکلا تو کتاب کی جلد اول اور جلد دوم تقریباً ختم ہو گئی تھیں، بڑی جد وجہد کے بعد ۴۵-۱۹۴۶ء میں یہ دونوں جلدیں تیار ہوئیں، کچھ ہی دن گزرے تھے کہ جلد سوم ناپید ہو گئی، اس جلد کی کتابت آخری مرحلوں سے گزر رہی تھی کہ ملک میں ایک ہولناک اور خونخوار انقلاب رُونما ہو گیا، دہلی میں قیامت برپا ہوئی اور ندوۃ المصنفین تباہ ہو گیا، ادارے کی دیگر مطبوعات کے لاکھوں روپے کے ذخیرے کے ساتھ قصص القرآن کی ہزاروں جلدیں بھی برباد ہو گئیں، اب کہ جلد سوم کا یہ دوسرا ایڈیشن پیش کیا جا رہا ہے حصہ اول، دوم اور چہارم برائے نام باقی رہ گئے ہیں۔

ناظرین کو معلوم ہے "قصص القرآن" کا شمار "ندوۃ المصنفین" کی مقبولِ عام اور مفید ترین کتابوں میں ہے اور اس لیے میری ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ اس عظیم الشان کتاب کے تمام حصے ہر وقت موجود رہیں اور اربابِ ذوق کو زحمتِ انتظار اُٹھانی نہ پڑے، لیکن تَجْرِی الرِّیَاحُ بِمَا لَا تَشْتَهِی السُّفُنُ۔

گرامی قدر مؤلف دہلی کی مقامی انجمنوں اور دیگر اہم ترسیاسی مشاغل میں ایسے پھنسے ہوئے ہیں کہ ارادے کے باوجود اب تک تصنیف و تالیف کے لیے وقت نہیں نکال سکے چنانچہ یہ ایڈیشن نظر ثانی کے بغیر بعینہٖ پہلی ہی ترتیب پر نکل رہا ہے، فرق صرف یہ ہے کہ پہلا ایڈیشن ۲۰ × ۲۶-۲۱ سطر پر تھا اور یہ ۲۰ × ۲۶-۱۹ سطر پر ہے۔ اس طرح کتابت نسبتاً کھل گئی ہے اور حجم بھی بڑھ گیا ہے۔

عتیق الرحمٰن عثمانی

۱۸ ذیقعدہ ۶۷ھ
م ۲۳ ستمبر ۱۹۴۸ء

# طبع سوم

یقین تھا کہ تیسرا ایڈیشن مؤلف گرامی کی نظر ثانی کے بعد نکلے گا، لیکن حالات نے اس کی اجازت نہ دی، کتاب بالکل ختم ہو چکی تھی اور نظر ثانی کے انتظار میں اس کی اشاعت ملتوی نہیں کی جا سکتی تھی۔ بنا بریں یہ ایڈیشن بھی پہلے دو ایڈیشنوں کے مطابق نکل رہا ہے، البتہ اس دفعہ کتابت اور تصحیح کا زیادہ اہتمام کیا گیا ہے۔ جس کو ناظرین نمایاں طور پر محسوس کریں گے۔

عتیق الرحمٰن عثمانی

یکم ذیقعدہ ۱۳۷۱ھ

# دیباچہ

# طباعت عکسی

قصص القرآن جلد اول اور جلد دوم کی عکسی طباعت کے بعد برابر یہ کوشش رہی کہ جلد سوم اور جلد چہارم بھی اسی انداز پر آجائیں۔ معیاری کتابت کا مرحلہ بھی آسان نہیں ہوتا، ہمارے یہاں اس وقت عکسی کتابت کا مدار مشہور اور بہترین خطاط منشی محمد خلیق صاحب ٹونکی پر ہے، منشی صاحب کی صحت ٹھیک نہیں رہتی اور اُن پر کام کی یورش بھی زیادہ رہتی ہے، اس لیے وقت گزرتا گیا اور کام

پورا نہ ہو سکا، شکر ہے اب کئی سال کے بعد جلد ثالث طبع آفسٹ قارئین کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے اور جلد چہارم بھی زیر کتابت ہے جس کا بڑا حصہ لکھا جا چکا ہے۔

قصص القرآن ندوۃ المصنفین کی نہایت اہم اور مقبول کتاب ہے، جی چاہتا تھا کہ کتاب کی کتابت و طباعت بھی اس کی شان کے مطابق ہو، خوشی کی بات ہے کہ یہ خیال عمل میں آگیا اور اس مشکل وقت میں بھی حسبِ منشا کام ہو گیا، کتاب کے مضامین و مباحث کے متعلق کچھ کہنا غیر ضروری ہے ہزاروں کی تعداد میں اس کی اشاعت ہو چکی ہے اور خواص و عوام سب ہی کے یہاں سے اس کو سندِ اعتبار و استناد مل چکی ہے، اس سلسلے میں بعض عجیب و غریب خواب بھی دیکھے گئے ہیں جن سے کتاب کے تقدس، اہمیت اور مقبولیت کا اندازہ لگانے میں بصیرت افروز مدد ملتی ہے۔

دیگر خصوصیات کے علاوہ اس جلد کی ایک تاریخی خصوصیت یہ بھی ہے کہ مصنف مرحوم نے اس کی تالیف کا بڑا حصہ جیل خانے میں تیار کیا تھا، مرحوم ۱۹۴۲ء کے QUIT INDIA کے ہنگامہ خیز معرکے میں محبوس کر دیے گئے تھے اور ڈسٹرکٹ جیل مراد آباد میں قیام پذیر تھے، اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اسی زمانے میں یہ اہم ترین خدمت انجام پائی، کتاب کا جتنا مسودہ تیار ہو جاتا تھا، کسی نہ کسی تدبیر سے باہر آجاتا تھا، اور ساتھ ہی ساتھ اس کی کتابت کا بھی انتظام کیا جاتا تھا، اب ہم آزاد ہیں لیکن غلامی کے اُس وقت کی یاد تازہ رہتی ہے، اب نہ مصنف مرحوم دنیا میں ہیں اور نہ ڈسٹرکٹ جیل مراد آباد کی وہ ایمان افروز فضا باقی ہے، قصص القرآن کا فیض البتہ جاری ہے اور ان شاء اللہ جاری رہے گا۔

عتیق الرحمٰن عثمانی

۴، شعبان المعظم ۱۳۹۷ھ

۲۲، جولائی ۱۹۷۷ء





# اصحابُ الجنّہ

سورۃ القلم اور اصحاب الجنّہ • واقعہ سے متعلق اقوال
تشریح • موعظت

**سورۃ القلم اور اصحابُ الجنّہ**

سورۃ القلم میں اللہ تعالیٰ نے کفارِ مکہ کے حسبِ حال ایک مثال بیان فرمائی ہے اور یہ بتایا ہے کہ جس طرح باغ والوں نے خدا کی نعمت کو ٹھکرایا اور اس کا حق ادا کرنے کے لیے شکرِ نعمت نہ کیا اسی طرح مکہ کے مشرکین کا حال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خاتم النبیین (صلی اللہ علیہ وسلم) کو مبعوث فرما کر اُن پر اپنی نعمت کاملہ کا اظہار فرمایا اور ان کے ارشاد و ہدایت کے لیے ہادیِ اعظم بھیج کر عظیم الشان احسان کیا، لیکن انھوں نے اُس کی کوئی قدر نہ کی اور انکار و مخالفت کے ساتھ اس نعمت کو رد کرنے لگے، تو اب ان کا بھی وہی نتیجہ ہونے والا ہے جو باغ والوں کا ہوا چنانچہ ارشاد ہوتا ہے :-

| | |
|---|---|
| اِنَّا بَلَوۡنٰهُمۡ كَمَا بَلَوۡنَاۤ اَصۡحٰبَ الۡجَـنَّةِ‌ | بے شبہ ہم نے ان (کفارِ مکہ) کو اسی طرح آزمایا ہے جس طرح |
| اِذۡ اَقۡسَمُوۡا لَيَصۡرِمُنَّهَا مُصۡبِحِيۡنَۙ‏ | باغ والوں کو آزمایا جو کہ انھوں نے قسم کھائی کہ ہم صبح ہوتے ان |
| وَلَا يَسۡتَثۡنُوۡنَ‏ ٥ فَطَافَ عَلَيۡهَا | (کے پھلوں) کو کاٹ لیں گے اور وہ انشاء اللہ بھی نہ کہتے تھے۔ |
| طَآئِفٌ مِّنۡ رَّبِّكَ وَهُمۡ نَآئِمُوۡنَ ٥ | پس ابھی وہ سو ہی رہے تھے کہ (ان کے باغ پر) تیرے پروردگار کی |
| فَاَصۡبَحَتۡ كَالصَّرِيۡمِۙ فَتَنَادَوۡا | جانب سے پھرنے والا پھر گیا (یعنی عذابِ الٰہی سے وہ باغ برباد ہو گیا) |
| مُصۡبِحِيۡنَۙ ٥ اَنِ اغۡدُوۡا عَلٰى | پس صبح کو ایسا ہو گیا گویا جڑ سے کاٹ کر پھینک دیا گیا ہے۔ (صبح ہوئی |

حَرْثِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰرِمِيْنَ ۝
فَانْطَلَقُوْا وَهُمْ يَتَخَافَتُوْنَ ۝
اَنْ لَّا يَدْخُلَنَّهَا الْيَوْمَ عَلَيْكُمْ
مِّسْكِيْنٌ ۝ وَّغَدَوْا عَلٰى حَرْدٍ
قٰدِرِيْنَ ۝ فَلَمَّا رَاَوْهَا قَالُوْٓا
اِنَّا لَضَآلُّوْنَ ۝ بَلْ نَحْنُ
مَحْرُوْمُوْنَ ۝ قَالَ اَوْسَطُهُمْ
اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ لَوْلَا تُسَبِّحُوْنَ ۝
قَالُوْا سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنَّا كُنَّا
ظٰلِمِيْنَ ۝ فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ
عَلٰى بَعْضٍ يَّتَلَاوَمُوْنَ ۝
قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا طٰغِيْنَ ۝
عَسٰى رَبُّنَآ اَنْ يُّبْدِلَنَا خَيْرًا
مِّنْهَآ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا رٰغِبُوْنَ ۝
كَذٰلِكَ الْعَذَابُ ۭ وَلَعَذَابُ
الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا
يَعْلَمُوْنَ ۝ (القلم پ ۲۹ ع ۱)

تو انھوں نے ایک دوسرے کو پکارا کہ اگر کھیتی کاٹنا چاہتے ہو تو سویرے
چلے چلو اور وہ چلتے چلتے آپس میں چپکے چپکے باتیں کرتے جاتے تھے
(کہ جلدی کرو) ایسا نہ ہو کہ کاٹتے وقت تم کو فقیر آگھیریں) اور اپنے
بخل کی وجہ سے بہت سویرے (باغ کھیت پر) پہنچے اندازہ لگا کر
(کہ اس وقت تک فقیر نہ پہنچ سکیں گے) پس جب اس کو (اس حال
میں) دیکھا تو کہنے لگے: یقیناً ہم راہ بھول گئے ہیں (یہ وہ مقام
نہیں ہے، مگر جب غور سے دیکھا تو کہنے لگے) بلکہ ہم (باغ کے نفع
سے) محروم رہ گئے۔ ان میں سے ایک بھلے آدمی نے کہا: کیا
میں نے تم سے پہلے ہی نہیں کہا تھا کہ (اس نعمتِ الٰہی پر) کیوں خدا
کی پاکی بیان نہیں کرتے (اب انجام بد کے بعد) کہنے لگے ہمارے
پروردگار کے لیے پاکی ہے بےشک ہم نے خود ہی اپنے نفس پر ظلم کیا،
اور آپس میں ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے (کہ تو نے ہی ہم کو
پہلے سے کیوں نہ سمجھایا) اور کہنے لگے: ہائے بدقسمتی! بلاشبہ ہم
سرکش تھے۔ جلد توقع ہے کہ ہمارا پروردگار ہم کو اس سے بہتر بدل
عطا فرمائے۔ بے شبہ (اب) ہم اپنے پروردگار ہی کی جانب متوجہ
ہیں (اے مکہ والو) خدا کا عذاب اسی طرح (اچانک) آجاتا ہے اور
آخرت کا عذاب تو بہت ہی ہولناک ہے کاش کہ وہ جان لیتے۔

**واقعہ سے متعلق اقوال** حضرتِ عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ یہ کفارِ مکہ کے حالات کے مناسب قرآن نے ایک مثال دی ہے کوئی واقعہ نہیں ہے[1]۔ اور سعید بن جبیر فرماتے ہیں کہ یہ واقعہ ہے جو یمن کی ایک بستی ضروان میں پیش آیا جو کہ صنعاء سے چھ میل پر واقع تھی[2] چنانچہ مفسرین

---

[1] تفسیر ابن کثیر سورۃ القلم۔ [2] ایضاً۔

نے اس واقعہ کی تفصیل یہ بیان فرمائی ہے:۔

اہلِ کتاب میں سے ایک شخص بہت مالدار، صاحبِ زمین و املاک اور مردِ نیک تھا، اپنی پیداوار میں سے فقراء و مساکین پر کافی خرچ کرتا رہتا تھا، اس کا جب انتقال ہوگیا تو اس نے چند لڑکے وارث چھوڑے، جب پھلوں اور کھیتوں کے کاٹنے کا وقت آیا تو ان لڑکوں نے آپس میں کہا "ہمارا باپ تو بہت ہی بے وقوف تھا کہ اپنی یہ کثیر دولت فقراء و مساکین میں لٹا دیتا تھا، ہم ایسے پاگل نہیں ہیں کہ اپنی محنت کو اس طرح رائگاں کر دیں۔ اور صلاح یہ ٹھہری کہ پھل اتارنے اور کھیتی کاٹنے کے لیے منہ اندھیرے چلو اور اتنی عجلت کرو کہ فقراء اور مساکین کو معلوم ہی نہ ہو سکے کہ کھیتوں پر آ کر ہم کو تنگ کریں۔

یہاں تو یہ خدا ناترس، بخیل یہ مشورہ کر رہے تھے کہ ساری دولت کو ذخیرہ کر کے "کنز" بنالیں اور اس میں سے نہ خدا کا حق ادا کریں اور نہ خدا کے بندوں کا اور دوسری جانب خدا کے حکم سے رات ہی میں ان کی تمام سرسبز و شاداب کھیتی اور باغ تیز اور گرم ہوا سے جل کر خاک ہو گئے۔ اب جو مشورہ کے مطابق یہ منہ اندھیرے وہاں پہنچے تو معاملہ دگرگوں پایا اور کچھ نہ سمجھے اور آگے نکل گئے کہ شاید یہ وہ جگہ ہی نہیں ہے مگر دوسرے نشانات دیکھ کر چونکے اور اب سمجھے کہ یہ ہمارے بخل اور مشورہ کا نتیجہ ہے جو ہم نے شبِ گزشتہ میں حکمِ الٰہی کے خلاف غریبوں اور مسکینوں کا حق تلف کرنے کے لیے کیا تھا۔ اب حسرت سے بدقسمتی کا شکوہ کرنے اور خدا کو پکارنے لگے، مگر وقت نکل جانے اور پاداشِ عمل پالینے کے بعد یہ پکار بے سود ثابت ہوئی۔

تشریح | یہ مثال ہو یا واقعہ، قرآنِ عزیز نے اس کے بیان میں تذکیر و تنذیر کا جو پہلو رکھا ہے وہ بہرحال اپنی جگہ ہے، اس لیے کہ ان آیات سے قبل قریشِ مکہ کی نافرمانیوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے انکار اور کفران کا ذکر کرتے ہوئے خصوصیت کے ساتھ ان کے ایک سردار ولید بن مغیرہ کی بداعمالیوں کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ اب ان کو ایک مثال دے کر یا واقعہ سنا کر یہ بتایا جا رہا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور خدا کی نعمت (قرآن) کے خلاف باہم سرگوشیاں کرنے، قرآن کی عطا کردہ تعلیم متعلق

حقوق اللہ و حقوق العباد سے گریز کر کے اپنی قوت و شوکت پر اتراتے اور گھمنڈ کرتے ہوئے پیغمبرِ معصوم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کی تحقیر کرنے کا انجام وہی ہونے والا ہے جو "باغ والوں" کا ہوا اور یہ اسلیے کہ اول خدا کی جانب سے قانونِ امہال (مہلت دینے کا قانون) متکبروں کو ڈھیل دیتا اور اصلاحِ حال کے لیے موقع عطا کرتا ہے مگر جب کوئی قوم اس سے فائدہ نہیں اُٹھاتی بلکہ خدا کی اس مہلت کو اپنی باطل پرستی کے لیے صداقت کی دلیل ٹھہرا کر صادقین اور اُن کی صداقت کی تحقیر و تذلیل پر آمادہ ہو جاتی ہے تو پھر اچانک قانونِ گرفت اپنا سخت پنجہ ان پر جما دیتا اور ان کو ہلاک و برباد کر کے کائنات کی عبرت و بصیرت کا سامان مہیا کر دیتا ہے، پھر اس وقت نہ حسرت کام آتی ہے نہ ندامت، اور اس گھڑی نہ ایمان لانا مفید ہوتا ہے اور نہ خدا کی اِنقیاد و اطاعت کا اعلان۔

| | |
|---|---|
| وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ | اور جب ہمیں منظور ہوتا ہے کہ کسی بستی کو ہلاک کریں تو ایسا ہوتا ہے کہ |
| قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا | اس کے خوش حال لوگوں کو حکم دیتے ہیں (یعنی وحی کے ذریعہ پیغامِ حق |
| فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا | پہنچا دیتے ہیں) پھر وہ بجائے اس کے کہ اس کی تعمیل کریں نافرمانی میں سرگرم |
| الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا ۝ | ہو جاتے ہیں پس ان پر عذاب کی بات ثابت ہو جاتی ہے اور (پاداشِ عمل |
| (بنی اسرآءیل پ ۱۵ ع ۲) | میں) ہم انھیں برباد و ہلاک کر ڈالتے ہیں۔ |

**موعظت** اللہ تعالیٰ نے اس کائناتِ ہست و بود میں انسان کو اجتماعی حیات کے لیے پیدا کیا ہے اور حاجاتِ انسانی کو ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح مربوط کر دیا ہے کہ یہ کارخانہ باہمی اشتراک و اعانت کے بغیر نہیں چل سکتا اور چونکہ اجتماعی زندگی افراد ہی سے منتج اور سنورتی ہے اس لیے از بس ضروری ہے کہ ان کی نشو و نما اور بقاءِ حیات کا ایسا قانون مقرر کیا جائے جس کی بدولت افرادِ انسانی کے درمیان رشتۂ اخوت و مودّت قائم ہو سکے اور کسی وقت بھی رقابت اور تنافس پیدا نہ ہونے پائے۔ لہٰذا حق تعالیٰ نے اس نظام کی تکمیل کے لیے معاشی زندگی سے متعلق "دو حقوق" مقرر فرمائے، ایک حقِ معیشت اور دوسرا درجاتِ معیشت۔

حقِ معیشت کا قانون یہ ہے کہ اس عالم میں ایک جاندار بھی ایسا نہیں رہنا چاہیے جو

حقِ معیشت سے محروم ہو، یہ ہر شخص کا انفرادی حق ہے کہ وہ زندہ رہے اس لیے حقِ معیشت میں یہاں سب مساوی ہیں اور کسی کو کسی پر تفوق و برتری حاصل نہیں۔

دوسرا درجاتِ معیشت کا مسئلہ ہے یعنی یہ ضروری ہے کہ معاشی زندگی کے لیے سب کو ملے مگر یہ ضروری نہیں کہ سب کو برابر ملے" وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ" لیکن درجاتِ معیشت کی اس کمی و بیشی اور تفاضل کا یہ مطلب نہیں کہ اس نے جو کچھ کمایا ہے وہ سب اس کا انفرادی حق ہے، نہیں بلکہ جو جس قدر زیادہ کمائے گا اسی قدر اس کی دولت میں اجتماعی حق زیادہ ہوگا اور پھر یہ اجتماعی حق دو قسم پر تقسیم ہو جاتا ہے، ایک حق اللہ دوسرا حق العباد۔ پس جو شخص اپنی دولت و ثروت کو صرف انفرادی مِلک سمجھتا اور اس میں حق اللہ اور حق العباد دونوں کا انکار کرتے ہوئے اس کے نشہ میں مست ہو کر احکامِ الٰہی سے بے پروا ہو جاتا ہے اس کا انجام کبھی بخیر نہیں ہوتا اور وہ خدا کے غضب کا مستحق قرار پاتا ہے:۔

| | |
|---|---|
| وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ | اور جو لوگ چاندی سونا اپنے ذخیروں میں ڈھیر کرتے |
| وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ | رہتے ہیں اور اللہ کی راہ میں اسے خرچ نہیں کرتے تو |
| فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ (سورۃ) | ایسے لوگوں کو دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دو۔ |

ولید بن مغیرہ اور قریشی سرداروں کو خدا نے ہر قسم کی نعمتیں عطا فرمائی تھیں اور پھر ان مادی ترقیات کے ساتھ ساتھ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت فرما کر ان کی روحانی نعمت کو بھی کامل و مکمل کر دیا تھا، لیکن ان بدبختوں نے شکر ادا کرنے کی بجائے کفرانِ نعمت کیا، آخر نتیجہ یہ نکلا کہ جس طرح باغ والے اپنے باغ کی نعمتوں سے محروم ہو گئے اِسی طرح کفارِ مکہ بھی مادی اور رُوحانی نعمتوں سے محروم ہو کر ابدی ذلت و خسران کے ماسوا اور کچھ نہ پا سکے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔



# مؤمن وکافر

سورۂ کہف اور مومن وکافر کا مذاکرہ، واقعہ کی تشریح،
بصائر

سورۂ کہف اور مومن وکافر کا واقعہ

اللہ تعالیٰ نے سورۂ کہف میں اصحاب کہف کے واقعہ کے بعد ایک اور واقعہ کا ذکر فرمایا ہے، یہ واقعہ دو انسانوں کے درمیان مناظرانہ گفتگو کی شکل میں ذکر ہوا ہے اور ساتھ ہی اس کا نتیجہ اور ثمرہ بھی مذکور ہے۔ یعنی ایک کا طریق زندگی مآل کے اعتبار سے کامیاب رہا اور دوسرے کو ندامت وحسرت کا مُنہ دیکھنا پڑا۔

اس کے متعلق بعض مفسرین کا خیال ہے کہ قرآن عزیز نے اس واقعہ کو مثال کے طور پر کفارِ مکہ اور مسلمانوں کی جماعت کے حالات کو سامنے رکھ کر تذکیر اور نصیحت کے لیے بیان کیا ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ اس طرح کا واقعہ درحقیقت دو آدمیوں (مومن وکافر) کے درمیان زمانہ ماضی میں پیش آیا تھا۔

اور ابن کثیر کہتے ہیں کہ جمہور کا قول یہ ہے کہ جس طرح اصحاب کہف کا واقعہ پیش آیا ہے اسی طرح نزولِ قرآن سے قبل دو انسانوں کے درمیان یہ واقعہ بھی پیش آیا ہے اور قرآن نے ان دونوں واقعات کو مشرکینِ مکہ کی تذکیر وتنذیر کے لیے بیان کیا ہے۔

قرآنِ عزیز نے جس انداز میں اس واقعہ کا ذکر کیا ہے کتبِ احادیث وسیر اور تاریخ میں اس سے زیادہ کچھ اور موجود نہیں ہے لہذا وہی قابلِ مراجعت ہے:۔

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ — اور (اے پیغمبر) لوگوں کو ایک مثال سُنادو۔ دو آدمی تھے،

| | |
|---|---|
| جَعَلْنَا لِأَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ | ان میں سے ایک کے لیے ہم نے انگور کے دو باغ مہیا کر دیے |
| اَعْنَابٍ وَّحَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ وَّ | گرد اگرد کھجور کے درختوں کا احاطہ تھا بیچ کی زمین میں کھیتی تھی، پس |
| جَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا ۞ كِلْتَا | ایسا ہوا کہ دونوں باغ پھلوں سے لد گئے اور پیداوار میں کسی طرح |
| الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ اُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ | کی بھی کمی نہ ہوئی ہم نے ان کے درمیان (آب پاشی کے لیے) |
| مِّنْهُ شَيْـًٔا ۙ وَّفَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا | ایک ندی جاری کر دی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ آدمی دولتمند ہو گیا۔ |
| نَهَرًا ۞ وَّكَانَ لَهٗ ثَمَرٌ ۚ فَقَالَ | تب ایک دن (گھمنڈ میں آکر) اپنے دوست سے (جسے |
| لِصَاحِبِهٖ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗٓ اَنَا | خوش حالیاں میسر نہ تھیں) باتیں کرتے کرتے بول اٹھا دیکھو میں |
| اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّاَعَزُّ نَفَرًا ۞ | تم سے زیادہ مالدار ہوں اور میرا جتھا بھی بڑا طاقتور جتھا ہے" |
| وَدَخَلَ جَنَّتَهٗ وَهُوَ ظَالِمٌ | پھر وہ (یہ باتیں کرتے ہوئے) اپنے باغ میں گیا اور وہ اپنے |
| لِّنَفْسِهٖ ۚ قَالَ مَآ اَظُنُّ اَنْ | ہاتھوں اپنا نقصان کر رہا تھا۔ اس نے کہا "میں نہیں سمجھتا کہ |
| تَبِيْدَ هٰذِهٖٓ اَبَدًا ۞ وَّمَآ | ایسا شاداب باغ کبھی ویران ہو سکتا ہے مجھے توقع نہیں کہ |
| اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ وَّلَئِنْ | قیامت کی گھڑی برپا ہوگی اور اگر ایسا ہوا بھی کہ میں اپنے |
| رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ لَاَجِدَنَّ | پروردگار کی طرف لوٹایا گیا تو (میرے لیے کیا کھٹکا ہے) |
| خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا ۞ قَالَ | مجھے ضرور (وہاں بھی) اس سے بہتر ٹھکانا ملے گا" یہ سن کر |
| لَهٗ صَاحِبُهٗ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗٓ | اس کے دوست نے کہا اور باہم گفتگو کا سلسلہ جاری تھا۔ |
| اَكَفَرْتَ بِالَّذِيْ خَلَقَكَ | "کیا تم اس ہستی کا انکار کرتے ہو جس نے تمہیں پہلے مٹی |
| مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ | سے اور پھر نطفہ سے پیدا کیا اور پھر آدمی بنا کر نمودار کر دیا لیکن |
| ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًا ۞ لٰكِنَّا۠ | میں تو یقین رکھتا ہوں کہ وہی اللہ میرا پروردگار ہے اور میں |
| هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ وَلَآ اُشْرِكُ بِرَبِّيْٓ | اپنے پروردگار کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا اور پھر جب |
| اَحَدًا ۞ وَلَوْلَآ اِذْ دَخَلْتَ | تم اپنے باغ میں آئے (اور اس کی شادابیاں دیکھیں) تو کیوں |
| جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ ۙ | تم نے یہ نہ کہا کہ وہی ہوتا ہے جو اللہ چاہتا ہے، اس کی مدد |

لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ۚ اِنْ تَرَنِ
اَنَا اَقَلَّ مِنْكَ مَالًا وَّوَلَدًا ۚ
فَعَسٰى رَبِّيْٓ اَنْ يُّؤْتِيَنِ خَيْرًا
مِّنْ جَنَّتِكَ وَيُرْسِلَ عَلَيْهَا
حُسْبَانًا مِّنَ السَّمَاۗءِ فَتُصْبِحَ
صَعِيْدًا زَلَقًا ۙ اَوْ يُصْبِحَ مَاۗؤُهَا
غَوْرًا فَلَنْ تَسْتَطِيْعَ لَهٗ طَلَبًا ۝
وَاُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ فَاَصْبَحَ يُقَلِّبُ
كَفَّيْهِ عَلٰي مَآ اَنْفَقَ فِيْهَا وَهِيَ
خَاوِيَةٌ عَلٰي عُرُوْشِهَا وَيَقُوْلُ
يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّيْٓ
اَحَدًا ۝ وَلَمْ تَكُنْ لَّهٗ فِئَةٌ
يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَمَا
كَانَ مُنْتَصِرًا ۝ هُنَالِكَ
الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ ۭ هُوَ خَيْرٌ
ثَوَابًا وَّخَيْرٌ عُقْبًا ۝
(کہف پ ۱۵ ع ۵)

بغیر کوئی کچھ نہیں کر سکتا؟ اور یہ جو تمھیں دکھائی دے رہا ہے
کہ میں تم سے مال اور اولاد کم تر رکھتا ہوں تو (اس پر مغرور
نہ ہو) کیا عجب ہے میرا پروردگار مجھے تمھارے اس باغ
سے بھی بہتر باغ (جنت) دیدے اور تمھارے باغ پر
آسمان سے ایسی اندازہ کی ہوئی بات اتار دے کہ وہ چٹیل
میدان ہو کر رہ جائے یا پھر بربادی کی کوئی اور صورت
نکل آئے مثلاً اس کی نہر کا پانی بالکل نیچے اتر جائے اور
تم کسی طرح بھی اس تک نہ پہنچ سکو اور پھر (دیکھو) ایسا ہی
ہوا کہ اس کی دولت (بربادی کے) گھیرے میں آگئی وہ ہاتھ
مل مل کر افسوس کرنے لگا کہ ان باغوں کی درستگی پر میں نے
کیا کچھ خرچ کیا تھا (وہ سب برباد ہوگیا) اور باغوں کا حال
ہوا کہ ٹٹیاں گر کے زمین کے برابر ہوگئیں اب وہ کہتا ہے
اے کاش میں اپنے پروردگار کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرتا
اور دیکھو کوئی جتھا نہ ہوا کہ اللہ کے سوا اس کی مدد کرتا اور نہ خود
اس نے یہ طاقت پائی کہ بربادی سے جیت سکتا۔ یہاں سے
معلوم ہوگیا کہ فی الحقیقت سارا اختیار اللہ ہی کے لیے ہے
وہی ہے جو بہتر ثواب دینے والا ہے اور اسی کے ہاتھ بہتر انجام ہے۔

**واقعہ کی تشریح** ان آیات سے قبل یہ ذکر ہو رہا ہے کہ جو لوگ منکر ہیں ان کے لیے جہنم کی آگ ہے اور جو مؤمنین ہیں ان کے لیے ہمہ قسم کی خوش عیشیاں اور ابدی باغ (جنت) ہے، اس کے بعد آیات زیر بحث میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ جو منکرین ہیں ان کے لیے صرف آخرت ہی کی محرومیاں نہیں ہیں بلکہ وہ اس دنیا میں بھی عنقریب ناکامیوں اور بدبختیوں سے دوچار ہونے والے ہیں اُن کا

یہ گھمنڈ کہ ان کو ہر قسم کی رفاہت اور خوش عیشی حاصل ہے اور وہ مال و دولت کے مالک ہیں اور ان کا جتھا بھی بہت طاقتور ہے بہت جلد خاک میں مل جانے والا ہے اور مومن اپنی موجودہ تنگ حالی پر دل گیر اور بددل نہ ہوں کہ وقت آپہنچا ہے کہ ان کی یہ بے چارگی و بے بسی ہمہ قسم کی عزت و طاقت سے بدل جائے گی، نیز یہ کہ دنیا کی خوش عیشی چلتی پھرتی چھاؤں ہے اس پر بھروسہ بیکار ہے وہ جب مٹنے پر آتی ہے تو لمحوں کی بھی دیر نہیں لگتی اور دنیا کی کوئی طاقت بھی اس کو نہیں بچا سکتی۔

چنانچہ اس حقیقت کو واضح کرنے کے لیے قرآن نے یہ مثال دی کہ یوں سمجھو کسی جگہ دو آدمی تھے ایک کو خدائے تعالیٰ نے دنیوی عیش و عشرت کے کل سامان دے رکھے تھے اور دوسرا تنگدست اور پریشان حال تھا۔ وہ خدا کا منکر اور دولت کے نشہ میں چُور اپنے نادار دوست سے غرور و نخوت کے ساتھ یہ کہتا رہتا کہ میری یہ دولت و حشمت پائدار ہے کوئی طاقت نہیں کہ اس کو مجھ سے چھین لے اور ایک تو ہے کہ افلاس اور تنگی میں بسر کر رہا ہے۔ مفلس دوست اگرچہ تنگدست تھا مگر خدائے برتر کا سچا پرستار تھا اس نے جواب میں کہا "اپنی دولت کے نشہ میں اس درجہ مغرور نہ ہو کون جانتا ہے کہ لمحوں میں کیا سے کیا ہو جائے اور کس کو خبر ہے کہ وہ مجھ کو ان بخششوں سے نواز دے جس پر آج تو غرور کر رہا ہے آخر کار یہی ہوا کہ اس کے وہ تمام باغ جن کی شادابیوں اور عطر بیزیوں پر اس کو گھمنڈ تھا اچانک جل بھن کر خاک ہو گئے اور کل جہاں چمن زار تھا آج وہاں ویرانی کے سوا اور کچھ باقی نہ رہا۔

اس مثال میں حق تعالیٰ نے مشرکینِ مکہ اور مسلمانوں کی جماعت سے متعلق وہی نقشہ کھینچا ہے جو عرب کے ماحول کے ٹھیک ٹھیک مطابق تھا، کیونکہ ان کے یہاں اس سے بڑھ کر کوئی دولت نہ تھی کہ تاکستان کے بہتر سے بہتر باغ ہوں، ان کے چاروں طرف کھجور کے گنجان درخت لگے ہوں، درمیان میں نہر ہو اور نہر کے اردگرد سرسبز و شاداب کھیتیاں ہوں اور یہ سب کچھ مشرکینِ مکہ کو میسر تھا اور مسلمان اس وقت ان ظاہری نعمتوں سے محروم تھے۔

بہرحال یہ واقعہ ہو یا مثال، تذکیر و تدبیر کے جس مقصد کی خاطر بیان کی گئی ہے اس کے

پیشِ نظر مشرکینِ مکہ اور مسلمانوں کے باہمی تقابل کا نہایت ہی جامع اور کامل نقشہ ہے، قریشِ مکہ کے غرور و نخوت کا یہ حال تھا کہ اول تو پیغامِ ہدایت پر کان ہی نہ دھرتے تھے اور اگر کبھی سُننے پر آمادگی ظاہر بھی کرتے تو یہ شرط لگاتے کہ جب تک ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھیں اس وقت تک ان خستہ حال مسلمانوں میں سے کوئی ہمارے برابر آکر نہ بیٹھے کیونکہ ان کے ساتھ بیٹھنا ہماری سخت توہین ہے، وہ سمجھتے تھے کہ ہماری یہ دولت وحشمت غیر فانی اور ہمارا یہ کرّ و فر ابدی ہے، اس لیے مسلمانوں کو کمزور اور تنگ دست دیکھ کر ان کا مضحکہ کرتے اور حقیر و ذلیل سمجھتے تھے۔

پس قرآنِ عزیز نے لطیف اور معجزانہ اسلوب کے ساتھ مسلمانوں کے حق میں ایسے ناسازگار حالات کے وقت ان کی کامرانی اور مشرکین کی ناکامی کے اس انجام کی خبر دی ہے جو کچھ عرصہ بعد ہونے والا تھا، چنانچہ جو سعید روحیں تھیں انھوں نے سمجھا اور حق کی آغوش میں خود کو سپرد کر دیا اور جن کی شقاوت و بدبختی پر مہر لگ چکی تھی ان کا تھوڑے عرصہ بعد ہی وہ حسرتناک انجام ہوا جس کے لیے یہی کہا جا سکتا ہے "خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةَ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِينُ"

اور شاہ عبدالقادر (رحمہ اللہ) ان آیات کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"پہلے وقت میں ایک شخص مالدار مرگیا، دو بیٹے رہے، برابر مال بانٹ لیا، ایک نے زمین خرید کی، دو طرف میووں کے باغ لگائے بیچ میں کھیتی اور ندی کاٹ کر ان پر لا ڈالی کہ مینہ نہ ہو تو بھی نقصان نہ آوے اور عمدہ جگہ بیاہ کیا، اولاد ہوئی اور نوکر رکھے، تدبیر دنیا درست کر کر آسودہ گذران کرنے لگا، دوسرے نے سب مال اللہ کی راہ میں خرچ کیا، آپ قناعت سے بیٹھ رہا۔"[1]

معلوم نہیں کہ حضرت شاہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے واقعہ کی یہ تفصیل کہاں سے اخذ فرمائی ہے، کتبِ سیر و روایات ....... اور تاریخ کے اوراق تو اس بارہ میں خاموش ہیں اور "چھوٹا منہ بڑی بات" حضرت شاہ صاحب نے اس واقعہ میں جس طرح دونوں کا تقابل ظاہر فرمایا ہے قرآن کا ظاہر سیاق اس کی تائید نہیں کرتا، اس لیے کہ مردِ مومن نے کافر کے غرور کا جو

---

[1] موضح القرآن۔

جواب دیا اور کافر نے جو اُس کے افلاس پر طعنہ دیا وہ ہرگز اس صورتِ حال کے مناسب نہیں ہیں کہ مومن حقیقۃً مال دار تھا مگر اس نے اپنا سارا مال راہِ خدا میں خرچ کر دیا تھا، اگر ایسا ہوتا تو مومن و کافر کے سوال و جواب کا اسلوب دوسرا ہی ہوتا واللہ اعلم بالصواب۔

**بصائر** (۱) دُنیوی نعمتیں دو گھڑی کی دھوپ اور چار دن کی چاندنی ہیں، ناپائدار اور فانی، پس عقل مند وہ ہے جو ان پر گھمنڈ نہ کرے اور ان کے بل بوتہ پر خدا کی نافرمانی پر آمادہ نہ ہو جائے اور تاریخ کے ان اوراق کو پیشِ نظر رکھے جن کی آغوش میں فرعون، نمرود، ثمود اور عاد کی قاہرانہ طاقتوں کا انجام آج تک محفوظ ہے:۔

سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِينَ ۝ (سورۂ نمل پ۲۰) — زمین کی سیر کرو اور پھر دیکھو کہ نافرمانوں کا انجام کیا ہوا؟

(۲) حقیقی عزت ایمان باللہ اور عملِ صالح سے بنتی ہے، دولت و ثروت اور سطوت و حشمتِ دُنیوی سے حاصل نہیں ہوتی، قریشِ مکہ کو ثروت و سطوت دونوں حاصل تھیں مگر بدر کے میدان میں ان کا انجام بد اور دین و دنیا کی رسوائی کو کوئی روک نہ سکا، مسلمان دنیا کے ہر قسم کے سامانِ عیش سے محروم تھے مگر ایمان باللہ اور عملِ صالح نے جب ان کو دینی و دُنیوی عزت و حشمت عطا کی تو اس میں کوئی حائل نہ ہو سکا۔

وَلِلَّهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَلَٰكِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۝ (منفقون پ۲۸ ع) — حقیقی عزت اللہ اس کے رسول اور مسلمانوں کے لیے ہی ہے مگر منافقین اس حقیقت سے ناآشنا ہیں۔

(۳) مومن کی شان یہ ہے کہ اگر اس کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کی نعمتوں سے نوازا ہے تو غرور اور تکبر کی بجائے درگاہِ الٰہی میں جبینِ نیاز جھکا کر اعترافِ نعمت کرے اور دل و زبان دونوں سے یہ اقرار کرے کہ خدایا اگر تو یہ عطا نہ فرماتا تو ان کا حصول میری اپنی قوت و طاقت سے باہر تھا، یہ سب تیرے ہی عطاء و نوال کا صدقہ ہے۔ وَلَوْلَا إِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَاءَ اللَّهُ لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ صحیح حدیث میں ہے کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "الکنز من کنوز الجنۃ

لاحول ولا قوۃ الا باللہ جنّت کے پوشیدہ خزانوں میں سے ایک خزانہ یہ ہے کہ بندہ اعتراف کرے کہ بھلائی کرنے کی طاقت اور برائی سے بچنے کی قوت اللہ کی مدد کے بغیر ناممکن ہے۔ یعنی جس شخص نے زبان سے اس کا اقرار کیا اور دل میں اس حقیقت کو جاگزیں کرلیا اس نے گویا جنّت کے مستور خزانوں کی کنجی حاصل کرلی۔

اس کے برعکس کافر کی حالت یہ ہے کہ اس کو جب دولت و ثروت اور جاہ و جلال میسّر آجاتے ہیں تو خودی میں آکر مغرور ہوجاتا ہے اور جب کوئی خدا کا نیک بندہ اس کو سمجھاتا ہے کہ یہ سب خدا کا فضل ہے اس کا شکر ادا کر تو وہ اکڑ کر کہتا ہے " اُوْتِیْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ مِّنْ عِنْدِیْ یہ خدا کا دیا ہوا نہیں ہے بلکہ میری اپنی دانائی اور علم کا نتیجہ ہے۔"

پس مومن اور کافر کے لیے خدا کی جانب سے بھی الگ الگ جواب ملتا ہے، جن کو سورۂ مومنون میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:-

| | |
|---|---|
| اَیَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ | کیا یہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ ہم مال اور اولاد سے اس لیے |
| مِنْ مَّالٍ وَّبَنِیْنَ ۙ نُسَارِعُ لَهُمْ | ان کی امداد کر رہے ہیں کہ بھلائی پہنچانے میں سرگرمی دکھائیں؟ |
| فِی الْخَیْرٰتِ ؕ بَلْ لَّا یَشْعُرُوْنَ ۝ | نہیں مگر وہ شعور نہیں رکھتے (کہ ان کے بارے میں حقیقت |
| اِنَّ الَّذِیْنَ هُمْ مِّنْ خَشْیَةِ رَبِّهِمْ | حال دوسری ہے یعنی قانونِ امہال کام کر رہا ہے) اور جو لوگ |
| مُّشْفِقُوْنَ ۙ وَالَّذِیْنَ هُمْ بِاٰیٰتِ | اپنے پروردگار کے خوف سے ڈرتے رہتے ہیں، جو اپنے پروردگار |
| رَبِّهِمْ یُؤْمِنُوْنَ ۙ وَالَّذِیْنَ هُمْ | کی نشانیوں پر یقین رکھتے ہیں جو اپنے پروردگار کے ساتھ کسی ہستی |
| بِرَبِّهِمْ لَا یُشْرِكُوْنَ ۙ وَالَّذِیْنَ | کو شریک نہیں ٹھہراتے، جو اس کی راہ میں جتنا کچھ دے سکتے ہیں، بلا |
| یُؤْتُوْنَ مَاۤ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ | تامل دیتے ہیں اور (پھر بھی) ان کے دل ترساں رہتے ہیں کہ |
| اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ ۙ | اپنے پروردگار کے حضور لوٹنا ہے تو بلاشبہ یہ لوگ ہیں جو |
| اُولٰٓئِكَ یُسَارِعُوْنَ فِی الْخَیْرٰتِ | بھلائیوں کے لیے تیز گام ہیں اور یہی ہیں جو اس راہ میں |
| وَهُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ ۝ (المؤمنون پ ۱۸ ع ۴) | سب سے آگے نکل جانے والے ہیں۔ |

(۴) سعید وہ ہے جو انجام سے قبل حقیقتِ انجام کو سوچ لے اور انجامِ کار سعادتِ ابدی وسرمدی پائے اور شقی و بدبخت وہ ہے جو انجام پر غور کیے بغیر اوّل غرور و نخوت کا اظہار کرے اور اس انجامِ بد کو دیکھنے کے بعد ندامت و حسرت کا اظہار کرے اور یہ ندامت و حسرت اس وقت کچھ کام نہ آئے۔ چنانچہ اس واقعہ یا مثال میں بھی منکر کو وہی شقاوت پیش آئی :-

| | |
|---|---|
| وَاُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ فَاَصْبَحَ يُقَلِّبُ | اور اس کی دولت (ثمرات) گھیرے میں آگئی اور جب کہ اس کے |
| كَفَّيْهِ عَلٰى مَآ اَنْفَقَ فِيْهَا وَهِيَ | باغ کی ٹٹیاں زمین پر گر کے برابر ہوگئیں تو ہاتھ مل مل کر کہتا رہ گیا |
| خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَيَقُوْلُ | "افسوس میں نے ان پر کتنی کثیر دولت صرف کی تھی وہ سب |
| يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّيْٓ | برباد ہوگئی" اور حسرت کے ساتھ کہتا تھا" کاش کہ میں اپنے |
| اَحَدًا ۝ (الکہف پ ۱۵ ع ۶) | پروردگار کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتا"۔ |

اور یہی روزِ بد فرعون کو دیکھنا پڑا کہ وقت گزرنے پر اس نے وہی کہا کہ اگر عذاب کے مشاہدے سے پہلے موسیٰ علیہ السلام کی نصیحت مان لیتا تو اس دردناک عذاب کی نذر نہ ہوتا۔

| | |
|---|---|
| حَتّٰٓى اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ قَالَ | یہاں تک کہ جب وہ غرق ہونے لگا تو اس نے اب |
| اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ | کہا" میں اقرار کرتا ہوں کہ کوئی خدا نہیں ہے سوا اس |
| اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِيْلَ وَ | ایک ذات کے جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں |
| اَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝ آٰلْئٰنَ وَ | اور میں مسلمانوں میں سے ہوتا ہوں" (اللہ نے جواب |
| وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ | دیا) اور اس سے پہلے نافرمانی کرتا رہا اور تو |
| مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ۝ (یونس پ ۱۱ ع ۹) | فسادیوں میں سے تھا۔ |



# اصحاب القریۃ (یا) اصحاب یٰسین

اصحاب قریہ اور قرآن عزیز، واقعہ، واقعہ سے
متعلق اقوال، نقد و تبصرہ، موعظت

اصحابِ قریہ اور قرآنِ عزیز

قرآنِ عزیز (سورۂ یٰسین) میں ایک بہت ہی مختصر واقعہ مذکور ہے جو آیت " وَاضْرِبْ لَهُمْ مَثَلًا أَصْحَابَ الْقَرْيَةِ سے شروع ہو کر فَإِذَا هُمْ خَامِدُونَ " پر ختم ہوتا ہے اور سورۃ کی نسبت سے اس کو "واقعۂ اصحابِ یٰسین" اور آیات کے اسلوبِ بیان کے مطابق "واقعۂ اصحابِ قریہ" کہتے ہیں۔

واقعہ

قرآنِ عزیز نے اس واقعہ کے متعلق صرف اس قدر بتایا ہے کہ گزشتہ زمانہ میں ایک بستی میں کفر و شرک اور شر و فساد کو دور کرنے اور رشد و ہدایت کا سبق دینے کے لیے اللہ تعالیٰ نے دو پیغمبروں کو مامور کیا، انھوں نے اہلِ قریہ کو حق کی تلقین کی اور صراطِ مستقیم کی جانب دعوت دی، لیکن بستی والوں نے اِن دونوں کو جھٹلایا تب ہم نے ایک ہادی کا اور اضافہ کر دیا اور وہ تین مل کر ایک جماعت ہو گئے" اب ان تینوں نے ان کو یقین دلایا کہ بے شبہ ہم خدا کے بھیجے ہوئے ہیں مگر انھوں نے نہ مانا اور ان کا مذاق اُڑایا کہ تم بھی آدمی اور ہم بھی آدمی، پھر تمھارے اندر وہ کون سی عجیب بات ہے کہ تم پیغمبر بنا دیے گئے، یہ سب تمھارا جھوٹ اور تمھاری سازش ہے، انھوں نے کہا کہ خدا اس کا شاہد ہے کہ ہم جھوٹے نہیں وہ دانا و بینا اس کو خوب جانتا ہے مگر تم پھر بھی نہیں مانتے تو ہمارا کام اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ خدا کا پیغام تم تک پہنچا دیں اور راہِ حق دکھا دیں۔ بستی والے کہنے لگے کہ ہم تو تم کو منحوس سمجھتے ہیں کہ تم نے خواہ مخواہ ہمارے یہاں

اگر گڑبڑ پیدا کردی اور اگر تم اس سے باز نہ آئے تو ہم تم تینوں کو مار ڈالیں گے یا سخت قسم کی تکالیف میں مبتلا کردیں گے، انھوں نے جواب دیا خدا کی نافرمانی کرکے نحوست تو تم خود اپنے اوپر لاچکے ہو، اس سے زیادہ نحوست اور کیا ہوسکتی ہے کہ تم نصیحت اور خیرخواہی تک کو قبول نہیں کرتے بلکہ اور زیادہ حد سے گزرتے جاتے ہو؟

بستی کے آخری کنارے پر ایک نیک مرد رہتا تھا اس نے جب سنا کہ بستی والے خدا کے رسولوں کو جھٹلا رہے اور طرح طرح کی دھمکیاں دے رہے ہیں تو عجلت کے ساتھ وہاں آپہنچا جس جگہ یہ گفتگو ہو رہی تھی اور کہنے لگا اے قوم خدائے تعالیٰ کے پیغمبروں کی پیروی کر، اِن مقدس لوگوں کی پیروی سے کیوں منہ موڑتی ہے جو تجھ سے اِس خدمتِ حق کا کوئی معاوضہ تک نہیں طلب کرتے اور جو خدا رسیدہ اور ہدایت مآب انسان ہیں، بتاؤ میں کیوں اس ایک خدا کی ہی پرستش نہ کروں جس نے مجھ کو نیست سے ہست کیا ہے اور مرنے کے بعد میں اور تم سب اسی کی جانب لوٹ جانے والے ہیں۔ تم جو اِن برگزیدہ انسانوں کی تکذیب کررہے ہو تو میں دریافت کرتا ہوں کہ کیا مجھ کو خدائے واحد کے سوائے معبودانِ باطل کو اپنا خدا مان لینا چاہیے کہ اگر وہ ذاتِ واحد جو نہایت ہی مہربان اور رحم والا ہے مجھے کسی قسم کا نقصان پہنچانے کا ارادہ کرلے تو اِن معبودانِ باطل کی نہ سفارش کارگر ہوسکے اور نہ وہ اس نقصان سے مجھ کو بچاسکیں، اگر تمھارا مقصد یہ ہے تو ایسی صورت میں بلاشبہ میں تو سخت گمراہی میں پھنس جاؤں گا، لہٰذا کان کھول کر سن لو کہ تم ان مقدس انسانوں کی بات مانو میں تو اس ذات پر ایمان لے آیا جو میرا اور تمھارا پروردگار ہے۔

قوم نے اپنی تکذیب اور مقدس رسولوں کی تصدیق میں نیک مرد کی یہ پُراز ہدایت گفتگو سنی تو غیظ وغضب میں آگئی اور اس کو شہید کر ڈالا۔

واقعہ کا اس حد تک ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ ہم نے جرأتِ حق کی جزا میں اس کو جنت عطا کی اور جب اس نے اپنا پاک مقام اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تو

وجد آفریں انداز میں کہنے لگا کاش کہ میری قوم کے لوگ یہ جان سکتے کہ میرے پروردگار نے مجھ کو مغفرت کا کیسا بیش بہا تحفہ عطا فرمایا اور میرا کس درجہ اعزاز و اکرام کیا" پھر ارشاد ہوتا ہے کہ اس مردِ نیک کی قوم کی بدکرداری پر ان کو ہلاک کرنے اور سزا دینے کے لیے ہمیں آسمان سے کسی لشکر بھیجنے کی ضرورت نہیں تھی فقط ایک ہولناک چیخ نے ان سب کا کام تمام کر دیا اور وہ جہاں کے تہاں بجھ کر رہ گئے، معلوم ایسا ہوتا ہے کہ شاید ان بدبختوں نے خدا کے رسولوں کو بھی شہید کر ڈالا تھا، جیسا کہ انھوں نے ان کو دھمکی دی تھی اور اگرچہ قرآنِ عزیز میں یہ مذکور نہیں ہے مگر اس مردِ شہید کے ذکر کے بعد چونکہ ان رسولوں کا کوئی ذکر نہیں ہے اس لیے قرینہ یہی شہادت دیتا ہے:

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ اِذْ جَآءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ ۚ اِذْ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوْهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ فَقَالُوْٓا اِنَّآ اِلَيْكُمْ مُّرْسَلُوْنَ ۚ قَالُوْا مَآ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۙ وَمَآ اَنْزَلَ الرَّحْمٰنُ مِنْ شَيْءٍ ۙ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَكْذِبُوْنَ ۞ قَالُوْا رَبُّنَا يَعْلَمُ اِنَّآ اِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُوْنَ ۞ وَمَا عَلَيْنَآ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۞ قَالُوْٓا اِنَّا تَطَيَّرْنَا بِكُمْ ۚ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهُوْا لَنَرْجُمَنَّكُمْ وَلَيَمَسَّنَّكُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۞ قَالُوْا

(اے پیغمبر) ان (مشرکین مکہ) سے بستی والوں کا واقعہ بیان کر جب کہ ان کے پاس خدا کے رسول آئے۔ جب یہ صورت ہوئی کہ ہم نے اول ان کے پاس دو بھیجے تھے تو انھوں نے ان کو جھٹلایا تب ہم نے ان دونوں کو تیسرے کے ذریعے سے قوت و عزت عطا کی، اب ان تینوں نے بستی والوں سے کہا "ہم یقین دلاتے ہیں کہ ہم کو خدا نے تمھارے پاس بھیجا ہے" بستی والوں نے کہا "بجز اس بات کے کہ تم بھی ہماری طرح ایک انسان ہو کون سی ایسی خوبی ہے کہ تم خدا کے رسول ہو اور رحمٰن نے تم پر کچھ بھی نازل نہیں کیا اس لیے تم صاف جھوٹے ہو" ان تینوں نے کہا ہمارا پروردگار خوب جانتا ہے کہ ہم یقیناً خدا کے فرستادہ ہیں اور ہمارے ذمہ صرف واضح اور صاف طور پر خدا کا پیغام پہنچا دینا ہے، زبردستی قبول کرا دینا ہمارا کام نہیں ہے، بستی والے کہنے لگے ہم تو تم کو منحوس سمجھتے ہیں پس اگر تم [illegible] سے باز نہ آئے تو ہم تم کو سنگسار کر دیں گے اور سخت قسم کا عذاب چکھائیں گے۔

| | |
|---|---|
| طٰۤىِٕرُكُمْ مَّعَكُمْ اَىِٕنْ ذُكِّرْتُمْ | کہا تمہاری نحوست تو خود تمہارے ساتھ وابستہ ہے کہ تم کو جو |
| بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ۝ | نصیحت کی جاتی ہے اس کو نحوست کہتے ہو بلکہ تم تو حد سے |
| وَجَآءَ مِنْ اَقْصَا الْمَدِیْنَةِ | گزر رہے ہو، اور شہر کے آخری کنارے سے ایک آدمی دوڑتا ہوا |
| رَجُلٌ یَّسْعٰى قَالَ یٰقَوْمِ اتَّبِعُوا | آیا اور اس نے کہا، اے قوم تم خدا کے رسولوں کی پیروی کرو، |
| الْمُرْسَلِیْنَ۝ اتَّبِعُوْا مَنْ لَّا | ان کی پیروی کرو جو تم سے اپنی نیک ہدایت پر کوئی اجرت طلب |
| یَسْــٴَـلُكُمْ اَجْرًا وَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ۝ | نہیں کرتے، اور مجھے کیا بات مانع ہے کہ میں صرف اپنے |
| وَمَا لِیَ لَاۤ اَعْبُدُ الَّذِیْ فَطَرَنِیْ | پیدا کرنے والے ہی کی پرستش نہ کروں، اس کی پرستش |
| وَاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ۝ ءَاَتَّخِذُ | جس کی جانب ہم تم کو لوٹ جانا ہے، کیا میں اس ذاتِ واحد |
| مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً اِنْ | کے سوائے باطل معبودوں کو خدا بنالوں کہ اگر رحمٰن مجھ کو |
| یُّرِدْنِ الرَّحْمٰنُ بِضُرٍّ لَّا | کوئی نقصان پہنچانا چاہے تو اِن باطل معبودوں کی نہ کچھ |
| تُغْنِ عَنِّیْ شَفَاعَتُهُمْ شَیْــٴًـا | سفارش چل سکے اور نہ وہ اس مضرت سے بچا سکیں، میں |
| وَّلَا یُنْقِذُوْنِ۝ اِنِّیْۤ اِذًا لَّفِیْ | اگر ایسا کروں تو کھلا گمراہ ہوں۔ بیشک میں تو اپنے اور |
| ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ۝ اِنِّیْۤ اٰمَنْتُ | تمہارے پروردگار پر ایمان لے آیا۔ تم خوب کان لگا کر |
| بِرَبِّكُمْ فَاسْمَعُوْنِ۝ قِیْلَ | سن لو، تب اس کو (ہماری جانب سے) کہا گیا جنت میں |
| ادْخُلِ الْجَنَّةَ قَالَ یٰلَیْتَ | بے سزا داخل ہو جا، اس نے کہا، کاش کہ میری قوم |
| قَوْمِیْ یَعْلَمُوْنَ۝ بِمَا غَفَرَ لِیْ | جان لیتی کہ میرے پروردگار نے مجھے مغفرت کا کیسا اچھا |
| رَبِّیْ وَجَعَلَنِیْ مِنَ الْمُكْرَمِیْنَ۝ | تحفہ دیا اور مجھ کو ان لوگوں میں شامل کر لیا جن کو اس نے |
| وَمَاۤ اَنْزَلْنَا عَلٰى قَوْمِهٖ مِنْۢ | اعزاز و اکرام سے نوازا ہے اور ہم نے اس کی موت کے |
| بَعْدِهٖ مِنْ جُنْدٍ مِّنَ السَّمَآءِ | بعد اس کی قوم پر آسمان سے کوئی لشکر سزا دینے کے لیے |
| وَمَا كُنَّا مُنْزِلِیْنَ۝ اِنْ كَانَتْ | نہیں اُتارا اور ہم کو ایسا کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں تھی، |
| اِلَّا صَیْحَةً وَّاحِدَةً | (ان کی سزا کے لیے) اور کچھ نہیں تھا مگر ایک ہولناک |

فَاِذَا هُمْ خَامِدُوْنَ ۝ چیخ، پس وہ وہیں بجھ کر رہ گئے۔ (یعنی ہلاک ہو گئے)
(یٰس پ ۲۲: ۲۳ ع)

مفسرین اور ارباب سیرت اس واقعہ کے زمانہ اور تفصیلات میں اس درجہ مشکوک اور متردد نظر آتے ہیں کہ ان کے بیانات اور روایات سے واقعہ کی تعیین ناممکن ہو جاتی ہے اس لیے ہم یہی کہہ سکتے ہیں قرآنِ عزیز نے اپنے مقصدِ عظمیٰ "موعظت و عبرت" کے پیشِ نظر جس قدر بیان کیا ہے وہ ایک صاحبِ بصیرت کے لیے کافی و شافی ہے۔ خدا کی اس سرزمین پر حق و باطل کے جہاں بہت سے واقعات ہو گزرے ہیں اور اس پیرِ فلک نے اس سلسلہ میں جتنے ورق بھی اُلٹے ہیں اُن میں ایک یہ واقعہ بھی اسی آسمان کے نیچے اور اسی زمین کے اوپر ہو گزرا ہے، بستی، ایک مرد اور مقدس رسولوں کے نام معلوم ہوئے تب اور نہ ہوئے تب نفسِ واقعہ پر ان باتوں کا کوئی اثر نہیں پڑتا، کیونکہ تاریخ کے جن اوراق نے نوحؑ اور قومِ نوحؑ، ہودؑ اور عاد، صالحؑ اور ثمود، ابراہیمؑ، لوطؑ اور قومِ لوطؑ، موسیٰؑ اور فرعون، عیسیٰؑ اور بنی اسرائیل کے معرکۂ حق و باطل کے تفصیلی حالات و واقعات کو اپنے سینہ میں آج تک محفوظ رکھا ہے، اس میں اگر اس واقعہ کا بھی اضافہ ہو جائے جس کا مختصر و مجمل ذکر قرآنِ عزیز نے کیا ہے تو کون سی حیرت کی بات اور تعجب کا مقام ہے

واقعہ کا حاصل یہی تو ہے کہ چند مقدس پیغمبروں نے ایک بے راہ رو مخلوق کو سیدھا راستہ دکھانے کی کوشش کی اور اس نے ازراہِ عناد و گمراہی ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا، حتیٰ کہ خدا رسیدہ ہادیوں کو قتل کر دینے سے بھی باز نہ رہے تو اس قسم کے واقعات کو تاریخ نے صرف بنی اسرائیل ہی میں اتنی بار دہرایا ہے کہ تاریخِ اقوام و ملل کا حق آگاہ ایک لمحہ کے لیے بھی اسکے متعلق تردد نہیں کر سکتا۔

**واقعہ سے متعلق اقوال** ابنِ اسحٰق بروایتِ کعب احبار و وہب بن منبہ و عبداللہ بن عباسؓ نقل کرتے ہیں کہ یہ واقعہ شہرِ انطاکیہ (شام) کا ہے، اِس شہر کے لوگ بُت پرست تھے اور ان کے

بادشاہ کا نام انطخیس بن انطخیس تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایت کے لیے تین پیغمبروں صادق، صدوق اور شلوم کو بھیجا اور شہر کی آخری سمت سے جو نیک مرد اُن کی تائید کے لیے آیا اس کا نام حبیب تھا، پھر کوئی کہتا ہے کہ یہ عابد و زاہد اور مرتاض تھا اور شہر کے کنارے عبادت میں مصروف رہتا تھا اور کسی کا قول ہے کہ وہ ریشمی یا سوتی کپڑا بننے کا کام کرتا تھا اور صاحبِ صدقات و خیرات تھا[1] غرض ان کے نزدیک یہ واقعہ حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) سے بہت قدیم زمانہ کا ہے اور قتادۃؒ کہتے ہیں کہ یہ واقعہ حضرتِ مسیح (علیہ السلام) کے زمانہ کا ہے اور شہر انطاکیہ ہی کا واقعہ ہے، حضرتِ مسیح (علیہ السلام) نے اپنے تین حواری شمعون، یوحنا اور پولس کو وہاں بھیجا تھا کہ جاکر ان کو حق کی دعوت دیں اور پیغامِ الٰہی سنائیں مگر اہلِ شہر نے قبول نہ کیا اور ان کی ہی بستی کے ایک نیک مرد نے جب ان کو قبولِ حق کی ترغیب دی تو انھوں نے اس کو قتل کر ڈالا اور پاؤں سے کچل کر اس کی نعش کی توہین کی اس شخص کا نام حبیب تھا اور یہ نجاری (بڑھئی) کا پیشہ کرتا تھا، تب اللہ تعالیٰ نے اس بستی پر چیخ کا عذاب مسلط کر دیا، کہتے ہیں کہ جبرئیل فرشتہ نے ایسی ہولناک چیخ کی کہ اہلِ بستی اس کو سُن کر جس حالت میں بھی تھے اسی حالت میں مر کر رہ گئے[2]

**نقد و تبصرہ** | یہ روایات یا اقوال کعبِ احبار اور وہب بن منبہ کی اسرائیلی روایات سے ماخوذ ہیں حتیٰ کہ ابن اسحٰق کے پاس ان کے لیے مکمل و مسلسل سند بھی نہیں ہے اس لیے "بلغنی" کہہ کر بیان کرتا ہے اور اس قسم کی روایات میں خواہ مخواہ حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) کا نام آجانا اور تفسیری قصص و حکایات کو بغیر سند ان کی جانب منسوب کر دینا تو ایک عام بات ہو گئی ہے۔

یہ ہم نے اس لیے کہا کہ ہر دو واقعات اپنے تفصیلی جزئیات کے لحاظ سے غیر تاریخی ہیں بلکہ بعض تاریخی مسلمات کی تردید کرتے ہیں اور قرآنِ عزیز کے ظاہر سیاق کے بھی خلاف ہیں۔ چنانچہ مشہور محدث و مؤرخ حافظ عماد الدین ابن کثیر تحریر فرماتے ہیں کہ پہلے اور دوسرے واقعہ پر تو

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۲ و تاریخ ابن کثیر ج ۱ ص ۲۲۹۔ [2] ایضاً ج ۳ و تاریخ ابن کثیر ج ۱ ص ۲۳۰، ۲۲۹

یہ مشترک اعتراض واقع ہوتا ہے کہ شہر انطاکیہ ان چار مسیحی شہروں میں سے ہے جن کے متعلق باتفاقِ علماءِ سیر و تاریخ یہ ثابت ہے کہ وہ دعوتِ مسیح کے مرکز شمار کیے جاتے ہیں اس لیے کہ باختلافِ زمانہ ان شہروں میں جس وقت دعوتِ مسیح (علیہ السلام) پہنچی ہے انھوں نے برضا و رغبت اس پر لبیک کہا ہے اور وہ مسیحی پیغام کے لیے مدد و معاون ثابت ہوئے ہیں۔ حتیٰ کہ مسیحیوں کا یہ اعتقاد ہے کہ یہ چار مقامات مقدس مقامات ہیں اور بطریق (پاپائے اعظم) کا دارالخلافہ القدس (بیت المقدس) انطاکیہ، اسکندریہ اور روما (اٹلی) بیت المقدس اس لیے کہ وہ مسیح علیہ السلام کا وطن ہے اور انطاکیہ اس لیے کہ یہ پہلا شہر ہے جس کی کل آبادی ایک ہی وقت میں حضرتِ مسیح (علیہ السلام) پر ایمان لائی اور اسکندریہ اس لیے کہ یہ پہلا شہر ہے جس کے باشندوں نے صلح و آشتی کے ساتھ یہ منظور کیا کہ مسیحی مقدسین بطریق (پوپ) مطران، اسقف، قسیس، شماس اور راہب[1] یہاں اپنے اختیارات کے ساتھ قیام کریں گے اور روما اس لیے کہ قسطنطین اعظم کا دارالسلطنت تھا کہ جس نے عیسائی مذہب کو نئے سانچے میں ڈھال کر فروغ دیا اور دعوتِ مسیح (علیہ السلام) سے قبل بھی کسی تاریخی شہادت سے یہ ثابت نہیں ہے کہ انطاکیہ کسی زمانہ میں غضبِ الٰہی سے برباد و تباہ کر دیا گیا تھا اور بعد میں پھر بارونق شہر بن گیا۔ لہٰذا ہر دو اقوال کے مطابق اس واقعہ کو انطاکیہ سے وابستہ کرنا صحیح نہیں ہے۔

اور قتادہؓ کی روایت پر مسطورۂ بالا اعتراض کے علاوہ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ قرآن کا ظاہر سیاق یہ بتا رہا ہے کہ معذب بستی کی ہدایت کے لیے جو برگزیدہ انسان بھیجے گئے تھے وہ حضرت مسیح (علیہ السلام) یا کسی دوسرے نبی کے فرستادہ یعنی رسولِ خدا کے قاصد و ایلچی نہ تھے بلکہ براہِ راست خدا کے پیغمبر اور نبی تھے اس لیے کہ اگر وہ حضرتِ مسیح (علیہ السلام) کے فرستادہ ہوتے تو قرآن عزیز ضرور اس جانب کوئی اشارہ کرتا مگر ایسا نہیں ہے بلکہ تمام آیات میں ان کے متعلق لفظ اَرۡسَلۡنَآ (ہم نے ان کو بھیجا) استعمال کیا گیا ہے بلکہ رسولوں اور شہر کے باشندوں کے مکالمے کے جُملے تو جب ہی بغیر کسی تاویل کے واضح مطلب ادا کرتے ہیں جب کہ ان کو براہِ راست

[1] پادریوں کے مناصب اور عہدے ہیں۔

خدا کا رسول مانا جائے۔

وہ یہ کہ ان برگزیدہ انسانوں نے جب خود کو رسول ظاہر کیا تو اہلِ شہر ان پر وہی پرانا اعتراض وارد کرنے لگے جو ہمیشہ منکرینِ رسول کہتے چلے آئے ہیں انھوں نے کہا تم تو ہم ہی جیسے انسان ہو پھر رسول کیسے ہو سکتے ہو اور رحمٰن نے تم پر کچھ بھی نازل نہیں کیا تم جھوٹ کہتے ہو کہ تم پر خدا کا پیغام نازل ہوتا ہے پس اگر وہ خود خدا کے رسول نہیں تھے بلکہ حضرت مسیح (علیہ السلام) کے حواری تھے تو بلاغت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ جواب میں یہ نہ کہتے اللہ خوب جانتا ہے کہ ہم تمہاری جانب رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں" بلکہ جواب یہ دیتے کہ "ہم تو خدا کے پیغمبر عیسیٰ (علیہ السلام) کے قاصد ہیں اور تم کو دعوتِ حق دینے آئے ہیں۔ رہا انسان ہونے کا معاملہ تو اللہ کے پیغمبر انسان ہی ہوتے ہیں۔ فرشتے یا کسی اور مخلوق میں سے نہیں ہوتے[1]۔

ابن کثیر نے اس موقع پر ایک تیسرا اعتراض بھی کیا ہے مگر وہ چونکہ ہمارے نزدیک خود محلِ نظر ہے اس لیے نظر انداز کر دیا گیا۔

طبرانی نے معجم میں ایک روایت حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) سے نقل کی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ تین ہستیاں ہیں جو انبیاء علیہم السلام کی نقیب کہلاتی ہیں ایک موسیٰ علیہ السلام کے نقیب یوشع (علیہ السلام) دوسرے اصحابِ یٰسین حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے نقیب اور تیسرے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نقیب علی (رضی اللہ عنہ)

تو اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ واقعہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے حواریوں سے ہی وابستہ ہے مگر محدثین کے نزدیک یہ حدیث ضعیف بلکہ ناقابلِ اعتماد ہے۔ اس لیے کہ اس کی سند میں ایک راوی حسین الاشقر ہے اور یہ کذاب اور متروک الحدیث ہے[2]۔

امام بخاریؒ نے اگرچہ اس واقعہ سے متعلق کوئی روایت نہیں بیان فرمائی مگر انبیاء علیہم السلام کے تذکرہ میں اس واقعہ کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے مقدم رکھا ہے اور آیت کو نقل کرکے صرف حلِ لغات کر دیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن کثیر اور امام بخاریؒ کا رجحان یہ ہے کہ یہ



[1] تفسیر ابن کثیر ج ۳ سورۂ یٰسین و فتح الباری ج ۶ [2] فتح الباری ج ۶

واقعہ حضرت مسیح علیہ السلام سے قبل کا[1] ہے اور غالباً یہی صحیح ہے۔

الحاصل واقعہ کی جزئی تفصیلات کچھ بھی ہوں قرآن نے اس سلسلہ میں جو حصہ نقل کیا ہے وہ اس کے مقصدِ عظمیٰ کو پورا کرتا اور اہلِ مکہ اور اربابِ بصیرت کو عبرت و بصیرت کی دعوت دیتا ہے کہ وہ اس سے فائدہ اٹھائیں اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام رشد و ہدایت سے اصحابِ قریہ کی طرح منہ موڑ کر خسر الدنیا والآخرہ کا سبب نہ بنیں اِنَّ فِی ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِی الْاَلْبَابِ۔

رحمٰن | اصحابِ قریہ اگرچہ مشرک اور بُت پرست تھے مگر ان میں مذہبِ حق کی کچھ جھلک موجود تھی اور ان کے یہاں رحمٰن کا تصور پایا جاتا تھا کیا عجب ہے کہ بمصداق آیت وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِیْهَا نَذِیْرٌ کوئی قوم ایسی نہیں کہ جہاں ہمارا نذیر نہ پہنچا ہو وہ اس دعوت سے قبل عرصہ تک کسی پیغمبر صادق کے پیرو رہے اور آہستہ آہستہ زمانۂ دراز کے بعد شرک میں مبتلا ہو گئے ہوں۔

موعظت | (۱) ہدایت و ضلالت کے معاملہ میں ہمیشہ سے اہلِ باطل کا یہ عقیدہ رہا ہے کہ خدا کا پیغمبر انسان نہیں ہونا چاہیے بلکہ کسی مافوق الفطرۃ ہستی کو "رسول اللہ" ہونا چاہیے اسی لیے قوم نوح علیہ السلام سے لے کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمتِ دعوت تک ہر ایک گروہ نے سب سے پہلے اسی پر تعجب یا نفرت کا اظہار کیا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ہماری ہی طرح کا انسان اور لوازماتِ بشری کا محتاج انسان خدا کا پیغمبر ہو۔ چنانچہ اصحابِ قریہ کی طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرکینِ مکہ نے بھی یہی کہا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ یَاْكُلُ الطَّعَامَ وَیَمْشِیْ فِی الْاَسْوَاقِ یہ کیسا رسول ہے کہ ہماری ہی طرح کھاتا پیتا اور ہماری طرح بازاروں میں چلتا پھرتا ہے" اَبَشَرٌ یَّهْدُوْنَنَا کیا انسان ہماری ہدایت کریں گے" وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ یُّؤْمِنُوْا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰۤى اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْۤا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا "اور حقیقت یہ ہے کہ جب کبھی اللہ کی ہدایت (دنیا میں) ظاہر ہوئی تو صرف اسی بات نے لوگوں کو ایمان لانے سے روکا کہ متعجب ہو کر کہنے لگے کیا اللہ نے (ہماری طرح کا) ایک آدمی پیغمبر بنا کر بھیج دیا ہے" مگر ان کے اس جاہلانہ سوال کا قرآنِ عزیز نے یہ فیصلہ کن جواب دے کر ہمیشہ کے لیے اس بحث کا خاتمہ کر دیا "قُلْ لَّوْ كَانَ فِی الْاَرْضِ مَلٰٓىِٕكَةٌ یَّمْشُوْنَ مُطْمَىِٕنِّیْنَ لَنَزَّلْنَا

[1] فتح الباری ج ۶ و تفسیر ابن کثیر ج ۳۔

عَلَیْهِمْ مِّنَ السَّمَاۗءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا اے پیغمبر کہہ دے کہ اگر ایسا ہوتا کہ زمین میں انسانوں کی جگہ فرشتے بسے ہوتے اور اطمینان سے چلتے پھرتے ہوتے تو ہم ضرور آسمان سے ایک فرشتہ پیغمبر بنا کر اتار دیتے یعنی اس سوال کی بنیاد ہی بے وقوفی پر مبنی ہے اس لیے کہ جب دنیا میں انسان بس رہے ہیں اور فرشتوں کی آبادیاں نہیں ہیں تو پھر ان کی ہدایت کے لیے رسول اور پیغمبر بھی انسان ہی ہونا چاہیے نہ کہ فرشتہ۔

(۲) جہاں شر و فساد اور فتنہ و گمراہی کے جراثیم بہ کثرت موجود ہوتے ہیں وہاں خیر و سعادت کی بھی کوئی روح ضرور نکل آتی ہے اور وہ کلمۂ حق کی تائید میں جان کی بازی لگا دینے سے بھی گریز نہیں کرتی چنانچہ جس طرح اصحاب یٰسین کی حمایت میں شہر کے آخری حصہ سے ایک نیک مرد نکل آیا اور اس نے اپنی قوم کو نصیحت کی اور اس صلہ میں جان دی اسی طرح حضرتِ موسیٰ (علیہ السلام) کے قیامِ مصر کے زمانہ میں بھی شہر کے دور دراز سے ایک نیک مرد بھاگ کر آیا تھا اور اس نے موسیٰ علیہ السلام کی حفاظتِ جان کے لیے نیک صلاح دے کر اپنا فرض ادا کیا تھا "ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ۔

(۳) حق و باطل کے معرکہ میں حق کی حقانیت اور باطل کی بطالت کا ایک کھلا ہوا مظاہرہ یہ ہوتا ہے کہ حق جوں جوں دلائل و براہین کی روشنی میں اپنی صداقت کو جلوہ گر کرتا جاتا ہے باطل اسی درجہ زیادہ مشتعل ہو کر اور حق کی روشنی سے خیرہ ہو کر دلائل کی جگہ جنگ و جدل پر آمادہ ہو جاتا ہے مگر حق کے پرستار اس کی مطلق پروا نہیں کرتے بلکہ وفورِ جوش اور والہانہ شوق کے ساتھ حق پر جان قربان کر دیتے ہیں، چنانچہ اصحابِ قریہ کا واقعہ اس کی بولتی ہوئی شہادت ہے۔



# حضرت لقمان (رضی اللہ عنہ)

## (سنہ ۳ ق۔م)

لقمان ؟ قرآن عزیز اور حضرتِ لقمان، نبوت یا حکمت
چند تفسیری مطالب، حکمتِ لقمان، مواعظ

لقمان | لقمان یا حکیم لقمان، اہلِ عرب کے یہاں ایک مشہور شخصیت ہے لیکن اس کے باوجود ان کے حالات اور خاندان و نسب سے متعلق مختلف اقوال پائے جاتے ہیں اور اس اتفاق کے علاوہ کہ وہ ایک بہت بڑے دانا (حکیم) تھے اور ان کے حکیمانہ اقوال صحیفۂ لقمان کے نام سے ان کے درمیان معروف و مشہور تھے ان سے متعلق باقی امور میں متضاد آراء پائی جاتی ہیں۔

اور یہ اس لیے کہ تاریخ قدیم میں لقمان نام کی ایک اور شخصیت کا پتہ چلتا ہے جو عادِ ثانیہ (قوم ہود علیہ السلام) میں ایک نیک بادشاہ ہو گزرا ہے اور خالص عرب نژاد ہے، ابن جریر، ابن کثیر، سہیلی جیسے مؤرخین کی رائے یہ ہے: مشہور لقمان حکیم (افریقی النسل تھا اور عرب میں ایک غلام کی حیثیت میں آیا تھا، چنانچہ یہ حضرات اس کا نسب نامہ اور حلیہ اس طرح بیان کرتے ہیں:

هو لقمان بن عنقا بن سندون او لقمان بن ثار بن سندون[۱] وہ لقمان بن عنقا یا ثار بن سندون ہے

اور کہتے ہیں کہ وہ سوڈان کے نوبی قبیلہ سے تھا اور پستہ قد بھاری بدن، سیاہ رنگ تھا، ہونٹ موٹے اور ہاتھ پیر بھدے تھے، مگر نہایت نیک، عابد و زاہد صاحبِ حکمت اور دانا تھا، اللہ تعالیٰ نے اس کو حکمت سے حصۂ وافر عطا فرمایا تھا اور بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں عہدۂ قضا پر مامور ہو گیا تھا۔

[۱] روض الانف ج ۱ و ابن کثیر ج ۲ و تفسیر ابن کثیر ج ۳

| | |
|---|---|
| عن ابن عباس قال کان عبدًا | حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے فرماتے تھے کہ لقمان حبشی |
| حبشیاً نجاراً وعن جابر بن | غلام تھے اور نجاری کا پیشہ کرتے تھے اور جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ |
| عبداللہ قال کان لقمان قصیراً | فرماتے ہیں کہ لقمان پستہ قد موٹے ہونٹ والے نوبہ کے |
| افطس من النوبة[۱] | قبیلے سے تھے۔ |
| وعن سعید بن المسیب کان | اور سعید بن مسیبؓ فرماتے ہیں کہ لقمان مصری سوڈانی تھے |
| لقمان من سودان مصر | اور ان کے ہونٹ بہت موٹے تھے اللہ تعالیٰ نے ان کو |
| ذا مشافر اعطاه الله الحکمة | اگرچہ نبوت نہیں عطا کی مگر حکمت و دانائی سے حصہ وافر |
| ومنعه النبوة[۲] | عطا فرمایا تھا۔ |
| عن عبدالرحمٰن بن حرملة قال | عبدالرحمٰن بن حرملہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک حبشی سعید بن |
| جاء اسود الی سعید بن المسیب | مسیبؒ کے پاس آ نکلا اور کچھ سوال کیا انھوں نے |
| یسأله فقال له سعید لا تحزن | فرمایا تو اس بات سے دل گیر نہ ہو کہ کالا حبشی ہے اس لیے |
| من اجل انك اسود فانه کان من | کہ سوڈانیوں میں تین آدمی دنیا کے بہترین انسان ہوئے |
| اخیر الناس ثلاثة من السودان | ہیں بلالؓ، حضرت عمرؓ کا غلام مہجع اور لقمان حکیم جو |
| بلال ومهجع مولی عمرؓ ولقمان الحکیم | سوڈانی نوبی تھے اور ان کے لب بہت موٹے اور بھدے |
| کان اسود نوبیاً ذا مشافر[۱] | تھے۔ |

اور مشہور مؤرخ اور صاحبِ مغازی محمد بن اسحٰق کہتے ہیں کہ لقمان حکیم عرب کے مشہور قبیلہ عاد سے یعنی عرب بائدہ کی نسل سے تھے اور غلام نہ تھے بلکہ بادشاہ تھے۔

| | |
|---|---|
| قال وهب فلما مات شداد | وہب بن منبہ کہتے ہیں جب شداد بن عاد کا انتقال ہو گیا |
| بن عاد صار الملك الی اخیه | تو حکومت اس کے بھائی لقمان بن عاد کو ملی اور اللہ تعالیٰ |
| لقمان بن عاد وکان اعطی الله | نے لقمان کو وہ چیز عطا فرمائی تھی جو اس زمانے کے |
| لقمان ما لم یعط غیره من الناس | انسانوں میں کسی کو نہیں عطا کی تھی، اللہ تعالیٰ نے |

[۱] روض الانف ج ۱ و ابن کثیر ج ۲ و تفسیر ابن کثیر ج ۳ [۲] تاریخ ابن کثیر ج ۲۔

فی زمانہ اعطاہ حاسۃ مائۃ رجل وکان طویلاً لایقاربہ اھل زمانہ۔

اس کو سو انسانوں کی برابر ادراک وحاسہ عطا فرمایا تھا اور وہ اپنے زمانہ کے لوگوں میں سب سے زیادہ طویل قامت تھے۔

قال وھب قال ابن عباس کان لقمان بن عاد بن الملطاط بن السلک بن وائل بن حمیر نبیاً غیر مرسل[1]

وہب کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے تھے کہ لقمان بن عاد کا نسب نامہ یہ ہے: ملطاط بن سلک بن وائل بن حمیر اور وہ نبی تھے مگر رسول نہیں تھے

اور لطف یہ ہے کہ ابن جریر اور ابن کثیر بھی اپنی تائید میں حضرت عبداللہ بن عباس ہی کا قول نقل کرتے ہیں اور ابن اسحٰق بھی ان ہی کے قول کو اپنی تائید میں پیش کرتے ہیں اور معاصر مؤرخین میں سے مصنف ارض القرآن یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ لقمان حکیم اور لقمان بادشاہ ایک ہی شخصیت ہے اور وہ بلاشبہ عادِ ثانیہ کے نیک بادشاہوں میں اور بہت بڑے حکیم و دانا تھے اور عرب میں لقمان کے نام سے جو "صحیفہ" منسوب تھا وہ ان ہی لقمان عاد کا ہے۔ اور وہ اپنے اس دعوے کے مختلف دلائل میں سے ایک دلیل یہ دیتے ہیں کہ شاعر جاہلی سلمٰی بن ربیعہ کے یہ اشعار اس حقیقت کو بخوبی واضح کرتے ہیں:

اھلکن طسماً وبعدہ غذی بھم وذا جدون

واھل جاش ومارب "وحی لقمان" والتقون

"حوادثِ زمانہ نے قبیلۂ طسم کو اور اس کے بعد ذاجدون شاہِ یمن کو اہلِ جاش ومارب کو اور قبیلۂ لقمان کو مٹا دیا"

اس کے بعد فرماتے ہیں:

اس دوسرے شعر سے نہ صرف لقمان کا عرب ہونا ظاہر ہوتا ہے بلکہ ایک قبیلہ کا مالک، یمن کا باشندہ اور عظمت وشوکت میں سبا کا مقابل اور یہ تمام باتیں لقمان عاد پر صادق آتی ہیں۔

عاد کا ایک کتبہ جو ۱۸۳۴ء میں ملا تھا اس میں چند حسب ذیل فقرے ہیں:

ہم پر وہ بادشاہ حکومت کرتے ہیں جو کمینہ خیالات سے بہت دور اور شریروں کو سزا

[1] کتاب التیجان۔ ص ۷۰۔

دینے والے تھے اور ہود کی شریعت کے مطابق ہمارے واسطے پیدا ہوتے تھے اچھے فیصلے ایک کتاب میں لکھے جاتے تھے۔"

کیا ہم ان آخری الفاظ سے جو کاغذ پر نہیں پتھر پر لکھے پائے گئے ہیں یہ نتیجہ نہیں نکال سکتے ہیں کہ صحیفۂ لقمان لقمان کے اچھے فیصلے ایک کتاب میں لکھے ہوئے تھے۔[1]

**قرآنِ عزیز اور حضرتِ لقمان**

حضرتِ لقمان کا ذکر قرآنِ عزیز نے بھی کیا ہے اور قرآن کی ایک سورۃ کا نام اسی تقریب سے سورۂ لقمان ہے اور اگرچہ اس نے اپنے پیشِ نظر مقصد کی خاطر ان کے نسب و خاندان کی بحث میں جانا پسند نہیں کیا تاہم ان کے حکیمانہ مقولات کا جس انداز میں ذکر کیا ہے اس سے لقمان کی شخصیت پر ایک حد تک روشنی ضرور پڑتی ہے اس لیے مناسب ہے کہ اس کو بیان کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا جائے کہ مسطورۂ بالا ہر دو رایوں میں سے کون سی رائے صحیح یا قرین قیاس ہے۔

| | |
|---|---|
| وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ | اور بلاشبہ ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی (اور کہا کہ) اللہ کا شکر |
| لِلّٰهِ ۭ وَمَنْ يَّشْكُرْ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ | ادا کر (پس جو شخص اس کا شکر ادا کرتا ہے وہ اپنے نفس کے |
| وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ○ | فائدہ کے لیے کرتا ہے اور جو کفر کرتا ہے تو اللہ بے پرواہ ہر |
| وَاِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَهُوَ يَعِظُهٗ | مالک حمد ہے اور جس وقت لقمان نے اپنے بیٹے سے |
| يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ڼ اِنَّ الشِّرْكَ | نصیحت کرتے ہوئے کہا اے میرے بیٹے اللہ کا شریک |
| لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ○ وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ | نہ ٹھہرا بے شک شرک بہت بڑا ظلم ہے۔ اور ہم نے حکم |
| بِوَالِدَيْهِ ۚ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا | کیا انسان کو اس کے ماں باپ کے بارے میں" کہ اٹھاتی |
| عَلٰي وَهْنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ | ہے اس کو اس کی ماں تکلیف در تکلیف جھیل کر اور دو |
| اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ ۭ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ ○ | برس کے اندر دودھ پلاتے رہنا" یہ کہ میرا شکر گزار بن |
| وَاِنْ جٰهَدٰكَ عَلٰٓي اَنْ تُشْرِكَ | اور اپنے والدین کا شکر گزار رہو، آخر میری ہی جانب |
| بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا | لوٹنا ہے اور اگر تیرے ماں باپ تجھ پر سختی کریں اس |

[1] ارض القرآن ج ۱ ص ۱۰۱ و ۱۰۲۔

وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا ۖ
وَاتَّبِعْ سَبِيلَ مَنْ أَنَابَ إِلَيَّ ۚ
ثُمَّ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأُنَبِّئُكُمْ بِمَا
كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۝ يَا بُنَيَّ إِنَّهَا
إِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ
فَتَكُنْ فِي صَخْرَةٍ أَوْ فِي السَّمَاوَاتِ
أَوْ فِي الْأَرْضِ يَأْتِ بِهَا اللَّهُ ۚ
إِنَّ اللَّهَ لَطِيفٌ خَبِيرٌ ۝ يَا بُنَيَّ
أَقِمِ الصَّلَاةَ وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ
وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلَىٰ
مَا أَصَابَكَ ۖ إِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ
الْأُمُورِ ۝ وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ
لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ
مَرَحًا ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ
مُخْتَالٍ فَخُورٍ ۝ وَاقْصِدْ فِي مَشْيِكَ
وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ۚ إِنَّ أَنْكَرَ
الْأَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيرِ ۝
(لقمٰن پ ۲۱ ع ۲)

بارے میں کہ میرا شریک ٹھہرا کہ جس کے متعلق وہ
نادانی اور جہالت میں ہیں تو اس میں ان دونوں کی
پیروی نہ کر اور دنیوی زندگی میں ان کے ساتھ اچھا برتاؤ
کر اور پیروی اس شخص کی کر کہ جو صرف میری ہی جانب رجوع
کرتا ہے پھر میری ہی جانب تم سب کو لوٹنا ہے۔ پس میں
اس وقت تم کو تمہارے کیے کی خبر دوں گا" اے میرے
بیٹے بلاشبہ اگر رائی کے دانہ کی برابر بھی کوئی چیز چھوٹی
ہوتی ہے اور وہ پتھر کے اندر یا آسمانوں یا زمینوں میں
کہیں بھی ہو اللہ اس کو لے آتا ہے۔ بے شک اللہ دقیق
مشاہدہ کرنے والا خبردار ہے۔ اے میرے بیٹے قائم کر
نماز کو اور حکم کر بھلائی کا اور برائی سے منع کر اور جو تجھ پر
پڑے اس پر صبر کر بلاشبہ یہ عزائم امور میں سے ہے
اور تو اپنے رخساروں کو لوگوں سے (از راہِ تکبر)
نہ پھیر اور زمین پر اترا کر نہ چل بے شبہ اللہ تعالیٰ کسی
تکبر اور شیخی کرنے والے کو دوست نہیں رکھتا اور اپنی
چال میں میانہ روی اختیار کر اور اپنی آواز کو نرم
و پست کر۔ بے شبہ گدھے کی آواز بہت ہی
ناپسندیدہ آواز ہے۔

ان آیات میں لقمان نے اپنے بیٹے کو جو نصائح کی ہیں اور حکمت و دانائی کی باتیں بتائی ہیں ان میں ان باتوں پر بھی زور دیا ہے کہ (۱) لوگوں کے ساتھ حسن اخلاق کے ساتھ پیش آنا چاہیے یہ نہ ہو کہ از راہِ غرور منہ موڑ لیا جائے (۲) اور نہ خدا کی زمین پر اکڑ اکڑ کر چلو، یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ

خدائے تعالیٰ مغرور اور اکڑنے والے کو پسند نہیں کرتا (۳) ہمیشہ رفتار میں متواضعانہ میانہ روی قائم رہنی چاہیے (۴) اور آواز کو گفتگو میں نرم رکھو اس لیے کہ چیخنا چلانا انسانوں کا کام نہیں ہے اگر کرخت اور بے وجہ بلند آواز پسندیدہ چیز ہوتی تو گدھے کی آواز قابلِ ستائش سمجھی جاتی حالانکہ اس کی آواز بدترین آواز شمار ہوتی ہے۔

حکیم لقمان اگر غلام ہوتے تو اپنے بیٹے غلام زادہ کو یہ نصائح نہ کرتے اس لیے کہ غرور ونخوت، خود بینی وشیخی، کرختگی وخشونت ایسے اوصاف ہیں جو بادشاہوں، شاہزادوں، متمول وصاحبِ اقتدار انسانوں کے اندر ہی کثرت سے پائے جاتے ہیں اور یہ ناخدا ترس اور نشۂ دولت میں چور دولت مندوں ہی کا شیوہ ہو سکتا ہے اور یہ وہ تمام اوصاف وعادات ہیں جو عموماً متکبرین اور جبابرہ کے لیے مخصوص ہیں، غلام اور غلام زادہ کے لیے نہ ان کا موقع ہے اور نہ فرصت کیوں کہ ان کا وقتِ عزیز تو دوسروں کی نیازمندی اور خدمت گزاری ہی کے لیے وقف ہوتا ہے۔ شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے اسی لیے یہ فرمایا ہے:

تواضع زگردن فرازاں نکوست
گدا اگر تواضع کند خوئے اوست

اس تفصیل کے بعد جو کہ قرآنِ عزیز سے ماخوذ ہے اب ہم بھی یہ کہتے ہیں کہ بلاشبہ لقمان حکیم اور لقمانِ عاد ایک ہی شخصیت ہے اور وہ عادِ ثانیہ کے نیک نفس بادشاہ اور حضرتِ ہود (علیہ السلام) کے پیرو تھے اور حبشی الاصل نہیں بلکہ عربی الاصل تھے اور صاحب سیرت محمد بن اسحاق کی نقل اور شاعر جاہلی علی بن ربیعہ کی شہادت اس مسئلہ میں صحیح اور راجح ہیں اور عادِ ثانیہ کے زمانہ کے حجری کتبہ میں جو کہا گیا ہے اس سے مراد وہی صحیفۂ لقمان ہے جو عرب میں مشہور ومعروف تھا۔

ممکن ہے کہ اس موقع پر ان مرفوعہ روایات کو پیش کر کے ہمارے دعوے کی تردید کی جائے جن میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ منقول ہے کہ لقمان حکیم حبشی الاصل تھے مگر واضح رہے کہ صاحب جرح وتعدیل محدثین نے ان روایات کے رفع کو صحیح تسلیم نہیں کیا اور ان میں سے بعض کو

ضعیف اور منکر قرار دیا ہے یعنی محدثین کے نزدیک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ منقول نہیں ہے کہ لقمان حبشی غلام تھے۔

**نبوت یا حکمت** | اگرچہ محمد بن اسحاق کی روایت "عن ابن عباسؓ" میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرت لقمان نبی تھے لیکن قرآنِ عزیز کا اسلوبِ بیان اس کی موافقت نہیں کرتا۔ اس لیے کہ سورۂ لقمان میں باوجود اس امر کے کہ ان کی بعض حکیمانہ نصائح اور بلیغانہ وصایا کا ذکر بصراحت مذکور ہے لیکن کسی ایک جگہ میں بھی ایسا اشارہ نہیں پایا جاتا کہ جو ان کی "نبوت" پر دلالت کرتا ہو اسی لیے جمہور کی رائے اس کے خلاف ہے بلکہ خود حضرت ابن عباسؓ سے بھی دوسرا قول اس قول کے خلاف مذکور ہے۔ چنانچہ ابنِ کثیر اپنی تاریخ میں فرماتے ہیں:

والمشهور عن الجمهور انه كان حكيماً وليًا ولم يكن نبيًا وقد ذكره الله تعالى في القرآن فاثنى عليه وحكى من كلامه فيما وعظ به ولده الذي هو احب الخلق اليه[1]

اور جمہور کا مشہور قول یہ ہے کہ لقمان خدا کے ولی اور حکیم دانا تھے نبی نہیں تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان کا قرآن میں ذکر کیا ہے اور ان کی تعریف کی اور ان کے اس کلام کو بیان کیا جس میں انھوں نے اپنے بیٹے کو جو کہ خدا کی مخلوق میں ان کے لیے سب سے زیادہ محبوب تھا" نصیحت کی ہے۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا لُقْمَانَ الْحِكْمَةَ قال يعني الفقه والاسلام ولم يكن نبياً ولم يوح اليه وهكذا نص على هذا غير واحد من السلف منهم مجاهد وسعيد بن المسيب وابن عباس والله اعلم[2]

"وَلَقَدْ آتَيْنَا لُقْمَانَ الْحِكْمَةَ" یعنی دانائی اور اسلام اور وہ نبی نہیں تھے اور نہ ان پر وحی نازل ہوئی اور بہت سے سلف سے یہی ثابت ہے مثلاً مجاہد، سعید بن مسیب اور ابن عباس وغیرہ۔

**چند تفسیری مطالب** | (۱) حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو سب سے پہلے جو اہم نصیحت کی وہ شرک باللہ سے اجتناب اور توحید کا رام ہے کیونکہ "دینِ حق" میں یہی وہ حقیقت ہے جو

[1] تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۱۲۵۔ [2] ایضاً۔

حنیف کو مشرک سے ممتاز کرتی ہے اور شرک ہی ایسا گناہ ہے جو کسی حالت میں بھی قابلِ بخشش نہیں مگر یہ کہ اس سے تائب ہو جائے۔

| | |
|---|---|
| اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ | بے شک جو خدا کے ساتھ شرک کرتا ہے اس کو |
| بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ | خدائے تعالیٰ نہیں بخشے گا اور کفر و شرک کے علاوہ |
| يَّشَآءُ (نساء پ ع) | گناہ جس کے لیے چاہے گا بخش دے گا۔ |

(۲) حضرتِ لقمان نے شرک کو "ظلمِ عظیم" فرمایا ہے۔ اس سلسلہ میں بخاری کی ایک روایت ہے، وہ یہ کہ جب یہ آیت نازل ہوئی "اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ خدا کی مغفرت ان لوگوں کے لیے ہے جو ایمان لائے اور انھوں نے اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ خلط ملط نہیں کیا" تو صحابہ رضی اللہ عنہم پر یہ بات بہت شاق گزری اور انھوں نے خدمتِ اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم) میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ ایسا تو کوئی شخص بھی نہ ہوگا جس نے خدائے تعالیٰ کے احکام کے پیشِ نظر کچھ نہ کچھ ظلم نہ کیا ہو، تب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

| | |
|---|---|
| انه ليس بذٰلك الم تسمع الى | آیت کا مطلب یہ نہیں ہے۔ کیا تم نے لقمان کا یہ قول |
| قول لقمٰن يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ | نہیں سنا "اے میرے بیٹے اللہ کے ساتھ شریک |
| اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ[1] | نہ ٹھہرا، بلاشبہ شرک بہت بڑا ظلم ہے۔ |

مطلب یہ ہے کہ آیت لَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ میں ظلم سے مراد "شرک" ہے نہ کہ معصیتِ صغائر و کبائر۔

(۳) سورۂ لقمان میں وَاِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ سے لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ تک اور پھر يٰبُنَيَّ سے لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ تک حضرتِ لقمان کے مقولات بیان کیے گئے ہیں اور درمیان میں وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ سے اُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ تک بطور جملہ معترضہ اللہ تعالیٰ کا ارشادِ مبارک ہے تو اس کے لیے وجہِ مناسبت یہ ہے کہ جب قرآن نے ایک ایسے واقعہ کا ذکر کیا جس میں باپ نے بیٹے کو پند و نصائح کیے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے امتِ مرحومہ کو یہ نصیحت کرنا ضروری سمجھا کہ

[1] بخاری کتاب التفسیر۔

جب کہ باپ اور ماں کی محبت کا یہ عالم ہے کہ وہ دنیوی اور اُخروی کسی معاملہ میں بھی اولاد کو بے راہ دیکھنا نہیں چاہتے تاکہ انجام کار اولاد کو دکھ جھیلنا نہ پڑے تو اولاد کے لیے از بس ضروری ہے کہ وہ خدا کی صحیح اور حقیقی معرفت کے بعد سب سے زیادہ والدین کی خدمت اور ان کی رضاجوئی کو مقدم سمجھے حتیٰ کہ اگر والدین کافر و مشرک ہوں تب بھی اس کا فرض ہے کہ ان کی خدمت اور ان کے ساتھ حُسنِ سلوک تواضع اور نیازمندی کو ہاتھ سے نہ دے۔ البتہ اگر وہ دینِ حق سے اعراض اور شرک کے اختیار پر اصرار کریں تو اس کو قبول نہ کرے اس لیے کہ خدا کی نافرمانی میں کسی کی اطاعت بھی درست نہیں ہے، چنانچہ ارشادِ نبوی ہے "لاطاعة لمخلوق فی معصیة الخالق" لیکن اس مکالمہ میں بھی اپنے انکار کے وقت نرمی اور حسنِ خطابت کو نہ چھوڑے اور درشت کلامی اختیار نہ کرے۔

(۴) سورۂ لقمان میں جو نصائح مذکور ہیں ان میں حسنِ خلق اور تواضع کی ترغیب اور کبر، شیخی اور بدخلقی کی مذمت کی گئی ہے۔ حضرتِ لقمان نے امر و نہی میں ان باتوں کو خصوصیت کے ساتھ اس لیے انتخاب فرمایا ہے کہ کائنات میں جس قدر بھی بھلائی اور برائی پیش آتی ہے ان سب کی جڑ اور بنیاد یہی امور ہیں چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی امتِ مرحومہ کو ان امور کی اہمیت پر بہت زیادہ توجہ دلائی ہے۔

| | |
|---|---|
| **حُسنِ خلق** قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم بعثت لاتمم حسن الاخلاق[1] | رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بے شبہ میں اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ محاسنِ اخلاق کو درجۂ کمال تک پہونچاؤں۔ |
| عن ابن عمر رضی اللّٰہ عنہ قیل یا رسول اللّٰہ ای المؤمن افضل قال احسنھم خلقا۔ (بیھقی) | حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے منقول ہو کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ کونسا مسلمان سب سے زیادہ صاحبِ فضیلت ہے؟ آپ نے فرمایا جو ان میں سب سے زیادہ حسنِ اخلاق رکھتا ہو وہی سب سے زیادہ افضل ہے۔ |
| عن انس قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ | حضرتِ انس رضی اللہ عنہ سے منقول ہو کہ رسول اللہ |

[1] موطا امام مالک۔

علیہ وسلم ان العبد لیبلغ بحسن خلقہ درجات الآخرۃ وشرف المنازل وانہ لضعیف العبادۃ وانہ لیبلغ بسوء خلقہ درک جہنم وھو عابد۔[1]

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بلاشبہ ایک بندہ باوجود عبادت میں کمزور ہونے کے اپنے حسن اخلاق کی وجہ سے آخرت کے بلند درجات اور منازل علیا کو حاصل کرلیتا ہے اور عابد ہونے کے باوجود بدخلقی کی وجہ سے جہنم پاتا ہے۔

وقال میمون بن مہران عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما من ذنب اعظم عند اللہ من سوء الخلق۔[2]

میمون بن مہران نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: اللہ کے نزدیک بدخلقی سے زیادہ بڑا کوئی گناہ نہیں ہے۔

**تواضع**

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طوبیٰ للاتقیاء الاثریاء الذین اذا حضروا لم یعرفوا واذا غابوا لم یتفقدوا اولئک مصابیح یجردون من کل فتنۃ غبراء مشتتۃ۔[3]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بشارت ہو نکوکار بےنفس لوگوں کے لیے جن کی حالت یہ ہے کہ مجلس میں موجود ہوں تو کوئی تعارف نہ کرے اور جب غائب ہوجائیں تو کوئی تلاش نہ کرے۔ یہی ہیں روشن چراغ اور ہر تاریک و پراگندہ فتنہ سے محفوظ۔

**کبر وغرور**

عن عبد اللہ بن مسعود قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یدخل الجنۃ من کان فی قلبہ مثقال ذرۃ من کبر۔[4]

عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جنت میں وہ شخص ہرگز داخل نہ ہوگا جس کے قلب میں ذرہ کی مقدار بھی غرور وکبر ہوگا۔

عن عبد اللہ بن عمرو قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من کان فی قلبہ مثقال ذرۃ من کبر اکبہ اللہ علی وجہہ فی النار۔[5]

حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص کے دل میں ذرہ برابر بھی کبر ہے اس کو اللہ تعالیٰ جہنم میں اوندھے منہ گرادے گا۔

---

[1] معجم طبرانی (مجمع الزوائد ج ۸ ص ۲۵) [2] تفسیر ابن کثیر ج ۳۔ [3] ایضاً۔ [4] اصحاب السنن۔ [5] ایضاً۔

| | |
|---|---|
| عن بریدۃ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم من جر ثوبہ خیلاء لم ینظر اللّٰہ الیہ[1] | حضرت بریدہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو شخص اپنے لباس کو از راہِ غرور زمین پر کھینچتا ہوا چلتا ہے اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کی جانب نظرِ رحمت سے نہ دیکھے گا۔ |

(۵) حضرتِ لقمان نے درشت اور کرخت آواز سے بات چیت کرنے کو بھی منع فرمایا ہے اور یہ بہت واضح بات ہے اس لیے کہ نرم گفتاری حسنِ خلق کا شعبہ اور درشت و کرخت لہجہ بدخلقی کا جز ہے اور اسی بناء پر اس طرزِ گفتگو کو "صوتِ حمار" سے مشابہ بتایا گیا اور نہیقِ حمار کے متعلق یہ حدیث بہت معروف و مشہور ہے:

| | |
|---|---|
| عن ابی ھریرۃ رضی اللّٰہ عنہ عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال اذا سمعتم صیاح الدیکۃ فاسئلوا اللّٰہ من فضلہ واذا سمعتم نھیق الحمیر فتعوذوا باللّٰہ من الشیطان فانھارات شیطانًا[2] | حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جب تم مرغ کی آواز سنو تو اللہ تعالیٰ سے فضل طلب کرو اور گدھے کی آواز سنو تو شیطان سے پناہ مانگو اس لیے کہ وہ شیطان کو دیکھ کر آواز کرتا ہے |

یعنی مرغ کی آواز ملائکۃ اللہ کے نزول کی دلیل ہے کیونکہ وہ سحر میں تسبیح کا عادی ہے اور حمار کی آواز نزولِ شیاطین کا پتہ دیتی ہے اس لیے کہ ہر کروہ اور فطرتِ سلیم کو ناگوار شے شیطان کے لیے محبوب ہے۔

(۶) حضرتِ لقمان نے اپنے بیٹے کو جو نصائح کی ہیں ان میں یہ بھی کہا ہے کہ "زمین پر اکڑ کر نہ چلو" اس مضمون کو قرآنِ عزیز نے دوسری جگہ عجیب انداز سے بیان کیا ہے:

| | |
|---|---|
| وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا ۖ إِنَّكَ لَن تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَلَن تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُولًا | اور زمین پر اتراتا ہوا نہ چل تو اپنے اس اندازِ رفتار سے نہ زمین کو پھاڑ سکے گا اور نہ پہاڑوں کی چوٹیوں تک طویل ہو جائے گا۔ |
| (بنی اسرائیل پ۱۵ ع۴) | |

مغرور انسان کے اندازِ رفتار کو کس معجزانہ بلاغت کے ساتھ ادا کیا ہے گویا وہ اس طرح

[1] مسلم۔ [2] تفسیر ابن کثیر ج ۸ ص ۴۔

چلتا ہے کہ اپنی اکڑی ہوئی بلند گردن کے ذریعہ پہاڑوں کی بلندی سے بھی اونچا ہوجانا چاہتا ہے اور قدم کو اس طرح زمین پر رکھتا ہے کہ گویا اس کو پھاڑ ڈالے گا۔ مگر یہ نہیں سمجھتا کہ وہ ان میں سے کوئی بات بھی نہ کرسکے گا پھر بلاوجہ اکڑ کر چلنے کے کیا معنی؟

اور اس کے برعکس متواضع اور با اخلاق انسانوں کی یہ کیفیت ہے کہ:

| | |
|---|---|
| وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ | اور جو رحمٰن کے بندے (یعنی حکم بردار بندے) ہیں |
| عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ | وہ زمین پر وقار اور تواضع کے ساتھ چلتے ہیں اور جب |
| الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ۝ | ان سے جاہل لوگ مخاطب ہوتے ہیں تو وہ (جہالت |
| (فرقان پ ۱۹ ع ۶) | سے بچنے کے لیے) سلام کہہ کر الگ ہوجاتے ہیں۔ |

**حکمتِ لقمان** گذشتہ سطور میں یہ ذکر آچکا ہے کہ عرب میں حکمتِ لقمان کا ذکر چرچا تھا اور وہ اکثر مجالس میں ان کے حکیمانہ اقوال کو نقل کرتے رہتے تھے چنانچہ تابعین صحابہ بلکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اس سلسلہ کے بعض اقوال منقول ہیں اور ان میں سے چند حسب ذیل ہیں:

(۱) حکمت و دانائی مفلس کو بادشاہ بنا دیتی ہے (۲) جب کسی مجلس میں داخل ہو تو اول سلام کرو پھر ایک جانب بیٹھ جاؤ اور جب تک اہلِ مجلس کی گفتگو نہ سن لو خود گفتگو شروع نہ کرو پس اگر وہ خدا کے ذکر میں مشغول ہوں تو تم بھی اس میں سے اپنا حصہ لے لو اور اگر وہ فضولیات میں مشغول ہوں تو وہاں سے علیحدہ ہوجاؤ اور دوسری کسی عمدہ مجلس کو حاصل کرو (۳) اللہ تعالیٰ جب کسی کو امانت دار بنائے تو امین کا فرض ہے کہ اس امانت کی حفاظت کرے (۴) اے بیٹے خدائے تعالیٰ سے ڈر اور ریاکاری سے خدا کے ڈر کا مظاہرہ نہ کر کہ لوگ اِس وجہ سے تیری عزت کریں اور تیرا دل حقیقۃً گنہ گار ہے (۵) اے بیٹے جاہل سے دوستی نہ کر کہ وہ یہ سمجھنے لگے کہ تجھ کو اس کی جاہلانہ باتیں پسند ہیں اور دانا کے غصہ کو بے پرواہی میں نہ ٹال کر کہیں وہ تجھ سے جدائی نہ اختیار کرلے۔ (۶) واضح رہے کہ داناؤں کی زبان میں خدا کی طاقت ہوتی ہے۔ ان میں سے کوئی کچھ نہیں بولتا مگر یہ کہ اس بات کو اللہ تعالیٰ اسی طرح کرنا چاہتا ہو (۷) اے بیٹے خاموشی میں کبھی ندامت

اُٹھانی نہیں پڑتی اور اگر کلام چاندی ہے تو سکوت سونا ہے (۸) بیٹا ہمیشہ شر سے دُور رہو تو شر تم سے دور رہے گا اس لیے کہ شر سے ہی شر پیدا ہوتا ہے (۹) بیٹا غیظ و غضب سے بچو اس لیے کہ شدتِ غضب دانا کے قلب کو مُردہ بنا دیتی ہے (۱۰) بیٹا خوش کلام ہو، طلاقتِ وجہ اختیار کرو تب تم لوگوں کی نظروں میں اس شخص سے بھی زیادہ محبوب ہو جاؤ گے جو ہر وقت ان کو داد و دہش کرتا رہتا ہو (۱۱) نرم خوئی دانائی کی جڑ ہے (۱۲) جو بوؤ گے وہی کاٹو گے (۱۳) اپنے اور اپنے والد کے دوست کو محبوب رکھو (۱۴) کسی نے لقمان سے دریافت کیا سب سے زیادہ صابر کون شخص ہے؟ کہا جس کے صبر کے پیچھے ایذا نہ ہو، پھر دریافت کیا سب سے بڑا عالم کون ہے؟ جواب دیا جو دوسروں کے علم کے ذریعہ اپنے علم میں اضافہ کرتا رہے پھر سوال کیا سب سے بہتر آدمی کون سا ہے فرمایا "غنی" سائل نے پھر کہا غنی سے مال دار مراد ہے؟ جواب میں کہا نہیں بلکہ غنی وہ ہے جو اپنے اندر خیر کو تلاش کرے تو موجود پائے ورنہ خود کو دوسروں سے مستغنی رکھے (۱۵) کسی نے دریافت کیا بدترین انسان کون سا ہے فرمایا جو اس کی پرواہ نہ کرے کہ لوگ اس کو بُرائی کرتا دیکھ کر برا سمجھیں گے (۱۶) بیٹا تیرے دسترخوان پر ہمیشہ نکوکاروں کا اجتماع رہے تو بہتر ہے اور مشورہ صرف علماءِ حق ہی سے لینا۔[۱]

مواعظ (۱) انسان اگر نبی معصوم اور پیغمبر بھی نہ ہو مگر حکمت و دانائی سے مشرف ہو تب بھی خدا کے نزدیک اس کا مرتبہ عظیم الشان ہے، اسی لیے حضرتِ لقمان کو یہ عزت ملی کہ خدائے تعالیٰ نے قرآن عزیز میں ان کی ثنا و توصیف فرمائی اور امتِ مرحومہ کے لیے ان کی بعض ان نصائح اور وصایا کو نقل فرمایا جو انھوں نے اپنے بیٹے کو کی تھیں حتیٰ کہ قرآن کی ایک سورۃ ان کے نام سے منسوب ہوئی۔

(۲) شرک باللہ تمام بھلائیوں کو مٹا کر انسان کو خدا کے سامنے خالی ہاتھ لے جاتا ہے اس لیے ہمیشہ اس سے پرہیز لازم ہے۔

شرکِ جلی کی طرح شرکِ خفی بھی اعمالِ انسانی کو اس طرح کھا لیتا ہے جس طرح آگ لکڑی کو

کھالیتی ہے اور شرکِ خفی میں ریا، نمائش اور شہرت پسندی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

(۳) والدین کے ساتھ حُسنِ سلوک اور اُن کی عظمت کو اسلام میں اس درجہ اہمیت حاصل ہے کہ قرآنِ عزیز نے ان کو ربِ مجازی کہا ہے اور ان کی خدمت اور ان کے سامنے سرِ نیاز جھکا دینے کو والدین کے اسلام وکفر دونوں حالتوں میں ضروری قرار دیا ہے اور اسی اہمیت کے پیشِ نظر جگہ جگہ اپنے حق یعنی توحید باللہ کے ساتھ ساتھ حقوقِ والدین کا ذکر کیا اور ان کو تمام حقوق پر مقدم رکھا۔ چنانچہ بنی اسرائیل میں ارشاد ہے:۔

| | |
|---|---|
| وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ | اور حکم کر چکا تیرا رب کہ اس کے سوا کسی کو نہ پوجو |
| وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۭ اِمَّا يَبْلُغَنَّ | اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرو، اگر پہنچ جائے |
| عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰـهُمَا | تیرے سامنے بڑھاپے کو ان میں سے ایک یا |
| فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا | دونوں تو ان کو "اُف" بھی نہ کہو اور نہ ان کو جھڑکو |
| وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ۝ وَاخْفِضْ | اور ان سے ادب کے ساتھ بات کرو اور ان کے |
| لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ | سامنے عاجزی کے ساتھ کاندھے جھکا دو |
| وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ | نیازمندانہ طریقہ پر اور کہو اے رب ان پر |
| صَغِيْرًا ۝ رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ | رحم کر جس طرح پالا انھوں نے مجھ کو چھوٹا سا، |
| نُفُوْسِكُمْ ۭ اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِيْنَ | تمھارا رب خوب جانتا ہے جو تمھارے جی میں ہے |
| فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا ۝ | اگر تم نیک نفس ہو گے تو وہ رجوع ہونے والوں |
| (بنی اسرائیل پ ۱۵ ع ۳) | کو بخشتا ہے۔ |

اور والدین کے ساتھ حُسنِ سلوک سے متعلق احادیث تو بہت کثرت سے ذخیرۂ حدیث میں پائی جاتی ہیں حتیٰ کہ یہ کہا گیا ہے کہ جنت ماں کے قدموں کے نیچے[1] ہے۔



[1] نسائی۔

# اصحابِ سَبتُ

## سنہ ۱۱۰۰ ق.م (تخمیناً)

قرآنِ عزیز اور اصحابِ سبت، سبت اور اس کی حرمت، واقعہ کی تفصیلات تعیینِ مقام، زمانہ، حادثہ، چند تفسیری حقائق، حقیقتِ مسخ، مسخ شدہ اقوام کا انجامِ دنیوی، حضرت ابن عباسؓ اور عکرمہؒ کا مکالمہ، بصائر

**قرآنِ عزیز اور اصحابِ سَبت**

قرآنِ عزیز میں اصحابِ سبت کا ذکر سورۂ بقرہ، نساء، مائدہ، اور اعراف میں کیا گیا ہے جس کی تفصیل ذیل کے نقشہ سے ظاہر ہوتی ہے :-

| شمار | سورۃ | آیات | عدد |
|---|---|---|---|
| ۱ | بقرہ | ۶۵-۶۶ | ۲ |
| ۲ | نساء | ۴۷ | ۱ |
| ۳ | مائدہ | ۶۰ | ۱ |
| ۴ | اعراف | ۱۶۳-۱۶۶ | ۴ |
| | | | ۸ |

**سَبت اور اس کی حرمت**

قصص القرآن کے گذشتہ مباحث میں یہ واضح ہو چکا ہے کہ ابراہیم (علیہ السلام) کے زمانہ سے "دینِ حنیف" یعنی خدا کے سچے دین کی تعلیم کا سلسلہ انکی دو شاخوں بنو اسمٰعیل اور بنو اسحٰق کے ذریعہ قوموں اور ملکوں میں پھیلا ہے اس لیے ان دونوں سلسلوں میں "شعائر اللہ" کے متعلق یکساں اصول پائے جاتے ہیں مگر حضرتِ اسحٰق (علیہ السلام) کے صاحبزادہ اسرائیل (یعقوب) علیہ السلام کی اولاد نے جو کہ بنی اسرائیل کہلاتی ہے اپنے زمانہ کے انبیاء علیہم السلام

سے اختلاف اور جھگڑے کر کے بعض معاملات میں تشدد اور سختی کے احکام اور بعض معاملات میں ملتِ ابراہیمی سے جدا احکام کا بار اپنے کاندھوں پر ڈال لیا تھا۔ مثلاً حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے اپنی امت میں عبادتِ الٰہی کے لیے ہفتہ کے سات دنوں میں سے جمعہ کا دن مقرر فرمایا تھا، حضرتِ موسیٰ (علیہ السلام) کے زمانہ میں یہود بنی اسرائیل نے اپنی روایتی کج روی کی بناء پر حضرتِ موسیٰ سے یہ اصرار کیا کہ ان کے لیے ہفتہ (سنیچر) کا دن عبادت و برکت کا دن مقرر کر دیا جائے۔

حضرتِ موسیٰ (علیہ السلام) نے پہلے تو اُن کو ہدایت فرمائی کہ وہ اپنے غلط اصرار سے باز آجائیں اور ملتِ ابراہیمی کے اس امتیاز کو جو خدائے برتر کے نزدیک پسندیدہ و مقبول ہے" ہاتھ سے ضائع نہ ہونے دیں لیکن جب اُن کا اصرار حد سے متجاوز ہو گیا تو وحیِ الٰہی نے موسیٰ (علیہ السلام) کو یہ اطلاع دی کہ خدائے تعالیٰ ان کے اصرارِ بیجا کے نتیجہ میں جمعہ کی سعادت و برکت کو ان سے واپس لے لیتا اور ان کے مطالبہ کو منظور کرتے ہوئے ان کے لیے ہفتہ (سنیچر) کو جمعہ کا قائم مقام بنائے دیتا ہے۔ لہٰذا اب آپ ان کو مطلع کر دیں کہ وہ اپنے اس مطلوبہ دن کی عظمت کا پاس و لحاظ کریں اور اس کی حرمت کو قائم رکھیں، ہم اس دن میں ان کے لیے خرید و فروخت، زراعت و تجارت اور شکار کو حرام کرتے اور اس کو صرف عبادت کے لیے مخصوص کیے دیتے ہیں۔

قرآنِ عزیز نے بھی مختصر الفاظ میں اس اختلاف کا ذکر کیا ہے جو انھوں نے ہفتہ میں عبادت کے لیے ایک دن مخصوص کرنے کے متعلق اپنے پیغمبر (موسیٰ علیہ السلام) کے ساتھ کیا تھا:

| | |
|---|---|
| اِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِيْنَ | بیشک سبت کا دن ان لوگوں کیلیے (عبادت کا دن) مقرر کیا گیا |
| اخْتَلَفُوْا فِيْهِ وَاِنَّ رَبَّكَ لَيَحْكُمُ | جو اس کے متعلق جھگڑا کرتے تھے اور یقیناً تیرا رب ضرور قیامت |
| بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا | کے دن ان کے درمیان فیصلہ کر دے گا کہ جس کے متعلق وہ |
| فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝ (نحل پ ۱۴ ع ۱۶) | اختلاف کرتے تھے اس میں حق کیا تھا اور باطل کیا؟ |

چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے تقررِ سبت (سنیچر) کے بعد بنی اسرائیل سے عہد میثاق لیا کہ وہ اس کی حرمت کو برقرار رکھیں گے، در عبادتِ الٰہی کے سوا ان باتوں کو اس دن میں اختیار نہیں کرینگے

جن کو اللہ تعالیٰ نے ان پر حرام کر دیا ہے :۔

| | |
|---|---|
| وَقُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوا فِي السَّبْتِ | اور ہم نے ان (بنی اسرائیل) سے کہا: سبت (ہفتہ) کے |
| وَأَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيثَاقًا غَلِيظًا ○ | بارہ میں حد سے نہ گزرنا (خلاف ورزی نہ کرنا) اور ہم نے ان سے |
| (النساء پ ع ) | اس کے متعلق بہت سخت قسم کا عہد و پیمان لیا۔ |

حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہم دنیا میں سب سے آخر آنے والے آخرت میں سب سے مقدم ہوں گے خصوصاً اہلِ کتاب سے جو کہ ہم سے پہلے ہو گزرے ہیں اور یہ (جمعہ کا دن) ہم سب سے پہلے ان اہلِ کتاب پر فرض کیا گیا تھا مگر انھوں نے اس کے متعلق اختلاف ظاہر کیا اور ہم کو اللہ تعالیٰ نے اس (جمعہ کے دن) کو قبول کر لینے کی ہدایت و توفیق دی سو دنیا میں بھی وہ اس معاملہ میں ہم سے پیچھے رہ گئے اس لیے کہ یہود کا روزِ عبادت جمعہ سے ایک دن بعد (سنیچر) ہے اور نصاریٰ کا اس کے بعد (اتوار) کا دن ہے۔[1]

| | |
|---|---|
| عن ابی ھریرۃ وحذیفۃ (رضی اللہ | حضرت ابوہریرہ اور حضرت حذیفہ (رضی اللہ عنہما) نے فرمایا |
| عنہما) قالا قال رسول اللہ صلی اللہ | رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو جو |
| علیہ وسلم: اضل اللہ عن الجمعۃ من | ہم سے پہلے گزر چکے جمعہ کے دن سے محروم کر دیا۔ سو یہود کیلیے سبت |
| کان قبلنا فکان للیھود یوم السبت | (سنیچر) کا دن ٹھہرا اور نصاریٰ کے لیے اتوار کا پھر اللہ تعالیٰ نے ہم کو |
| وکان للنصاریٰ یوم الاحد فجاء اللہ | دنیا میں بھیجا اور جمعہ کے دن کے متعلق ہماری رہنمائی فرمائی اور اس |
| بنا فھدانا اللہ لیوم الجمعۃ فجعل | طرح جمعہ سنیچر اور اتوار علیحدہ علیحدہ امتوں کے لیے مقرر ہو گئے |
| الجمعۃ والسبت والاحد وکذالک | لہٰذا اسی طرح یہ سب امتیں قیامت کے دن ہماری تابع ہونگی |
| ھم تبع لنا یوم القیٰمۃ نحن الاخرون | اور ہم جو دنیا میں آخر ہیں قیامت میں پاداشِ عمل کے اعتبار |
| من اھل الدنیا والاولون یوم القیٰمۃ | سے مقدم ہوں گے اور تمام مخلوق سے قبل ہمارا ہی |
| والمقضی بینھم قبل الخلائق[2] | فیصلہ ہوگا۔ |

---

[1] بخاری۔ شاہ ولی اللہؒ نے اس حدیث کے معنی یہ بیان کیے ہیں کہ منجانب اللہ تو یہ حکم ہوا تھا کہ ہفتہ میں سے ایک روز عبادت کے لیے مقرر کر لو اور تعیین امم کی فطرت پر چھوڑ دی گئی تھی چنانچہ تمام امم کے مقابلہ میں صرف ہم نے ہی جمعہ کا انتخاب کیا۔ [2] مسلم۔

سبت کی حرمت کے متعلق موسوی قانون میں بنی اسرائیل کو کیا ہدایات تھیں وہ تورات کے اس بیان سے بھی ظاہر ہوتی ہیں :-

"پھر خداوند نے موسیٰؑ سے ہم کلام ہو کے کہا تو بنی اسرائیل کو فرما اور ان کو کہہ کہ تم میرے سبتوں کو مانو اس لیے کہ یہ میرے اور تمھارے درمیان تمھارے قرنوں میں نشانی ہے تاکہ تم جانو کہ میں خداوند تمھارا پاک کرنے والا ہوں۔ پس تم سبت کو مانو اس لیے کہ وہ تمھارے لیے مقدس ہے جو کوئی اس کو پاک نہ جانے وہ ضرور مار ڈالا جائے جو اس میں کچھ کام کرے وہ اپنی قوم سے کٹ جائے۔ چھ دن کام کرنا لیکن ساتویں دن آرام کے لیے سبت ہے وہ خداوند کے لیے مقدس ہے۔ پس بنی اسرائیل سبت کو مانیں اور اسے اپنی پشت در پشت عہدِ ابدی جان کے اس میں آرام کریں میرے اور بنی اسرائیل کے درمیان یہ علامت ابدی ہے۔"[1]

**واقعہ کی تفصیلات** غرض ایک طویل مدت تک یہود (بنی اسرائیل) اپنے مطلوبہ روزِ عبادت (سبت) کی عزت و حرمت میں خدا کے لیے ہوئے عہد و پیمان پر قائم رہے اور جن باتوں کو اس دن میں حرام کر دیا گیا تھا ان سے بچتے رہے مگر آہستہ آہستہ ان کی کج روی اور متمردانہ سرکشی بروئے کار آتی گئی اور انھوں نے اللہ تعالیٰ کے ان احکامات کی جو کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی معرفت سبت سے متعلق ان پر لازم کیے گئے تھے خلاف ورزی شروع کر دی اور اگرچہ شروع میں یہ خلاف ورزی انفرادی اور خفیہ طریق پر ہوتی رہی مگر شدہ شدہ اس نے علی الاعلان جماعتی حیثیت اختیار کر لی اور بے خوفی اور بے باکی کے ساتھ اس کو کیا جانے لگا بلکہ بہانے حیلے تراش کر اپنی اس بدعملی پر فخر کیا جانے لگا، تب خدا کے عذاب نے ان کو آپکڑا اور وہ ذلت و رسوائی کے ساتھ ہلاک کر دیے گئے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کے عہدِ مبارک سے عرصۂ دراز کے بعد بنی اسرائیل کی ایک جماعت بحرِ قلزم کے کنارے آباد ہو گئی تھی۔ چونکہ یہ لوگ ساحل کے باشندے تھے اس لیے مچھلی ان کا قدرتی شکار تھا اور وہ اس کو بہت محبوب مشغلہ سمجھتے اور اس کی خرید و فروخت کا کاروبار کرتے تھے۔ یہ لوگ ہفتہ کے چھ دن مچھلی کا شکار کھیلتے اور سبت کا روز عبادتِ الٰہی میں صرف

[1] خروج باب ۳۱ آیات ۱۲ تا ۱۷

کرتے اس لیے قدرتی طور پر مچھلیاں چھٹے روز جان بچانے کی خاطر پانی کی تہہ میں پوشیدہ رہتیں اور سبت کے روز پانی کی سطح پر تیرتی نظر آتی تھیں۔ ساتھ ہی خدائے تعالیٰ نے اس طریقہ سے ان کو آزمایا اور ان کی قوتِ ایمانی کا امتحان لیا حتیٰ کہ سبت کے علاوہ ہفتہ کے باقی دنوں میں مچھلیوں کا حاصل ہونا مشکل تر ہو گیا اور چھٹے دن یہ کیفیت رہنے لگی کہ گویا قلزم میں مچھلی کا نام ونشان باقی نہیں رہا مگر سبت کے روز وہ اس کثرت سے پانی پر تیرتی نظر آتیں کہ جال اور کانٹے کے بغیر ہاتھوں سے بآسانی گرفت میں آسکتی تھیں۔

کچھ دنوں تک تو یہود اس حالت کو صبر آزما طریقہ پر دیکھتے رہے، آخر نہ رہ سکے اور ان میں سے بعض بعض نے خفیہ طریقوں سے ایسے حیلے ایجاد کرلیے کہ جس سے یہ بھی ظاہر نہ ہوسکے کہ وہ سبت کے احکام کی خلاف ورزی کر رہے ہیں اور سبت کے دن مچھلیوں کی کثرتِ آمد سے بھی فائدہ اٹھالیں۔

چنانچہ بعض تو یہ کرتے کہ جمعہ کی شام کو قلزم کے قریب گڑھے کھود لیتے اور دریا سے ان گڑھوں تک نہر کی طرح ایک گول نکال لیتے اور جب سبت کے روز سطحِ آب پر مچھلیاں تیرنے لگتیں تو وہ دریا کے پانی کو کھول دیتے تاکہ پانی گڈھوں میں چلا جائے اور اس طرح مچھلیاں بھی پانی کے بہاؤ سے اُن میں چلی جائیں اور جب سبت کا دن گزر جاتا تو یک شنبہ (اتوار) کی صبح کو ان مچھلیوں کو گڈھوں میں سے نکال کر کام میں لاتے۔

اور بعض یہ کرتے کہ جمعہ کے روز دریا میں جال اور کانٹے لگا آتے تاکہ سبت کے روز اُن میں مچھلیاں پھنس جائیں اور اتوار کی صبح کو اُن جالوں اور کانٹوں میں گرفتار مچھلیوں کو پکڑ لاتے اور یہ سب اپنی ان ترکیبوں پر بے حد مسرور نظر آتے تھے چنانچہ جب ان کے علماءِ حق اور مخلصینِ امت نے ان کو اس حرکت سے روکا تو انھوں نے معترضین کو یہ جواب دیا کہ خدا کا حکم یہ ہے کہ سبت کے دن شکار نہ کرو لہٰذا ہم اس کی تعمیل میں سبت کے دن شکار نہیں کرتے بلکہ اتوار کے روز کرتے ہیں باقی یہ ترکیبیں منع نہیں ہیں اور اگرچہ اُن کا دل اور ضمیر ملامت کرتا تھا مگر کج روی یہ جواب دے کر ان کو مطمئن کر دیتی تھی کہ ہمارا یہ حیلہ خدا کے یہاں ضرور چل جائے گا۔

اصل بات یہ تھی کہ وہ دین کے احکام پر صداقت وسچائی کے ساتھ عمل نہیں کرتے تھے اور اسی لیے شرعی حیلے نکال کر ان کے امتثال سے بچنا چاہتے تھے، گویا خود فریبی میں مبتلا تھے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے تھے، چنانچہ نتیجہ یہ نکلا کہ ان چند حیلہ جو انسانوں کی اِن حرکات کا علم دوسرے حیلہ ساز افراد کو بھی ہوا اور انھوں نے بھی ان کی تقلید شروع کر دی اور آخر کار بستی کی ایک بہت بڑی جماعت بہانگ دہل، ان حیلوں کی آڑ میں سبت کی حرمت کی خلاف ورزی کرنے لگی۔

اس جماعت کی یہ ذلیل حرکات دیکھ کر بستی ہی میں سے ایک سعادت مند جماعت نے کمرِ ہمت چست کی اور ان کے مقابل آکر ان کو اس بدعملی سے باز رکھنے کی کوشش کی اور اس طرح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کو ادا کیا مگر انھوں نے کچھ پرواہ نہیں کی اور اپنی حرکت پر قائم رہے تب سعادت مند جماعت کے دو حصے ہو گئے ایک نے دوسرے سے کہا کہ ان لوگوں کو نصیحت کرنا اور سمجھانا بے کار ہے، باز آنے والے نہیں کیونکہ یہ اس کام کو اگر گناہ سمجھ کر کرتے تب تو یہ توقع تھی کہ شاید کسی وقت باز آکر تائب ہو جائیں۔ لیکن جب کہ یہ شرعی حیلے تراش کر اپنی بدعملی پر نیکی کا پردہ ڈالنا چاہتے ہیں تو ہم کو یقین ہوتا جاتا ہے کہ اس جماعت پر بہت جلد خدا کا عذاب آنے والا ہے یا یہ ہلاک کر دیے جائیں گے اور یا کسی سخت عذاب میں مبتلا کیے جائیں گے۔ لہٰذا اب ان سے کوئی تعرض نہ کرو۔

یہ سُن کر سعادت مند جماعت کے دوسرے حصہ نے کہا کہ ہم اس لیے ان کو برابر نصیحت کرتے رہنا چاہتے ہیں کہ فردائے قیامت میں اپنے پروردگار کے سامنے یہ عذر پیش کر سکیں کہ ہم نے آخر وقت تک ان کو سمجھایا اور نہی عن المنکر کے فریضہ کو ادا کیا، لیکن انھوں نے کسی طرح نہیں مانا نیز ہم مایوس نہیں ہیں بلکہ توقع رکھتے ہیں کہ عجب نہیں کہ ان کو توفیق نصیب ہو جائے اور یہ اپنی بدعملی سے باز آجائیں۔

بہرحال حیلہ جو جماعت اپنے حیلوں پر قائم رہی اور سبت کی حرمت اور اس دن میں شکار کی ممانعت کے احکام سے قطعاً غافل اور بے پروا ہو کر نڈر اور بے باک ہو گئی تب اچانک غیرت حق کو

حرکت ہوئی اور مہلت کے قانون نے گرفت کی صورت اختیار کرلی یعنی خدائے تعالیٰ کا حکم ہوگیا کہ جس طرح تم نے میرے قانون کی اصل صورت و شکل کو حیلوں کے ذریعہ مسخ کردیا قانونِ پاداشِ عمل کے مطابق اسی طرح تمھاری صورت و شکل بھی مسخ کردی جاتی ہے تاکہ "پاداشِ عمل از جنسِ عمل" کے مظاہرے سے دوسرے لوگ بھی عبرت و بصیرت حاصل کریں چنانچہ حضرتِ حق جل مجدہٗ نے "کُن" کے اشارہ سے ان کو بندر اور خنزیر کی شکلوں میں مسخ کردیا اور وہ انسانی شرف سے محروم ہوکر ذلیل و خوار حیوانوں میں تبدیل ہوگئے۔

مفسرین کہتے ہیں کہ سعادت مند جماعت کا جو حصہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرتا رہا اس نے جب یہ دیکھا کہ متمرد اور سرکش جماعت کسی طرح حق پر کان نہیں دھرتی تو مجبور ہوکر اس نے ان سے ترکِ تعاون کرلیا اور کھانا پینا اور خرید و فروخت غرض ہر قسم کا اشتراکِ عمل ختم کردیا حتیٰ کہ اپنے مکانوں کے دروازوں تک کو ان پر بند کردیا تاکہ کسی قسم کا بھی اشتراک باقی نہ رہے چنانچہ جس دن بدکرداروں پر عذابِ الٰہی نازل ہوا تو ان کے معاملہ کی اس جماعت کو گھنٹوں خبر نہ ہوئی لیکن جب کافی وقت گزر گیا اور اس جانب سے کسی انسان کی نقل و حرکت محسوس نہ ہوئی تب ان کو خیال ہوا کہ معاملہ دگرگوں ہے لہٰذا وہاں جاکر دیکھا تو صورتِ حال اس درجہ عجیب تھی کہ جس کا وہ تصور بھی نہیں کرسکتے تھے یعنی وہاں انسانوں کی جگہ بندر اور خنزیر تھے جو اپنے ان عزیزوں کو دیکھ کر قدموں میں لوٹتے اور اپنی حالتِ زار کا اشاروں سے اظہار کرتے تھے۔ سعادت مند جماعت نے باحسرت و یاس ان سے کہا کہ کیا ہم تم کو بار بار اس خوفناک عذاب سے نہیں ڈراتے تھے۔ انھوں نے یہ سنا تو حیوانوں کی طرح سر ہلاکر اقرار کیا اور آنکھوں سے آنسو بہاتے ہوئے اپنی ذلت و رسوائی کا دردناک نظارہ پیش کیا:

| | |
|---|---|
| وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا | اور (اے گروہ یہود) تم بلاشبہ (اپنے پیش رووں میں سے) ان لوگوں کو |
| مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا | اچھی طرح جانتے ہو جو سبت کے بارہ میں احکامِ الٰہی کی حدود سے متجاوز |
| قِرَدَةً خٰسِئِيْنَ ۚ فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا | ہوگئے تھے اور ہم نے ان کے لیے کہہ دیا تم ذلیل بندر ہوجاؤ پس ہم نے |
| بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا | اس بستی کے ان بدبخت لوگوں کو گرد و پیش کے لوگوں کیلئے عبرت اور |

وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ (بقرہ پ۱ ع۸)

خدا سے ڈرنے والوں کے لیے نصیحت اور عظت بنا دیا۔

وَسْئَلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ إِذْ يَعْدُوْنَ فِي السَّبْتِ إِذْ تَأْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّيَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ لَا تَأْتِيْهِمْ كَذٰلِكَ نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۝ وَإِذْ قَالَتْ أُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمًا اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ أَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا قَالُوْا مَعْذِرَةً إِلٰى رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۝ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ أَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ وَأَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍ بَئِيْسٍ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۝ فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خَاسِئِيْنَ ۝

(اعراف پ۹ ع۲۱)

اور (اے پیغمبر) بنی اسرائیل سے اس شہر کے بارہ میں پوچھو، جو سمندر کے کنارے واقع تھا اور جہاں سبت کے دن لوگ خدا کی ٹھہرائی ہوئی حد سے باہر ہو جاتے تھے سبت کے دن ان کی (مطلوبہ) مچھلیاں پانی پر تیرتی ہوئی ان کے پاس آجاتیں مگر جس دن سبت نہ مناتے نہ آتیں اس طرح ہم انھیں آزمائش میں ڈالتے تھے بسبب اس نافرمانی کے جو وہ کیا کرتے تھے اور جب اس شہر کے باشندوں میں سے ایک گروہ نے (ان لوگوں سے جو نافرمانوں کو وعظ و نصیحت کرتے تھے) کہا تم ایسے لوگوں کو (بیکار) نصیحت کیوں کرتے ہو جنھیں (ان کی شقاوت کی وجہ سے) یا تو خدا ہلاک کر دیگا یا نہایت سخت عذاب میں مبتلا کریگا انھوں نے کہا اس لیے کرتے ہیں تاکہ تمھارے پروردگار کے حضور معذرت کر سکیں (کہ ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا) اور اس لیے بھی کہ شاید یہ لوگ باز آجائیں پھر جب ایسا ہوا کہ ان لوگوں نے وہ تمام نصیحتیں بھلا دیں جو انھیں کی گئی تھیں تو ہمارا مواخذہ نمودار ہو گیا ہم نے ان لوگوں کو تو بچا لیا جو برائی سے روکتے تھے مگر شرارت کرنے والوں کو ایک ایسے عذاب میں ڈالا کہ محرومی و نامرادی میں مبتلا کرنیوالا عذاب تھا بسبب ان نافرمانیوں کے جو وہ کیا کرتے تھے پھر جب وہ اس بات میں حد سے زیادہ سرکش ہو گئے جس سے انھیں روکا گیا تھا تو ہم نے کہا بندر ہو جاؤ ذلت و خواری سے ٹھکرائے ہوئے۔

قُلْ هَلْ أُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ

(اے پیغمبر) کہہ دیجیے کیا میں تم کو بتاؤں کہ قیامت کے دن اللہ کے نزدیک جزا کے اعتبار سے کون سب سے بدتر ہوگا وہ شخص ہوگا جس کو

| | |
|---|---|
| وَغَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمُ | خدا نے لعنت کی اور اس پر غضبناک ہوا اور وہ جس میں سے |
| الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيرَ وَعَبَدَ | اس نے بندر اور خنزیر کی شکل میں مسخ کر دیے اور جس نے ان میں سے |
| الطَّاغُوتَ أُولَٰئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا | شیطان (یا بُت) کی پوجا کی یہی ہیں بدترین مرتبہ والے اور سیدھے |
| وَأَضَلُّ عَن سَوَاءِ السَّبِيلِ ○ | راستہ سے بہت دور بھٹکے ہوئے (یعنی اے بنی اسرائیل ہم بدترین جزاء |
| (مائدہ پ ۶ ع ۹) | کے مستحق نہیں ہیں بلکہ تم ہو جن کے یہ کچھ اعمال و اطوار ہیں۔ |
| يَا أَيُّهَا الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ آمِنُوا بِمَا | اے اہلِ کتاب تم اس کتاب پر ایمان لاؤ جو ہم نے تم پر اتاری ہے جو |
| نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُم مِّن قَبْلِ أَن | اس کی تصدیق کرنے والی ہے جو تمھارے پاس ہے (یعنی توراۃ) |
| نَّطْمِسَ وُجُوهًا فَنَرُدَّهَا عَلَىٰ | اس سے پہلے ایمان لاؤ کہ ہم چہروں کو مٹا ڈالیں اور ان کی پیٹھ پر ان کو |
| أَدْبَارِهَا أَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّا أَصْحَابَ | لگا دیں یا ہم ان پر لعنت کریں جس طرح ہم نے سبت والوں پر لعنت کی |
| السَّبْتِ وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ مَفْعُولًا ○ (نساء ۷ع) | اور اللہ کا حکم پورا ہو کر رہنے والا ہے۔ |

**تعیینِ مقام** جس بستی پر یہ حادثہ گزرا اس کا نام کیا ہے؟ قرآنِ عزیز سورۂ اعراف میں صرف یہ بیان کرتا ہے کہ وہ ساحلِ بحر پر واقع تھی "الْقَرْيَةِ الَّتِي كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ" مگر مفسرین نے اس کی تعیین میں متعدد نام لیے ہیں، حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے ایک روایت یہ نقل کی جاتی ہے کہ یہ مدین کا واقعہ ہے اور ابن زیدؓ کہتے ہیں کہ اس کا نام مقنا تھا اور یہ مدین اور عینونا کے درمیان واقع تھا[1]

اور عکرمہ، مجاہد، قتادہ، سدی کبیر اور ایک روایت میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ منقول ہے کہ اس بستی کا نام ایلہ تھا اور یہ بحرِ قلزم کے ساحل پر واقع تھی، عرب جغرافیہ داں کہتے ہیں کہ جب کوئی شخص طورِ سینا سے گزر کر مصر کو روانہ ہو تو طورِ سینا کی جانب ساحلِ بحر پر یہ بستی ملتی تھی یا یوں کہہ لیجیے کہ مصر کا باشندہ اگر مکہ کا سفر کرے تو راہ میں یہ شہر پڑتا تھا، یہی قول راجح ہے[2]

**زمانۂ حادثہ** شاہ عبدالقادر (نور اللہ مرقدہٗ) اور ان کے اتباع میں بعض دوسرے مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ واقعہ حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں پیش آیا ہے لیکن ابن جریر، ابن کثیر، ابوحیان اور امام رازی (رحمہم اللہ) جیسے جلیل القدر مفسرین کے طرزِ بیان اور خود قرآنِ عزیز کے اسلوب سے یہ قول صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

[1] تفسیر ابن کثیر سورۂ اعراف و تاریخ ابن کثیر ج ۲۔ [2] ایضاً و فتح الباری ج ۶۔

اس لیے کہ قرآنِ عزیز نے اس واقعہ کو سورۂ اعراف میں قدرے تفصیل سے بیان کیا ہے اور وہاں یہ بتایا ہے کہ جب یہ واقعہ پیش آیا تو اہلِ بستی تین جماعتوں میں تقسیم ہو گئے تھے اور ان میں سے ایک جماعت سرکش اور حیلہ جو نافرمانوں کو راہِ ہدایت پر قائم رکھنے کی سعی کر رہی تھی پس اگر یہ واقعہ حضرتِ داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں پیش آیا تو یہ بات بعید از قیاس اور بعید از اسلوبِ قرآن تھی کہ وہ ایسے موقع پر جب کہ انسانوں کی ایک بہت بڑی جماعت پر مسخ کا عذاب مسلط ہونے کا ذکر کر رہا ہو اس زمانہ کے پیغمبر کا اس سلسلہ میں قطعاً کوئی ذکر نہ کرے اور یہ نہ بتائے کہ نافرمان قوم کے اور ان کے درمیان کیا معاملہ پیش آیا نیز سلفِ صالحین سے بھی کوئی ایسی روایت موجود نہیں ہے کہ جس سے یہ واضح ہوتا ہو کہ یہ واقعہ حضرت داؤد (علیہ السلام) کے زمانہ میں پیش آیا اور نہ تاریخ ہی اس کے لیے کوئی مواد بہم پہونچاتی ہے۔ اس لیے مذکورۃ الصدر جلیل المرتبت مفسرین نے بھی اس واقعہ سے متعلق چاروں مقامات میں سے کسی ایک مقام کی تفسیر میں بھی یہ ذکر نہیں کیا کہ یہ واقعہ حضرت داؤد (علیہ السلام) کے زمانہ میں پیش آیا ہے۔ پھر نہیں معلوم کہ حضرت شاہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے یہ کس جگہ سے اخذ فرمایا کہ یہ واقعہ داؤد (علیہ السلام) کے زمانہ کا ہے ممکن ہے کہ انھوں نے سورۂ مائدہ کی اس آیت سے یہ اندازہ لگایا ہو:۔

| | |
|---|---|
| لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰي لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ۝ (مائدہ پ۶ ع۱۱) | داؤد اور عیسیٰ بن مریم کی زبانی بنی اسرائیل میں سے وہ لوگ لعنت کیے گئے جنھوں نے کفر کیا اس لیے کہ وہ نافرمانی کے خوگر تھے اور حد سے گزرے ہوئے تھے۔ |

مگر اس آیت سے استدلال صحیح نہیں ہے اس لیے کہ اوّل تو اس مقام پر بنی اسرائیل کی عام گمراہی کا تذکرہ ہے۔ خاص سبت کا واقعہ زیرِ بحث نہیں ہے۔ دوسرے اس میں صرف داؤد علیہ السلام ہی کا ذکر نہیں ہے بلکہ حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) کا بھی تذکرہ ہے۔ چنانچہ ابن کثیرؒ اس آیت کی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں:۔

| | |
|---|---|
| يخبر تعالٰى انه لعن الكافرين من بني اسرائيل | اللہ تعالیٰ خبر دیتا ہے کہ بنی اسرائیل میں سے کفر کرنے والوں پر |

| | |
|---|---|
| من دھر طویل فیما انزلہ علی داؤد | داؤد علیہ السلام کی زبانی زبور میں عرصہ دراز کے بعد لعنت کی گئی اور عیسیٰ ابن |
| نبیہ علیہ السلام وعلی لسان | مریمؑ کی زبانی بھی انجیل میں اس لیے کہ خدا کی نافرمانیوں مسلسل سرکشیوں |
| عیسیٰ ابن مریم بسبب عصیانہم | اور مخلوقِ خدا پر ظلم کرنے کی وجہ سے اسی قابل تھے کہ ان پر لعنت ہوتی |
| للہ واعتداءہم علی خلقہ | رہے (تاکہ دوسرے لوگ عبرت پکڑیں) عوفیؒ کہتے ہیں کہ ابن عباس |
| قال العوفی عن ابن عباس لعنوا | (رضی اللہ عنہما) سے منقول ہے وہ آیت کی تفسیر میں فرمایا کرتے تھے |
| فی التوراۃ والانجیل وفی الزبور | کہ بنی اسرائیل میں سے کفر کرنے والوں پر توراۃ انجیل زبور اور قرآن |
| وفی الفرقان[1] الخ۔ | سب ہی کتابوں میں لعنت کی گئی ہے۔ |

الحاصل قرآن کے اسلوبِ بیان اور جلیل القدر مفسرین کی شرح و تفصیل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اصحابِ سبت کا یہ واقعہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اور حضرت داؤد (علیہ السلام) کے درمیانی زمانہ میں کسی ایسے وقت پیش آیا جب کہ ایلہ میں کوئی نبی موجود نہیں تھے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ وہاں کے علماءِ حق ہی کے سپرد تھا اس لیے قرآنِ عزیز نے صرف ان ہی کا تذکرہ کیا اور کسی نبی یا پیغمبر کا ذکر نہیں کیا۔

**چند تفسیری حقائق** (۱) سورۂ بقرہ میں اصحابِ سبت کے تذکرہ میں ہے "نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا" تو مَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا سے کیا مراد ہے اس کے جواب میں مفسرین کے متعدد اقوال ہیں سے بہتر قول حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) سے منقول ہے یعنی اس سے وہ بستیاں مراد ہیں جو ایلہ کے گرد و پیش آباد تھیں اور مشہور تابعی سعید بن جبیر کے قول سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے:

| | |
|---|---|
| عن ابن عباس لما بین یدیھا من | ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ مراد یہ ہے کہ ایلہ کے سامنے اور پیچھے |
| القری وما خلفھا من القری[2] | جو بستیاں ہیں ان کے لیے ہم نے اس کو عبرت بنا دیا۔ |
| وقال سعید بن جبیر ای من بحضرھا | اور سعید بن جبیر فرماتے ہیں مراد یہ ہے کہ اس زمانہ میں جو لوگ |
| من الناس یومئذٍ[3] | تھے ایلہ کو ہم نے ان کے لیے سامانِ عبرت بنا دیا۔ |

(۲) اسی واقعہ سے متعلق سورۂ اعراف میں ہے "كَذَٰلِكَ نَبْلُوهُم بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ" یعنی

[1] تفسیر ابن کثیر جلد ۱۔ [2] ایضاً [3] ایضاً۔

ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے ہم نے ان کو امتحان و آزمائش میں مبتلا کردیا یہ اس طرف اشارہ ہے کہ جب بنی اسرائیل نے جمعہ کو یوم عبادت تسلیم کرنے سے انکار کردیا اور سبت (سنیچر) کے یوم عبادت بنائے جانے پر موسیٰ علیہ السلام سے جھگڑا کیا تو ہم نے اگرچہ ان کی بات مان لی لیکن سبت کے معاملہ میں ہم نے ان کو کڑی آزمائش میں ڈال دیا اور آزمائش کا یہ معاملہ مچھلی کے شکار سے متعلق تھا جس کی تفاصیل تم سُن چکے ہو۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے بھی یہی تفسیر بیان فرمائی ہے:۔

| | |
|---|---|
| ان اللہ انما افترض علی بنی اسرائیل | اللہ تعالیٰ نے ابتداء میں بنی اسرائیل کی عبادت کے لیے اسی طرح جمعہ |
| الیوم الذی افترض علیکم فی عید کم | کو فرض کیا تھا جس طرح ہم پر فرض کیا ہے مگر انھوں نے مخالفت |
| الیوم الجمعۃ فخالفوا الی السبت فعظموہ | کرکے اس کو سنیچر کے دن سے بدل لیا اور اس کی عظمت کرنے لگے |
| وترکوا ما امروا بہ فلما ابوا الا لزوم | اور جمعہ کے بارہ میں جو حکم ان کو ملا تھا اس کو نہ مانا پس جب وہ سبت |
| السبت ابتلاھم اللہ فیہ [1] | پر اڑ گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو اس سلسلہ میں آزمائش میں ڈال دیا۔ |

(۳) اسی سورہ میں ہے "بِعَذَابٍ بَئِيسٍ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ" اس آیت کی تفسیر میں دو احتمال بیان کیے جاتے ہیں ایک یہ کہ یہ اجمال ہے اس تفصیلی عذاب کا جو اگلی آیت "كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ" میں بیان ہوا ہے اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ اول اہل بستی پر ایک نوع کا عذاب آیا تاکہ اُن کی آنکھیں کُھلیں اور وہ یہ سمجھیں کہ وہ ان حیلوں سے خدا کے احکام کی تعمیل نہیں کر رہے بلکہ اس کے حکم کو منسوخ کر رہے ہیں مگر انھوں نے اس عذاب سے کوئی عبرت حاصل نہیں کی تب اُن پر "مسخ" کا عذاب آگیا، جمہور پہلے قول کو ترجیح دیتے ہیں۔

(۴) سورۂ مائدہ میں ہے "جَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيرَ" حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ معذب گروہ کے نوجوان..... "بندر" کی شکل میں مسخ کیے گئے اور بوڑھے "خنزیر" کی صورت میں مسخ ہوئے۔[1]

**حقیقتِ مسخ** (۵) سورۂ بقرہ، مائدہ اور اعراف میں ہے "كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ" "وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيرَ" تو انسان کے بندر یا خنزیر ہو جانے کے کیا معنی ہیں؟ جمہور کی رائے یہ ہے کہ

[1] ابن کثیر ج ا۔

اس سے مسخِ حقیقی (صوری) مراد ہے اور مشہور تابعی مجاہدؔ کہتے ہیں کہ اس سے مسخِ معنوی مراد ہے یعنی وہ حقیقۃً بندر کی شکل میں تبدیل نہیں ہو گئے تھے بلکہ ان کے قلوب مسخ ہو گئے تھے۔

| | |
|---|---|
| قال مسخت قلوبهم ولم يمسخوا قردة وانما هو مثل ضربه الله "كمثل الحمار يحمل اسفارا" وهذا اسند جيد عن مجاهد وقول غريب خلاف الظاهر من السياق في هذا المقام وفي غيره ۔[1] | مجاہد کہتے ہیں کہ ان کے قلوب مسخ ہو گئے تھے اور وہ واقعی بندر نہیں بن گئے تھے اور دراصل یہ ایک مثل ہے جیسا کہ قرآن میں یہ مثل ہے: "مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا" یعنی اہلِ کتاب کے توراۃ وانجیل پڑھنے اور پھر اس کے مطابق عمل نہ کرنے کی مثال ایسی ہے کہ گویا گدھے پر کتابیں لدی ہوئی ہیں، مجاہد کا یہ قول ان کی جانب صحیح سند سے ثابت ہے مگر یہ غریب انوکھا اور اوپرا قول ہے اور قرآن کے ان تمام مقامات کے ظاہر کے خلاف ہے جو مختلف سورتوں میں اس مسئلہ میں بیان کیے گئے ہیں۔ |

جمہور کے خلاف مجاہدؔ اپنے اس قول میں منفرد ہیں اور یہ قول ظاہرِ قرآن کے بھی خلاف ہے اس لیے کہ سورۂ بقرہ میں واقعۂ مسخ کا ذکر کرتے ہوئے یہ کہا گیا ہے کہ یہ عذاب جس طرح سرکشی اور نافرمان لوگوں کی پاداشِ عمل کے لیے ضروری تھا اسی طرح اس میں یہ بھی حکمت و مصلحت تھی کہ یہ لرزہ براندام کر دینے والا واقعہ گرد و پیش کے رہنے والوں کے لیے بھی سامانِ عبرت بن جائے چنانچہ ارشاد ہے: "فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا" پس اگر مسخ کا یہ عذاب صرف مسخِ قلوب تک محدود تھا تو گرد و پیش کے بسنے والے کے لیے یہ کس طرح سامانِ عبرت و خوف بن سکتا تھا کیونکہ قلب کے مسخ ہو جانے کا مطلب تو یہ ہوتا ہے کہ وہ رشد و ہدایت کے قبول سے محروم ہو جائے اور یہ بات دوسروں کی نگاہ میں مشاہدؔ اور محسوس نہیں ہوا کرتی بلکہ ایک معنوی شے ہے جس کو دوسرا انسان ثمرہ یا نتیجہ اور یا کافی تجربہ کے بعد ہی معلوم کر سکتا ہے۔ نیز عدمِ قبولِ ہدایت اور انکارِ ہدایت کا معاملہ تو کچھ ان ہی لوگوں کے لیے مخصوص نہیں ہے یہ تو ہر پیغمبر کی دعوت و تبلیغ کے وقت پیش آتا رہتا ہے، لہٰذا اگر اصحابِ سبت کی پیہم سرکشی کی وجہ سے ان کے قلوب مسخ کر دیے گئے یعنی ان سے قبولِ ہدایت سلب کر لی گئی تو ان میں وہ کیا خاص بات پیدا ہو گئی تھی کہ جس کی وجہ سے مسخِ قلوب

[1] ابن کثیر ج ۱ سورۂ بقرہ۔

کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ تعبیر اختیار فرمائی "کُوْنُوْا قِرَدَةً خَاسِئِیْنَ"

علاوہ ازیں اگر اس تعبیر سے صرف مسخِ قلوب ہی مراد ہوتا تو بلحاظِ بلاغت یہ کہہ دینا کافی تھا کہ "کُوْنُوْا قِرَدَةً" "تم بندر کی طرح ہو جاؤ" یعنی جس طرح "بندر" انسان نما شریر و خبیث حیوان ہے اسی طرح تم بھی ہو کہ صورت انسانوں کی مگر قلب میں شرارت و خباثت بندر کی سی ہے اور قردۃ کی صفت خاسئین ۔ ذلیل و رسوا بندر" کے اضافہ کی قطعاً ضرورت نہیں تھی اس لیے کہ جب ان کی صورتیں بندر کی شکل میں مسخ ہو کر تبدیل نہیں ہو گئی تھیں تو پھر یہ حکمت صحیح نہیں ہو سکتی کہ اگر فقط قردۃ (بندر) کہا جاتا تو ممکن تھا کسی کے دل میں یہ شبہ باقی رہ جاتا کہ جب کہ بعض پالتو بندر پالنے والوں کی نظروں میں پیارے لگتے ہیں تو کسی انسان کے لیے صرف یہ کہہ دینا کہ وہ بندر سا لگتا ہے مذمت کے موقع پر کافی نہیں ہے اس لیے ضروری ہوا کہ "خَاسِئِیْنَ" کہہ کر یہ بتا دیا جائے کہ وہ محبوب بندر نہیں بلکہ ذلیل و رسوا بندر بنا دیے گئے۔

یہ حکمت تو جب ہی صحیح ہو سکتی ہے کہ ان انسانوں کو حقیقی طور پر بندر کی شکل میں مسخ کر دیا گیا ہو اور چونکہ بعض لوگ بندر کی حرکات سے خوش ہو کر اُن کو پالتے اور محبوب رکھتے ہیں لہٰذا ان معذب انسانوں کو بندر کی شکل میں بھی اس طرح مسخ کیا گیا کہ دیکھنے والا ان سے گھن کھائے اور ان کا اپنے قریب آنا بھی گوارا نہ کرے۔

مجاہدؒ کا یہ کہنا بھی درست نہیں ہے کہ یہ اسی طرح ایک مثل ہے جس طرح "کَمَثَلِ الْحِمَارِ یَحْمِلُ اَسْفَارًا" عالمِ بے عمل کے لیے مثل ہے" یہ قول اس لیے درست نہیں ہے کہ قرآنِ عزیز نے بعض مواقع میں جو مثالیں بیان کی ہیں یا تو وہ "مثل" کہہ کر ہی بیان ہوئی ہیں مثلاً مسطورۂ بالا امثال یا مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِی اسْتَوْقَدَ نَارًا" منافقین کی مثال" یا مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا" جیسی مثال اور یا وہاں ایسا صاف اور واضح قرینہ موجود ہوتا ہے جو ظاہر کرتا ہے کہ اس جگہ حقیقتِ حال کو "مثل" کے پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً آیت "خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ" میں یہ بتایا گیا ہے کہ جو شخص ہدایت کو ہدایت سمجھنے کے باوجود قبول نہیں کرتا

وہ کانوں سے سُنتا ہے مگر اس پر توجہ نہیں کرتا وہ حق کو آنکھوں سے دیکھتا ہے مگر اس سے آنکھیں پھیر لیتا ہے اور اپنی زندگی کو مسلسل ایسی کجروی اور بغاوت پر قائم رکھتا ہے تو اس کی مثال ایسی ہے گویا اللہ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے، پس یہاں یہ واضح قرینہ موجود ہے کہ مشرکین مکہ کے نہ کانوں پر مہر لگی ہوئی تھی اور نہ دلوں پر اور نہ ان کی آنکھوں پر پردے لٹکے ہوئے تھے لہٰذا آیت کا مطلب یہ ہے کہ عادت اللہ یہ جاری ہے کہ جو سمجھ رکھنے کے باوجود ناسمجھ بنتا، شنوا ہونے کے باوجود ناشنوا ہو جاتا اور بینا ہونے کے باوجود حق سے نابینا بنتا ہے اور اس حالت پر مصر رہتا ہے تو خدائے تعالیٰ کی پاداشِ عمل کا قانون اس کے قلب، سمع اور بصر کی اس استعداد کو سلب کر لیتا ہے جو قبولِ حق کے لیے اس کو خلقت و پیدائش کے وقت عطا ہوئی تھی۔

لیکن زیرِ بحث مقام پر "کُونُوا قِرَدَۃً" کو نہ صاف الفاظ میں "مثل" کہا گیا ہے اور نہ یہاں کوئی ایسا قرینہ موجود ہے جو "مسخ معنوی" پر دلالت کرتا ہو۔ بلکہ "خَاسِئِیْنَ" کو قردۃ کے لیے صفت لانا اس کا قرینہ ہے کہ یہاں بلاشبہ "مسخِ حقیقی" مراد ہے۔

نیز یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ اگر اصحابِ سبت کا معاملہ محض مسخ معنوی کی حیثیت رکھتا ہے تو اس سے متعلق مثل بیان کرنے کے لیے قردہ (بندر) اور خنزیر (خوک) میں سے کسی ایک حیوان کا ذکر کافی تھا اور ان دونوں میں سے شرارت اور خباثت میں جو زیادہ سمجھا جاتا ہو مثال کے طور پر صرف اسی کو بیان کر دینا چاہیے تھا مگر ایسا نہیں کیا گیا بلکہ سورۂ مائدہ میں یہ بتایا کہ اصحابِ سبت میں سے کچھ تو بندر بنا دیے گئے اور کچھ خنزیر کی شکل میں مسخ کر دیے گئے۔ "وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيرَ"

یہ ہیں وہ وجوہ جن کی بنا پر ابن کثیرؒ، ابن جریرؒ، ابن حیانؒ، ابن تیمیہؒ، رازیؒ، آلوسی (رحمہم اللہ) جیسے متقدمین و متاخرین جلیل القدر مفسرین، مجاہد کے انفرادی قول کو قرآنِ عزیز کے سیاق و سباق کے خلاف قرار دیتے ہوئے جمہور کے قول کی تائید کرتے اور اصحابِ سبت سے متعلق آیات میں مسخِ حقیقی مراد لیتے ہیں۔ چنانچہ ابن کثیر (رحمہ اللہ) حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) قتادہؒ، ربیع بن انسؒ

ابوالعالیہ، ضحاک اور جمہور کے اقوال نقل کرنے کے بعد یہ تحریر فرماتے ہیں :-

| | |
|---|---|
| (قلت) والغرض من هذا السياق | میں کہتا ہوں ان ائمۂ تفسیر کے بیانات کو ذکر کرنے سے یہ مقصد |
| عن هؤلاء الائمة بيان خلافما ذهب | ہے کہ یہ ظاہر ہو جائے کہ یہ تمام بالاتفاق مجاہد کے اس قول کے |
| اليه مجاهد رحمه الله من ان مسخهم | مخالف ہیں "کہ بنی اسرائیل کی زیر بحث جماعت کا مسخ صرف معنوی |
| انما كان معنويا لا صوريا بل الصحيح انه | تھا حقیقی نہ تھا" کیونکہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ مسخ معنوی اور حقیقی |
| معنوي صوري (والله اعلم) | دونوں حیثیت سے تھا۔ |

مسئلہ کا یہ پہلو نقل سے تعلق رکھتا ہے، رہا عقلی نقطۂ نظر سو اس کے پیش نظر بھی بآسانی کہا جا سکتا ہے کہ ایسا ہو جانا عقلاً ناممکن اور محال نہیں ہے اس لیے کہ اس مسئلہ میں اگر عقلی استعجاب ہو سکتا ہے تو صرف یہی کہ ایک حقیقت کس طرح دوسری حقیقت میں تبدیل ہو سکتی ہے؟ لیکن تبدیلِ حقایق کا یہ مسئلہ قدیم و جدید فلسفہ کے مسلمات میں سے شمار کیا گیا ہے اور جدید فلسفہ کے نظریۂ ارتقاء (THE THEORY OF RVOLUTION) کی اساس و بنیاد تو صرف اسی پر موقوف ہے کہ ایک حقیقت کا دوسری حقیقت میں تبدیل ہو جانا نہ صرف ممکن بلکہ کائناتِ ہست و بود میں واقع اور درجاتِ ارتقاء کے لحاظ سے ایک حقیقت کا دوسری حقیقت اختیار کر لینا ہمیشہ ہوتا رہتا ہے پس اگر نظریۂ ارتقاء کے اصول پر ایک گوریلا یا شمپانزی قسم کا بندر اپنی حقیقت سے منتقل ہو کر انسانی حقیقت میں بدل جا سکتا ہے تو انسان کا بندر کی حقیقت میں بدل جانا کیوں محال نظر آتا ہے۔

کیا وہ یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ ہر شے کا ردِ عمل (REACTION) ممکن بھی ہے اور واقع و مشاہد بھی تو اِس اصول پر یہ بھی ثابت ہو جائے کہ جس طرح ایک ادنیٰ حقیقت اعلیٰ حقیقت میں تبدیل ہو جاتی ہے اسی طرح کبھی خصوصی حالات و ناموافق اثرات کی بنا پر اعلیٰ حقیقت، ادنیٰ حقیقت میں منقلب ہو جاتی ہے تو عقلاء جدید کے پاس اس نظریہ کے انکار کے کون سے دلائل ہیں اور یہاں ردِ عمل (ری ایکشن) کیوں اپنا اثر نہیں کر سکتا؟

آج کی دنیا میں ایک حقیقت کا دوسری حقیقت میں بدل جانا نہ صرف نظریہ اور تھیوری تک

محدود ہے بلکہ روزمرہ لاکھوں کی تعداد میں ہوتا رہتا اور مشاہدوں میں آتا رہتا ہے اور یہ اس طرح کہ یہ مسئلہ صدیوں تک پیچیدہ رہا ہے کہ انسان کی پیدائش کا ابتدائی تخم (نطفہ) کن کن مدارج سے گزر کر انسان کی شکل اختیار کرتا ہے اور قرآنِ عزیز نے اس سلسلہ میں جن مدارج کا ذکر کیا ہے مفسرینِ قدیم ان مدارج کے حقائق بیان کرنے میں یا اجمال سے کام لیتے رہے ہیں اور یا وقت کی تحقیقاتِ علمی جہاں تک قرآن کا ساتھ دیتی رہی ہیں اس کے مطابق کچھ تفصیلات دیتے رہے ہیں لیکن چونکہ یہ سب کچھ نظری اور عملی حدود میں محدود تھا اس لیے قرآنِ عزیز کے بیان کردہ حقائق کی پوری تشریح سامنے نہیں آئی تھی لیکن اب اس مسئلہ میں نظریات سے آگے بڑھ کر علمی تحقیقات نے مشاہدہ تک ترقی کرلی ہے اور رحمِ مادر میں انسانی تخم پر انسان بننے تک جو تطورات و تحولات گزرتے ہیں ان کو سائنس اور علمِ طب کے جدید آلات کے ذریعہ مشاہدہ کرکے صحیح طور پر معلوم کرلیا گیا ہے اور یہ ثابت ہوگیا ہے کہ قرآنِ عزیز نے اس سلسلہ میں نطفہ، علقہ، مضغہ فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا۔ ثُمَّ أَنْشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ کی جو تعبیرات ایک نبی اُمّی صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت سنائی تھیں حرف بحرف وہی صحیح اور حقیقتِ نفس الامر کے مطابق ہیں گویا علمی تحقیقات کو صدیوں تک اپنی جگہ سے حرکت کرتے کرتے مشاہدہ کی حد میں پہونچ کر آخر اسی جگہ ٹھہرنا پڑا جو قرآن واضح کرچکا تھا اور اس طرح علمی تحقیق کو اپنی جگہ سے ہٹنا پڑا۔ اور جب تک قرآن کے دیے ہوئے علم الیقین کے ساتھ مطابقت نہ کرلی اپنی جگہ قائم نہ رہ سکی۔

"پیدائشِ جنین" کا یہ مسئلہ نشو و ارتقاء کے جن نظریات پر قائم اور عالمِ مشاہدہ میں آچکا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ نطفہ جب علقہ، مضغہ اور اسی طرح کے درجات طے کرتا ہے تو یہ اپنے ہر درجۂ ادنیٰ میں ایک خاص حقیقت ہوتا ہے اور درجۂ عالی میں منتقل ہوکر بالکل دوسری حقیقت بن جاتا ہے اور اسی طرح حقائق کا تحوّل و انقلاب ہوتا رہتا ہے لیکن یہ تمام انقلابات ایک مہینہ کے اندر اندر اس طرح ہوتے ہیں کہ گویا اس ابتدائی دور میں ایک انسان کا جنین بھی درجات کے لحاظ سے ویسا ہی ہوتا ہے۔ جیسا کہ نباتات کا جنین، ایک مچھلی کا، ایک چارپائے کا اور ایک بندر کا اور اس دور کے آخر میں وہ بندر کی اعلیٰ قسم گوریلا اور شمپازی کے جنین سے بالکل مشابہ ہوتا ہے۔

اس کے بعد دوسرے مہینے کے شروع میں ان تمام درجاتِ نباتاتی وحیوانی میں ایک ایسا عظیم الشان انقلاب پیدا ہوجاتا ہے کہ کل تک جو جنین حیوانات کی اعلیٰ قسم کے جنین کے مشابہ تھا یک بیک انسانی حقیقت میں تبدیل ہونے لگتا اور "ثُمَّ اَنْشَاْنٰہُ خَلْقًا اٰخَرَ" کا مظاہرہ کرکے اعلان کرتا ہے "فَتَبٰرَکَ اللّٰہُ اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ" اور پھر پورے سات مہینے تک اس جنین میں قدرت مختلف قسم کی نقاشیاں کرتی رہتی اور اس انسانی ڈھانچہ کو مکمل انسان بناتی رہتی ہے اور "جنینِ انسانی" میں جو انقلابِ حقائق ہوتا رہتا ہے اور وہ ادنیٰ حقیقت چھوڑ کر اعلیٰ حقیقت اختیار کرتا رہتا ہے اگر بعض مرتبہ قدرتِ الٰہی اپنے مصالح کی بنا پر "خَلْقًا اٰخَرَ" کا پورا مظاہرہ نہیں کرتی تو آپ سنتے ہیں کہ فلاں شخص کے ایسا بچہ پیدا ہوا ہے جو بیل یا بندر یا بن مانس کی شکل ہے بلکہ بعض مرتبہ بعینہ ان حیوانات کی ہی شکل کا بچہ عالمِ وجود میں آجاتا ہے تو یہ دلیل ہے اس امر کی کہ قدرت کی صناعی نے اس کو اس لیے ادھورا چھوڑ دیا اور مکمل انسانوں کی شکل میں اس حقیقت کو تبدیل نہیں کیا کہ چشمِ عبرت اس سے عبرت حاصل کرے اور خدا کا شکر ادا کرے کہ اس نے ہم کو انسان بنایا اور عقل وخرد عطا فرما کر کائنات سے ممتاز ومشرف فرمایا ورنہ خدا چاہتا تو ہم بھی رحمِ مادر میں اسی طرح ہوکر رہ جاتے۔ نیز اس حقیقت کی جانب بھی توجہ ہوسکے کہ خود انسان کا جنین بھی کن کن جامہائے حقائق کو ترک کرکے انسانی جامہ پہنتا اور تب "انسان" کہلانے کے قابل بنتا ہے۔

پس اگر تبدیلِ حقائق کا یہ مظاہرہ روز وشب کائناتِ بحر وبر میں ہوتا رہتا ہے تو اگر ایک انسان کے متعلق یہ ثابت ہوجائے کہ خاص حالات وتاثرات نے اس میں یہ ردِ عمل (ری ایکشن) پیدا کردیا کہ وہ انسانی شکل وصورت کو چھوڑ کر جو کہ اس کی تخلیق کا سب سے بلند اور آخری انقلاب تھا اپنی خلقت کے اس پچھلے درجہ میں منقلب ہوگیا جو کہ حیوانی شکل سے متعلق ہے تو عقل وفلسفہ کا کونسا نظریہ اس کی تردید کرسکتا ہے؟

بہرحال ایک حقیقت کا دوسری حقیقت اختیار کرلینا عقلاً کوئی مُستبعد بات نہیں ہے جو مسئلۂ مسخ پر وارد ہوسکے۔ البتہ یہ امر کہ یہ واقعہ درحقیقت پیش آیا یا نہیں، سو اس کا تعلق عقل سے

نہیں ہے بلکہ علم تاریخ اور نقل صحیح سے متعلق ہے اور جب کہ قرآن کے علم یقین نے اس واقعہ کا بصراحت اظہار کیا اور جمہور سلف وخلف اس واقعہ کی تفسیر میں مسخ حقیقی کا اعتراف کرتے چلے آتے ہیں تو محض اس لیے کہ عام طور پر ہم ایسے واقعات کا مشاہدہ نہیں کرتے اس حقیقت کا انکار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ کسی شے کے مشاہدہ نہ کرنے یا اس کے زیر نظر نہ آنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ واقعہ میں وہ شے موجود نہیں ہے یا نہیں ہو سکتی۔

علاوہ ازیں مشہور طبیب اور ماہر فن زکریا رازی نے جذام (LEDROSY) پر بحث کرتے ہوئے اس کی مختلف اقسام میں سب سے ردّی اور خراب قسم یہ بتائی ہے کہ جسم میں زہر پھیل کر خون اس درجہ فاسد ہو جاتا ہے کہ وہ اعصاب اور شرائین میں تشنج پیدا کر دیتا ہے اور اس کی وجہ سے مریض کا جسم ایک گھنونے اور مکروہ صورت بندر کی طرح نظر آنے لگتا ہے اور اس درجہ پہنچ کر مرض لاعلاج ہو جاتا ہے۔ زکریا نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ مرض جذام کے متعلق ان کی یہ تحقیق ذاتی کاوش کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اطبائے یونان اور قدیم اہل فن نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔

لہٰذا کیا عجب ہے کہ بنی اسرائیل کی اس جماعت پر خدائے تعالیٰ کا عذاب اس طرح نازل ہوا کہ ایک جانب تو ان کے قلوب مسخ ہو کر قلوب انسانی کے خواص سے محروم کر دیے گئے اور دوسری جانب ان کے جسم بدترین جذام کے ذریعہ اس درجہ خراب کر دیے گئے کہ وہ بندر اور خنزیر کی شکل میں تبدیل نظر آنے لگے "کُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ"

اور غالباً یہی وجہ ہے کہ صحیح احادیث میں یہ آتا ہے کہ جو قومیں حیوانات کی شکل میں مسخ ہوئی ہیں وہ تین دن سے زیادہ زندہ نہیں رہیں[1] یعنی مسخ کا عذاب ان کے اندر و ظاہر کو اس درجہ فاسد اور گندہ کر دیتا ہے کہ وہ پھر جانبر نہیں ہو سکتیں اور جلد ہی موت کی آغوش میں چلی جاتی ہیں

اس مقام پر یہ شبہ پیدا نہیں کرنا چاہیے کہ اگر مسخ کو معنیً اور صورتاً دونوں حیثیت سے تسلیم کر لیا جائے تو اس سے تناسخ (آواگون) لازم آجاتا ہے حالانکہ یہ باطل اور فاسد عقیدہ ہے، یہ شبہ اس لیے صحیح نہیں ہے کہ تناسخ میں روح (جیو) ایک قالب (کالبد) کو چھوڑ کر دوسرے قالب میں چلی جاتی ہے اور

[1] مسند احمد۔

انسانی اعمالِ نیک وبد کی پاداش میں جون بدلنے کا یہ سلسلہ ازل سے ابد تک یوں ہی قائم ہے اور رہے گا لیکن مسخ کی صورت میں نہ روح بدلتی ہے اور نہ قالب بدلتا ہے بلکہ وہی قالب (جسم) ایک خاص ہیئت اور حقیقت سے دوسری حقیقت وہیئت میں تبدیل ہو کر موت کی نذر ہو جاتا اور دوسرے مردہ انسانوں کی طرح مالکِ حقیقی کے سامنے اپنے اعمال کے جواب دہ ہونے کے لیے عالمِ برزخ کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔

**حضرت ابن عباسؓ اور عکرمہؓ کا مکالمہ**

عکرمہؓ جو حضرت عباس (رضی اللہ عنہما) کے شاگردِ رشید ذکی وفہیم اور جلیل القدر تابعی ہیں فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں ابن عباسؓ کی خدمت میں حاضر ہوا، دیکھا کہ اُن کی گود میں قرآنِ عزیز کھلا ہوا رکھا ہے اور ان پر گریہ طاری ہے یہ دیکھ کر کچھ دیر تو میں ان کی عظمت کی وجہ سے دُور بیٹھا رہا مگر جب اس حالت میں ان پر کافی وقت گزر گیا تو مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے قریب جا کر بعد سلام عرض کیا: اللہ تعالیٰ مجھ کو آپ پر قربان کرے یہ تو فرمائیے کہ آپ کس لیے اس طرح رو رہے ہیں؟ ابن عباسؓ فرمانے لگے میرے ہاتھ میں جو یہ ورق ہیں مجھ کو رُلا رہے ہیں، میں نے دیکھا تو سورۂ اعراف کے ورق تھے، پھر مجھ سے فرمایا تم ایلہ کو جانتے ہو؟ میں نے عرض کیا جانتا ہوں اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ اس بستی میں بنی اسرائیل رہتے تھے، ان کے یہاں سبت کے دن مچھلیاں پانی کی سطح پر آجاتی تھیں اور سبت کے بعد پانی کی تہ میں بیٹھ جاتی تھیں اور بمشکل ایک دو ہاتھ آتی تھیں، کچھ دن گزرنے پر شیطان نے ان میں سے بعض کو یہ سکھایا کہ اللہ تعالیٰ نے سبت میں مچھلی کھانے کو منع فرمایا ہے، مچھلی کے شکار کو نہیں منع فرمایا اس لیے انھوں نے یہ کیا کہ سبت کے دن خاموشی کے ساتھ مچھلیاں پکڑ لیتے اور دوسرے دن کھا لیتے[1]۔ جب یہ حیلہ عام ہو گیا تو اہلِ حق نے ان کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ سبت کے دن مچھلی پکڑنا، شکار کرنا اور کھانا سب منع ہے لہذا تم اس حیلہ جوئی کو چھوڑ دو ورنہ خدا کا عذاب تم کو برباد کر ڈالے گا۔ مگر جب انھوں نے نہ مانا تو اس دوسری جماعت میں سے ایک جماعت اگلے ہفتہ ان سے جدا ہو گئی اور وہ مع اپنے اہل وعیال ان سے دور جا بسے اور ایک جماعت نے سبت کی خلاف ورزی کو بُرا تو جانا مگر مخالفین کے ساتھ

[1] تفسیر ابن کثیر سورۂ اعراف۔ معلوم ہوتا ہے کہ اصحابِ حیل کے مختلف حیلوں میں سے ایک حیلہ یہ بھی تھا۔ مؤلف

ہی رہے سہے اور ان سے ترکِ تعلق نہیں کیا، چنانچہ داہنے بازو (ایمنون) یعنی ترکِ تعلق کرنیوالوں نے جب نافرمانوں کو ڈانٹا اور عذابِ الٰہی سے ڈرایا تو بایاں بازو (ایسرون) کہنے لگا: "لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمًا ۨ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ" تب (ایمنون) نے جواب دیا "مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ" بالآخر ایک روز امر بالمعروف کرنے والی جماعت نے مخالفین کو مخاطب کرکے کہا کہ یا تو تم باز آجاؤ ورنہ ہم یقین کرتے ہیں کہ کل تم پر ضرور کوئی عذاب نازل ہو کر رہے گا۔

اس کے بعد سرکشوں پر عذاب نازل ہونے کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے فرمایا اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ میں دو جماعتوں کے مآل اور انجام کا ذکر فرمایا ہے، ایک سرکش اور متمرد انسانوں کی جماعت جو ہلاک اور مسخ کردی گئی اور دوسری (ایمنون) امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرنے والی جماعت کہ اس نے نجات پائی اور عذاب سے محفوظ رہی۔ لیکن تیسری جماعت یعنی ساکتین (ایسرون) کا کوئی ذکر نہیں فرمایا اور میرے دل میں ان کے متعلق ایسے خیالات آتے ہیں کہ میں ان کو زبان سے کہنا پسند نہیں کرتا (یعنی امر بالمعروف ونہی عن المنکر سے چونکہ باز رہے اگرچہ خود خلاف ورزی کے مرتکب نہیں ہوئے لہٰذا وہ بھی کہیں عذاب کے تو مستحق نہیں قرار دیے گئے اور سرکشوں کے زمرہ میں تو داخل نہیں کرلیے گئے) تب میں نے عرض کیا: میں آپ پر فدا ہوجاؤں آپ اس بارہ میں اس قدر پریشان نہ ہوں بلاشبہ یہ تیسری جماعت بھی نجات پانے والوں میں ہی رہی اس لیے کہ خود قرآنِ عزیز ان کے متعلق یہ کہتا ہے کہ انھوں نے نصیحت کرنے والوں سے یہ کہا کہ تم ایسی جماعت کو کس لیے نصیحت کرتے ہو جس کی بداعمالیوں کی بنا پر خدائے تعالیٰ یا ان کو ہلاک کرنے والا ہے اور یا کسی سخت عذاب میں ڈالنے والا ہے" تو ان کے متعلق قرآنِ عزیز کی یہ تعبیر صاف صاف بتا رہی ہے کہ وہ ہلاک نہیں کیے گئے ورنہ تو اُن کا ذکر بھی ہلاک ہونے والوں ہی کے ساتھ کیا جاتا نجات پانے والوں کے ساتھ نہ ہوتا، نیز یہ جماعت اس عملِ بد کے بدکرداروں کی حرکات سے مایوس ہو کر ایسا کہتی تھی اس لیے بھی مستحقِ عذاب نہیں ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے یہ سُنا تو بیحد مسرور ہوئے اور آیات کی اس تفسیر پر مجھ کو خلعت بخشا۔

مسخ شدہ اقوام کا انجامِ دنیوی | جو قومیں خدائے تعالیٰ کے عذاب سے مسخ کردی جاتی ہیں وہ زندہ باقی نہیں رکھی جاتیں بلکہ تین دن کے اندر اندر اُن کو فنا کر دیا جاتا ہے تاکہ ان کی نسل کا سلسلہ جاری نہ ہو اور دنیا میں ان کا وجود خود اُن کے لیے بھی عرصہ تک باعثِ ذلّت و خواری نہ رہے چنانچہ صحیح روایات میں یہ بصراحت موجود ہے :-

| | |
|---|---|
| عن ابن مسعود قال سألنا رسول الله صلى الله عليه وسلم عن القردة والخنازير من نسل اليهود فقال لا ان الله لم يلعن قوماً قط فمسخهم فكان لهم نسل ولكن هذا خلق كان فلما غضب الله على اليهود فمسخهم جعلهم مثلهم[1] | حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم نے دریافت کیا کہ یہ بندر و خوک مسخ شدہ یہود کی نسل میں سے ہیں؟ آپ نے فرمایا نہیں، اللہ تعالیٰ جب کسی قوم پر مسخ کی لعنت مسلط کرتا ہے تو اس کی نسل نہیں چلاتا۔ لیکن یہ جانور خدا کی مستقل مخلوق ہیں۔ لہٰذا جب خدا کا غضب یہود پر نازل ہوا تو ان کو ان جانوروں کی شکل میں مسخ کر دیا گیا۔ |

اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں :-

| | |
|---|---|
| لم يمسخ قوماً فيجعل لهم نسلاً ولا عقباً وان القردة والخنازير كانت قبل ذلك[2] | اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کو مسخ کرتا ہے تو نہ ان کو باقی چھوڑتا ہے اور نہ اُن کی نسل چلتی ہے اور بندر اور خوک تو مسخ کے واقعہ سے قبل بھی موجود تھے۔ |
| عن ابن عباس قال لم يعش مسخ قط فوق ثلثة ايام ولم يأكل ولم يشرب ولم ينسل[3] | حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ مسخ شدہ انسان تین دن سے زیادہ زندہ نہیں رہے اور نہ انھوں نے اس درمیان میں کھایا پیا اور نہ ان کی نسل کا سلسلہ چلا۔ |

بصائر | (۱) "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" عظیم الشان فریضہ ہے اور انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصدِ عظیم بھی اسی فرض کو پورا کرنا ہے اور جب کسی قوم اور اُمت میں کوئی نبی یا رسول موجود نہ ہو تو پھر علماءِ اُمت کے ذمہ واجب ہے کہ وہ اس فرض کو انجام دیں۔ چنانچہ قرآنِ عزیز

[1] مسند احمد، ابو داؤد طیالسی، مسلم [2] مسند احمد، ابو داؤد طیالسی، مسلم [3] ابن کثیر ج ۱۔

اور صحیح احادیث نے بھی اُمتِ مرحومہ کو اس فرض کی جانب بہت زیادہ اہمیت کے ساتھ توجہ دلائی ہے اور تعمیل کرنے والے کو اجر و ثواب کی بشارت اور ترک کرنے والے کو مستحق عقاب و وعید قرار دیا ہے:

| | |
|---|---|
| كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (الآیہ) آلِ عمران | تم دنیا کی بہترین امت ہو جو کائنات انسانی کے لیے پیدا کی گئی ہے تاکہ ان کو بھلی باتوں کا حکم کرو اور بُری باتوں سے باز رکھو۔ |
| لُعِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ عَلَىٰ لِسَانِ دَاوُودَ وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ ذَٰلِكَ بِمَا عَصَوا وَّكَانُوا يَعْتَدُونَ كَانُوا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُنْكَرٍ فَعَلُوهُ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ (مائدہ پ ع) | بنی اسرائیل میں سے جنھوں نے کفر اختیار کیا ان پر داؤد اور عیسیٰ ابن مریمؑ کی زبانی لعنت کی گئی اس لیے کہ وہ نافرمانی کرتے اور خدا کی حدود سے تجاوز کرتے تھے، وہ بُری باتوں سے لوگوں کو نہیں روکتے تھے اور ان کے یہ کردار بہت ہی بُرے تھے۔ |
| عن عدی بن عمیرة یقول سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ لایعذب العامة بعمل الخاصة حتی یروا المنکر بین ظهرانیهم وهم قادرون علی ان ینکروه فلا ینکرونه فاذا فعلوا ذٰلك عذب اللہ الخاصة والعامة۔ | عدی بن عمیرہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے: بلاشبہ اللہ تعالیٰ خاص خاص لوگوں کی بداعمالیوں پر عام لوگوں پر عذاب نازل نہیں کرتا البتہ جب ان لوگوں کے سامنے کہ جو ان برائیوں کے روکنے پر قدرت رکھتے ہیں علی الاعلان معاصی ہونے لگیں اور وہ نہ روکیں تو بے شک اس وقت خدا اپنا عذاب عام و خاص سب پر نازل کر دیتا ہے۔ |
| عن ابی سعید الخدری ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال من رأی المنکر فلیغیره بیده ومن لم یستطع | حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص کسی کو بُرا عمل کرتا دیکھے تو اس کو چاہیے کہ ہاتھ سے روک دے اور جو |

| | |
|---|---|
| فبلسانہ ومن لم یستطع | اس کی طاقت نہ رکھتا ہو وہ زبان سے روکے اور جو اس کی بھی |
| فبقلبہ وذٰلک اضعف | طاقت نہ رکھتا ہو وہ دل ہی میں اس کو بُرا جانے اور یہ |
| الایمان۔ | ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے۔ |

حضرت ابوسعید خدری (رضی اللہ عنہ) کی حدیث اس جانب بھی توجہ دلاتی ہے کہ مسلمانوں میں اتنی قوت اور حاکمانہ اقتدار ضرور ہونا چاہیے کہ وہ اگر کسی کو برے عمل اور بدکرداری میں مبتلا دیکھیں تو طاقت وقوت سے اس کو روک دیں اور اگر انھوں نے یہ درجہ اپنی کوتاہیوں کی بدولت کھو دیا ہے تو اس درجہ قوتِ ایمانی ضروری ہے کہ وہ زبان سے اس عملِ بد کے خلاف جہاد کر سکے اور اگر اس درجہ سے بھی محروم ہے تو اس کے بعد سوائے اس کے ایمان کا کوئی اور درجہ نہیں کہ وہ کم از کم اس عملِ بد کو بُرا سمجھے اور اس پر اظہارِ رضا نہ کرے۔ لہٰذا اس حدیث کے الفاظ سے کسی کو یہ شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ جب ایک شخص کو پہلا یا دوسرا درجہ حاصل ہی نہیں تو پھر دوسرا یا تیسرا جو درجہ بھی حاصل ہے اس کے اختیار کر لینے پر وہ ضعیف یا اضعف الایمان کیوں قرار پاتا ہے۔

(۲) انسان کی مختلف گمراہیوں میں سے بہت بڑی گمراہی یہ بھی ہے کہ احکامِ الٰہی سے بچنے کے لیے حیلے اور بہانے تراش کر حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنانے کی سعی کرے کیوں کہ اس طرح وہ شریعتِ حقہ کے اوامر و نواہی کو مسخ کرنے کا مرتکب ہوتا ہے۔ قرآن اور توراۃ دونوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود اس گمراہی میں بھی پیش پیش اور اس اقدام پر بہت جری تھے اور اسی لیے ان پر مسخ کا عذاب نازل ہوا۔ چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے بیان کردہ اس واقعہ کی روشنی میں امتِ مرحومہ کو سخت تاکید فرمائی ہے کہ وہ ایسی گمراہی پر ہرگز اقدام نہ کریں اور اپنا دامنِ عمل اس سے بچائے رکھیں:۔

| | |
|---|---|
| عن ابی ھریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ | رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایسی گمراہی کا ہرگز |
| علیہ وسلم قال لا ترتکبوا ما ارتکبت | ارتکاب نہ کرنا جس کا یہود نے ارتکاب کیا کہ اللہ کی |
| الیھود فتستحلوا محارم اللہ | حرام کی ہوئی باتوں کو معمولی حیلوں کے ذریعہ حلال |

بادنی الحیل [۱]  کر لیتے تھے (حالانکہ وہ حلال نہیں ہو جاتی تھیں)

مگر افسوس کہ ہم نے آج اس کو بھی اپنا لیا اور یہود کی طرح ہم نے بھی اللہ کے فرائض سے بچنے کے لیے حیلے تراش لیے مثلاً ایسے تموّل اور سرمایہ داری کے باوجود کہ جس پر خدا کا حکم "وَاٰتُوا الزَّکوٰۃَ" وارد ہوتا صرف زکوٰۃ سے بچنے کے لیے یہ حیلہ نکال لیا کہ اس سرمایہ پر پورا ایک سال اپنی ملکیت نہ ہونے دیا جائے تاکہ "حولانِ حول" کی شرط پوری نہ ہونے پائے اور چھ ماہ بعد اس کو اپنی بیوی کے نام منتقل کر دیا اور اس سلسلہ کو برابر جاری رکھا اور اس طرح اَلَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّۃَ کا لطف اُٹھاتے رہے (اَعَاذَنَا اللہُ مِنْ ذٰلِکَ)

البتہ فقہائے امت نے حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنانے کی غرض سے نہیں بلکہ اُمت کو کسی ضیق اور تنگی سے نکالنے کے لیے استنباط اور اجتہادِ صحیح کے ذریعہ جو بعض آسانیاں بہم پہنچائیں اور جو دراصل صاحب شریعت کے اوامر و نواہی کے مقاصد کو فوت نہیں ہونے دیتیں تو وہ اس وعید کا مصداق نہیں ہیں مگر ان مسائل کے لیے "کتاب الحیل" کی تعبیر صحیح نہیں ہے بلکہ ان کا عنوان..... "کتاب التسہیل" ہونا چاہیئے تھا۔

(۳) قرآنِ عزیز کے مطالعہ سے بہ آسانی معلوم ہو سکتا ہے کہ خدائے تعالیٰ کی حکمت کا تقاضہ یہ ہے کہ ہمیشہ "پاداشِ عمل از جنسِ عمل" ہو جیسا کہ مسئلۂ زیرِ بحث میں بھی موجود ہے کہ اصحابِ سبت نے حیلوں اور بہانوں کے ذریعہ سبت کے قانون کو مسخ اور محرّف کر دیا تھا لہٰذا ان کے لیے سزا بھی "مسخ" ہی تجویز کی گئی، حافظ ابن کثیر اس حقیقت کا اظہار اس طرح فرماتے ہیں :-

| | |
|---|---|
| فلما فعلوا ذلک مسخھم اللہ الی صورۃ | پس جب یہود نے یہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو بندروں کی |
| القردۃ وھی اشبہ شیئ بالاناسی فی شکل | شکل میں مسخ کر دیا اور یہ اس لیے کہ ظاہر شکل میں بندر |
| الظاھر ولیست بانسان حقیقۃ فلذلک | انسان سے زیادہ مشابہ ہے اگرچہ حقیقت میں وہ انسان |
| اعمال ھؤلاء وحیلتھم لما کانت مشابھۃ | نہیں ہے پس جب کہ ان یہود کے یہ اعمالِ بد اور حیلے ظاہر میں |
| للحق فی الظاھر ومخالفۃ فی الباطن کان | حق کے مشابہ اور باطن میں اس کے مخالف ہیں تو انکو سزا بھی |

جزاء ھم من جنس العمل[1] جنسِ عمل ہی سے دی گئی ہے۔

(۴) اداءِ فرض میں اس کی پرواہ نہیں کرنی چاہیے کہ جن کے مقابلہ میں فریضہ ادا کیا جارہا ہے وہ اس کو قبول کرتے ہیں یا نہیں اس لیے کہ اس کا اداءِ فرض کی جزاء میں یہ کیا کم سعادت ہے کہ وہ شخص بہرحال اجر و ثواب اور رضاءِ الٰہی سے معزز و مفتخر ہوتا ہے۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ○



---

[1] تفسیر ابن کثیر۔

# اصحابُ الرسّ

## تقریباً سنہ ۶۳۰ ق م (یا مدت نامعلوم)

رسّ ۔ قرآنِ عزیز اور اصحاب الرس ۔ اصحاب الرّس؟ قولِ راجح ۔ موعظت

**رسّ** لغت میں "رسّ" کے معنی پُرانے کنوئیں کے ہیں اس لیے اصحاب الرس کے معنی ہوئے "کنوئیں والے" قرآنِ عزیز نے اس نسبت کے ساتھ ایک قوم کی نافرمانی اور سرکشی کی پاداش میں اس کی ہلاکت و بربادی کا ذکر کیا ہے ۔

**قرآنِ عزیز اور اصحابُ الرس** قرآنِ عزیز نے سورۂ فرقان اور "ق" میں ان کا ذکر کیا ہے اور جن قوموں نے انبیاء علیہم السلام کی تکذیب و استہزاء کے سبب ہلاکت و تباہی مول لی انکی فہرست میں صرف ان کا نام بیان کر دیا ہے اور حالات و واقعات سے کوئی تعرض نہیں کیا:

| | |
|---|---|
| وَعَادًا وَّثَمُوْدَ وَاَصْحٰبَ الرَّسِّ | اور عاد اور ثمود اور اصحاب الرس کو اور ان کے درمیانی |
| وَقُرُوْنًاۢ بَيْنَ ذٰلِكَ كَثِيْرًا وَكُلًّا | زمانہ کی بہت سی (قوموں) کو (ہم نے ہلاک کر دیا) اور ہم |
| ضَرَبْنَا لَهُ الْاَمْثَالَ وَكُلًّا تَبَّرْنَا | نے ہر ایک کے واسطے مثالیں بیان کیں اور ہم نے ان |
| تَتْبِيْرًا (فرقان پ ع) | سب کو ہلاک کر دیا ۔ |
| كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّ | ان سے پہلے بھی نوحؑ کی قوم نے اور کنوئیں والوں نے |
| اَصْحٰبُ الرَّسِّ وَثَمُوْدُ وَعَادٌ وَّ | اور ثمود، عاد، فرعون، برادرانِ لوطؑ، اصحاب ایکہ |
| فِرْعَوْنُ وَاِخْوَانُ لُوْطٍ وَّ | اور تبع کی قوم نے رسولوں کو جھٹلایا، ان میں سے |

أَصْحٰبُ الْأَيْكَةِ وَقَوْمُ تُبَّعٍ كُلٌّ كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ وَعِيْدِ ۝ ہرایک نے رسولوں کو جھٹلایا پس

(ق پ ۲۶) اُن پر عذاب لازم ہوا۔

**اصحاب الرس** ان کو اصحاب الرس کیوں کہتے ہیں؟ اس کے جواب میں علمائے تفسیر کے اقوال اس درجہ مختلف ہیں کہ حقیقتِ حال بجائے منکشف ہونے کے اور زیادہ مستور ہوگئی ہے۔

(۱) ابن جریرؒ کی رائے یہ ہے کہ چونکہ رس کے معنی "غار" کے بھی آتے ہیں اس لیے اصحابِ اخدود (گڑھوں والے) ہی کو اصحاب الرس بھی کہتے ہیں۔

لیکن یہ اس لیے صحیح نہیں ہے کہ سورۂ ق میں اصحاب الرس کا ذکر ان قوموں کے ساتھ کیا گیا ہے جو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) سے قبل ہو گزری ہیں اور سورۂ فرقان میں عاد، ثمود اور اصحاب الرس کا ذکر کرنے کے بعد کہا گیا ہے۔ "وَقُرُوْنًا بَيْنَ ذٰلِكَ كَثِيْرًا" اور ان کے درمیانی زمانہ کی بہت سی قوموں کو ہلاک کر دیا" اس کا تقاضا یہ ہے کہ اصحاب الرس کا زمانہ کم از کم حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) سے قبل ہونا چاہیے اور اصحاب الاخدود کا زمانہ عیسیٰ (علیہ السلام) سے صدیوں بعد ہے۔ علاوہ ازیں قرآن کے ان بیانات میں تصریح ہے کہ اصحاب الرس ہلاک شدہ قوموں میں سے ہیں اور اصحاب الاخدود کے متعلق قولِ صحیح یہ ہے کہ وہ اپنے مشہور ظلم کے بعد فوراً ہلاک نہیں کیے گئے اور ان کو مہلت اور ڈھیل دی گئی کہ وہ باز آجائیں ورنہ پاداشِ عمل کے لیے تیار رہیں جیسا کہ عنقریب واقعہ کی تفصیل سے ظاہر ہو جائے گا۔

(۲) ابن عساکر نے تاریخ میں اپنا رجحان اس روایت کی جانب ظاہر کیا ہے کہ اصحاب الرس عاد سے بھی صدیوں پہلے ایک قوم کا نام ہے یہ جس جگہ آباد تھے وہاں اللہ تعالیٰ نے ایک پیغمبر حنظلہ بن صفوان کو مبعوث کیا تھا انھوں نے ان میں رہ کر تبلیغ اسلام کی مگر اصحاب الرس نے کسی طرح حق کو قبول نہیں کیا اور پیغمبرِ خدا کو قتل کر دیا اس پاداش میں وہ سب ہلاک کر دیے گئے[1]۔

لیکن اس روایت سے یہ بات صاف نہیں ہوتی کہ اُن کو "کنوئیں والے" کیوں کہا گیا اور یہ نسبت واقعہ کے ساتھ کیا تعلق رکھتی ہے؟

(۳) ابن ابی حاتم بروایت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) نقل کرتے ہیں کہ آذربیجان کے قریب ایک کنواں تھا یہ قصہ چونکہ اس سے تعلق رکھتا ہے اس لیے وہاں کے بسنے والوں کو اصحاب الرس کہتے ہیں۔ عکرمہؓ کہتے ہیں کہ اس کنوئیں کے قریب آباد قوم نے اپنے نبی کو چونکہ مسطورۂ بالا کنوئیں میں ڈال کر زندہ دفن کر دیا تھا اس لیے ان کو "اصحاب الرس" کہا گیا۔[1]

(۴) اور قتادہ کہتے ہیں کہ یمامہ کے علاقہ میں فلج نام کی ایک بستی تھی اصحاب الرس وہیں آباد تھے اور یہ اور اصحاب یٰسین (اصحاب القریہ) ایک ہی ہیں اور یہ مختلف نسبتوں سے پکارے جاتے ہیں۔[2] ایک روایت عکرمہؓ سے بھی اس کی تائید میں موجود ہے لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ ابن ابی حاتم اور عکرمہ دونوں کی روایت کا ایک ہی مطلب ہے مگر یہ دونوں رائیں بھی مشکوک ہیں اس لیے کہ قرآن عزیز نے اصحاب القریہ (اصحاب یاسین) اور اصحاب الرس کا تذکرہ جدا جدا کیا ہے اور دونوں تذکروں میں کسی ایک جگہ بھی یہ اشارہ نہیں ہے کہ یہ دونوں ایک ہیں۔ حالانکہ یہ طرزِ بیان، اصولِ بلاغت کے خلاف ہے کہ ایک ہی معاملہ کو جدا جدا نسبتوں اور کیفیتوں کے ساتھ بیان کیا جائے اور ان میں سے کسی ایک میں بھی یہ اشارہ موجود نہ ہو کہ یہ مختلف نسبتیں اور تعبیریں ایک ہی معاملہ سے تعلق رکھتی ہیں اور نہ نبی معصوم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے ایسی کوئی تفسیر مذکور ہے جو دونوں کو ایک ظاہر کرتی ہو۔ خصوصاً جب کہ قرآئن یہ بتا رہے ہیں کہ اصحاب الرس کا معاملہ قبل مسیح علیہ السلام ہے اور تاریخ اور تحقیق یہ ثابت کر چکی ہے کہ اصحاب القریہ کا معاملہ مسیح علیہ السلام کے بہت بعد کا ہے۔[3]

(۵) ابوبکر عمر بن حسن نقاش اور سہیلی کہتے ہیں کہ اصحاب الرس کی آبادی میں ایک بہت بڑا کنواں تھا جس کے پانی سے وہ پینے اور کھیتی سیراب کرنے دونوں کا کام لیتے تھے۔ اس بستی کا بادشاہ بہت عادل تھا اور لوگ اس سے بے حد محبت کرتے تھے، اس کا جب انتقال ہوگیا تو اہلِ شہر اس کی موت سے سخت غمگین اور حزین تھے کہ ایک دن شیطان بادشاہِ عادل کی شکل بنا کر پہنچا اور اہلِ شہر کو جمع کر کے تقریر کی کہ میں تم سے کچھ دنوں کے لیے جدا ہو گیا تھا مرا نہیں تھا اب آگیا ہوں اور ہمیشہ زندہ رہوں گا۔ لوگوں نے انتہاءِ محبت میں یقین کر لیا اور اس کی آمد پر جشن منایا تب

[1] تفسیر ابن کثیر سورۂ فرقان و تاریخ ابن کثیر ج ۱ [2] ایضاً [3] یہ بحث عنقریب آنے والی ہے۔

شیطان نے ان کو حکم دیا کہ وہ ہمیشہ مجھ سے پسِ پردہ باتیں کیا کریں، چنانچہ اس کے حکم کی تعمیل کی گئی اور وہ پسِ پردہ بیٹھ کر گمراہی پھیلانے لگا۔ اس وقت بقول سہیلی صاحب "روض الانف" ایک شخص حنظلہ بن صفوان کو خواب میں یہ بتایا گیا کہ ان کو اس آبادی میں راہِ ہدایت دکھانے کے لیے پیغمبر بنا دیا گیا، صفوان نے ان کے پاس جاکر توحید کی تعلیم اور شرک سے اجتناب کی تلقین کی اور بتایا کہ یہ تمھارا بادشاہ نہیں ہے بلکہ پسِ پردہ شیطان ہے لوگوں کو یہ بات سخت ناگوار گزری اور قبولِ حق کی بجائے پیغمبرِ خدا پر حملہ کرکے ان کو قتل کر دیا۔ اس پاداش میں ان کو خدا کے عذاب نے تباہ و برباد کر دیا اور کل جس بستی میں چہل پہل تھی اور باغات اور نہروں سے جنگل میں منگل ہو رہا تھا آج وہ جل بھن کر چٹیل میدان نظر آنے لگا جس میں کتوں بھیڑیوں اور شیروں کے مسکن کے سوا کچھ باقی نہ رہا۔

یہ روایت اصولِ روایت و درایت دونوں اعتبار سے ساقط الاعتبار ہے اور من گھڑت داستان سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔[1]

(۶) محمد بن کعب قرظیؒ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ان اول الناس یدخل الجنۃ یوم القیٰمۃ العبد الاسود" (جنت میں سب سے پہلے جو شخص داخل ہوگا وہ ایک سیاہ غلام ہوگا) اور یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک بستی میں اپنا پیغمبر بھیجا مگر اس کالے کلوٹے غلام کے علاوہ کسی نے اس کو قبول نہیں کیا اور کوئی ایمان نہیں لایا، پھر اہلِ شہر نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ نبی کو ایک کنوئیں میں بند کر دیا اور کنوئیں کے منہ پر بہت بھاری پتھر رکھ دیا تاکہ کوئی کھول نہ سکے مگر یہ سیاہ فام غلام جنگل سے لکڑیاں لاتا، بازار میں فروخت کرتا اور ان کی قیمت سے کھانا خرید کر روزانہ کنوئیں پر پہنچ کر پتھر کو ہٹاتا اور خدا کے پیغمبر کی خدمت میں کھانا پیش کرتا تھا، کچھ دنوں کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس پر جنگل میں نیند طاری کر دی اور یہ چودہ سال تک اسی حالت میں پڑا رہا۔ یہاں تک تو یہ ہوا اور اُدھر قوم کو اپنی نازیبا حرکت پر افسوس آیا اور انھوں نے پیغمبرِ خدا کو کنوئیں سے نکال لیا اور توبہ کے بعد ایمان قبول کر لیا اور اسی مدت کے اندر پیغمبر کا انتقال ہو گیا۔ چودہ سال کے بعد جب غلام کی آنکھ کھلی تو اس نے سمجھا کہ میں چند گھنٹے سویا ہوں جلدی سے لکڑیاں چن کر شہر پہنچا دیکھا تو حالات بدلے ہوئے ہیں دریافت کیا تو

[1] تفسیر ابن کثیر سورۂ فرقان، البدایہ والنہایہ ج ۱۔

سارا قصہ معلوم ہوا۔ اسی غلام کے متعلق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جنت میں سب سے پہلے ایک سیاہ فام غلام جائے گا۔[۱]

یہ روایت اپنی سند کے لحاظ سے بھی قابلِ جرح ہے اور درایت کے اعتبار سے بھی، چنانچہ محدثین کہتے ہیں کہ یہ طویل داستان خود محمد بن کعب کی جانب سے ہے جس کو انھوں نے اسرائیلیات سے اخذ کر کے بیان کیا ہے، نبی معصوم صلی اللہ علیہ وسلم کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔[۲] علاوہ ازیں قرآنِ عزیز میں صراحت کے ساتھ موجود ہے کہ اصحاب الرس بھی ہلاک شدہ قوموں میں سے ہیں اور یہ روایت اس کے خلاف اُن کو نجات یافتہ بیان کرتی ہے اس لیے قطعاً غلط ہے اور روایت کا وہ جملہ جو قوسین میں "عبدِ اسود" سے متعلق ہے اگر بسندِ صحیح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت بھی ہو جائے تو بھی اس کا اصحاب الرس کے واقعہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ابن جریرؒ نے بھی اس روایت کو نقل کرنے کے بعد اس پر اسی قسم کی جرح وارد کی ہے۔

(۷) مشہور مؤرخ مسعودی کہتا ہے کہ اصحاب الرس حضرت اسمٰعیل (علیہ السلام) کی اولاد میں سے ہیں اور یہ دو قبیلے تھے، ایک قیدماں (قیدماہ) اور دوسرا یامین یا رعویل اور یہ یمن میں آباد تھے۔

لیکن مسعودی نے صرف اسی قدر تعارف پر اکتفا کیا ہے اور تاریخی حیثیت سے نہیں بتایا کہ وہ کن وجوہ کی بنا پر قیدماہ اور رعویل کو اصحاب الرس کہتا ہے اور ان کو "رس" کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ یہ صحیح ہے کہ حضرت اسمٰعیل (علیہ السلام) کے بارہ بیٹوں میں سے ایک کا نام قیدماہ بھی ہے۔ لیکن توراۃ اور تاریخ دونوں اس بات سے خاموش ہیں کہ اس کی اولاد کو اصحاب الرس بھی کہا جاتا ہے۔ لہٰذا مسعودی کا قول دلیل کا محتاج ہے۔

مگر صاحب ارض القرآن نے صرف اس بنا پر کہ مسعودی نے اپنی رائے تذبذب اور تردد کے ساتھ بیان نہیں کی اسی قول کو ترجیح دی ہے۔[۳]

(۸) مصر کے ایک مشہور معاصر عالم فرج اللہ زکی کردی کہتے ہیں کہ لفظِ "رس" "ارس" کی تخفیف ہے،

---

[۱] مروج الذہب ص ۸۶ [۲] حاشیہ الکامل ج ۱ [۳] ارض القرآن ج ۲ ص ۵۶۔

اور یہ اس مشہور شہر کا نام ہے جو قفقاز کے علاقہ میں واقع ہے۔ اس وادی ارس میں اللہ تعالیٰ نے ایک نبی کو مبعوث فرمایا جس کا نام ابراہیم زردشت تھا انھوں نے اپنی قوم کو دینِ حق کی دعوت دی مگر قوم نے انکار کیا اور ان کی دعوت وارشاد کے مقابلہ میں اور زیادہ سرکشی اور بغاوت اختیار کر لی، چنانچہ قوم نے اس کی سزا پائی اور ہلاک کر دی گئی۔ اس کے بعد اُن کی دعوت کا میدانِ عمل اس مخصوص علاقہ قفقاز (آذر بائجان وغیرہ) سے کل ایران تک وسیع ہوگیا' زردشت' کا صحیفہ اگرچہ محرف ہو چکا ہے مگر اس کا ایک حصہ اب بھی قدیم فارسی میں مکتوب موجود ہے[1] اور اس صحیفہ میں اب بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور دینِ اسلام کی بشارت کا ذکر پایا جاتا ہے جس کا مفہوم یہ ہے:

عنقریب عرب میں ایک "نبی عظیم" مبعوث ہوگا اور جب اس کی شریعت پر ایک ہزار سال سے زیادہ عرصہ گزر جائے گا اور دوسرا ہزار شروع ہوگا تو اس دین میں ایسی باتیں پیدا ہو جائیں گی کہ یہ پہچاننا مشکل ہو جائے گا کہ کیا یہ دین وہی دین ہے جو اپنے قرنِ اول میں تھا یعنی بدعات واہوا اور رسومِ قبیحہ پیدا ہو جائیں گی)

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ زردشت کی اصل اور حقیقی تعلیم "حق" تھی اور اسی لیے انھوں نے بعثتِ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بشارت دی اور بعض ایسی تفصیلات کا بھی ذکر کیا جو آج حرف بحرف صحیح ثابت ہو رہی ہیں مگر دوسرے ادیان وملل کی طرح ان کے متبعین نے بھی اس تعلیمِ حق کو مسخ و محرف کر ڈالا' ان کے متبعین مجوس (پارسی) اب بھی ایران و ہندوستان میں پائے جاتے ہیں[2]

علامہ زکی کے اس قول کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ کتبِ تفسیر میں ایک قول ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی منقول ہے کہ اصحاب الرس آذربیجان کے قریب ایک کنوئیں کی نسبت سے مشہور تھے لہٰذا ممکن ہے کہ یہ "نہر ارس" ہی سے مراد ہو اور ابن کثیر میں ہے۔

| | |
|---|---|
| واصحاب الرس قال | بعض مفسرین کہتے ہیں کہ آذربیجان میں ایک پرانا کنواں "رس" تھا |
| بئر باذربیجان | اس وادی میں رہنے والے اسی وجہ سے اصحاب الرس کہلاتے تھے |

[1] اوستا کی جانب اشارہ ہے۔ [2] حاشیہ تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۴۳-۴۲ مختصراً۔

بلکہ خود ابن کثیر (رحمۃ اللہ) نے اپنی تفسیر میں اس آیت "اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَیُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّفَرِّقُوْا بَیْنَ اللّٰہِ وَرُسُلِہٖ"[1] کے تحت میں زردشت کے متعلق یہ تحریر فرمایا ہے:

| | |
|---|---|
| والمجوس یقال انھم کانوا یومنون | اور مجوس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے اندر مبعوث |
| بنبی لھم یقال لہٗ زرداشت | پیغمبر زردشت پر اوّل ایمان لے آئے تھے اس کے بعد |
| ثم کفروا بشرعہ فرفع من بین | انھوں نے کفر کی راہ اختیار کرلی۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس |
| اظھرھم[2] واللہ اعلم۔ | پیغمبر کو ان کے درمیان سے اٹھالیا۔ واللہ اعلم۔ |

ادیان وملل کی تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ابراہیم زردشت کی اصل تعلیم انبیاء کرام علیہم السّلام کی تعلیمِ حق ہی کے مطابق تھی اور وہ یرمیاہ (علیہ السّلام) یا دانیال (اکبر) علیہ السّلام کے تلمیذ اور فیض یافتہ تھے ذوالقرنین کے واقعہ میں انشاء اللہ تعالیٰ قدرے تفصیل سے اس پر روشنی ڈالی جائے گی۔

قولِ فیصل | اس مسئلہ میں قرآن کا ظاہر یہ ثابت کرتا ہے کہ یہ واقعہ یقیناً حضرت مسیح علیہ السّلام سے قبل ہو گزرا ہے۔ اب رہا یہ امر کہ یہ حضرتِ موسیٰ (علیہ السّلام) اور حضرت عیسیٰ (علیہ السّلام) کے درمیان کے زمانہ کی کسی قوم کا تذکرہ ہے یا کسی قدیم العہد قوم کا تو قرآن نے اس سے تعرض نہیں کیا اور مسطورۂ بالا تفسیری روایات سے اس کا قطعی فیصلہ ناممکن ہے البتہ میرا وجدان آخری قول کو راجح سمجھتا ہے۔

بہرحال قرآن کا جو مقصدِ موعظت و عبرت ہے وہ اپنی جگہ صاف اور واضح ہے اور یہ تاریخی تعینات و مباحث اس کے لیے موقوف علیہ نہیں ہیں بلکہ ایک عبرت نگاہ اور گوشِ حق نیوش کیلیے یہ کافی وشافی ہے کہ جو قومیں اس دنیا میں خدائے برتر کے پیغامِ حق کو ٹھکراتی اور اس کے خلاف بغاوت و سرکشی کا علَم بلند کرتی ہیں اور مسلسل مہلت اور ڈھیل دینے کے باوجود وہ اپنی متکبرانہ اور مفسدانہ زندگی کو ترک کرکے صالح اور پاک زندگی بسر کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتیں تو پھر ان پر خدائے تعالیٰ کی سخت گرفت "بطشِ شدید" آجاتی ہے اور وہ بے یار و مددگار ہلاک و برباد کردی جاتی ہیں۔

---

[1] نساء۔ [2] تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۵۵۲۔

**موعظت** کائناتِ انسانی کے پاس جس وقت سے اپنی تاریخ کا ذخیرہ موجود ہے وہ اس حقیقت سے بخوبی آشنا ہے کہ دنیا کی جس قوم نے بھی خدا کے پیغامِ حق کے ساتھ استہزاء کا معاملہ کیا اور خدا کے پیغمبروں اور ہادیوں کے ساتھ سرکشی اور شرارت کو جائز رکھا ان کی زبردست طاقت و شوکت اور عظیم الشان تمدن کے باوجود قدرت کے ہاتھوں نے ہلاک و برباد کرکے ان کا نام و نشان تک مٹا دیا اور آسمانی یا زمینی عبرتناک عذاب نے صفحۂ عالم سے ان کو حرفِ غلط کی طرح محو کر دیا مگر یہ عجیب بات ہے کہ اپنے پیشرووں کے ہیبت ناک انجام کو دیکھنے اور سننے کے باوجود اُن کی وارث قوموں نے پھر تاریخ کو دہرایا اور اسی قسم کی حرکات کو اختیار کیا جن کے انجام میں ان کے پیشرووں کو روزِ بد دیکھنا پڑا تھا "اِنَّ هٰذَا الشَّيْءُ عَجِيْبٌ"

(۲) ایک حساس دل و دماغ کے لیے یہ تازیانۂ عبرت کافی ہے کہ اس دنیا میں جب کہ کسی شے کو بقا نہیں ہے اور ہر شے کے لیے فنا لازم تو پھر کبر و نخوت اور انانیت کے کیا معنی؟ اور جو مقدس ہستیاں اپنے اوصافِ کریمانہ اور اخلاقِ حسنہ کے ساتھ خدمتِ خلق اور ہدایت و رشد کو بغیر کسی دنیوی لالچ و توقع کے انجام دیتی ہیں ان کے ساتھ تحقیر و تضحیک کا برتاؤ عقل کے کس فیصلہ کے مطابق ہے؟

اگر انسان اس زندگی میں ان دو حقیقتوں کی معرفت حاصل کرے تو حیاتِ ابدی و سرمدی میں کبھی ناکام نہیں رہ سکتا اور یہی وہ رموزِ زندگی ہیں جن پر گامزن ہو کر تو میں "اصحاب الجنۃ" کہلائیں اور ان سے غافل رہ کر "اصحٰب النار" کہلانے کی سزاوار ہوئیں۔



# بیتُ المقدِس اور یہُود

## ۶۰۴ سنہ ق م تا سنہ ۵۶۱ ق م و سنہ ۷۰ء تا ۱۸ سنہ

تمہید - بیت المقدس (یروشلم) قرآنِ عزیز اور شرارتِ یہود کے دو اہم معاملے
شرارتِ یہود کا پہلا دور - غلامی کے بعد نجات - شرارتِ یہود کا دوسرا دور -
حضرتِ یحییٰ علیہ السلام کا قتل - پاداشِ عمل - تیسرا زرین موقعہ اور یہود کی روگردانی
ابدی ذلت و خسران - بصائر -

**تمہید** جن اصحابِ ذوق نے قصص القرآن جلد اول و دوم کا مطالعہ فرمایا ہے اُن کی نظر سے یہ پوشیدہ نہ رہا ہوگا کہ قرآنِ عزیز اقوامِ ماضیہ کے تاریخی واقعات یعنی ان کے رشد و ہدایات کے قبول و انکار اور اس کے نیک و بد نتائج و ثمرات کے حالات پیشِ نظر لانے اور ان سے عبرت و بصیرت حاصل کرنے کی جگہ جگہ ترغیب دیتا ہے اور خود بھی اسی لیے گزشتہ قوموں کے ان واقعات کو بکثرت بیان کرتا ہے جو اس مقصدِ عظمیٰ کے لیے مفید اور عبرت آموز ہیں اور اگر ان وقائع میں حقائق کے ساتھ غلط اور دُور از کار داستانیں شامل ہوگئی ہیں تو ان کی اصلاح بھی کرتا جاتا ہے چنانچہ بہت سی وہ پیچیدگیاں جو گزشتہ اقوام و امم ان کے مواطن و مساکن اور ان سے متعلق حالات میں صحیح اور غلط واقعات کے خلط ملط سے پیدا ہو چکی تھیں قرآنِ عزیز نے ان کو اس طرح بیان کیا ہے کہ تمام پیچیدگیاں دور ہو کر حقیقتِ حال روشن سے روشن تر نظر آنے لگی چنانچہ ان واقعات سے متعلق اصل حقائق کا اظہار ہو جانے کے صدیوں بعد جب علم الآثار (ARCHAEOLOGY) علم طبقات الارض (GEOLOGY) اور تاریخی مشاہدات و تجربات کے ذریعہ ان اقوام و امم کے حالات ناقابلِ انکار

درجہ تک روشنی میں آئے تو دنیا کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ قرآنِ عزیز نے ان سے متعلق جو کچھ کہا تھا وہ حرف بحرف صحیح نکلا اور اس کے بیان میں حقیقت سے سرِ مو تجاوز ثابت نہیں ہوا۔ رقیم (پیٹرا) کی تاریخِ ماضی اصحابُ الحجر کے واقعات، عاد و ثمود کا تمدن اور مقامِ تاریخ، موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں بنی اسرائیل اور فرعونِ مصر کی آویزش کے واقعات اور سدِ عرم کے حالات غرض یہ اور اسی قسم کے دوسرے تاریخی وقائع ہیں جو مسطورہ بالا حقیقت کے لیے زندہ جاوید شہادت ہیں۔

پس کیا یہ قرآنِ عزیز کے کلامِ الٰہی ہونے کی ایک ناقابلِ تردید شہادت نہیں ہے کہ ایک "امی" انسان ایک ایسے ملک میں جہاں ہر قسم کے علمی ذرائع مفقود و معدوم ہیں دنیا کی قوموں کو رشد و ہدایت کے سلسلہ میں اقوامِ ماضیہ اور امم سابقہ کے ایسے تاریخی واقعات سناتا ہے جن کے ایک حرف کی بھی تردید نہیں ہو سکی اور صدیوں تک علماءِ تحقیق نے کروڑوں اور اربوں روپیہ اور اپنے قیمتی وقت اور عمر کو صرف کر کے جب ان حالات کو جدید علومِ انکشاف کے ذریعہ مشاہدہ کی حد تک حاصل کیا تو ان کو بالآخر یہ اقرار کرنا پڑا کہ قرآن نے ان سے متعلق جو کچھ کہا اور جس قدر کہا بلاشبہ علمِ تحقیق اس کے آگے ایک شوشہ بھی اضافہ نہیں کر سکا چہ جائیکہ اس کے خلاف ثابت کر سکتا۔

بہر حال اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر گذشتہ اقوام کے حالات ظاہر کر کے عبرت آموز قلب اور بصیرت افروز نگاہ کے لیے بہت کچھ سامانِ رشد و ہدایت عطا فرمایا تاکہ موجودہ امم و اقوام سرکش اور مفسد قوموں کے نتائجِ بد اور ہولناک پاداشِ عمل سے عبرت حاصل کریں اور نکوکار و خیر اندیش قوموں کے حالات و واقعات اور ان کے ثمراتِ خیر کو اختیار کر کے دین و دنیا کی فوز و فلاح کو اپنا سرمایہ بنائیں اور چونکہ قرآنِ عزیز کا مقصد صرف موعظت و تذکیر ہے نہ کہ اقوام و امم کی مکمل تاریخ اس لیے اس نے نہ دنیا کی تمام قوموں کی تاریخ بیان کی ہے اور نہ جن قوموں کی تاریخ سے تعرض کیا ہے ان کی پوری تاریخ کو پیش کیا ہے کیونکہ یہ اس کے موضوع اور مقصد سے خارج ہے، وہ رشد و ہدایتِ اقوام کے لیے بلاشبہ ایک مکمل صحیفۂ قانون ہے مگر تاریخ و جغرافیہ یا فلسفہ و سائنس کی کتاب نہیں ہے کہ اس میں وہ سب کچھ بھی موجود ہو جس کا فلسفہ و تاریخ کی کتابوں

میں ہونا ضروری ہے۔

الحاصل اممِ ماضیہ کے ان حالات و واقعات میں سے جو بدکردار اور نیک کردار انسانوں کے درمیان امتیاز پیدا کرتے اور قوموں کی انفرادی و اجتماعی اصلاح و انقلاب کے لیے سرمایۂ عبرت و بصیرت ثابت ہوتے ہیں ایک اہم واقعہ وہ بھی ہے جو یہود بنی اسرائیل کی پیہم شرارتوں اور فساد انگیزیوں کی بناء پر دو مرتبہ مقدس ہیکل اور یروشلم و بیت المقدس کی تباہی و بربادی اور خود اُن کی غلامی و رسوائی کی شکل میں ظاہر ہوا اور جس نے اُن کی قومی ذلت اور اجتماعی ہلاکت پر ہمیشہ کے لیے مہر لگا دی۔

بیتُ المقدس | بیت المقدس کی تعمیر کا واقعہ حضرت سلیمان (علیہ السلام) کے واقعات کے ضمن میں تفصیل کے ساتھ بیان ہو چکا ہے' یہ پاک جگہ اپنے ہیکل (مسجد) کی وجہ سے بنی اسرائیل کا قبلہ رہی ہے اور یہ مقدس مقام بے شمار انبیاء بنی اسرائیل کا مہبط و مدفن ہے اور اس کی عظمت نہ صرف یہود و نصاریٰ ہی کی نگاہ میں ہے بلکہ اس کو مسلمان بھی مقامِ مقدس مانتے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعۂ اسراء (معراج) نے اس کے تقدس کو اور بھی چار چاند لگا دیے ہیں اور جب بھی کوئی مسلمان سورۂ اسراء کو تلاوت کرتا ہے اس کے قلب میں اس مقام کا تقدس و جلال اثر کیے بغیر نہیں رہتا۔

| | |
|---|---|
| سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا | پاکی ہے اس ذات کے لیے جس نے اپنے بندہ (محمد |
| مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا | صلی اللہ علیہ وسلم) کو راتوں رات مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ |
| الَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا | تک سیر کرائی وہ مسجدِ اقصیٰ جس کے اطراف کو ہم نے بڑی |
| اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ۝ | برکت دی ہے اور اس لیے سیر کرائی کہ اپنی نشانیاں دکھائے |
| (بنی اسرائیل پ ۱۵ ع ۱) | بلاشبہ وہی ذات ہے جو سننے والی دیکھنے والی ہے۔ |

بیت المقدس کی اس مسجد کو "مسجدِ اقصیٰ" اس لیے کہتے ہیں کہ وہ مکہ (حجاز) سے بہت دُور فاصلہ پر واقع ہے۔

معراج کے واقعہ میں جب قرآن نے "بیت المقدس" کا ذکر کیا تو ساتھ ہی اس جانب بھی توجہ دلائی کہ بنی اسرائیل کی دعوت و تبلیغ کا یہ مقام اور بنی اسرائیل کا قبلۂ صلوٰۃ جو تمہارے نزدیک بھی عظمت و

تقدیس سے معمور ہے یہود کی مفسدانہ سرگرمیوں اور احکامِ الٰہی کے خلاف مسلسل بغاوتوں اور شرارتوں کی وجہ سے دو مرتبہ تباہی و بربادی اور اہانت سے دوچار ہو چکا ہے اور نہ صرف یہ مقام بلکہ خود یہ بھی مشرکوں اور عیسائیوں کے ہاتھوں حد درجہ ذلیل و رسوا ہو چکے ہیں مگر ان کو پھر بھی عبرت و بصیرت حاصل نہیں ہوئی اور آج جبکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ عامہ ان کو رشد و ہدایت اور دین و دنیا کی عزت و عظمت کا پیغام سنا رہی ہے یہ اس کے ساتھ نفرت و حقارت ہی کا معاملہ کر رہے ہیں اور پہلے سانحوں کی طرح اب بھی غفلت اور سرکشی اختیار کر کے ابدی ذلت و خسران کو دعوت دے رہے ہیں۔

قرآنِ عزیز کہتا ہے کہ ہم نے کتاب (صحف انبیاء علیہم السلام) میں پہلے سے بنی اسرائیل کو آگاہ کر دیا تھا کہ تم دو مرتبہ سخت فتنہ و فساد اور سرکشی و بغاوت کرو گے اور خدا کے اس مقدس مقام میں فتنہ ساماں بنو گے اور اس کی پاداش میں دونوں مرتبہ تم کو ذلت و ہلاکت کا مُنہ دیکھنا پڑے گا اور جس سرزمین کو تم بہت زیادہ محبوب رکھتے ہو یہ بھی دو مرتبہ ظالموں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہو گی۔

اس کے بعد ہم پھر ایک مرتبہ تم پر رحم کریں گے اور سعادت و فلاح کی طرف دعوت دیں گے پس اگر تم نے گزشتہ واقعات سے عبرت و موعظت حاصل کر کے اس دعوتِ حق پر لبیک کہا اور اس کو بطیبِ خاطر قبول کیا تو دنیا کی کوئی طاقت تمہاری اس سعادت کو نہیں سلب کر سکتی اور اگر تمہاری تاریخی کجروی اور سرکشی اور حق کے ساتھ بغاوت اور مخالفت نے تمہارا ساتھ نہ چھوڑا اور گزرے ہوئے واقعات کی طرح اس مرتبہ بھی تم نے فساد و گمراہی کو اپنایا تو ہماری جانب سے بھی پاداشِ عمل کا قانون اسی طرح پھر دُہرایا جائے گا اور اس کے بعد تم پر ابدی ذلت و رسوائی کی مہر لگا دی جائے گی اور یہ سب کچھ تو دنیا کا معاملہ ہے اور ایسے سرکشوں کے لیے آخرت میں بہت بُرا ٹھکانا "جہنم" ہے۔

| | |
|---|---|
| وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ فِي | اور ہم نے کتاب (صحفِ انبیاء) میں بنی اسرائیل کو اس فیصلہ کی |
| الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ | خبر دیدی تھی کہ تم ضرور ملک میں شر و فساد پھیلاؤ گے اور بڑی ہی |
| وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا ۝ فَاِذَا جَآءَ | سخت درجہ کی سرکشی کرو گے پھر جب دو وقتوں میں سے پہلا |
| وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ | وقت آگیا تو اے بنی اسرائیل ہم نے تم پر اپنے ایسے بندے |

| | |
|---|---|
| أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ فَجَاسُوا | بھیج دیے جو بڑے ہی خوفناک تھے۔ پس وہ تمھاری |
| خِلَالَ الدِّيَارِ ۚ وَكَانَ وَعْدًا | آبادیوں کے اندر پھیل گئے اور اللہ کا وعدہ تو اسی لیے |
| مَفْعُولًا ۝ ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ | تھا کہ پورا ہو کر رہے۔ پھر (دیکھو) ہم نے زمانہ کی گردش |
| عَلَيْهِمْ وَأَمْدَدْنَاكُمْ بِأَمْوَالٍ وَبَنِينَ | تمھارے دشمنوں کے خلاف اور تمھارے موافق کر دی، |
| وَجَعَلْنَاكُمْ أَكْثَرَ نَفِيرًا ۝ إِنْ | اور مال و دولت اور اولاد کی کثرت سے تمھاری مدد کی، |
| أَحْسَنْتُمْ أَحْسَنْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ ۖ | اور تمھیں پھر ایسا بنا دیا کہ بڑے جتھے والے ہوگئے، اگر تم |
| وَإِنْ أَسَأْتُمْ فَلَهَا ۚ فَإِذَا جَاءَ | نے بھلائی کے کام کیے تو اپنے ہی لیے کیے اور اگر برائیاں |
| وَعْدُ الْآخِرَةِ لِيَسُوءُوا وُجُوهَكُمْ | کیں تو بھی اپنے ہی لیے کیں۔ پھر جب دوسرے وعدے کا |
| وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوهُ | وقت آیا (تو ہم نے اپنے دوسرے) بندوں کو بھیج دیا تاکہ |
| أَوَّلَ مَرَّةٍ وَلِيُتَبِّرُوا مَا عَلَوْا | تمھارے چہروں پر رسوائی کی کالک پھیر دیں اور اسی طرح |
| تَتْبِيرًا ۝ عَسَىٰ رَبُّكُمْ | (ہیکل) مسجد میں داخل ہو جائیں جس طرح پہلی مرتبہ حملہ آور |
| أَنْ يَرْحَمَكُمْ ۚ وَإِنْ عُدْتُمْ | گھسے تھے اور جو کچھ پائیں توڑ پھوڑ کر برباد کر ڈالیں، کچھ |
| عُدْنَا ۘ وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ | عجب نہیں کہ تمھارا پروردگار تم پر رحم فرمائے (اگر اب بھی |
| لِلْكَافِرِينَ حَصِيرًا ۝ | باز آجاؤ) لیکن اگر تم پھر سرکشی، فساد کی طرف لوٹ آؤ گے |
| (سورۂ بنی اسرائیل) | تو ہماری طرف سے پاداشِ عمل لوٹ آئے گی اور ہم نے منکرینِ |
| (پ ۱۵ — ع ۱) | حق کے لیے جہنم کا قید خانہ تیار کر رکھا ہے۔ |

اس مقام پر "الکتاب" سے مراد انبیاء بنی اسرائیل کے وہ صحیفے ہیں جن میں یہود کے دو مرتبہ سخت فساد اور سرکشی کرنے اور اس کی بدولت بیت المقدس کی بربادی اور ان کے ہلاک اور غلام بن کر ذلیل و رسوا ہونے کے متعلق وہ پیشین گوئیاں کی گئی تھیں جو بذریعہ الہام و وحی ان کو خدا کی جانب سے معلوم ہوئی تھیں چنانچہ موجودہ توراۃ میں یسعیاہ، یرمیاہ، حزقیل اور زکریا[1] (علیہم السلام) کے صحیفوں میں وہ اب بھی مذکور ہیں اور ان صحیفوں کا بیشتر حصہ اسی قسم کی پیشین گوئیوں پر مشتمل ہے اور ان تینوں

[1] یہ یحییٰ علیہ السلام کے والد نہیں ہیں دوسرے نبی ہیں۔

صحیفوں میں دو مرتبہ کے ان فسادات اور فسادات سے متعلق خدائے تعالیٰ کی جانب سے سخت سزا کا جس تفصیل کے ساتھ ذکر ہے اس کے حرف بحرف قرآنِ عزیز کے ارشاد کی تصدیق ہوتی ہے یسعیاہ کی کتاب میں یہود کی پہلی شرارت و فساد کا ذکر اس طرح شروع ہوتا ہے۔

رویا یسعیاہ بن اموص کی جو اس نے یہوداہ اور یروشلم کی بابت یہوداہ کے بادشاہوں عزیاہ اور یوتام اور آخز اور حزقیاہ کے دنوں میں دیکھی۔ سنو! اے آسمانو اور کان لگا اے زمین کہ خداوند یوں فرماتا ہے کہ لڑکوں کو میں نے پالا اور پوسا پھر انھوں نے مجھ سے سرکشی کی۔ بیل اپنے مالک کو پہچانتا ہے اور گدھا اپنے مالک کی چراگاہ کو مگر بنی اسرائیل نہیں جانتے میرے لوگ کچھ نہیں سوچتے آہ خطاکار گروہ ایک قوم جو گناہوں سے لدی ہوئی ہے بدکاروں کی نسل، خراب اولاد کہ انھوں نے خداوند کو ترک کیا اسرائیل کے قدوس کو ہلاک جانا اور اس سے بالکل پھر گئے تھے[1]

اور پھر ان کی بدکاریوں کی وجہ سے جو سزا اُن کو ملنے والی تھی اس کا ذکر اسی مکاشفہ میں اس طرح ہے:۔

تمہارا ملک اُجاڑ ہے، تمہاری بستیاں جل گئیں، پردیسی لوگ تمہاری زمین کو تمہارے سامنے نگلتے ہیں وہ ویران ہے گویا کہ اسے اجنبی لوگوں نے اُجاڑا ہے اور صیہون کی بیٹی چھوڑی گئی ہے[2]

اور یرمیاہ کی کتاب میں یہ پیشین گوئی ان الفاظ سے شروع کی گئی ہے:۔

کیونکہ خداوند فرماتا ہے کہ دیکھ میں اتر کے بادشاہوں کے سارے خاندانوں کو بلاؤں گا اور وہ آئیں گے اور ہر ایک اپنا اپنا تخت یروشلم کے پھاٹکوں میں داخل ہونے کی راہ پر اور اس کی سب دیواروں کے گرداگرد اور یہوداہ کے تمام شہروں کے مقابل قائم کرے گا اور میں ان (یہود) کی ساری شرارت کی بابت کہ انھوں نے مجھے چھوڑا ہے اور بیگانے خداؤں کے سامنے لوبان جلایا اور اپنے ہی ہاتھوں کے کاموں کو سجدہ کیا اپنی عدالت ظاہر کرکے ان پر حکم کروں گا[3]

دیکھو تم جھوٹی باتوں پر جو سود مند نہیں ہو سکتیں اعتماد کرتے ہو۔ کیا تم چوری کرو گے، خون کرو گے، زناکاری کرو گے، جھوٹی قسمیں کھاؤ گے اور بعل (بت) کے آگے لوبان جلاؤ گے اور غیر معبودوں کی

---

[1] باب آیات ۴-۱ [2] صیہون شام کے ملک میں مشہور پہاڑ ہے' باب آیات ۸-۷ [3] باب آیات ۱۶-۱۵

جنھیں تم نہیں جانتے پیروی کروگے ؟ اور میرے حضور اس گھر میں جو میرے نام کا کہلاتا ہے آکے کھڑے ہوگے اور کہوگے کہ ہم نے خلاصی پائی تاکہ نفرت کے کام کرو[1]

اے یروشلم (بیت المقدس) اپنے بال منڈا اور پھینک دے اور اونچی جگہوں پر جاکے نوحہ کر کیونکہ خداوند نے اس نسل کو جس پر اس کا قہر پڑا تھا مردود کیا اور ترک کر دیا ہے کہ بنی یہوداہ نے میری نظر میں برائی کی خداوند کہتا ہے اس گھر میں جو میرے نام کا کہلاتا ہے انھوں نے اپنی مکروہات رکھیں کہ اسے ناپاک کریں[2]

اس لیے رب الافواج یوں کہتا ہے لہٰذا تم نے میری باتیں نہ سُنیں دیکھ میں اتر کے سارے گھرانوں کو اور شاہ بابل بنوکد نذر کو بلا بھیجوں گا۔

اور حزقیل کی کتاب میں یہ واقعہ اس طرح مذکور ہے:

خداوند یہوداہ یوں کہتا ہے یہی یروشلم ہے میں نے اسے قوموں اور مملکتوں کے درمیان جو اس کے آس پاس ہیں رکھا ہے۔ لیکن اس نے میری عدالتوں کو شرارت کرکے قوموں کی نسبت زیادہ ٹال دیا اور میری شریعتوں کو آس پاس کی مملکتوں کی بہ نسبت زیادہ عدول کیا کہ انھوں نے میری عدالتوں کو حقیر جانا اور میری شریعتوں پر عمل نہیں کیا۔ سو خداوند یہوداہ یہ کہتا ہے از بس کہ تم نے ان قوموں کی نسبت سے جو تمھارے گرد و پیش ہیں زیادہ بغاوت کی اور میری شریعتوں پر نہ چلے...... سو خداوند یہوداہ یوں کہتا ہے کہ دیکھ میں ہاں میں ہی تیرا مخالف ہوں اور تیرے درمیان سب قوموں کی آنکھوں کے سامنے تجھے سزا دوں گا[3]

اور زکریاہ نبی کی کتاب میں یہود کے دوسرے فساد اور بیت المقدس کی دوبارہ تباہی کے متعلق یہ پیشین گوئی درج ہے۔

دیکھو خداوند کا دن آتا ہے اور تیری لوٹ کا مال تیرے درمیان بانٹا جائے گا اور میں ساری قوموں کو فراہم کروں گا کہ یروشلم پر چڑھیں اور لڑیں اور شہر لے لیا جائے گا اور گھر کے گھر لوٹے جائیں گے

---

[1] باب آیات ۱۱۔ [2] باب آیات ۱۱-۸ باب ۲۵ آیات ۹-۸۔ [3] باب ۵ آیات ۹-۵۔

اور عورتیں بے حرمت کی جائیں گی اور آدھا شہر اسیر ہو کے جائے گا پھر وہ جو باقی رہ جائیں گے شہر میں کاٹے نہ جائیں گے، تب خداوند خروج کرے گا اور ان قوموں کے ساتھ جنگ کرے گا جس طرح سابق میں جنگ کے دن لڑا تھا[1]

یہ ہے خلاصہ ان مکاشفات یا پیشین گوئیوں کا جو انبیاء بنی اسرائیل کے صحیفوں میں بڑی تفصیلات کے ساتھ مذکور ہیں اور جن کا اجمالی تذکرہ قرآن عزیز (سورۂ بنی اسرائیل) میں بھی بصورت تصدیق موجود ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ان مکاشفات اور پیشین گوئیوں کا ظہور کس کس زمانہ میں ہوا اور کس طرح ہوا تو مفسرین میں سے ابن کثیر کے طرز بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہود کی ان دو[2] شر انگیزیوں میں سے ایک کو بعثت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے قبل زمانہ سے متعلق سمجھتے ہیں اور دوسری کو زمانۂ بعثت صلی اللہ علیہ وسلم پر محمول فرماتے ہیں اور پھر پہلے واقعہ کے متعلق اپنی جانب سے فیصلہ دیتے ہوئے مفسرین کے تین قول نقل کرتے ہیں (۱) قتادہ کہتے ہیں کہ یہود کی پہلی شرارت کی سزا میں جالوت کا حملہ ہوا جس نے یہود کو بہت مصیبت میں ڈال دیا تھا مگر داؤد علیہ السلام کی بدولت اس کے فتنہ سے انکو نجات ملی یہ واقعہ سورۂ بقرہ کی تفسیر میں گزر چکا (۲) سعید بن جبیرؒ کی رائے ہے کہ پہلا وعدۂ الٰہی جو پاداش عمل میں یہود پر نافذ ہوا موصل ونینوی کے مشہور قاہر بادشاہ سنجاریب کے حملہ کی شکل میں ظاہر ہوا جس نے فلسطین کے اکثر شہروں پر قبضہ کر لیا تھا اور بیت المقدس کا محاصرہ کیے ہوا تھا مگر جب یہود اور شاہ یہود حزقیاہ نے اپنے زمانہ کے نبی یسعیاہ علیہ السلام کے ہاتھ پر توبہ وانابت کی اور وہ سچائی کے ساتھ اپنی بداعمالیوں اور بدکاریوں سے باز آ گئے تب خدائے تعالیٰ نے ان پر سے اس بلا کو ٹال دیا اور محاصرہ ترک کر کے واپس ہوا (۳) سعید بن جبیرؒ ہی سے دوسری روایت یہ ہے کہ اس سے مراد بخت نصر (بنوکدنذر) شاہ بابل کا وہ مشہور حملہ ہے جس نے نہ صرف فلسطین اور شام کے تمام علاقے کو تاراج کر دیا تھا اور بیت المقدس کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی بلکہ یہود کی قومیت ونسل کو بھی برباد کر ڈالا اور ہزاروں بچوں، بوڑھوں، عورتوں اور مردوں کو

[1] باب ۱۴

غلام بنا کر بابل لے گیا تھا مگر یرمیاہ علیہ السلام کی پیشین گوئی کے مطابق ستر برس کے بعد یہود کو خورس شاہ فارس نے بابل کی غلامی سے نجات دلائی اور ان کو دوبارہ آزادی شادمانی اور خوش عیشی نصیب ہوئی اور خورس کے حکم سے بیت المقدس بھی دوبارہ تعمیر ہوا اور اس نے حضرت دانیال علیہ السلام کو ان کا سردار بنا کر یروشلم واپس کر دیا۔[۱]

اور قاضی بیضاوی اور بعض دوسرے مفسرین نے پہلی مرتبہ کے معاملہ کو سنجاریب یا بخت نصر سے متعلق کیا ہے اور دوسرے واقعہ کے متعلق یہ کہا ہے کہ یہ فارس کے ملوک الطوائف میں سے ہردوس بادشاہ کے زمانہ میں پیش آیا جب کہ اس نے بیت المقدس پر سخت حملہ کیا اور یہود اس کی مقاومت سے عاجز رہے مگر جب انھوں نے اپنے زمانہ کے پیغمبر کے سامنے سچی توبہ کی اور نیک کردار زندگی اختیار کرنے کا پختہ عہد و پیمان کیا تو ان سے یہ مصیبت ٹال دی گئی اور یہود کی شرانگیزیوں کے متعلق فرماتے ہیں کہ ان پر یہ تباہیاں اس وقت لائی گئیں جب کہ وہ اپنی شرارتیں میں اس درجہ بڑھ گئے تھے کہ انبیاء علیہم السلام کے قتل سے بھی باز نہیں رہتے تھے۔ چنانچہ پہلی مرتبہ میں یسعیاہ یا یرمیاہ[۲] کو قتل کیا تھا اور دوسری مرتبہ زکریا یحییٰ اور حضرت عیسیٰ (علیہم السلام) کے قتل پر بھی آمادہ تھے اور وَإِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا میں اُمت تیسرے واقعہ کا تذکرہ ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پیش آیا یعنی یہود نے اپنی الہامی کتابوں میں آپ کی نبوت و رسالت کے حالات و علامات جان لینے کے باوجود آپ کا انکار کیا اور بدعہدیاں کر کے آپ کو اور مسلمانوں کو ہر قسم کی ایذائیں پہنچائیں نتیجہ یہ نکلا کہ اس مرتبہ جب ٹھکرائے گئے تو پھر کبھی نہ ابھرے اور نہ قیامت تک کبھی صاحب حکومت ہو سکیں گے۔[۳]

دوسری رائے یہ ہے کہ یہود کی پہلی شرارت اور اس کی پاداش کا معاملہ بخت نصر کے حملۂ بیت المقدس سے تعلق رکھتا ہے اور دوسری مرتبہ کا معاملہ طیطوس (ٹیٹس) رومی کے حملہ سے متعلق ہے اور یہی رائے صحیح اور قرآن عزیز کی آیات اور تاریخی نقول کے مطابق ہے اور یہ اس لیے کہ قرآن عزیز نے اس معاملہ کے متعلق جو کچھ کہا ہے اس سے حسب ذیل باتیں خصوصیت کے ساتھ ظاہر

---

[۱] تفسیر ابن کثیر ج ۲ و تاریخ ابن کثیر ج ۲ [۲] ان ہر دو انبیاء میں سے کوئی بھی قتل نہیں کیے گئے" [۳] بیضاوی سورۂ اسریٰ

ہوتی ہیں :-

(۱) "الکتاب" میں یہ خبر دیدی گئی تھی کہ یہود دو مرتبہ سخت شر انگیزی اور فساد کریں گے۔ "وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ فِي الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا ۝"

(۲) جب انھوں نے پہلی مرتبہ شر و فساد کیا تو ہم نے ان پر ایسی قاہرانہ طاقت مسلط کر دی کہ اس نے ان کی بستیوں میں گھس کر ان کو اور ان کے گھروں کو تباہ و برباد کر ڈالا" فَاِذَا جَاۗءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ ۭ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا ۝"

(۳) اس تباہی کے بعد (ان کی توبہ و انابت پر) ہم نے ان کو سابق کی طرح پھر حکومت و طاقت بھی بخشی اور مال و متاع کی بہتات سے بھی مستفیض کیا" ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَاَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَجَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِيْرًا"

(۴) اور ان کو یہ بھی بتا دیا کہ سرکشی اور فساد سے پرہیز اور امن و آشتی اور خدائے تعالیٰ کی فرمانبرداری کے قبول کا باز اثر ہم کو کوئی فائدہ یا نقصان نہیں پہونچاتا بلکہ اس کی خلاف ورزی میں تمہارا اپنا ہی نقصان ہے اور اس کی اطاعت و انقیاد سے تم ہی کو فائدہ پہنچتا ہے" اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ ۣ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا"

(۵) مگر انھوں نے دوسری مرتبہ پھر بد عہدی کی اور خدا کی نافرمانی اور فساد فی الارض میں دوبارہ بے باک ہو گئے تو ہم نے بھی پہلے کی طرح ان پر ایک ظالم طاقت کو مسلط کر دیا جس نے سابق ظالم حکمراں کی طرح دوبارہ بیت المقدس اور اس کے ہیکل (مسجد) کو بھی برباد کیا اور ان کو بھی ذلیل و رسوا کر کے ان کی سرکشی کا سر کچل دیا۔" فَاِذَا جَاۗءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْۗءٗا وُجُوْهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا ۝

اور اگرچہ یہود کی یہ تباہی بظاہر حال ابدی معلوم ہو لیکن خدائے تعالیٰ کی رحمت تیسری مرتبہ اور موقع دے گی کہ وہ عزت و سربلندی حاصل کریں اور ان کی مایوسی مبدل بہ کامرانی ہو جائے لیکن اگر انھوں نے اس کو بھی ٹھکرا دیا تو بے شک پھر اس کا "قانونِ پاداشِ عمل" بھی ان کو ضرور سزا دے گا

اور وہ جیسا کریں گے ویسا بھریں گے اور پھر یقیناً رہتی دنیا تک ذلیل و خوار ہی رہیں گے اور دار آخرت میں تو جہنم ایسے ہی متکبروں کے لیے تیار کی گئی ہے عَسٰی رَبُّكُمْ اَنْ یَّرْحَمَكُمْ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِیْنَ حَصِیْرًا۔

ان تفصیلات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہود کی شر انگیزیوں پر بصورت سزا و عذاب جن جابر و قاہر بادشاہوں کو مسلط کیا گیا انھوں نے دونوں مرتبہ بیت المقدس (یروشلم) کو ضرور تباہ و برباد کیا۔ "وَلِیَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِیُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِیْرًا" اس لیے جن اقوال میں پہلے واقعہ کا مصداق آشوری حکمران "سنجاریب" یا "جالوت" کو بتایا گیا ہے وہ غلط ہے کیونکہ ان دونوں میں سے کوئی ایک بھی بیت المقدس میں داخل نہیں ہو سکا چہ جائیکہ وہ اس کو تباہ و برباد کرتا چنانچہ جالوت کے متعلق تو قرآن کی تصریحات بھی اس کی تائید کرتی ہیں اور سیر و تاریخ کی نقول بھی جیسا کہ ہم حضرتِ سموئیل علیہ السلام اور حضرتِ داؤد علیہ السلام کے واقعات میں بیان کر چکے ہیں اسی طرح سنجاریب کے متعلق "یسعیاہ کی کتاب" میں یہ موجود ہے۔

پس شاہِ حزقیاہ کے ملازم یسعیاہ پاس آئے۔ تب یسعیاہ نے انھیں فرمایا تم اپنے آقا سے کہو خداوند یوں فرماتا ہے کہ تو ان باتوں سے جنھیں شاہِ آشور (سنجاریب) کے جوانوں نے کہہ کے میری تکفیر کی ہراساں مت ہو دیکھ میں اس میں روح ڈالوں گا اور وہ ایک افواہ سن کے اپنی مملکت کو پھر جائے گا اور میں اسے اس ہی کی سرزمین میں تلوار سے مروا ڈالوں گا...... سو خداوند شاہ آشور (سنجاریب) کے حق میں یوں فرماتا ہے کہ وہ اس شہر (یروشلم) میں نہ آئے گا نہ اس کے اندر تیر چلائے گا نہ پھر پکڑ کے اس کے سامنے ظاہر ہوگا اور نہ اس کے مقابل دمدمہ باندھے گا بلکہ جس راہ سے وہ آیا اسی راہ سے پھر جائے گا اور اس شہر میں نہ آسکے گا۔ تب سنحریب (سنجاریب) شاہ آشور نے کوچ کیا اور چلا گیا اور پھر گیا اور نینوی میں آرہا۔[۱]

اور قاضی بیضاوی کا یہ قول بھی صحیح نہیں ہے کہ یہود سے متعلق دوسرے حادثہ کا مصداق فارس کے ملوک الطوائف میں سے شاہ ہردوس ہے اس لیے کہ تاریخ و سیر میں ملوک الطوائف

کے عہد میں کسی ایسے بادشاہ کا ذکر نہیں پایا جاتا جس نے بیت المقدس پر چڑھائی کر کے اس کو فتح کیا اور اس کو تباہ و برباد کر ڈالا ہو۔

ان اقوال کے برعکس توراۃ (صحائفِ انبیاء) اور سیر و تاریخ کی نقول سے باتفاق یہ ثابت ہوتا ہے کہ فلسطین اور سرزمین یہوداہ کی تباہی اور ہیکل کی بربادی صرف دو بادشاہوں کے ہاتھوں ہوئی ہے اور نہ صرف شہروں کی بربادی بلکہ یہودی قومیت کی وہ تباہی و بربادی جو دنیا کے انقلابات کی تاریخ میں اہم جگہ رکھتی ہے۔ ایک بابل کے قاہر بادشاہ بنوکدنذر (بخت نصر) کے ہاتھ سے اور یہ تقریباً ۶۰۴ ق.م کا واقعہ ہے اور دوسری طیطوس رومی کے ہاتھوں سے اور یہ واقعہ رفع مسیح علیہ السلام سے تقریباً ستر سال بعد پیش آیا اور ان ہی دو حادثوں میں یہود، یہودی قومیت اور یہودی مذہب پر وہ سب کچھ ہو گزرا جس کی اطلاع پہلے سے توراۃ (صحفِ انبیاء) میں دیدی گئی تھی اور جس کی تصدیق کے لیے قرآنِ عزیز بھی شہادت دے رہا ہے۔

اس لیے بلا خوفِ تردید یہ کہنا صحیح ہے کہ یہود کی بدکرداریوں کے نتیجہ میں جابر و قاہر بادشاہوں کے ہاتھوں ان کی تباہی و بربادی کے جو دو سانحے پیش آئے اور جن کا ذکر سورۂ اسراء (بنی اسرائیل) میں ہے وہ بلاشبہ بخت نصر اور طیطوس (ٹیٹس) ہی سے تعلق رکھتے ہیں تو اب ازبس ضروری ہے کہ ان ہر دو واقعات کی تفصیلات بیان کر کے یہ دکھایا جائے کہ اس زمانہ میں یہود کی شرانگیزیاں اور مفسدانہ کارگزاریاں اس حد تک بڑھ گئی تھیں کہ ان دونوں تباہ کن حوادث میں ان پر جو کچھ گزرا وہ ان کی بداعمالیوں ہی کا ثمرہ اور نتیجہ تھا اور پاداشِ عمل ہی نے ان دو طاقتوں کی شکل میں نمود و ظہور کیا تھا......

**شرارتِ یہود کا پہلا دور**

اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے قانونِ قدرت کا ہمیشہ سے یہ اٹل فیصلہ رہا ہے کہ جب بداخلاقی، فتنہ و فساد، خون ریزی، جبر و ظلم اور حق کے مقابلہ میں بغض و حسد کسی جماعت کا قومی مزاج بن جاتے ہیں اور چند افراد میں نہیں بلکہ پوری قوم کے اندر یہ امور نشو و نما پا جاتے ہیں... تو پھر قبولِ حق کی صحیح استعداد اُن سے سلب کر لی جاتی ہے اور وہ اس درجہ بے خوف اور بے باک

ہوجاتے ہیں کہ اگر ان کے پاس خدا کے سچے پیغمبر دعوتِ حق اور پیغامِ الٰہی سُنانے آتے ہیں تو وہ صرف اس دعوت سے مُنہ ہی نہیں موڑ لیتے بلکہ ان انبیار و رسل کو قتل تک کر دینے سے گریز نہیں کرتے اور شرک و طغیان کو راہِ عمل بنا کر اولیاء الرحمٰن کی جگہ اولیاء الشیطان بن جاتے ہیں جب اُن کی حالت اس درجہ تک پہنچ جاتی ہے تو اب خدائے برتر کا قانون "پاداشِ عمل" بروئے کار آتا ہے اور آخرت کے عذابِ الیم کے علاوہ دنیا میں ہی ان کو ایسی ہلاکت و بربادی سے دوچار کر دیتا ہے کہ اِس قوم کا تمام کبر و غرور اور شر و فساد کی شعلہ سامانیاں ذلت و خواری کے ساتھ خاک کر دی جاتی ہیں اور ان کی قومی زندگی کو قعرِ مذلت میں پھینک دیا جاتا ہے تاکہ اُن کی آنکھیں مشاہدہ کر لیں اور عبرت آموز قلب بھی یہ سمجھ لیں کہ حقیقی عزت و سربلندی کے مالک تم نہیں ہو اور ذلت و عزت تمہارے اپنے ہاتھ میں نہیں ہے بلکہ اُس قادرِ مطلق ہستی کے قبضہ میں ہے جو کائناتِ ہست و بود کا خالق و مالک ہے اور جس کا یہ اعلان ہے کہ بدکاروں کے لیے انجام کار ذلت و رسوائی کے سوا اور کچھ نہیں ہے اور حقیقی عزت نکوکاروں ہی کے لیے ہے اور وہی اس حقیقت کے پیشِ نظر جس کو چاہتا ہے عزت بخشتا اور جس کو چاہتا ہے ذلت دیتا ہے " وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ "

پس جب ہم اس قانونِ فطرت کو پیشِ نظر رکھ کر یہودِ بنی اسرائیل کے اس عہد کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں جو زیرِ بحث واقعات سے متعلق ہے تو یہ بات روزِ روشن کی طرح نمایاں نظر آتی ہے کہ ان کی قومی زندگی کا قوام مسطورہ بالا بداخلاقیوں سے ہی بنا تھا اور وہ اپنی اس زندگی پر فخر و مباہات کرتے تھے۔ چنانچہ حضرتِ داؤد و سلیمان (علیہما السلام) کے بعد ان کی مذہبی اور اخلاقی پستی کا یہ عالم تھا کہ جھوٹ، فریب، ظلم و سرکشی اور فساد و فتنہ انگیزی اُن کا شعار بن گئے تھے حتیٰ کہ شرک و بُت پرستی تک اُن میں رچ گئی تھی لیکن اس کے باوجود عرصہ دراز تک خدائے تعالیٰ کے قانونِ "مہلت" نے ان کو مہلت دی کہ وہ اپنی حالت کی اصلاح کریں اور اس کی صفت "رحمت" نے ان سے مُنہ نہیں موڑا بلکہ ان کی رشد و ہدایت اور اصلاحِ اخلاق و اعمال کے لیے نبیوں اور پیغمبروں کا سلسلہ قائم رکھا جو برابر اُن کو نکوکاری کی ترغیب دیتے اور بدکاری سے اجتناب کی تلقین کرتے رہتے تھے۔

تاکہ ان کو دین و دنیا کی سربلندی حاصل ہو اور وہ انبیاء و رسل علیہم السلام کی اولاد ہونے کی حیثیت سے دوسروں کے لیے اسوۂ حسنہ بن سکیں مگر یہود پر ان کے ارشاد و تبلیغ کا مطلق کوئی اثر نہیں ہوا اور ان کی سرکشی اور نافرمانی ترقی پذیر ہوتی گئی اور ان کے علماء و احبار نے سیم و زر کی خاطر خدائے برتر کے احکام میں تلبیس شروع کر دی اور حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنانے میں بے خوف ہو گئے اور عوام نے کتاب الٰہی کو پس پشت ڈال کر گمراہی کو اپنا امام بنا لیا اور بے باکی کے ساتھ ہر قسم کی بداخلاقی کو اپنا لیا اور آخر کار ان کے خواص و عوام اس انتہائی شقاوت و بدبختی پر اتر آئے کہ خدا کے معصوم پیغمبروں کو قتل کرنا شروع کر دیا اور ان کی تکذیب کر کے ان کے خونِ ناحق پر فخر و مباہات کرنے لگے۔ چنانچہ یسعیاہ نبی کی کتاب میں جگہ جگہ ان کی بدکرداریوں اور نافرمانیوں کا اس طرح ذکر موجود ہے :-

بنی اسرائیل نہیں جانتے میرے لوگ کچھ نہیں سوچتے آہ خطاکار گروہ ایک قوم جو گناہوں سے لدی ہوئی ہے بدکرداروں کی نسل خراب اولاد کہ انھوں نے خدا کو ترک کیا' اسرائیل کے قدوس کو حقیر جانا اس سے بالکل پھر گئے۔[1]

اے میری اُمت تیرے پیشوا تجھ کو گمراہ کرتے ہیں اور تیرے راہ گیروں کی راہ مارتے ہیں خداوند کھڑا ہے کہ مقدمہ پیش کرے اور وہ لوگوں کی عدالت کرنے پر مستعد ہے۔[2]

کیونکہ وہ جو ان کے پیشوا ہیں ان سے خطا کاری کراتے ہیں اور وہ جو ان کی پیروی کرتے ہیں نگلے جاتے ہیں گے سو خداوند ان کے جوانوں سے خوشنود نہیں اور وہ ان کے یتیموں اور انکی بیواؤں پر رحم نہ کرے گا کہ ان میں ہر ایک بے دین ہے اور بدکردار ہے۔[3]

اور یرمیاہ نبی کی کتاب میں اس طرح مذکور ہے :-

اور خداوند نے اپنے سارے خدمت گذار نبیوں کو تمھارے پاس بھیجا' صبح سویرے اٹھ کے بھیجا' پر تم نے نہ سنا نہ سننے کو اپنا کان لگایا' انھوں نے کہا کہ ہر ایک اپنی بُری راہ سے اور

[1] باب ۱ آیات ۴-۳۔ [2] باب ۳ آیات ۱۳-۱۲۔ [3] باب ۹ آیات ۱۷-۱۶۔

اپنے کاموں کی برائی سے باز آؤ اور اس سرزمین میں جسے خداوند نے تم کو اور تمھارے باپ دادوں کو ہمیشہ کے لیے دیا بستے رہو اور تم بیگانے باطل معبودوں کا پیچھا نہ کرو کہ ان کی بندگی اور ان کو سجدہ کرنے لگو اور اپنے ہاتھوں کے کاموں سے مجھے غصہ نہ دلاؤ، اور میں تم پر کچھ ضرر نہ پہنچاؤں گا۔ پھر تم نے میری نہ سنی، خداوند کہتا ہے تاکہ اپنے ہاتھوں کے کاموں سے اپنے زیان کے لیے مجھے غصہ دلاؤ۔[1]

اور ایسا ہوا کہ جب یرمیاہ ساری باتیں کہہ چکا جو خداوند نے اسے حکم دیا تھا کہ ساری قوم سے کہے تب کاہنوں اور نبیوں (جھوٹے مدعیانِ نبوت) اور ساری قوم نے اس کو پکڑا اور کہا کہ تو یقیناً قتل کیا جائے گا۔ تو نے خداوند کا نام لے کر کس لیے نبوت کی ہے اور یہ کہا کہ یہ گھر (یروشلم) سیلا کی مانند ہو جائے گا اور یہ شہر ویران کیا جائے گا۔[2]

کیونکہ اے یہوداہ جتنے تیرے شہر ہیں اتنے ہی تیرے معبود ہیں تم کاہے کو مجھ سے حجت کرو گے تم سب مجھ سے پھر گئے ہو خداوند کہتا ہے میں نے تمھارے لڑکوں کو عبث مارا پیٹا ہے وہ تربیت پذیر نہیں ہوئے، تمھاری ہی تلوار پھاڑنے والے شیرِ ببر کی مانند تمھارے نبیوں کو کھا گئی ہے (یعنی تم نے اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے سچے پیغمبروں کو قتل کیا ہے)

یہود کی سرکشی اور خدا سے بغاوت کے یہ افسوسناک حالات تھے جن پر خدا کی جانب سے بار بار ان کو تنبیہ کی جاتی اور مہلت سے فائدہ اٹھانے کی ترغیب دی جاتی رہی لیکن ان پر الٹا ہی اثر ہوتا رہا اور ان کی بے حیائی اور بیجا جسارت بڑھتی ہی رہی تب یکایک غیرتِ حق نے قہر اور بطشِ شدید کی شکل اختیار کر لی اور اس کا زبردست ہاتھ اُن کی جانب پاداشِ عمل کے لیے بڑھا۔

ساتویں صدی قبلِ مسیح کے آخری دور میں بابل (عراق) کی حکومت پر ایک زبردست جری اور ظالم و جابر بادشاہ سریر آرائے سلطنت ہوا۔ اس کا نام بنوکد نذر یا بنوکد زار تھا اور عرب اس کو بخت نصر کہتے تھے اگرچہ اس زمانہ میں بابل کی حکومت بذاتِ خود ایک متمدن اور زبردست حکومت شمار ہوتی تھی مگر اس سے قریب نینویٰ کی مشہور طاقت کی تباہی کے بعد تو اس کو اور زیادہ

[1] باب ۲۵ آیات ۵۔۷ - [2] باب ۲۶ آیات ۔

قوت و شوکت حاصل ہوگئی اور وہ ایک عظیم الشان شہنشاہیت تسلیم کرلی گئی۔ حتیٰ کہ ایران کی مختلف قبائل حکومتیں بھی اس کی باج گزار اور ماتحت حکومتیں سمجھی جانے لگیں۔

بخوکدنذر کی شمشیر کشورستان نے اس پر بھی اکتفا نہیں کیا اور اس کی نظریں شام و فلسطین کے علاقوں پر بھی پڑنے لگیں جو یہودیا کا علاقہ کہلاتا اور بنی اسرائیل کے مذہب اور قومیت کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا چنانچہ وہ اس کی جانب بڑھا۔ جب یہودیا کی سرزمین کے باشندوں نے یہ سنا تو ان کے ہوش و حواس جاتے رہے اور بادشاہ سے لے کر رعایا تک سب کو موت کا نقشہ نظر آنے لگا اور اب وہ سمجھے کہ یسعیاہ اور یرمیاہ (علیہما السلام) نے ہماری بدکاریوں پر متنبہ کرتے ہوئے جس سزا اور عذابِ الٰہی کا ذکر کیا تھا اور جس سے ناراض ہو کر ہم نے یرمیاہ (علیہ السلام) کو قید خانہ میں ڈال رکھا ہے وہ وقت آپہنچا مگر شومیٔ قسمت دیکھیے کہ انھوں نے اس حالت کو دیکھ کر اپنی بداعمالیوں اور بدکرداریوں پر اظہارِ ندامت اور درگاہِ الٰہی میں توبہ و انابت کی جانب پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنی مادی طاقت کے اسباب و وسائل پر بھروسہ کیا اور شاہِ بابل کی مقاومت کے لیے آمادہ ہو گئے نتیجہ یہ نکلا کہ وہ فلسطین و شام کے شہروں اور آبادیوں کو ویران اور مسمار کرتا ہوا بیت المقدس (یروشلم) کے دروازے پر آکھڑا ہوا۔ اب شاہِ یہودا یکونیاہ بن یہویقیم کو بجز اطاعت کوئی چارہ نہ رہا۔ بخوکدنذر، یروشلم میں لشکر سمیت داخل ہوا اور بادشاہ، سردار اور تمام امراء کو قید کر لیا اور شہر کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ لشکریوں نے تمام مال و متاع اور ہیکل کی تمام اشیاء کو لوٹ لیا اور توراۃ کے تمام نسخوں کو آگ میں جلا کر خاک کر دیا اور ہزارہا انسانوں کو قتل اور باختلافِ روایت ایک لاکھ سے زائد یہودیوں کو (جن میں بوڑھے، بچے، عورتیں اور مرد سب ہی تھے) بھیڑ بکری کی طرح ہنکاتا ہوا پاپیادہ پابابل لے گیا اور ان سب کو غلام و باندی بنا لیا، علاقہ فلسطین و شام کے لاکھوں انسانوں کو قتل و غارت کرنے کے علاوہ صرف دمشق میں اس نے بے تعداد یہودیوں کو تہِ تیغ کیا، حتیٰ کہ خود یہودیوں کی زبان پر یہ تھا کہ یہ انبیاء علیہم السلام کے ناحق قتل کرنے کی سزا ہے جو ہم کو شاہِ بابل کی شمشیرِ براں کے ذریعہ دی جا رہی ہے۔

ؔ باب ۲۴ آیت ۱۔

غرض شاہِ بابل کے اس حملہ نے یہوداہ کا ملک ہی ویران نہیں کیا بلکہ ان کے مذہب اور قوم کو بھی پارہ پارہ کر دیا چنانچہ یہود کے ان قیدیوں میں حضرت دانیال (اصغر) حضرت عُزیر اور بعض دوسرے وہ بزرگ بھی تھے جن کو خدائے تعالیٰ کی جانب سے قیامِ بابل کے زمانہ میں یہود کی اصلاح کے لیے نبوت سے سرفراز کیا گیا تا کہ وہ اس بُت پرست شاہنشاہی کی غلامی میں طاقت و آزادی سے محرومی کے ساتھ ساتھ دین و مذہب سے بھی محروم نہ ہو جائیں [۱]

ابنِ کثیر نے اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے کہ جب بنوکدنذر (بخت نصر) بیت المقدس میں داخل ہو کر سب کچھ برباد کر چکا تو اس کو اطلاع دی گئی کہ یہود نے اپنے ایک نبی یرمیاہ (علیہ السلام) کو اس بنیاد پر قید کر رکھا ہے کہ انھوں نے تیری آمد اور حملہ سے قبل اپنی قوم کو ان تمام باتوں کی خبر دیدی تھی جو آج پیش آئیں یہ سن کر شاہِ بابل نے ان کو زندان سے نکالا اور ان سے بات چیت کر کے بیحد متاثر ہوا اور اصرار کیا کہ اگر وہ بابل چلنے پر آمادہ ہوں تو اُن کو حکومت میں منصبِ جلیل دیا جائے گا اور اُن کی کیاست و فراست سے فائدہ اٹھایا جائے گا مگر حضرت یرمیاہ نے یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا کہ تیرے ہاتھوں میری بدقسمت قوم کا جو حال ہوا ہے اس کے بعد میرے لیے بابل جانا میری زندگی کا سب سے بدترین سانحہ ہوگا۔ میں تو اَب ان ہی کھنڈرات پر زندگی گزاروں گا۔ پس اے بادشاہ تو مجھ سے اس بارہ میں اصرار نہ کر شاہِ بابل یہ سن کر خاموش رہا اور بابل کو روانہ ہو گیا [۲]

**غلامی سے نجات** بابل کی غلامی کا یہ زمانہ یہود کے لیے کس درجہ یاس انگیز حسرت زا اور عبرتناک رہا ہوگا اس کا حقیقی اندازہ ہمارے اور آپ کے لیے بہت مشکل ہے بظاہر کوئی سہارا نہیں تھا کہ جس کے بل بوتہ پر وہ اپنی اس حالت میں انقلاب پیدا کر سکتے البتہ جب کہ وہ یسعیاہ اور یرمیاہ (علیہما السلام) کے مکاشفوں اور پیشین گوئیوں کی ابتدائی صداقت [۳] کا تجربہ کر چکے بلکہ اپنی زندگی پر انکو گزرتا ہوا دیکھ چکے تو

---

[۱] تاریخ ابن کثیر ج ۲ - [۲] ایضاً۔

[۳] شاہِ بابل نے یہود اور یروشلم کے ساتھ جو کچھ کیا اس کی خبر یہود کو پہلے سے دیدی گئی تھی اور بتا دیا گیا تھا کہ تمہاری بدکاریوں کا اگر یہی حال رہا تو تم ایک بُت پرست بادشاہ بنوکدنذر کے ہاتھوں ذلیل و رسوا کیے جاؤ گے یہ پیشین گوئی بھی یسعیاہ اور یرمیاہ کے صحیفوں میں آج تک موجود ہے۔ (باقی بر صفحۂ آئندہ)

ان کے لیے امید کی ایک یہ جھلک ضرور باقی تھی کہ ان مکاشفوں اور پیشین گوئیوں میں ساتھ ہی یہ بھی خبر دی گئی تھی کہ یہود بابل میں ستر برس غلام رہیں گے اور ستر برس گزرنے پر فارس سے ایک بادشاہ کا ظہور ہوگا جو خدا کا مسیح اور اس کا چرواہا کہلائے گا اور وہ یہود اور یروشلم کا نجات دہندہ ہوگا یہ پیشین گوئی حضرت یسعیاہ نے واقعہ سے تقریباً ایک سو ساٹھ برس اور حضرت یرمیاہ نے ساٹھ برس قبل یہوداہ کو ان کی تباہی و بربادی کی پیشین گوئی کے ساتھ ساتھ سُنادی تھی حتیٰ کہ قیام بابل کے دوران میں پیشین گوئی کے ظہور سے تھوڑے زمانہ قبل دانیال (علیہ السلام) نے اپنے مکاشفہ میں اس شاہِ فارس کو ایک ایسے مینڈھے کی شکل میں دیکھا تھا جس کے دو سینگ (قرنین) ہیں' اور جبرئیل علیہ السلام نے اس کی یہ تعبیر دی ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ بادشاہ مادہ (میڈیا) اور فارس دو بادشاہتوں کو ملا کر بادشاہی کرے گا اور اسی مکاشفہ میں انھوں نے یہ بھی دیکھا کہ ایک اور بکرا ہے جس کی پیشانی پر صرف ایک سینگ ہے اور اس نے دو سینگ والے مینڈھے کو مغلوب کر لیا ہے اور پھر جبرئیل علیہ السلام نے اس کی تعبیر یہ دی کہ یہ ایک ایسا زبردست بادشاہ ہوگا جو ایران کی اس شاہنشاہی کا خاتمہ کر کے اس پر قابض ہو جائے گا (یعنی سکندر یونانی)

---

بقیہ صفحہ گذشتہ : تب یسعیاہ نبی نے حزقیاہ بادشاہ کے پاس آ کر اس سے کہا کہ ان شخصوں نے کیا کہا اور وہ کہاں سے تیرے پاس آئے؟ حزقیاہ نے جواب دیا کہ ایک دور ملک بابل ہی سے میرے پاس آئے تب اس نے کہا کہ انھوں نے تیرے گھر میں کیا کیا دیکھا؟ حزقیاہ نے جواب دیا سب کچھ کہ جو میرے گھر میں ہے انھوں نے دیکھا تب یسعیاہ نے حزقیاہ کو کہا کہ رب الافواج کا کلام سن دیکھ وہ دن آتے ہیں کہ وہ سب کچھ جو کہ تیرے گھر (یروشلم) میں ہے اور جو کچھ تیرے باپ دادوں نے آج کے دن تک ذخیرہ کر رکھا ہے اُٹھا کے بابل کو لے جائیں گے۔ خداوند فرماتا ہے کوئی چیز باقی نہ چھوٹے گی اور وہ تیرے بیٹوں میں سے جو تیری نسل سے ہوں گے اور تجھ سے پیدا ہوں گے لیجائیں گے' اور وہ شاہِ بابل کے قصر میں خواجہ سرا ہوں گے (باب ۳۹ آیات ۳-۷)

یہ پیشین گوئی حضرت یسعیاہ نے اس وقت کی تھی جب کہ بخوکد نزر سے بہت پہلے بابل کے بادشاہ مرودک نے یہوداہ کے بادشاہ حزقیاہ کے پاس اپنے ایلچی بھیجے تھے اسی طرح حضرت یرمیاہ کی کتاب میں ہے۔

اس لیے رب الافواج یوں کہتا ہے تم نے میری باتیں نہیں سنیں تو دیکھو میں شمال کے سارے گھرانوں کو اور بخوکد نزر کو جو کہ میرا غلام ہے بلا بھیجوں گا خداوند کہتا ہے اور میں انھیں اس سرزمین اور اس کے باشندوں پر اور ان ساری قوموں پر جو چہار جانب ہیں چڑھائی کرواؤں گا۔ لہ باب ۲۵۔ آیات ۹-۸

چنانچہ یرمیاہ کی کتاب میں بصراحت یہ مدت مذکور ہے :۔

اور یہ ساری سرزمین ویرانہ اور حیرانی کا باعث ہوجائے گی اور یہ قومیں ستر برس تک بابل کے بادشاہ کی غلامی کریں گی۔[1]

اور ایسا ہوگا "خداوند کہتا ہے" کہ جب ستر برس ہوں گے میں بابل کے بادشاہ کو اور اس کی قوم کو اور کسدیوں (بابلیوں) کی سرزمین کو ان کی بدکرداری کے سبب سزا دوں گا اور میں اسے ایسا اُجاڑوں گا کہ ہمیشہ تک ویرانہ رہے۔[2]

خداوند یوں کہتا ہے کہ جب بابل میں ستر برس گزر چکیں گے تو میں تمہاری خبر لینے آؤں گا اور تمہیں اس مکان میں پھر لانے سے اپنی اچھی بات تم پر قائم کروں گا۔[3]

اور ان ہی پیشین گوئیوں میں یہ بھی بتا دیا گیا تھا کہ یہود کو بابل کی غلامی سے نجات دینے والی ہستی کا ایران سے ظہور ہوگا اور اس کا نام خورس ہوگا اس کی حکومت اور شاہنشاہیت کا فروغ خداوند اسرائیل کی کرشمہ سازیوں کا نتیجہ ہوگا اور جو بات ان کے گذشتہ بادشاہوں کو نصیب نہیں ہوئی اُس کو نصیب ہوگی، کیونکہ وہ خدا کا چرواہا، مسیح (مُبارک) اور بنی اسرائیل کا نجات دہندہ ہوگا۔ چنانچہ یسعیاہ کی کتاب میں اس کے ظہور کی خبر صاف الفاظ میں اس طرح دی گئی ہے :۔

(میں خداوند بنی اسرائیل کا خدا) یروشلم کی بابت کہتا ہوں کہ وہ آباد کی جائے گی اور یہوداہ کے شہروں کی بابت کہتا ہوں کہ وہ بنائے جائیں گے اور میں اس کے ویران مکانوں کو تعمیر کروں گا جو سمندر کو کہتا ہوں کہ سوکھ جا اور میں تیری ندیاں سوکھا ڈالوں گا۔ جو خورس کے حق میں کہتا ہوں کہ وہ میرا چرواہا ہے اور وہ میری ساری مرضی پوری کرے گا اور ہیکل کی بابت کہ اس کی بنیاد ڈالی جائیگی خداوند اپنے "مسیح" خورس کے حق میں یوں فرماتا ہے کہ میں نے اس کا داہنا ہاتھ پکڑا کہ اُمتوں کو اس کے قابو میں کروں اور بادشاہوں کی کمریں کھلوا ڈالوں اور دوہرائے ہوئے دروازے اس کے لیے کھول دوں اور وہ دروازے بند نہ کیے جائیں گے ...... میں ہی خداوند ہوں اور کوئی نہیں میرے سوا کوئی خدا نہیں میں نے تیری کمر باندھی اگرچہ تو نے مجھے نہ پہچانا تاکہ لوگ

[1] باب ۲۵ آیات ۱۱ [2] باب ۲۵ آیات ۱۳-۱۲ [3] باب ۲۹ آیات ۱۱-۱۰

سورج نکلنے کی اطراف سے اور سورج کے غروب ہونے کی اطراف تک جانیں کہ میرے سوا کوئی نہیں میں ہی خداوند ہوں...... میں نے اس کو صداقت کے لیے برپا کیا ہے اور میں اس کی ساری راہیں آراستہ کروں گا وہ میرا شہر بنائے گا اور میرے اسیروں کو بغیر قیمت اور عوض لیے چھڑائے گا...... اے اسرائیل کے خدا نجات دینے والے وہ سب کے سب پشیمان اور سراسیمہ بھی ہوں گے وہ جو بُت تراش (اہلِ بابل) ہیں سب کے سب گھبرا جائیں گے پھر اسرائیل خداوند میں ہو کے ابدی نجات کے ساتھ رہائی پائے گا۔[1]

گزرو، آستانہ پر سے گزرو، لوگوں کے لیے راہ راست کرو اور شاہراہ اونچی کرو، پتھر سر کا دو قوموں کے لیے جھنڈا کھڑا کرو، دیکھو خداوند دنیا کی سرحدوں تک منادی کرتا ہے کہ صیہون کی بیٹی کو کہو دیکھو تیرا نجات دینے والا آتا ہے دیکھو اس کا اجر اس کے ساتھ اور اس کا کام اس کے آگے ہے۔[2]

بابل کی بابت وہ الہامی بات جسے اموص کے بیٹے یسعیاہ نے رویا میں دیکھا...... میں نے اپنے مخصوص کیے ہوؤں کو حکم کیا۔ میں نے اپنے بہادروں کو جو میری خداوندی سے مسرور ہیں کہ وہ میرے قہر کو انجام دیں...... رب الافواج جنگی لشکر کی موجودات لیتا ہے وہ دور ملک سے آسمان کی انتہا کی طرف سے آتے ہیں...... دیکھو میں مادیون (میڈیا والوں کو) ان پر چڑھاؤں گا جو کہ روپیہ کو خاطر میں نہیں لاتے اور سونے سے خوش نہیں ہوتے۔[3]

اور یرمیاہ کی کتاب میں مذکور ہے :۔

دیکھ میں اتر کی سرزمین سے بڑی قوموں کے ایک گروہ کو برپا کروں گا اور بابل پر لے آؤں گا۔ ...... کسدستان (بابل) لوٹا جائے گا سب جو اسے لوٹیں گے آسودہ ہوں گے" خداوند کہتا ہے۔[4] "اس لیے خداوند یوں کہتا ہے دیکھ میں تیری حجت ثابت کروں گا اور تیرا انتقام لوں گا اور اس (بابل) کے دریا سکھا دوں گا اور اس کے سوتے خشک کر دوں گا اور بابل کھنڈر ہو جائے گا اور گیدڑوں کا مقام اور حیرانی کا باعث ہوگا اور اس میں کوئی نہ بسے گا...... کیونکہ حملہ آور اس پر چڑھے ہیں...... بابل سے رونے کی آواز اور بڑی ہلاکت

[1] یسعیاہ باب ۴۰ آیت ۲۸-۲۹ و باب ۴۱ آیت ۱۲- [2] باب ۶۲ آیت ۱۰-۱۱- [3] باب ۱۳ آیت ۱-۱۷- [4] باب ۵۰-

کی صدا کسدیوں کی سرزمین سے آتی ہے کیونکہ خداوند بابل کو غارت کرتا ہے ....... بابل کے بھاری شہر کی دیواریں سراسر ڈھائی جائیں گی اور اس کے بلند پھاٹک آگ سے جلا دیے جائیں گے[1]

توراۃ کے ان بیان کردہ واقعات کی تصدیق تاریخ کے روشن صفحات اس طرح کرتے ہیں کہ:

تقریباً ۶۳۵ قبل مسیح ایران میں قبائلی طرز حکومت رائج تھا اور ایران دو حصوں پر تقسیم تھا جہاں دو چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم تھیں ان میں سے شمال مغربی حصہ میڈیا (مادہ یا ماٹ) کہلاتا تھا اور جنوبی حصہ پارس کے نام سے موسوم تھا مگر اس دور میں چونکہ بابل و نینویٰ کی حکومتیں زبردست اور قاہر حکومتیں تھیں اس لیے یہ دونوں ریاستیں نینویٰ کی حکومت کے زیر اثر اور ماتحت سمجھی جاتی تھیں۔ لیکن جب ۶۱۲ھ ق م نینویٰ تباہ ہو گیا اور آشوری حکومت کا خاتمہ ہو گیا تو اگرچہ میڈیا کو آزادی نصیب ہو گئی اور وہاں قومی حکومت کے جذبات ابھرنے لگے اور ایک حکمراں شاہی خاندان بھی پیدا ہو گیا تاہم پارس اور میڈیا دونوں ریاستوں کو آزاد سلطنت قائم کر لینے کی جرأت نہ ہو سکی اور بابلی حکومت کو بیحد فروغ ہو گیا گویا نینویٰ کی تباہی نے بابل کی طاقت کو بہت بڑی شاہنشاہیت میں تبدیل کر دیا جس کے سامنے یہ ریاستیں بے اثر ہی رہیں۔ یہ کیفیت سنہ ۵۶۰ تک رہی لیکن سنہ ۵۵۹ ق م میں اچانک میڈیا کے رئیس کبوجیہ (کیقباد) کے جانشین کے ارش (خورس) نے غیر معمولی حالات کے ساتھ ظہور کیا اور چند ہی روز میں میڈیا اور فارس کی ریاستوں نے برضا و رغبت اس کو اپنا واحد شاہنشاہ تسلیم کر لیا اور وہ بغیر کسی خونریزی کے ایشیائے کوچک کے تمام علاقوں کا زبردست اور خود مختار شاہنشاہ بن گیا۔

اہل فارس اس کو کے ارش اور گورش کہتے ہیں لیکن یہ یونانی میں سائرس اور عبرانی میں خورس اور عربی میں کیخسرو کے ناموں سے مشہور ہے۔

کے ارش کے ظہور سے یونانی اور یہودی دو قومیں خصوصیت کے ساتھ متعارف ہیں اسلیے کہ ان دونوں قوموں پر اس کی حکومت کا موافق اور مخالف حیثیت سے نمایاں اثر پڑا اور یہود کیلئے تو اس کا عروج و ظہور خوش حالی، آزادی اور امن و اطمینان کا بہت بڑا سبب بنا اسی لیے وہ

[1] باب ۵۱۔

اس کی شخصیت کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور ان کے انبیار کے صحیفوں میں اس کو "خدا کا چرواہا" مسیح اور بنی اسرائیل کا نجات دہندہ" کہا گیا ہے۔ مگر اہلِ عرب قبل از اسلام اس کی شخصیت سے زیادہ متعارف نہیں تھے اور بعد از اسلام جب مسلمانوں نے ایران کو فتح کیا تب بھی ان کو اس کی شخصیت کے تعارف سے اس لیے واسطہ نہیں پڑا کہ یہ ایران کے دورِ اوّل کا ہیرو ہے اور مسلمانوں کی فتوحات کا تعلق تمام تر ایران کے تیسرے دور سے متعلق ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں اس کے نام اور شخصیت کے تعین میں بھی اختلاف نظر آتا ہے، چنانچہ بعض مؤرخینِ عرب نے اس کو بہمن بن اسفندیار کہا ہے اور بعض نے ذوالقرنین کی شخصیت پر بحث کرتے ہوئے اس کا نام کیقباد بیان کیا ہے حالانکہ ایران و یونان کے وہ مؤرخین جو کے ارش کے معاصر ہیں کیقباد (کمبوجیہ) اس کے باپ اور اس کے بیٹے کا نام بتاتے ہیں اور بعض عرب مؤرخین نے اس کو لہراسپ بن کشتاسپ بتایا ہے [۱]

غرض جب گورش یا خورس میڈیا (ماہات) اور پارس دونوں ریاستوں کو ملا کر ایک زبردست اور خود مختار بادشاہ ہوگیا تو یہ وہ وقت ہے کہ بابل کے تختِ سلطنت پر بنوکدنزر (بخت نصر) کا ایک جانشین بیل شازار سریر آرائے سلطنت تھا۔

یہ بادشاہ بخت نصر کی طرح اگرچہ جری اور بہادر نہیں تھا مگر ظلم اور عیاشی میں اس سے بھی آگے تھا حتیٰ کہ خود اس کی اپنی رعایا اس کے اعمالِ بد سے سخت پریشان اور اس کے ظلم سے عاجز اور ہر وقت انقلاب کی خواہاں رہتی تھی اور یہ وہ زمانہ تھا جب کہ حضرتِ دانیال اپنی الہامی پیشین گوئیوں، کریمانہ اخلاق، عالی صفات اور غیر معمولی فہم و فراست کی وجہ سے پبلک میں اس درجہ مقبول تھے کہ حکومت کے نظامِ کار میں دخیل اور مشیر بن گئے تھے۔ انھوں نے بیل شازار کو ہر چند سمجھایا اور بداعمالیوں سے روکا اور ڈرایا مگر اس پر مطلق اثر نہ ہوا اور ایک دن اس نے یہ نوبت پہنچا دی کہ اپنی محبوبہ کے اصرار پر یروشلم کے مقدس ظروف کو جو بخت نصر لوٹ کر لایا تھا مجلسِ نشاط

---

[۱] یہ مسئلہ ذوالقرنین کی بحث میں زیادہ واضح کیا جائے گا۔

میں منگوا کر ان میں شراب پی اور اُن کی توہین کی مگر ابھی وہ شراب نوشی میں مشغول ہی تھا کہ اس نے شمع کافوری کی روشنی میں یہ منظر اپنی آنکھ سے دیکھا کہ بغیر کسی شکل وصورت کے سامنے آتے ہوئے ایک ہاتھ غیب سے ظاہر ہوا اور اس نے محل کی دیوار پر چند جملے لکھ دیئے یہ دیکھ کر بادشاہ پر بہت ہیبت طاری ہوگئی اور اس نے فوراً نجومیوں، کاہنوں، جوتشیوں اور بڑے بڑے عقلاء و حکماء کو جمع کیا اور اُن سے اس واقعہ کو نقل کر کے تحریر کا مفہوم معلوم کرنا چاہا لیکن کوئی اس عقدہ کو حل نہ کر سکا اور وہ بھی بادشاہ کی طرح حیران رہ گئے، تب ملکہ نے کہا کہ آپ اس برگزیدہ انسان دانیال کو بلائیں جس کی باتیں ہمیشہ سچی ہوتی ہیں اور جو اپنے اعمال و کردار میں بے نظیر انسان ہے وہی اس کو حل کر سکتا ہے۔

حضرت دانیال دربار میں پہنچے تو بادشاہ نے واقعہ نقل کیا اور کہا کہ اگر تم اس کو حل کر دو تو میں تم کو دولت و ثروت سے مالا مال کر دوں گا۔ دانیال علیہ السلام نے ہنس کر جواب دیا کہ مجھے بادشاہ کی دولت درکار نہیں ہے میں بغیر کسی عوض کے ہی بادشاہ کے اس عقدہ کو حل کر دوں گا اے بادشاہ گوش ہوش سے سن! خدا نے تجھ کو قوت اور دولت دونوں سے حصۂ وافر عطا فرمایا اور نبیوں کی اولاد تک تیرے حوالہ کر دی مگر تو نے خدا کا شکر ادا نہ کیا اور جس نیک کرداری کی تجھ سے توقع ہو سکتی تھی وہ تو نے پوری نہ کی اور حد یہ ہے کہ تو نے مجلس نشاط میں یروشلم کے ظروف کی توہین کر کے گویا یروشلم کے خدا کو چیلنج کیا چنانچہ اس کی جانب سے تجھ کو وہ جواب ملا جو تو نے نوشتہ میں دیکھا، نوشتہ کہتا ہے کہ ہم نے تجھ کو وزن کیا اگر تو پورا نہ اترا اور کم نکلا ہم نے تیری حکومت کا حساب کیا اور اس کو تمام کر ڈالا اور ہم نے تیری حکومت پارہ پارہ کر کے فارس اور میڈیا کے بادشاہ کو بخش دی۔[1]

چنانچہ اس واقعہ کو چند دن بھی نہ گزرے تھے کہ بابل کی رعایا نے چند افسروں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ خورس کے پاس جائیں اور اس سے عرض کریں کہ آپ کی ایمانداری، عدل و انصاف اور رعایا پروری کی شہرت نے ہم کو مجبور کیا ہے کہ ہم آپ کو دعوت دیں کہ آپ ہم کو بیل شازار کے مظالم سے نجات دلا کر اپنی رعایا بنا لیجیے۔ خورس کے پاس یہ وفد اس وقت پہنچا جبکہ وہ مشرق کی مہم

---

[1] نوشتہ کے الفاظ یہ ہیں "منی منی تقیل اوف یوسین" دانی ایل کی کتاب باب ۵ آیات ۲۸-۲۵۔

سر کرنے میں مشغول تھا اس نے وفد کی درخواست کو سنا اور قبول کیا اور مشرقی مہم سے فارغ ہو کر بابل پہنچا اور اس کی مستحکم اور نہ تسخیر ہونے والی دوہری شہر پناہ کو منہدم کر کے حکومت بابل کا خاتمہ کر دیا اور تمام رعایا کو امن دے کر ان کو بیل شازار کے مظالم سے نجات دلائی جس کا بابل کی رعایا نے بیحد شکریہ ادا کیا اور بخوشی اس کی اطاعت قبول کر لی [1]

جب خورس بابل کے شہر میں فاتحانہ داخل ہوا تو دانیال (علیہ السلام) نے اس کو توراۃ (صحف انبیاء) کی وہ پیشین گوئیاں دکھائیں جو حضرت یسعیاہ اور حضرت یرمیاہ نے یہود کو غلامی سے نجات دلانے والی ہستی کے متعلق کی تھیں، خورس ان کو دیکھ کر بیحد متاثر ہوا اور اس نے اعلان کر دیا کہ تمام یہود آزاد ہیں کہ وہ ملک شام و فلسطین کو واپس چلے جائیں اور وہاں جا کر خدا کے مقدس گھر یروشلم (بیت المقدس) اور اس کے ہیکل (مسجد) کو دوبارہ تعمیر کریں اور اس سلسلہ کے تمام اخراجات سرکاری خزانہ سے ادا کیے جائیں، اور یہ بھی اعلان کیا کہ یہی دین، دینِ حق ہے اور یروشلم کا خدا ہی سچا خدا ہے۔

"عزرا کی کتاب" میں ہے کہ اگرچہ خورس کی بدولت یہود کو دوبارہ آزادی اور خوش حالی نصیب ہوئی اور ہیکل کی تعمیر بھی شاہی خزانہ سے شروع ہو گئی مگر ابھی تکمیل نہیں ہوئی تھی کہ خورس کا انتقال ہو گیا اور اس کا بیٹا کیقباد (کمبوجیہ) بھی جلد مر گیا تب آٹھ سال کے اندر ہی دارا جو خورس کا چچازاد بھائی تھا اس کا جانشین ہوا اس درمیان میں بعض مخالف افسروں نے یروشلم کی تعمیر کو جبراً روک دیا۔ تب حجّی نبی اور زکریا [2] نبی نے دارا کے دربار میں ایک مراسلہ بھیجا جس میں تعمیرِ بیت المقدس کے متعلق لکھتے ہوئے اس کو بتایا تھا کہ سرکاری دفتر میں خورس کا وہ حکم نامہ ضرور موجود ہو گا جس میں بیت المقدس کی تعمیر کا حکم اور خزانہ شاہی سے اخراجات کا ذکر کیا گیا ہے آپ اس کو نکلوائیں اور اپنے متعلقہ افسروں کو حکم دیں کہ جو بھی اس کی تعمیر میں حائل ہو رہے ہیں اُن کو روک دیں تاکہ ہم باطمینان اس کی تعمیر کر سکیں چنانچہ دارا نے جب خورس کا حکم نامہ دفتر سے طلب کیا تو اس میں یہ تحریر تھا:

خورس بادشاہ کی سلطنت کے پہلے سال مجھ خورس بادشاہ نے خدا کے گھر کی بابت جو یروشلم میں ہے یہ حکم کیا کہ

---

[1] تاریخ کے یہ واقعات مع حوالجات ذوالقرنین کی بحث میں مفصل بیان ہوں گے۔
[2] یہ زکریا یحییٰ علیہ السلام کے والد نہیں ہیں بلکہ دوسرے نبی ہیں۔

وہ گھر اور وہ مکان جہاں قربانیاں کرتے ہیں بنایا جائے اور اس کی بنیادیں مضبوطی سے ڈالی جائیں، اور خرچ بادشاہ کے خزانہ سے دیا جائے اور خدا کے گھر کے سنہرے روپہلے برتن بھی جنھیں بنوکدنضر (یروشلم) کی ہیکل سے نکال لایا اور بابل میں لا رکھا سو پھیر دیے جائیں اور یروشلم کی ہیکل میں اپنی اپنی جگہ رکھ دیے جائیں یعنی خدا کے گھر میں رکھ دیے جائیں [۱]

پس اس حکم کے مطابق دارا نے یروشلم کی تکمیل کا حکم دیا اور افسروں کو سختی کے ساتھ روک دیا کہ کوئی اس میں ہرگز مزاحم نہ ہو اور یروشلم اور خدائے یروشلم کے ساتھ اپنی اور اپنے پیشرو کی عقیدت کا ان الفاظ میں اظہار کیا :

میں ایک اور حکم کرتا ہوں کہ جو شخص اس فرمان کو ٹال دے اس کے گھر پر سے کوئی لٹھا کھینچ کر نکالا جائے اور وہ کھڑا کیا جائے اور وہ اس پر پھانسی دیا جائے اس بات کے لیے اس کا گھر کوڑے کا ڈھیر کر دیا جائے پر وہ خدا جس نے اپنا نام وہاں رکھا ہے سب بادشاہوں اور لوگوں کو جو اس حکم کو بدل کے خدا کا وہ گھر جو یروشلم میں ہے بگاڑنے کو ہاتھ بڑھاتے ہوں غارت کرے میں (دارا) حکم دے چکا اس پر جلد عمل کرنا چاہیئے [۲]

چنانچہ جلد ہی حجی اور زکریاہ (علیہما السلام) انبیاء بنی اسرائیل کی نگرانی میں دارا کے نہر پار کے صوبہ دار تتنی اور شتر بوزنی اور ان کے رفقاء نے اس تعمیر کو مکمل کرا دیا۔ عزرا کی کتاب میں ہے:

چنانچہ انھوں نے اسرائیل کے خدا کے حکم کے مطابق اور فارس کے بادشاہ خورس اور دارا اور ارتخششتا کے حکم کے مطابق تعمیر کی اور کام کو انجام تک پہونچایا۔[۳]

یہود بنی اسرائیل کو اب پھر ایک بار امن و اطمینان نصیب ہوا اور انھوں نے ارض یہوداہ میں دوبارہ اپنی حکومت کو استوار کیا اور چونکہ شاہ بابل نے توراۃ کے تمام نسخوں کو بھی جلا کر خاک کر دیا تھا اور ستر برس تک وہ خدا کی اس کتاب سے محروم رہے تھے اس لیے ان کے اصرار پر حضرت عزیر (عزرا) علیہ السلام نے اپنی یادداشت سے از سرِ نو اس کو تحریر کیا۔

شرارت یہود کا دوسرا دور | یہود کی قومی خصائل و عادات سے متعلق کافی معلومات کے بعد آپ کے لیے

[۱] عزرا باب ۶ آیات ۵-۱ [۲] باب ۶ آیت ۱۲-۱۱ [۳] باب ۶ آیات ۱۴-۱۳

یہ بات حیرت انگیز نہیں ہو سکتی کہ اتنی سخت ٹھوکر کھانے اور ذلت و رسوائی کی اس عبرت ناک سزا کو برداشت کرنے کے باوجود جن کی تفصیلات ابھی سپردِ قلم ہو چکی ہیں، ان کی چشمِ عبرت اور گوشِ حق نیوش میں کوئی حرکت پیدا نہیں ہوئی اور ان کی حالت اس آیت کا مصداق ثابت ہوئی لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا یعنی آہستہ آہستہ انھوں نے پھر ظلم و فساد اور بغاوت و سرکشی پر کمر باندھ لی اور گذشتہ بداخلاقیوں اور بدکرداریوں کا مظاہرہ شروع کر دیا۔

کچھ یہ بھی نہیں تھا کہ کوئی ان کو سمجھانے اور تنبیہ کرنے والا نہیں تھا کیونکہ خدائے تعالیٰ کے سچے پیغمبروں کا سلسلہ ان میں جاری تھا اور وہ ان کو سیدھی راہ پر لگانے اور بری راہ سے بچانے کے لیے برابر پند و نصیحت اور موعظت و بصیرت کا حق ادا کرتے رہتے تھے مگر ان کے قومی مزاج کا توازن اس درجہ خراب ہو چکا تھا کہ ان پر کسی اچھی بات کا اثر ہی نہیں ہوتا تھا اور بادشاہ سے لے کر رعایا تک سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے تھے وہ پیغمبرانِ حق کا مذاق اڑاتے، باطل کوشی کو شیرِ مادر سمجھتے اور اپنی حرکاتِ بد پر شرمندہ ہونے کی بجائے فخر کرتے رہتے تھے پھر صورتِ حال اس حد پر جا کر بھی ختم نہیں ہوئی بلکہ اسی درمیان میں ایک ایسا ہوش ربا حادثہ پیش آگیا جس نے یہود کی دناءت اور باطل کوشی کو دوست دشمن دونوں کی نگاہ میں بخوبی روشن کر دیا۔

**حضرت یحییٰ علیہ السلام کا قتل**

اس ہوش ربا حادثہ کی تفصیل یہ ہے کہ انبیاءِ بنی اسرائیل میں سے یہ عہد حضرت یحییٰ علیہ السلام کی تبلیغ و دعوت کا عہد تھا اور ارضِ یہودیہ میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کے مواعظ کا یہ اثر ہو رہا تھا کہ بنی اسرائیل کے قلوب مسخر ہوتے جاتے تھے اور وہ جس جانب بھی نکل جاتے تھے جماعتِ کثیر ان پر پروانہ وار نثار ہونے لگتی تھی ادھر تو یہ حالت تھی اور دوسری جانب یہودیہ کا بادشاہ ہیرودیس نہایت ہی بدکار اور ظالم تھا وہ حضرت یحییٰ کی مقبولیت دیکھ دیکھ کر لرزہ براندام تھا اور خوف کھاتا تھا کہ کہیں یہودیہ کی بادشاہت میرے ہاتھ سے نکل کر اس مردِ ہادی کے پاس نہ چلی جائے، سو اتفاق کہ ہیرودیس کے سوتیلے بھائی کا انتقال ہو گیا اس کی بیوی ہیرو

حسین تھی اور ہیرودیس کی بھاوج ہونے کے علاوہ اس کی علاتی بھتیجی بھی تھی، ہیرودیس اس پر عاشق ہوگیا اور اس سے عقد کرلیا، چونکہ یہ عقد اسرائیلی ملت کے خلاف تھا اس لیے حضرت یحییٰ علیہ السلام نے سرِ دربار اس کو اس حرکت پر ملامت کی اور خدا کے خوف سے ڈرایا۔ ہیرودیس کی محبوبہ نے یہ سنا تو غم و غصہ سے بے تاب ہوگئی اور ہیرودیس کو آمادہ کیا کہ وہ یحییٰ (علیہ السلام) کو قتل کردے، ہیرودیس اگرا س نصیحت سے خود بھی بہت برافروختہ تھا مگر اس ارادہ میں متامل تھا لیکن محبوبہ کے اصرار پر اس نے حضرت یحییٰ (علیہ السلام) کا سر قلم کرکے اور طشت میں رکھ کر اس کے پاس بھجوادیا۔ سخت حیرت کا مقام ہے کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کی محبوبیتِ عام کے باوجود کسی اسرائیلی کو یہ جرأت نہیں ہوئی کہ ہیرودیس کی اس ملعون حرکت پر اس کو روکے یا ملامت کرے۔ بلکہ ایک جماعت نے اس کے اس ملعون عمل کو بنظرِ استحسان دیکھا۔ اب حضرت یحییٰ علیہ السلام کی شہادت کے بعد حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی دعوت و تبلیغ کا وقت آگیا اور انھوں نے علی الاعلان یہود کی بدعات مشرکانہ رسوم ظالمانہ خصائل اور بددینی کے خلاف جہادِ لسانی شروع کردیا۔ یہود میں یہ صلاحیت کہاں تھی کہ وہ امرِ حق پر لبیک کہتے۔ چنانچہ مختصر سی تعداد کے ماسوا بھاری اکثریت نے ان کی مخالفت شروع کردی، اسی درمیان میں نبطی بادشاہ حارث نے جو ہیرودیس کی پہلی بیوی کے رشتہ سے اس کا خسر تھا اس پر چڑھائی کردی اور سخت کشت و خون کرکے ہیرودیس کو ہزیمتِ فاش دی جس نے ہیرودیس کی قوت کا خاتمہ کردیا تاہم یہودیہ کی ریاست رومیوں کے بل بوتے پر قائم رہی، اس وقت اگرچہ عام طور پر یہود یہ کہتے تھے کہ ہیرودیس اور اسرائیلیوں کو یہ ذلت و ہزیمت حضرت یحییٰ علیہ السلام کے خونِ ناحق کی پاداش میں پیش آئی لیکن اس کے باوجود انھوں نے اس حادثہ سے کوئی سبق نہیں لیا اور وہ اپنے ظالمانہ مقاصد سے باز نہ آئے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مخالفت میں بغض و عناد کے ساتھ سرگرم رہے تا آنکہ شاہِ یہودیہ پلاطس سے ان کے قتل کی اجازت حاصل کرکے ان کا محاصرہ کرلیا، مگر خدائے تعالیٰ نے ان کے ارادوں کو ناکام بناکر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ آسمان پر اٹھالیا۔[1]

پاداشِ عمل | آخر پاداشِ عمل سامنے آئی اور اب خود یہودیوں کے باہم خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ وجہ

یہ پیش آئی کہ اس دور میں یہود کے تین فرقے ہو گئے تھے ایک فقہاء کی جماعت تھی اور ان کو "فریسی" کہتے تھے اور دوسری جماعت اصحابِ ظاہر کی تھی جو الہامی الفاظ کے ظاہر پر جمود کرتے تھے ان کو "صدوقی" کہتے تھے اور تیسری جماعت مرتاض راہبوں کی تھی ان میں سے فریسی اور صدوقی کا اختلاف اس درجہ ترقی کر گیا تھا کہ ان میں سخت خونریزیاں ہونے لگیں، شاہِ یہودیہ جس گروہ کا طرفدار ہو جاتا تھا وہ دوسرے گروہ کو بے دریغ قتل کرتا تھا آخر یہ جنگ اس قدر بڑھی کہ شاہِ یہودیہ کو باغیوں کے خلاف رومیوں سے مدد لینی پڑتی تھی اور بُت پرستوں کے ہاتھوں یہودیوں کو قتل کرایا جاتا تھا، چنانچہ اس کشمکش میں رفعِ عیسیٰ علیہ السلام سے تقریباً ستر سال بعد یہود کے دو مدعیانِ حق یوحنان اور شمعون کے درمیان سخت معرکۂ جنگ و جدل برپا ہوا، یہ وہ زمانہ تھا جب کہ تختِ روم پر اُس کا ایک بہادر جرنیل اسنبانوس قیصری کر رہا تھا اور ارضِ یہودیہ میں یوحنان کو کامیابی ہو گئی تھی جو نہایت سفاک اور بدکار تھا اور اس کے ظالم ساتھیوں کے ہاتھوں ارضِ قدس کی تمام گلی کوچوں میں خون کی ندیاں بہ رہی تھیں، اس حالت میں یہود نے اسنبانوس سے مدد چاہی اور اس نے اپنے بیٹے طیطوس (ٹیٹس) کو ارضِ مقدس کی فتح پر مامور کیا، وہ آگے بڑھا اور ارضِ یہودیہ کے قریب جا کر اپنے ایک قاصد نیقانوس کو صلح کے لیے بھیجا۔ یہود کا پارۂ ظلم و ستم بہت چڑھا ہوا تھا انھوں نے اسکو بھی قتل کر دیا اب طیطوس غضب ناک ہو گیا اور اس نے کہا کہ بلا لحاظ کسی فرقہ کے تمام یہود کا استیصال کر کے جاؤں گا تاکہ ہمیشہ کے لیے اس سرزمین سے یہ جھگڑا پاک ہو جائے، چنانچہ بقول مؤرخین اس نے بیت المقدس پر اس قدر سخت حملہ کیا کہ شہر پناہ منہدم ہو گئی ہیکل کی دیواریں شکستہ ہو گئیں، محاصرہ کی طوالت سے ہزاروں یہود بھوکے مر گئے اور ہزاروں فرار ہو کر بے وطن ہو گئے اور جو بچے تھے وہ تلوار کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ رومیوں نے ہیکل کی بے حرمتی کی اور جہاں خدائے واحد کی عبادت ہوتی تھی وہاں بُت جا کر رکھ دیے[1]

غرض یہ وہ شکست تھی کہ پھر یہود کبھی نہ ابھرے اور اپنی کمینہ اور ظالمانہ حرکات، علانیہ فسق و فجور اور نبیوں کے قتل کی پاداش میں ہمیشہ کے لیے ذلیل و خوار ہو کر رہ گئے۔

[1] ابن خلدون ج ۲۔

تیسرا زرین موقعہ اور یہود کی رُوگردانی

کچھ عرصہ بعد رومیوں نے بُت پرستی ترک کر کے عیسائیت اختیار کر لی اور اس طرح ان کے عروج و ترقی نے یہودی قومیت اور مذہب دونوں کو مغلوب و مقہور بنا دیا۔

آپ ابھی مطالعہ کر چکے ہیں کہ جب طیطوس رومی نے بیت المقدس کو برباد کر دیا تو یہودیوں کی ایک کافی تعداد وہاں سے بھاگ کر اطراف و جوانب میں جا بسی تھی ان ہی میں سے بعض وہ قبائل بھی ہیں جو یثرب (حجاز) اور اس کے قرب و جوار میں ساکن ہو گئے تھے یہ اور ان سے قبل و بعد جو قبائلِ یہود یہاں آکر سکونت پذیر ہوئے ان کے اس انتخابِ سکونت کے متعلق مؤرخین کی رائے یہ ہے کہ یہود کو توراۃ اور قدیم صحیفوں سے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ یہ سرزمین نبی آخر الزماں کا دار الہجرۃ بنے گی اور یہود نبی آخر الزماں کے اس درجہ منتظر تھے اور ان کے یہاں اُن کی آمد کی اس قدر شہرت تھی کہ جب حضرت یحیٰی علیہ السلام نے تبلیغ و دعوت کے ذریعہ پیغامِ الٰہی سنانا شروع کیا تو یہود نے جمع ہو کر ان سے صاف کہا کہ ہم تین نبیوں کا انتظار کر رہے ہیں، ایک مسیحؑ کا دوسرے الیاسؑ کا اور تیسرے اس مشہور و معروف نبیِ آخر الزماںؐ کا جس کی آمد کی شہرت ہمارے درمیان اس قدر ہے کہ ہم اس کے نام لینے کی بھی ضرورت نہیں سمجھتے اور صرف اس کی جانب اشارہ کر دینے سے ہر ایک یہودی اس کو پہچان لیتا ہے چنانچہ انجیل یوحنا میں یہ واقعہ اس طرح مذکور ہے۔

اور یوحنا (یحییٰ) کی گواہی یہ ہے کہ جب یہودیوں نے یروشلم سے کاہن[1] اور لیوی[2] یہ پوچھنے کو بھیجے کہ تو کون ہے تو اس نے اقرار کیا انکار نہ کیا بلکہ اقرار کیا کہ میں تو مسیح نہیں ہوں انھوں نے اس سے پوچھا پھر تو کون ہے؟ کیا تو ایلیا (الیاس) ہے اس نے کہا میں نہیں ہوں کیا تو وہ نبی ہے[3]؟ اس نے جواب دیا کہ نہیں، پس انھوں نے اس سے کہا پھر تو ہے کون؟ تاکہ ہم اپنے بھیجنے والوں کو جواب دیں[4]؟

توراۃ، انجیل، صحائفِ انبیاء اور تاریخِ یہود میں اور بھی بہت سے شواہد موجود ہیں کہ جن سے یہ

---

[1،2] یہ یہود کے مذہبی مناصب ہیں [3] توراۃ میں اس کا لقب فارقلیط (احمد) ہے۔ [4] باب ۱ آیات ۲۱ - ۱۹۔

تحقیق ہوتا ہے کہ یہود کو ایسے پیغمبر کا انتظار تھا جو نبی آخر الزماں ﷺ ہوگا اور حجاز میں مبعوث ہوگا اسی وجہ سے جب بھی وہ اپنے مرکز سے منتشر ہوئے ہیں تو ان کی ایک معقول تعداد اسی کے انتظار میں یثرب میں جا بسی۔[1]

ابدی ذلت و خسران | پس کس درجہ بدبخت و بدقسمت ہے وہ جماعت جس نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی ولادت سے تقریباً پانچ سو ستر سال تو اس انتظار میں گزارے کہ یثرب کی اس سرزمین میں جب خدائے تعالیٰ کا وہ پیغمبر (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ہجرت کرکے آئے گا تو ہم اس کی پیروی کرکے اپنی قومی اور مذہبی عظمت و وقار کو پھر ایک بار حاصل کریں گے حتیٰ کہ یثرب کے قبائل اوس و خزرج کے مقابلہ میں بھی اسی کی نصرت و مدد کے منتظر رہتے تھے مگر جب وہ نبی برحق آیا اور اس نے موسیٰ و عیسیٰ (علیہما السلام) اور توراۃ و انجیل کی تصدیق کرتے ہوئے ان کو پیغام حق سنایا تو سب سے پہلے انھوں (یہود) نے ہی ان کے خلاف بغض و عناد کا مظاہرہ کیا اور اس کی آواز پر کان نہ دھرتے ہوئے اس کی مخالفت کو اپنی زندگی کا نصب العین بنالیا اور نتیجہ میں ابدی ذلت و حرمان نصیبی کو مول لیا۔

اللہ تعالیٰ نے تو شروع ہی میں ان کو متنبہ کر دیا تھا کہ دو مرتبہ کی سرکشی اور اس کے انجام کے بعد ہم تم کو ایک موقع اور عنایت کریں گے پس اگر تم اس وقت سنبھل گئے اور تم نے خدا کی فرماں برداری کا ثبوت دیا اور خدا کے پیغمبر کی صداقت کا اقرار کرکے دین حق کو قبول کر لیا تو ہم بھی تمھاری عظمت رفتہ کو واپس لے آئیں گے اور دین و دنیا کی سعادت سے بہرہ اندوز کریں گے لیکن اگر تم نے اس موقع کو بھی گنوا دیا اور پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی قدیم شرارتوں کا مظاہرہ کیا تو ہم بھی پاداش عمل کا قانون نافذ کر دیں گے "وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا"

غرض جب یہود نے اس مرتبہ بھی اپنی قومی سرشت کو ہاتھ سے نہ جانے دیا تو خدائے تعالیٰ نے بھی ان کے حق میں یہ آخری فیصلہ سنا دیا ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْا بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ



[1] یہ بحث اپنے موقع پر تفصیل سے آئے گی۔

اور یہی ہوا بھی کہ قوم یہود کو نہ پھر کبھی عزت نصیب ہوئی اور نہ حکومت اور آج بھی وہ امریکہ اور یورپ میں بڑے بڑے سرمایہ دار ہونے کے باوجود قومی عزت و حکومت سے محروم ہیں اور قیامت تک محروم رہیں گے اور دنیا کی جو حکومت و طاقت بھی اپنے ناپاک مقاصد کی خاطر مسطورۂ بالا فیصلہ کو چیلنج کر کے ان کو برسرِ حکومت و اقتدار لانا چاہے گی وہ کبھی اپنے اس مذموم مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتی اور بہت ممکن ہے کہ خود بھی قہرِ الٰہی کا شکار ہو کر یہود ہی کی طرح ذلت و خسران میں مبتلا ہو جائے اور دوسروں کے لیے عبرت و بصیرت بنے "وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ"

بہرحال اہلِ ذوق ان حقائق کے بعد بآسانی یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ قرآنِ عزیز کی زیرِ بحث آیات کا مصداق جو کہ بیت المقدس کی تباہی اور یہود کی بربادی سے تعلق رکھتا ہے تاریخی اعتبار سے بخت نصر اور طیطیس رومی سے ہی متعلق ہے اور باقی اقوال بلحاظِ تاریخ آیات کا صحیح مصداق نہیں بنتے " فَاعْتَبِرُوْا يَا اُولِى الْاَلْبَابِ۔

بصائر (۱) اگرچہ دنیا "دار العمل" ہے "دار الجزاء" نہیں ہے تاہم خدائے تعالیٰ کبھی کبھی دنیا میں بھی مجرموں کو ان کی پاداشِ عمل میں اس طرح کس دیا کرتے ہیں کہ خود اُن کو اور اُن کے معاصرین کو یہ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ یہ اُن کے جرائم کی سزا ہے اور ان کی تاریخی زندگی بعد میں آنے والوں کیلئے سامانِ عبرت و بصیرت بن جاتی ہے خصوصاً غرور اور ظلم یہ دو ایسے سخت جرائم اور ام الخبائث ہیں کہ مغرور اور ظالم کو آخرت کے عذاب کے علاوہ دنیا میں بھی ضرور اپنی بدعملیوں کا کچھ نہ کچھ خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے فرق صرف اس قدر ہوتا ہے کہ انفرادی کبر و ظلم کی پاداش شخص و فرد کی زندگی سے متعلق ہوتی ہے اور قومی و اجتماعی کبر و ظلم کی پاداش قومی اور اجتماعی زندگی سے وابستہ ہوتی ہے اس لیے اول الذکر کی مدت میں زیادہ عرصہ نہیں ہوتا مگر ثانی الذکر کی مدت کبھی ایسی طویل نظر آتی ہے کہ مظلوم قوم اور جماعت مایوسی کی حد تک پہونچ جاتی ہے اور اس کی نظر سے یہ نکتہ اوجھل ہو جاتا ہے کہ قوموں کے عروج و زوال اور عزت و ذلت اور کامرانی و ناکامی کی عمر افراد و اشخاص کی عمر کی طرح نہیں ہوتی بلکہ طویل ہوتی ہے تاہم بعض حالات میں عبرت و بصیرت کے پہلو کو نمایاں کرنے کیلئے

اس مدت کو کبھی مختصر بھی کر دیا جاتا ہے چنانچہ یہود کی زیرِ بحث تاریخ کے واقعات وحالات اس کی زندۂ جاوید شہادت ہیں اور قابلِ صد ہزار عبرت وبصیرت۔

(۲) منکرینِ حق اور باطل پرست قوموں کو اگر عبرت وبصیرت کے پیشِ نظر دنیا میں کسی قسم کی سزا دی جاتی یا ان کو عذابِ الٰہی میں پکڑا جاتا ہے تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ان پر سے آخرت کا عذاب (عذابِ جہنم) ٹل جاتا اور معاف ہو جاتا ہے بلکہ وہ اسی طرح قائم رہتا ہے جو اپنے وقت پر ہو کر رہے گا:

وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا ۝

(۳) اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کو اس کی بدکرداریوں اور اس کے مظالم ومفاسد کی وجہ سے عذاب میں مبتلا کرنا اور اپنے پاداشِ عمل کے قانون کو ان پر نازل کرنا چاہتا ہے تو سنت اللہ یہ جاری ہے کہ وہ بداعمالیوں کے بعد فوراً ہی ایسا نہیں کرتا بلکہ ایک عرصہ تک اس کو مہلت دیتا اور ہادیوں اور پیغمبروں کی معرفت ان کو ترغیب وترہیب کی راہ سے ہدایت پر لانے کے تمام مواقع بہم پہنچاتا ہے تاکہ خدا کی حجت ہر طرح تمام ہو جائے پس اگر اس کے بعد بھی ان کی سرکشی اور بغاوت اور ظلم وعدوان کا تسلسل اسی طرح قائم رہتا ہے تو اس کی "بطشِ شدید" اچانک مجرم قوم کو اس طرح دبوچ لیتی ہے کہ پھر کیفرِ کردار پر پہونچے بغیر رستگاری ناممکن ہو جاتی ہے اور ان کے سامنے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان مشاہدہ کی صورت میں نمودار ہو جاتا ہے۔

| | |
|---|---|
| فَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا | عنقریب ظالم جان لیں گے کہ کس طریقہ |
| اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ۝ | انقلاب کے ذریعہ وہ الٹ دیے جائیں گے۔ |



# ذوالقرنین

## ۵۶۱ سنہ ق م

تمہید - زیر بحث مسائل اور علماء اسلام - ذوالقرنین - ذوالقرنین سے متعلق سوال کی نوعیت - ذوالقرنین اور سکندر مقدونی - ذوالقرنین اور اذواء یمن - علمائے سلف کی رائے - متاخرین کی رائے - یہود و قریش اور انتخاب سوالات - ذوالقرنین اور انبیاء بنی اسرائیل کی پیشین گوئیاں - خورس اور تاریخی شواہد - مغربی مہم - مشرقی مہم - تیسری (شمالی) مہم - فتح بابل - خورس کا مذہب - ایران قدیم کا مذہب - ایران اور مذہب زردشت - ذوالقرنین اور قرآن عزیز - یاجوج و ماجوج - سد - یاجوج و ماجوج کا خروج - کیا ذوالقرنین نبی تھے؟ - بصائر -

**تمہید** یہ واقعہ اپنی دلچسپ تاریخی روایت کے لحاظ سے تین اہم حصوں پر منقسم ہے، ذوالقرنین کی شخصیت؟ سد ذوالقرنین؟ یاجوج و ماجوج؟ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان ہر سہ مسائل کو جدا جدا بیان کر کے اس واقعہ کی اصل حقیقت کو واضح کیا جائے۔

**زیر بحث مسائل اور علماء اسلام** سلف میں اگرچہ مسائل زیر بحث کے متعلق ایسے اقوال بہ کثرت ملتے ہیں جو ان مسائل کی تفسیر و تفصیل کی غرض سے بیان کیے گئے ہیں لیکن علماء متاخرین نے اس سلسلہ میں دو جدا جدا راہیں اختیار کر لی ہیں: ایک جماعت سلف کے بعض اقوال کو نقل کرنے کے بعد یہ کہہ دینے پر اکتفا کرتی ہے کہ زیر بحث مسائل سے متعلق منقول اقوال چونکہ قرآن کی بیان کردہ شخصیت ذوالقرنین کے ساتھ پوری طرح مطابقت نہیں کرتے اس لیے ہمارے لیے یہ کافی ہے کہ

ایک جانب یہ یقین و اعتقاد رکھیں کہ قرآنِ عزیز نے جس حد تک ذوالقرنین کی شخصیت، سد، اور یاجوج و ماجوج پر روشنی ڈال دی ہے وہ بلاشبہ حق ہے اور باقی تفصیلات یعنی اس کی شخصیت کا تاریخی مصداق، سد کا جائے وقوع اور قوم یاجوج و ماجوج کا تعین، سو ان کے علم کو سپرد بخدا کر دینا چاہیے کیونکہ "تفویض" کا طریقہ ہی اسلم طریقہ ہے لیکن جب ایک تحقیق طلب طبیعت اس پر قانع نظر نہیں آتی اور وہ اضطراب و تردد میں پڑ جاتی ہے تو یہ جماعت اس کو مطمئن کرنے کے لیے اس طرح سمجھانے کی کوشش کرتی ہے کہ جب کہ دُنیوی اسبابِ علم اور وسائلِ معلومات کے اس حیرت زا دور میں بھی محققینِ علم الآثار (ARCHAEALOGY) کو یہ اعتراف ہے کہ ابھی وہ اس دنیا کے مستور تاریخی خزانوں اور نظروں سے اوجھل تاریخی حقائق کے معلوم کرنے میں سمندر میں سے قطرہ کی مقدار حاصل کر پائے ہیں اور جب کہ ہم چند صدی قبل تک دنیا کے چوتھے برِاعظم امریکہ کی دریافت سے بھی قاصر رہے تھے تو کون سے تعجب کی بات ہے اگر ابھی تک دنیا اور موجودہ علومِ تحقیق سدِ ذوالقرنین کو نہ پا سکے اور یاجوج و ماجوج کے متعلق ان کا علمِ تحقیق ابھی تک قاصر رہا ہو اور وہ ذوالقرنین کی شخصیت کا تعین نہ کر سکے ہوں اور ہو سکتا ہے کہ پہلے دو امور وقتِ موعود تک یعنی قریب بہ قیامت منکشف ہو کر ہمارے سامنے آجائیں اور ان دونوں کے انکشاف سے ذوالقرنین کی شخصیت کا بھی بآسانی تاریخی تعین ہو جائے، پھر کون سی وجہ ہے کہ اگر ہم ان امور کی تاریخی تفصیلات کو آج نہ بیان کر سکیں تو اس بنا پر ان امور کو محض افسانوی داستان سمجھ لیا جائے خصوصاً جب کہ قرآنِ عزیز وحیِ الٰہی کے علم و یقین کے ذریعہ ان کے وجود کی اطلاع دیتا ہے اور جب کہ اہلِ علم کا یہ مسلمہ نظریہ ہے کہ ہمارا کسی شے کو نہ جاننا اس کی دلیل نہیں ہو سکتا کہ وہ شے حقیقتاً بھی وجود نہیں رکھتی پس ایک مسلمان کے لیے تو اسی قدر کافی ہے کہ نفسِ مسئلہ پر یقین کرتے ہوئے تفصیلات کو سپرد بخدا کر دے اور منکرینِ وحیِ الٰہی کے لیے زیادہ سے زیادہ توقف کی گنجائش ہو سکتی ہے نہ کہ انکار پر اصرار کی۔

اس کے برعکس علماءِ اسلام میں سے دوسری جماعت ان مسائل کی تحقیق کے درپے ہے اور

وہ قرآن عزیز کی عطا کردہ روشنی میں ان کے حقائق کی تفصیلات کو واضح کرنا نہایت ضروری جانتی اور قرآن حکیم کی اہم تفسیری خدمت یقین کرتی ہے اس کا خیال ہے کہ مسائلِ زیرِ بحث میں تفویض کے طریقہ کو اختیار کرکے ہم اپنی ذمہ داری سے کسی طرح سبک دوش نہیں ہو سکتے اور یہ اس لیے کہ قرآن نے ذوالقرنین کے معاملہ کو یہود کے سوال کرنے پر بیان کیا ہے اور اسی بناء پر وہ اسلوب بیان اختیار کیا ہے جس سے سوال کرنے والی جماعت اس اقرار کرنے پر مجبور ہو جائے کہ "نبی امی" نے وحیِ الٰہی کے ذریعہ ان ہرسہ مسائل کے متعلق جو تفصیلات بیان کی ہیں بلاشبہ وہ صحیح ہیں اور سورۂ بنی اسرائیل میں "روح" کے سوال پر قرآن کا جواب اس کے برعکس اسلوب پر مذکور ہے اور دریافت کرنے والوں کو صرف اس قدر بتا کر کہ "روح" خدا کے حکم وامر میں سے ایک ایسی شے ہے جو اس کے حکم سے جسم میں داخل ہو جاتی ہے، مزید تفصیلات کو ان کی عقول کے لحاظ سے غیر ضروری قرار دے دیا ہے لہٰذا اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن عزیز ذوالقرنین سے متعلق تفصیلات کے درپے ہے اور یہود کو یا مشرکین اور یہود دونوں کو ان کی معلومات کے مطابق مطمئن کرنا چاہتا بلکہ اس سلسلہ میں ان کے یہاں بعض تفصیلات نے جو افسانوی شکل اختیار کر لی تھی اس کے خلاف حقائقِ واقعیہ کو کھول دینا چاہتا ہے۔

نیز اس لیے بھی یہ مسائل محتاجِ تحقیق ہیں کہ قرآنِ حکیم کے اسلوبِ بیان سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہود اس تاریخی حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے اور ان کی قومی اور مذہبی زندگی کا اس کے ساتھ گہرا تعلق تھا تب بھی انھوں نے اس مسئلہ کو مشرکین کی اعانت کے لیے اس لیے انتخاب کیا کہ اس سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا بآسانی امتحان ہو جائے گا، پس جو معاملہ آج سے تیرہ چودہ سو سال پہلے تک لوگوں کی معلومات میں تھا اور جس کی تفصیلات وہ قومیں بخوبی جانتی تھیں اس کے متعلق کا کر سبک دوش اور قرآن کے بیان کردہ اس اہم واقعہ کی تفسیر سے عہدہ برآ نہیں ہوا جا سکتا کہ جب کہ ہم خدا کی زمین کے بہت سے حصوں سے ابھی تک ناواقف ہیں تو ممکن ہے کہ اس واقعہ سے متعلق شخصیتیں اور مقامات بھی اسی طرح غیر معلوم ہوں اور ہم ابھی تک ان کا پتہ لگانے سے قاصر رہے ہوں۔

چنانچہ علماءِ محققین مثلاً حافظ ابن تیمیہ، ابن کثیر، ابوحیان، ابن عبدالبر، امام رازی، حافظ ابن حجر

شیخ بدرالدین عینی، ابن ہشام اور سہیلی رحمہم اللہ ان مسائل کی تحقیق و تدقیق کے درپے نظر آتے اور اس بارہ میں اپنے رجحان کے مطابق فیصلہ دینا چاہتے ہیں۔

مسائل زیرِ بحث سے متعلق ہمارا خیال ان ہی علماء تحقیق کی پیروی پر آمادہ ہے بلکہ ہم ان مسائل کے متعلق اس لیے اور بھی زیادہ تحقیق و تدقیق کے خواہش مند ہیں کہ جن مستشرقین یورپ نے قرآنِ عزیز کے الہامی کتاب ہونے کے خلاف زہر چکانی کی ہے اور اپنے مزعومہ دلائل سے جہاں اس کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام ثابت کیا ہے وہیں یہ بھی ہرزہ سرائی کی ہے کہ قرآن کے بعض بیان کردہ واقعات حقائق نہیں ہیں بلکہ اہلِ عرب کے مشہور افسانوں کو حقیقت کے نام سے بیان کر دیا گیا ہے۔

اسلامی مسائل میں مستشرقینِ یورپ کو یہ کمال حاصل ہے کہ وہ اکثر تاریخی حقائق کو نظر انداز کر کے اپنے اندازے اور قیاس سے چند ایسے مقدمات وضع کر لیتے ہیں جن سے ان کو اپنے مزعومات اور خیالات میں مدد ملے اور اسلام بلکہ قرآنِ عزیز کے بیان کردہ حقائق کی تردید کی جا سکے۔ چنانچہ اصحابِ رقیم (پیٹرا) کے متعلق قرآنِ عزیز نے جب چند حقائق کا اظہار کیا اور موعظت و عبرت کے لیے وہ ان کے حالات و واقعات کو روشنی میں لایا تو انھوں نے اپنی ناواقفیت و جہل کو چھپانے یا تعصب کی راہ سے قرآن کو جھٹلانے کے لیے رقیم (پیٹرا) کے وجود ہی سے انکار کر دیا اور جسارتِ بیجا کے ساتھ یہ کہہ دیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے عرب کے سنے سنائے جھوٹے قصے کو وحیِ الٰہی کہہ کر بیان کر دیا ہے، مگر جب قدرت کے ہاتھوں نے قرآن کے اعلانِ حق کے تیرہ سو سال کے بعد پیٹرا کو ٹھیک اسی مقام پر ظاہر کر دیا اور اس کے عظیم الشان کھنڈر اپنے وجود کا اعلان کرنے لگے تو ان کو حقیقت کے سامنے سر جھکانا پڑا اور ندامت و شرمساری کے ساتھ قرآنِ عزیز کے اعلانِ حق کو تسلیم کیے بغیر ان کے لیے کوئی چارۂ کار نہ رہا۔

اسی طرح جب قرآنِ عزیز نے تفصیل کے ساتھ یہ بتایا کہ بنی اسرائیل ایک طویل عرصہ تک مصر میں فراعنۂ مصر اور قبطیوں کے غلام رہے ہیں اور موسیٰ (علیہ السلام) نے صدیوں کے بعد ان کو خدا کے بخشے ہوئے اعجاز کے ذریعہ نجات دلائی اور اس مسئلہ میں توراۃ نے بھی ایک حد تک قرآن اور وحیِ الٰہی

کے علمِ یقین کا ساتھ دیا تو اس کے باوجود ان مدعیانِ علم نے ایک عرصہ تک مصر میں بنی اسرائیل کی غلامی کا انکار کیا اور علمِ حقیقی کی تکذیب کے درپے رہ کر اس کا مذاق اڑایا، مگر مصری حفریات نے جب فرعون کے مشہور سنگی کتبہ کا انکشاف کرایا اور کتبہ کی کندہ عبارت نے بنی اسرائیل کی غلامی پر ایک حد تک روشنی ڈالی تو آہستہ آہستہ جہل نے علم کے سامنے شکست قبول کر لی اور اب ان نظریات میں بھی تبدیل ہونے لگی جو فلسفۂ تاریخ کے نام پر محض ظن و تخمین سے قائم کیے گئے تھے اور جن کو علم کا درجہ دیا جاتا تھا یہاں تک کہ اب انکار اقرار کی شکل میں تبدیل ہونے لگا ہے۔

ٹھیک اسی طرح ذوالقرنین، یاجوج و ماجوج اور سد کا معاملہ ہے۔ قرآن عزیز نے سورۂ کہف میں ایک ایسے بادشاہ کا ذکر کیا ہے جس کا لقب ذوالقرنین ہے اور جس نے مشرق و مغرب تک فتوحات کیں اور دورانِ فتوحات میں ایک ایسے مقام پر پہنچا جہاں کے بسنے والوں نے اس سے یہ شکایت کی کہ یاجوج و ماجوج ہم کو ستاتے اور وحشیانہ حملے کر کے فساد مچاتے اور بربادی لاتے ہیں آپ ہم کو ان سے نجات دلائیے' ذوالقرنین نے یہ سن کر اُن کو تسلی و تشفی دی اور لوہے اور تانبے کو پگھلا کر دو پہاڑوں کے درمیان ایک ایسی سد قائم کر دی کہ شکایت کرنے والے یاجوج و ماجوج کے فتنہ سے محفوظ ہو گئے۔

مستشرقینِ یورپ نے جب اِس واقعہ کا مطالعہ کیا تو حسبِ عادت اپنے پیشرو مشرکینِ مکہ اور کفارِ عرب کی طرح فوراً یہ کہہ دیا:

اِنْ هِیَ اِلَّآ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ　　یہ (قرآن) کچھ نہیں ہے مگر پہلے لوگوں کی من گھڑت کہانیاں۔

اور بڑے زور و شور کے ساتھ یہ دعویٰ کیا کہ ذوالقرنین کا یہ قصہ اخبارِ قرآنی کے اعجاز اور عبرت و موعظت کے لیے حقیقی واقعہ نہیں ہے بلکہ عرب کی ایک فرسودہ داستان اور بے سروپا کہانی کو وحیِ الٰہی کی حیثیت دیدی گئی ہے ورنہ تاریخی دنیا میں ذوالقرنین اور یاجوج و ماجوج کی شخصیتیں اور سدِ ذوالقرنین کا وجود کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔

پس ایسی صورت میں ایک مسلمان کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ نہ صرف اپنے ذاتی اعتقاد کی بنا پر بلکہ

تاریخی نقطۂ نگاہ کے مطابق یہ واضح کرے کہ دوسرے تاریخی مسائل کی طرح قرآنِ عزیز کا عطا کیا ہوا علم و یقین اس مسئلہ میں بھی اپنی جگہ اٹل اور علم و یقین کے درجہ کی حقیقت ہے اور معترضین کا انکار بلاشبہ جہل، ظن و تخمین اور باطل مزعومات کا طومار ہے اور ان تاریخی حقائق کا انکار صرف بے جا تعصب پر مبنی ہے نہ کہ اظہارِ حقیقت کے پیشِ نظر۔

**ذوالقرنین** ذوالقرنین کی شخصیت پر بحث کرنے سے قبل حل طلب اہم سوال یہ ہے کہ قرآنِ عزیز نے اس معاملہ کی جانب کس لیے توجہ کی اور اگر از خود نہیں بلکہ کسی سوال کے جواب پر توجہ مبذول کی تو سائل کون ہیں اور کس بنیاد پر انھوں نے اس سوال کا انتخاب کیا؟ یہی وہ سوال ہے جو درحقیقت اس معاملہ کی اصل ہے اور اگرچہ بہ سلسلۂ شانِ نزول مفسرین اور اربابِ سیر نے اس کی جانب توجہ فرمائی ہے، مگر تحقیقِ شخصیت کے وقت ان حضرات نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا ہے۔

ساتھ ہی یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ ذوالقرنین کی شخصیت، سد کا تعین اور یاجوج و ماجوج کی تحقیق اگرچہ تین مستقل مسائل ہیں، تاہم یہ تینوں اس طرح باہم مربوط ہیں کہ اگر کسی ایک کے متعلق واضح تحقیق سامنے آجائے تو قرآنِ عزیز کی تفصیلات کی روشنی میں باقی دو مسائل کے حل میں بہت زیادہ سہولت ہو جاتی ہے۔

**ذوالقرنین سے متعلق سوال کی نوعیت** محمد بن اسحاق نے بروایت ابن عباس (رضی اللہ عنہ) بیان کیا ہے کہ قریش مکہ نے نضر بن حارث اور عقبہ بن معیط کو علماءِ یہود کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا کہ چونکہ تم خود کو اہلِ کتاب کہتے ہو اور تمہارا دعویٰ ہے کہ تمہارے پاس زمانۂ سابق کے پیغمبروں کا وہ علم ہے جو ہمارے پاس نہیں ہے لہٰذا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق ہم کو یہ بتائیں کہ ان کے دعویٰ پیغمبری کی صداقت کے متعلق آپ حضرات کی الہامی کتابوں میں کوئی تذکرہ یا علامات موجود ہیں یا نہیں؟ چنانچہ قریش کے وفد نے یثرب پہنچ کر علماءِ یہود سے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا۔ احبارِ یہود نے ان سے کہا تم اور باتوں کو چھوڑ دو ہم تم کو تین سوالات بتائے دیتے ہیں اگر وہ ان کا صحیح جواب دیدیں تو سمجھ لینا کہ وہ ضرور اپنے دعوے میں سچے ہیں اور نبیِ مرسل ہیں اور تم پر اُن کی پیروی واجب ہے اور اگر وہ

صحیح جواب نہ دے سکیں تو وہ کاذب ہیں پھر تم کو اختیار ہے کہ جو معاملہ ان کے ساتھ چاہو کرو، وہ سوالات یہ ہیں: (۱) اس شخص کا حال بیان کیجیے جو مشرق و مغرب تک فتوحات کرتا چلا گیا؟ (۲) ان چند نوجوانوں پر کیا گزرا جو کافر بادشاہ کے خوف سے پہاڑ کی کھوہ میں جا چھپے تھے؟ (۳) روح کے متعلق بیان کیجیے"؟ وفد مکہ واپس آیا اور اس نے قریش کو یہودی علماء کی گفتگو سنائی، قریش نے سن کر کہا: اب ہمارے لیے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارہ میں فیصلہ کرنا آسان ہوگیا کہ یہود کے ان سوالات کے جوابات ایک امی انسان جب ہی دے سکتا ہے کہ درحقیقت اس پر خدا کی جانب سے وحی آتی ہو، چنانچہ قریش مکہ نے خدمتِ اقدس میں حاضر ہو کر تینوں سوالات پیش کر دیے، ان ہی سوالات کے جوابات کے لیے آپ پر سورۂ کہف کا نزول ہوا[1]

محدثین نے اس روایت کے مختلف طریقوں کو بیان کر کے اس کی تحسین فرمائی ہے اور سدی کے طریقِ روایت میں اس قدر اور اضافہ ہے:

| | |
|---|---|
| قال قالت الیہود اخبرنا عن نبی | یہود نے کہا "ہم کو اس نبی کا حال بتایئے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے |
| لم یذکرہ اللہ فی التوراۃ الا فی | توراۃ میں صرف ایک ہی جگہ کیا ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم |
| مکان واحد قال ومن قالوا | نے دریافت فرمایا وہ "کون"؟ یہود نے کہا |
| "ذوالقرنین"[2] | ذوالقرنین" |

یہود کے اس بلاواسطہ سوال کے متعلق محدثین یہ فرماتے ہیں کہ اس جگہ راوی نے اختصار سے کام لیا ہے، صحیح تفصیل یہ ہے کہ ان سوالات کا انتخاب یہود نے کیا تھا مگر قریش کی زبان سے ادا کرائے گئے اور ہو سکتا ہے کہ سوال میں لفظِ توراۃ دیکھ کر نیچے کے کسی راوی نے اپنے وہم سے ان سوالات کو بلاواسطہ یہود کی جانب سے سمجھ لیا ہو۔

غرض اس روایت سے تین اہم باتوں پر روشنی پڑتی ہے (الف) یہ کہ ذوالقرنین سے متعلق سوال اگرچہ قریش کی زبان سے ادا ہوا لیکن اصل میں یہ یہود کی جانب سے تھا (ب) یہ ایسے شخص سے متعلق سوال تھا جس کو توراۃ میں صرف ایک جگہ "ذوالقرنین" کہا گیا ہے (ج) اس شخص کو قرآن نے

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۷۲-۷۱ و در منثور ج ۴ - [2] قرطبی قلمی سورۂ کہف۔

اپنی جانب سے ذوالقرنین کا لقب نہیں دیا بلکہ سوال کرنے والوں کے سوال کے پیشِ نظر اس کو دہرایا ہے، چنانچہ قرآن کا یہ اسلوبِ بیان بھی اسی جانب اشارہ کرتا ہے:

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِی الْقَرْنَيْنِ — وہ تجھ سے دریافت کرتے ہیں کہ ذوالقرنین کا حال بتاؤ

**ذوالقرنین اور سکندر مقدونی**

ذوالقرنین کس شخصیت کا لقب ہے اس بحث سے قبل یہ معلوم رہنا ازبس ضروری ہے کہ بعض حضرات کو یہ سخت مغالطہ ہوگیا ہے کہ سکندر مقدونی ہی وہ ذوالقرنین ہے جس کا ذکر قرآن سورۂ کہف میں کیا گیا ہے، یہ قول باتفاق جمہور علماء سلف و خلف قطعاً باطل اور جہالت پر مبنی ہے اس لیے کہ قرآن کی تصریحات کے مطابق ذوالقرنین صاحبِ ایمان اور مردِ صالح پادشاہ تھا اور سکندر مقدونی مشرک اور جابر بادشاہ گزرا ہے جس کے شرک و ظلم کی صحیح تاریخ خود اس کے بعض امرائے دربار نے بھی مرتب کی ہے اور تمام معاصرانہ شہادتیں بھی اس کے بُت پرست اور جابر و ظالم ہونے پر متفق ہیں۔

امام بخاریؒ نے کتابِ احادیث الانبیاء میں ذوالقرنین کے واقعہ کو حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے تذکرہ سے قبل نقل کیا ہے اس کی شرح کرتے ہوئے حافظ ابن حجرؒ تحریر فرماتے ہیں:-

| | |
|---|---|
| وفی ایراده المصنف ترجمة | مصنف نے ذوالقرنین کے واقعہ کو حضرتِ ابراہیمؑ کے |
| ذی القرنین قبل ابراهيم | تذکرہ سے قبل اس لیے بیان کیا ہے کہ وہ اس شخص |
| اشارة الى توهين قول من زعم | کے قول کی اہانت کرنا چاہتے ہیں جو سکندر یونانی کو |
| انه الاسكندر اليونانی۔[1] | ذوالقرنین کہتا ہے۔ |

اور پھر اپنی جانب سے تین وجوہِ فرق بیان کرکے یہ ثابت کیا ہے کہ [illegible] یونانی کسی طرح بھی قرآن میں مذکور ذوالقرنین نہیں ہو سکتا، انھوں نے یہ بھی تصریح کی ہے کہ جن حضرات نے سکندر مقدونی کو ذوالقرنین کہا ہے غالباً ان کو اس روایت سے مغالطہ ہوا ہے جو طبری نے اپنی تفسیر میں اور محمد بن ربیع جیزی نے کتاب الصحابہ میں نقل کی ہے اور جس میں اس کو رومی او[illegible] یہ کہا گیا ہے مگر یہ روایت ضعیف اور ناقابلِ اعتماد ہے۔[2]

[1] فتح البار[illegible] ج ٦ ص ٢٩٣۔

اور حافظ عماد الدین ابن کثیر ذوالقرنین کے نام کی تعیین سے متعلق مختلف اقوال نقل کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں :-

اور اسحق بن بشر نے بروایت سعید بن بشیر، قتادہ سے نقل کیا ہے کہ ذوالقرنین کا نام سکندر تھا اور یہ سام بن نوح (علیہ السلام) کی نسل سے تھا لیکن اسکندر بن فیلیپس (مقدونی) کو بھی ذوالقرنین کہنے لگے ہیں جو رومی اور بانی اسکندریہ ہے، مگر واضح رہے کہ یہ دوسرا ذوالقرنین پہلے سے بہت زمانہ بعد پیدا ہوا ہے کیونکہ سکندر مقدونی حضرت مسیح علیہ السلام سے تقریباً تین سو سال قبل ہوا ہے اور مشہور فلسفی ارسطاطالیس اس کا وزیر تھا اور یہ ہی وہ بادشاہ ہے جس نے دارا ابن دارا کو قتل کیا اور فارس کے بادشاہ کو ذلیل کر کے ان کے ملک پر قبضہ کر لیا۔ ہم نے یہ تنبیہ اس لیے کر دی کہ بہت سے آدمی یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ یہ دونوں ایک ہی شخصیت ہیں اور یہ اعتقاد کر بیٹھے ہیں کہ قرآن میں جس ذوالقرنین کا ذکر ہے وہ یہی سکندر مقدونی ہے جس کا وزیر ارسطاطالیس فلسفی تھا اور اس اعتقاد کی بدولت بہت بڑی غلطی اور بہت زیادہ خرابی پیدا ہو جاتی ہے اس لیے کہ ذوالقرنین اول مسلمان اور عادل بادشاہ تھا، اور اس کے وزیر خضر (علیہ السلام) تھے جن کے متعلق ہم ثابت کر آئے ہیں کہ وہ نبی تھے اور دوسرا (مقدونی) مشرک تھا اور اس کا وزیر فلسفی تھا اور ان دونوں کے درمیان تقریباً دو ہزار سال سے بھی زیادہ کا فصل ہے پس کہاں یہ (مقدونی) اور کہاں وہ (عربی سامی) اور ان دونوں کے درمیان اس درجہ امتیازات ہیں کہ ماسوا غبی اور حقائق سے ناآشنا شخص کے دوسرا کوئی شخص ان دونوں کو ایک کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا [1]

اور امام رازی نے اگرچہ سکندر مقدونی کو ذوالقرنین کا لقب دیا ہے باایں ہمہ ان کو بھی یہ اقرار ہے:

| | |
|---|---|
| كان ذوالقرنين نبياً وكان الاسكندر كافراً | ذوالقرنین نبی تھے اور سکندر مقدونی کافر |
| وكان معلمه ارسطاطاليس وكان يأتمر بامره | تھا اور اس کا معلم اور وزیر بلاشبہ |
| وهو من الكفار بلا شك [2] | کافر تھا۔ |

حافظ ابن حجرؒ نے اس مغالطہ کی وجہ یہ نقل کی ہے کہ چونکہ قرآن میں مذکور ذوالقرنین مقتدا ہے اور

[1] البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۱۰۶ - ۱۰۵ - [2] تفسیر کبیر سورۂ کہف۔

وہ وسیع حکومت کا مالک رہا ہے اور سکندر یونانی بھی وسیع حکومت کا حکمراں رہا ہے اس لیے اسکو بھی ذوالقرنین کہنے لگے، یا اس لیے کہ وہ دو پادشاہتوں روم اور فارس کا پادشاہ ہوگیا تھا اور دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے محمد بن اسحٰق نے اپنی سیرت میں ذوالقرنین کا نام سکندر نقل کر دیا ہے اور چونکہ اس کی سیرت بہت مشہور و مقبول ہے اس لیے یہ نام بھی شہرت پاگیا، اور حافظ عمادالدین کا خیال یہ ہے کہ چونکہ اسحٰق بن بشر کی روایت میں قرآن میں مذکورہ ذوالقرنین کا نام بھی سکندر بتایا گیا ہے اسلیے غلطی اور نادانی سے لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ سکندر مقدونی ہی ذوالقرنین ہے۔

غرض حافظِ حدیث شیخ الاسلام ابن تیمیہ، ابن عبدالبر، زبیر بن بکار، ابن حجر، ابن کثیر، عینی (رحمہم اللہ) جیسے محققین نے اس مغالطہ کی پوری طرح تردید کر دی اور حقیقت بھی یہ ہے کہ قرآن نے ذوالقرنین کے جو محاسن و مناقب بیان کیے ہیں ان کے پیشِ نظر ایک بُت پرست اور جابر و ظالم شخص کو انکا مصداق بنانا فاش غلطی ہے۔[1]

**ذوالقرنین اور اذواءِ یمن** ایک جویائے حق کو یہ بھی واضح رہنا چاہیے کہ وسعتِ حکومت اور زبردست سطوت و صولت کے لحاظ سے جس طرح بعض حضرات نے سکندر مقدونی کو ذوالقرنین کا لقب دیدیا ہے

## استدراک[1]

## کیا ذوالقرنین سکندر مقدونی ہے؟

جولائی سنہ ۱۹۶۱ء کے بُرہان میں میرا ایک مضمون "ذوالقرنین اور سدِ سکندری" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ یہ مسلسل مضمون کی پہلی قسط تھی اور اگست کے بُرہان میں بھی، ابھی تک وہ سلسلہ ناتمام ہی تھا کہ محترم مدیر صاحب صدق نے پہلی قسط پر ایک "استدراک" لکھ کر بُرہان کی عزت افزائی فرمائی اور مجھ کو اس سلسلہ میں مزید لکھنے کا موقع مرحمت فرمایا جس کے لیے صاحب موصوف کا ممنون ہوں۔

یہ "استدراک" بُرہان کی اشاعت سے قبل ہی ۴ اگست کے صدق میں قدرے اضافہ کے ساتھ طبع ہوگیا، اور اب ۱۸ اگست کے صدق میں بھی "سدِ سکندری" کے عنوان سے اسی کا ایک تکملہ یا ذیل شائع ہوا ہے:-

بہرحال اگست کے بُرہان میں جو "استدراک" شائع ہوا ہے چونکہ وہی اصل ہے اور صاحب استدراک

(باقی صفحہ ۱۳۰ پر)

اسی طرح یمن کے بعض تبابعہ کو بھی اہلِ عرب وسعتِ حکومت کی بنیاد پر ذوالقرنین کہتے آئے ہیں مثلاً ابوکرب تبع نے اپنے دادا کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے:۔

قد کان ذوالقرنین جدی مسلماً ملکاً تدین له الملوك وتسجد

"میرا دادا ذوالقرنین مسلمان تھا اور ایسا پُرشوکت بادشاہ تھا کہ بہت سے بادشاہ اس کے تابعِ فرمان اور اس کے سامنے پست تھے"

---

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۵ :

کے دلائل کا حال اس لیئے "تنقید بر استدراک" کی بنیاد بھی اسی پر قائم کی گئی ہے اور صدق کے ہر دو مضامین کے اضافات کو ضمنی طور پر پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ (محمد حفظ الرحمٰن)

ذوالقرنین کی تحقیق سے متعلق میرا مضمون تحلیل وتجزیہ کے بعد دو حصوں پر تقسیم ہو سکتا ہے ایک مسئلہ کا "اثباتی پہلو" اور دوسرا "منفی پہلو" "اثباتی پہلو" میں مضبوط دلائل کے ساتھ یہ واضح کیا گیا ہے کہ سائرس (کیخسرو یا خورس) ہی وہ شخصیت ہے جس کو قرآنِ عزیز نے "ذوالقرنین" کہہ کر یاد کیا ہے اور "منفی پہلو" میں ان اقوال کو مرجوح قرار دے کر جو "سائرس" کے علاوہ "ذوالقرنین" کا مصداق متعین کرتے ہیں اس کا اعتراف کیا ہے کہ یہ مسئلہ چونکہ قرآن عزیز میں منصوص اور مصرح مذکور نہیں ہے اس لیے دوسری ہستیوں کے متعلق بھی مجالِ گفتن باقی رہتی ہے لیکن ذوالقرنین سے متعلق قرآنی صفات اور تاریخی حقائق کی روشنی میں یہ امر قطعی ہے کہ "سکندر مقدونی" کسی حالت میں بھی "قرآن کا ذوالقرنین" نہیں کہلایا جا سکتا اور بعض علمائے حق نے اگر اس کو ذوالقرنین بتایا ہے تو سلفِ صالحین اور خلفِ صادقین کی اکثریت نے ان کے اس قول کی سختی سے تردید کی ہے اور ناقابلِ انکار دلائل کے ساتھ تردید کی ہے۔

علمائے اسلام نے جن دلائل کی روشنی میں اس انکار پر اصرار کیا ہے اس کو تفصیل کے ساتھ زیرِ بحث مضمون میں نقل کیا گیا ہے لیکن محترم "صاحبِ استدراک" نے ان میں سے صرف "تین" باتوں کو منتخب فرما کر ان پر "استدراک" سپردِ قلم فرمایا ہے' اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان پر ترتیب وار "تنقیدی نظر" ڈالی جائے تاکہ مسئلہ زیرِ بحث بخوبی منقح ہو سکے۔

صاحبِ موصوف تحریر فرماتے ہیں:۔

مقالہ مذکور مندرجہ برہان بابت جولائی ۱۹۴۰ء میں ذوالقرنین کے سکندر مقدونی ہونے سے انکار دلائل ذیل کی بناء پر کیا گیا ہے:۔

(۱) سکندر مقدونی کی تاریخ کا یہ مسئلہ باب ہے کہ وہ یونانیوں کے قدیم مذہب اور دیوتاؤں کی پرستش کا معتقد تھا اور یہ کہ وہ ہرگز مسلمان نہ تھا۔

(۲) سکندر باتفاق اصحابِ تاریخ جابر وقاہر تھا نہ کہ نیک سیرت و نیک نفس۔ (باقی ص ۱۲۷ پر)

اور عرب کے مشہور شعراء امراء القیس، اوس بن حجر اور طرفہ بن عبدہ وغیرہ کے کلام میں بھی حمیری بادشاہوں کو ذوالقرنین کہا گیا ہے [۱]

اسی طرح ایرانی بادشاہوں میں سے اہلِ عرب کیقباد اور فریدوں کو بھی ان کی قاہرانہ فتوحات کی وجہ سے ذوالقرنین کہتے تھے [۲]

مگر یہ سب مسطورہ بالا وجہ کی بنیاد پر ہی ذوالقرنین کہلاتے رہے ہیں اور قرآن میں مذکورہ

---

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۶ :

(۳) یہ بات بھی مسلمات میں سے ہے کہ اس کی فتوحات اور سیاحت کا سلسلہ مغرب کی جانب نہیں بڑھا (رسالہ مذکورہ ص ۱۷-۱۶)

"عرض کرنے دیجیے کہ یہ تینوں دعوے مسلمات نہیں، بجائے خود مخدوش و مجروح ہیں۔"

اس کے بعد صاحب موصوف نے ان تینوں دلائل یا دعاوی کو "مخدوش" اور "مجروح" ثابت کرنے کے لیے بالترتیب دلائل پیش فرمائے ہیں چنانچہ مضمون نگار کی پہلی دلیل کی تردید فرماتے ہوئے ارشاد ہے:۔

(۱) نزولِ قرآن سے قبل والا ذوالقرنین ظاہر ہے کہ اصطلاحی معنی میں تو مسلمان ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کے مومن ہونے سے مراد صرف یہی ہو سکتی ہے کہ موحد (مسلم) اور اپنے زمانہ کے نبی کا مطیع تھا۔ (برہان۔ ماہ اگست)

مُسلم؟ | مجھے یہ عرض کرنے کی اجازت دیجیے کہ "صاحبِ استدراک" کا سکندر کے مسلمان ہونے کی بحث میں یہ فرمانا کہ اصطلاحی معنی میں تو وہ مسلمان ہو ہی نہیں سکتا تھا" کیا معنی رکھتا ہے؟ اگر مراد یہ ہے کہ اصطلاحی معنی میں صرف وہی شخص "مسلمان" کہلایا جا سکتا ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت میں ہو اور دوسرے کسی نبی کی امت کو "مُسلم" نہیں کہہ سکتے تو ظاہر ہے کہ یہ اصطلاح "قرآن کی اصطلاح" نہیں ہے کیونکہ وہ صاف یہ اعلان کرتا ہے کہ آدمؑ سے لے کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک خدا کے ہر نبی و رسول کا دین اسلام اور اس کی امتِ اجابت "امتِ مسلمہ" ہے اور اس کا سچا مطیع "مُسلمان" :

اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ○ (بقرہ۔ پ۔ ع)

کیا تم اُس وقت موجود تھے جب یعقوبؑ کی وفات کا وقت آ پہنچا اس نے اپنی اولاد سے کہا میرے بعد تم کس کی پرستش کرو گے؟ انھوں نے جواب دیا ہم تیرے اور تیرے باپ ابراہیمؑ، اسمٰعیلؑ اور اسحٰقؑ کے ایک خدا کی پرستش کریں گے۔ اور ہم تو اسی کے فرمانبردار ہیں۔

(باقی ص ۱۲۸ پر)

[۱] فتح الباری ج ۶۔ [۲] تاریخ ابن کثیر ج ۲۔

ذوالقرنین ان میں سے کوئی نہیں ہے چنانچہ حضرتِ استاذ محقق عصر علامہ سید محمد انور شاہؒ نے اس حقیقت کو بخوبی واضح کر دیا ہے، فرماتے ہیں: ذوالقرنین کے معاملہ میں ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ نہ تو وہ اہلِ مشرق میں سے تھا جیسا کہ بعض کا خیال فغفورِ چین کی جانب ہے اس لیے کہ اگر وہ مشرقی ہوتا تو قرآنِ عزیز اس کے سفرِ مغرب کے بعد یہ کہتا کہ وہ پھر مشرق کو لوٹ گیا یعنی اپنے وطن کی جانب واپس ہو گیا یہ نہ کہتا اذا بلغ مطلع الشمس اور نہ وہ اہلِ مغرب میں سے تھا بلکہ مشرق و مغرب کے درمیانی علاقہ کا

---

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۷ :

حافظ عماد الدین ابن کثیر اس کی تفسیر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:۔

| | |
|---|---|
| وَالاسلام هو ملة الانبياء قاطبة وان تنوعت شرائعهم واختلفت مناهجهم | اور اسلام" یہی تمام انبیاء علیہم السلام کی ملت ہے بلا تخصیص، اگرچہ ان کی شریعتیں اور ان کے طریقے مختلف ہیں |
| (تفسیر ج ۱ ص ۳۲۴) | |

اور اگر صاحب استدراک کی مراد اصطلاحی معنی سے یہ ہے کہ سکندر اگرچہ موحد اور مسلم تو تھا مگر چونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے بہت پہلے تھا اس لیے عرفِ عام میں "مسلمان" نہیں ہو سکتا تو گستاخی معاف پھر اس کے لیے "اصطلاحی معنی" کی تعبیر صحیح نہیں ہے اور نہ اس ارشاد کی یہاں کوئی ضرورت تھی جب کہ متکلم اور مخاطب دونوں پر یہ عیاں ہے کہ یہ اس سکندر کا ذکر ہے جو تقریباً تین سو سال قبلِ مسیح تھا۔

آگے چل کر "صاحب استدراک" ارشاد فرماتے ہیں:

سو روایاتِ یہود میں سکندر کو اسی حیثیت سے (یعنی موحد اور اپنے زمانہ کے نبی کا مطیع تھا) پیش کیا گیا ہے چنانچہ جوزیفس (یہ حواریانِ مسیح کا ہم عصر ہے) کی قدیم تاریخ یہود میں بصراحت موجود ہے کہ سکندر نے ہیکل یروشلم پر آ کر وہاں عبادت کی۔ وہاں کے پیشواؤں کی تعظیم و تکریم کی اور جب دانیال کی یہ پیشین گوئی اسے دکھائی گئی کہ "ایک رومی فاتح ایران کی شہنشاہیت کو برباد کر دے گا" وہ اس پیشین گوئی کا مصداق اپنے ہی کو سمجھا۔ جیوش انسائیکلو پیڈیا میں تصریح لکھی چلی آتی ہے کہ اس وقت کے یہود اسے مسیح موعود ماننے کو تیار تھے (ج ۱ ص ۵۰۰) ظاہر ہے کہ یہ معاملہ کسی مشرک کے ساتھ روا نہیں رکھا جا سکتا تھا اور نہ کوئی مشرک فرمانروا خود یہ معاملہ مرکزِ توحید کے ساتھ روا رکھتا۔ (برہان۔ ماہِ اگست)

"موحد" اور "مسلم" کی غلط تشریح کے علاوہ صاحبِ استدراک نے سکندر کو اس کا مصداق ثابت کرنے میں جو سند اور دلیل پیش کی ہے وہ بھی صحیح نہیں ہے اس لیے کہ "صاحبِ استدراک" کے اس ارشاد میں ایک دعویٰ ہے اور دوسری اس کی دلیل، دعویٰ یہ ہے کہ "روایتِ یہود" میں سکندر کو موحد اور اسرائیلی نبی کے مطیع کی حیثیت میں پیش کیا گیا ہے اور دلیل یہ ہے کہ قدیم تاریخ یہود کے مصنف جوزیفس (جو کہ حواریانِ مسیح کا

(باقی صفحہ ۱۲۹ پر)

باشندہ تھا۔

| | |
|---|---|
| والراجح انه ليس من اذواء اليمن و | اور راجح یہ ہے کہ ذوالقرنین (مذکور فی القرآن) یمن کے |
| لا كيقباذ بن ملوك العجم ولاهو اسكندر | بادشاہوں میں سے تھا اور نہ شاہانِ عجم میں سے کیقباد |
| بن فيلفوس بل ملك آخر من الصالحين | ذوالقرنین تھا اور نہ سکندر بن فیلقوس (مقدونی) ہی ذوالقرنین |
| ينتهي نسبه الى العرب الساميين | تھا بلکہ وہ ان سب سے جدا ایک نیک بادشاہوں میں سے تھا جن کا |

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۸ :

ہم عصر ہے) نے سکندر کے متعلق وہ سب کچھ لکھا ہے جو صاحب استدراک کی عبارت سے ابھی نقل ہو چکا اور اس کا مطلب یہ ہوا کہ سکندر کے مسلمان (موحد) ہونے کا زبردست شاہد جوزیفس ہے۔ مگر جوزیفس کا یہ حال ہے کہ وہ خود یہود کے نزدیک قابلِ تسلیم نہیں۔

جوزیفس؟ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جوزیفسؔ یہود کے نزدیک "غیر معتبر اور ناقابلِ احتجاج و اعتماد ہے اور اس کی کتاب قدیم تاریخ یہود" ان میں غیر مقبول ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جوزیفس میں دو خرابیاں ہیں جو کسی طرح یہود کی روایات کی صحت باقی نہیں رہنے دیتیں۔ ایک یہ کہ وہ "مورخ" نہیں ہے بلکہ داستان سرا اور قصہ گو ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ اس درجہ جھوٹا ہے کہ واقعات کو طبع زاد گھڑ کر بیان کر دیتے اور اصل واقعہ میں اپنی جانب سے من گھڑت اضافے کرنے کا عادی ہے۔ دوسرا عیب یہ ہے کہ اس کی دلی خواہش یہ تھی کہ یہودیوں، یونانیوں اور رومیوں کے درمیان جو نفرت قائم تھی اس کو کسی طرح مٹائے اور دونوں قوموں کے درمیان رابطۂ اتحاد پیدا کرے اس لیے وہ یونانی و رومی روایات میں خصوصیت کے ساتھ ایسی داستانیں اختراع اور ایجاد کرتا رہتا اور ان کو تاریخی حیثیت میں پیش کیا کرتا تھا جن کے ذریعہ سے وہ اپنے مسطورہ بالا مقصد کو پورا کرے اس لیے یونانیوں سے متعلق جس قدر روایات وہ بیان کرتا ہے خصوصیت کے ساتھ وہ قطعاً ناقابلِ اعتماد ہیں اور کسی طرح لائقِ احتجاج نہیں۔ چنانچہ انسائیکلو پیڈیا آف رلیجن اینڈ ایتھکس میں ہے:

> یہ بات یقینی ہے کہ جوزیفس نہ تو اعلیٰ درجہ کا مؤرخ ہے اور نہ ایک ایمان دار اور بے تعصب محقق جسے صرف حقیقت کی تلاش ہو بلکہ وہ ایسا مصنف ہے جس کی غرض و غایت صرف ایک مخصوص اثر پیدا کرنا ہی (ج ۷، ص ۵۷۴)

جوزیفس کا مقصد اور منتہائے نظر کیا ہے؟ آگے چل کر اسی کتاب میں اس کو اس طرح ظاہر کیا گیا ہے:

> "اس کی منتہائے تمنا یہ ہے کہ یہودیوں کے خلاف جو تعصب پھیلا ہوا ہے اسے دور کرے اور ان پر جو الزامات عاید کیے جاتے ہیں ان سے ان کو بری ثابت کرے اور یہودیوں اور یونانیوں کے درمیان پیدا شدہ دشمنی کو مٹا دے۔" (ج ۷ ۔ ص ۵۷۴)

جوزیفس کا یہ مقصد بُرا نہیں تھا اگر تاریخی حقائق پر مبنی ہوتا اور صحیح واقعات کی روشنی میں اس کو کامیاب بناتا مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ بلکہ اس کے برعکس یہ کیا۔

(باقی ص۱۳۰ پر)

الاولین ذکرہ صاحب الناسخ [1] نسب قدیم سامی عرب تک پہنچتا ہے، ناسخ التواریخ نے ایسا ہی کہا ہے۔

اور سید محمد آلوسی نے بھی اذواء یمن میں سے کسی کو ذوالقرنین تسلیم نہیں کیا اور اس قول کو غلط قرار دیا ہے۔

ان تفصیلات کے بعد اب بسہولت یہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآن میں مذکور ذوالقرنین کے متعلق یہ سب اقوال نظر انداز کر دینے کے قابل ہیں اور صرف دو قول ہی قابلِ توجہ ہیں۔ جن میں سے ایک

---

[1] عقیدۃ الاسلام فی حیوۃ عیسٰی علیہ السلام ص ۱۹۵۔
آیت من آیات اللہ حضرت علامہ سید محمد انور شاہ (نور اللہ مرقدہٗ) نے ذوالقرنین کے مسئلہ کو ضمنی طور پر بیان فرمایا ہے کیونکہ اس مقام پر ان کا مطمحِ نظر ذوالقرنین کی شخصیت کی تحقیق نہیں ہے بلکہ مرزا غلام احمد قادیانی کی ان ہفوات کی تردید مقصود ہے جو یاجوج وماجوج 'سد' دجال کے خروج اور مسیح بن مریم (علیہما السلام) کے نزول سے متعلق ہیں اور جن پر قادیانی نے اپنی نبوت اور یسوع مسیح ہونے کے دعوے کی بنیاد قائم کی ہے اور یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ یورپ کی موجودہ متمدن اقوام ہی وہ یاجوج وماجوج ہیں جن کا ذکر قرآن عزیز نے کیا ہے اور یہ کہ دجال ان کے پادری ہیں اور میں ہی وہ یسوع مسیح ہوں، احادیث میں جس کے نزول کی خبر دی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ وہ قریب قیامت میں آکر ان سب کا استیصال کرے گا۔
حالانکہ قادیانی مشن کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ اس نے اقوام یورپ کے الحاد و زندقہ، فساد فی الارض، اور دجل مکر کی زبردست وبا کو روکنے یا ختم کر دینے کی بجائے ممالکِ اسلامیہ کو یورپ کی بعض حکومتوں کے استعماری عزائم کے حوالہ کرنے اور غلام بنانے، جہاد جیسے فریضۂ اسلامی کی منسوخی کا اعلان کر کے اپنے مزعومہ یاجوج وماجوج کو خوش کرنے اور اپنے منکرین پر کفر کا عام فتویٰ دے کر کروڑوں پرستارانِ توحید کو کافر اور خارج از اسلام قرار دینے کے علاوہ اور کچھ نہیں کیا اور نام نہاد تبلیغِ اسلام کے پردہ میں بھی اپنے مشن کی کامیابی کے علاوہ اور اسلام کی کوئی خدمت انجام نہیں دی۔

---

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۹:

اس کا یہ حمایتی مقصد اس امر سے بالکل آشکارا ہو جاتا ہے کہ وہ ایسے ماخذوں کا انتخاب کرتا ہے اور ایسے ٹکڑوں کا حوالہ دیتا ہے جن میں یہودیوں کے ساتھ قدیم بادشاہوں اور رومیوں کے الطاف واکرام کا تذکرہ ہے وہ صداقت کو اپنے میلان اور رجحان کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھاتا ہے اگرچہ وہ اس بات کا مدعی ہے کہ حقیقت اور مکمل حقیقت کے سوا کچھ نہیں لکھے گا لیکن وہ ایفاء وعدہ نہ کر سکا اس لیے کہ (وہ اپنے مسطورۂ بالا مقصد کو پورا کرنے کے لیے) کہیں تو بعض چیزوں کو قصداً قلم انداز کر جاتا ہے اور کہیں اپنی طرف سے اضافہ کر دیتا ہے اور جگہ جگہ نہایت بے پرواہی اور بے ضابطگی کے ساتھ ماخذوں کے حوالے دیتا ہے۔ (ج ، ص ۴ ، ۵) (باقی ص ۱۳۱ پر)

قول سلف کی جانب منسوب ہے اور دوسرا متاخرین میں سے ایک معاصر محقق کی تحقیق ہے۔

**علماء سلف کی رائے**

علماء سلف کی رائے یہ ہے کہ قرآن میں مذکور ذوالقرنین عربی الاصل تھا، سامیہ اولیٰ میں سے تھا اور حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا معاصر بادشاہ تھا اور حج کے سفر میں دونوں کا ساتھ رہا ہے اور ایک معاملہ میں حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے اس کی عدالت میں مرافعہ کیا تھا اور اس نے ان کے حق میں فیصلہ دیا اور خضر (علیہ السلام) اس کے وزیر باتدبیر تھے۔ لیکن علماء سلف کی اس تحقیق میں کئی

---

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۰ :

جوزیفس کی تاریخی بددیانتی کا معاملہ صرف یہیں ختم نہیں ہوجاتا بلکہ اس سے آگے بڑھ کر وہ مقصد کی تکمیل کے لیے اپنی مقدس کتاب بائبل کے واقعات کو بھی توڑ مروڑ کیے بغیر نہیں چھوڑتا۔

اور یہی وجہ ہے کہ بائبل کے واقعات بھی کبھی کبھی اس کے قلم سے بالکل نئے معنی اور نئے پہلو اختیار کر لیتے ہیں۔

(انسائیکلوپیڈیا رلیجین، ج ۷، ص ۵۷۴)

جوزیفس کی اس غیر مورخانہ روش اور بددیانتی کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اپنی تاریخی تصانیف کو خود اپنی قوم "یہود" میں بھی مقبول نہ کرسکا اور ان میں بھی اپنا اعتماد کھو بیٹھا۔

اس کی تاریخی تصانیف اس کی قوم میں سب سے کم مقبول ہوئیں، اس کی قوم اس کو بے وفا اور غدار سمجھتی رہی

(انسائیکلوپیڈیا رلیجین، ج ۷، ص ۵۷۷)

**یروشلم اور سکندر**

اور یہ واضح رہے کہ "جیوش انسائیکلوپیڈیا" کا مضمون بھی اسی کی تاریخ سے ماخوذ ہے۔ جوزیفس کے متعلق یہ حوالجات تو اس کی عام مورخانہ حیثیت اور اس کی تاریخی کتابوں کی قدر و قیمت سے متعلق تھے۔ اب رلیجین انسائیکلوپیڈیا کی زبانی ان واقعات خصوصی کی حقیقت کو بھی سن لیجئے جن کو صاحب استدراک نے سکندر کے موحد اور (مسلمان) ہونے کی دلیل میں ذکر فرمایا ہے یعنی اس کا یروشلم میں جانا، جاکر عبادت کرنا اور یہودی پیشواؤں کی تعظیم کرنا وغیرہ

ایسنز (ESTHAR) کی کتاب اور عہد ارٹا سرزز (ARTAZERXES) کے تذکرہ کے بعد جوزیفس جب قصص تورات کے آخری حصہ پر پہنچتا ہے تو اسی جگہ سے اس کی کتاب انٹی کوئٹس جوڈائکو (ANTIGAITETAS JUDACIO) کے دوسرے باب کا آغاز ہوتا ہے اس باب کے شروع ہی میں روایات کا تسلسل جاتا رہتا اور ان میں ایک خلا پیدا ہوجاتا ہے جو "مکابیین بغاوت" (MACEABBSN REVOLT) کے دور تک برابر قائم رہتا ہے اور تین صدی تک چلا جاتا ہے اور اسی کے اندر سکندر مقدونی، ٹولمی اور سلیولیسائڈ (SELEUEIDAT) وغیرہ کے عہد حکومت بھی آجاتے ہیں ان دوہائے حکومت کے متعلق جوزیفس صرف بے ربط قصے بیان کرتا ہے جو سکندر کے آخری دور کے ماخذ سے لیے گئے ہیں اس غیر مسلسل اور بے ربط سلسلہ کی سب سے پہلی چیز اسکندر یہ کا یروشلم جانا ہے اور اس کے ساتھ وہ تمام واقعات بھی ہیں جو اس کے وہاں جانے سے پہلے اور

(باقی ص ۱۳۲ پر)

فروگذاشتیں پائی جاتی ہیں جو اس تحقیق کو ایک متردد اور مضطرب رائے میں تبدیل کر دیتی ہیں، مثلاً قرآن نے ذوالقرنین کے اوصاف میں سے ایک وصف یہ بیان کیا ہے کہ اس نے اپنی عمر میں تین تاریخی مہم سر کی ہیں.... ایک میں وہ مطلع الشمس تک پہنچا ہے یعنی مشرق کی جانب اس حد تک پہنچا جہاں آبادیوں کا سلسلہ ختم ہو کر سورج سامنے سے طلوع ہوتا نظر آتا تھا اور دوسرے میں وہ مغرب الشمس تک گیا ہے یعنی اس حد تک پہنچا ہے جہاں حصۂ زمین ختم ہو کر سمندر کا کوئی ایسا حصہ

---

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۱ :

جانے کے بعد سے وابستہ ہیں کیونکہ یہ واقعہ جوزیفس نے ایک ایسے ماخذ سے لیا ہے جو غیر معتبر اور غیر موثق ہے اور دانیال نبی کی کتاب کے بعد کی کتاب سے ماخوذ ہے (انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس ج ۷، ص ۷۵۴)

یہ حقیقت ہے اس حوالہ کی جو جیوش انسائیکلو پیڈیا سے نقل کر کے "صاحب مستدرک" نے ایسے اہم تاریخی مسئلہ کے متعلق تحریر فرمایا ہے، کہاں یہ من گھڑت اور بے دلیل قصہ جس کا ماخذ تک غیر معتبر اور غیر مستند ہے اور کہاں سائرس کے یروشلم بنانے اور خدا کے مسیح ہونے کے وہ ناقابلِ تردید تاریخی واقعات جو کتابِ مقدس اور صحیح تاریخی حوالوں سے ثابت ہیں۔

بہرحال جوزیفس، اس کی کتبِ تاریخ اور اس کے تاریخی ماخذوں کے متعلق مسطورہ بالا محققانہ حوالجات کے بعد آپ خود کتابِ مقدس کی طرف رجوع کیجیے اور معلوم کیجیے کہ داستان سرا اور قصہ گو جوزیفس کی یروشلم والی داستان اور یہود کا سکندر کو مسیح موعود مان لینے کا قصہ یہ دونوں کیا حقیقت رکھتے ہیں۔

**خدا کا مسیح** | ابھی بابل کے بادشاہ بخت نصر (بنوکدرزار) نے بیت المقدس پر چڑھائی نہیں کی تھی کہ حضرت یسعیاہ نبی (علیہ السلام) نے وحیِ الٰہی سے خبر پا کر یہود کو مطلع کیا کہ وقت آنے والا ہے کہ بابل کی حکومت کے ہاتھوں یروشلم کا ہیکل برباد ہوگا اور اس کی توہین کی جائے گی اور اس کے بعد یہ بشارت سنائی کہ وہ پھر خورس (سائرس) کے ہاتھوں بنایا جائے گا اور اس کی عزت و حرمت برقرار کی جائے گی اور یہود بابل کی غلامی سے آزاد ہو جائیں گے۔ چنانچہ پیشین گوئی کے الفاظ یہ ہیں:

خداوند تیرا نجات دینے والا جس نے تجھے رحم میں بنا ڈالا یوں فرماتا ہے ...... یروشلم کی بابت کہتا ہوں کہ وہ آباد کی جائے گی اور یہوداہ کے شہروں کی بابت کہ وہ بنائے جائیں گے اور میں اس کے ویران مکانوں کو تعمیر کروں گا جو سمندر کو کہتا ہوں کہ سوکھ جا اور میں تیری ندیاں سکھا ڈالوں گا جو خورس کے حق میں کہتا ہوں کہ وہ میرا چرواہا ہے اور وہ میری ساری مرضی پوری کرے گا اور یروشلم کی بابت کہتا ہوں کہ وہ بنائی جائے گی اور ہیکل کی بابت کہ اس کی بنیاد ڈالی جائے گی۔ (یسعیاہ باب ۴۴ آیت ۲۳ - ۲۸)

خداوند اپنے مسیح خورس کے حق میں یوں فرماتا ہے کہ میں نے اس کا داہنا ہاتھ پکڑا کہ امتوں کو اس کے قابو میں کروں اور بادشاہوں کی کمریں کھلوا ڈالوں ...... اور میں گاڑے ہوئے خزانے اور پوشیدہ مکانوں کے گنج تجھے دوں گا تاکہ تو جانے کہ میں خداوند اسرائیل کا خدا ہوں جس نے تیرا نام لے کے بلایا ہے (باب ۴۴ آیت ۳۱)

(باقی ص ۱۳۳ پر)

سامنے تھا جس میں غروب کے وقت یوں معلوم ہوتا تھا گویا سورج گدلے چشمہ میں ڈوب رہا ہے اور تیسری مہم ایسے سفر سے متعلق تھی جس میں اس کو ایک ایسی قوم سے واسطہ پڑا جو اس کی زبان سے ناآشنا تھی اور جس نے یاجوج و ماجوج قبائل کی تاخت و تاراج کے متعلق اس سے شکایت کی اور اس نے ان کی فرمائش پر دو پہاڑوں کی پھاٹکوں کے درمیان لوہے اور تانبے سے ایک مضبوط بند قائم کر کے حملہ آور یاجوج و ماجوج قبائل سے ان کو محفوظ کر دیا لیکن علماء سلف یہ بتانے سے قاصر رہے ہیں

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۲ :

حضرت یسعیاہ نبی کی یہ پیشین گوئی خورس (سائرس) کے فتح بابل سے ایک سو ساٹھ برس پہلے یہود کو سنائی گئی اور فتح بابل کے صرف ساٹھ برس پہلے اسی کی تائید میں حضرت یرمیاہ نبی نے یہود کو یہ پیشین گوئی سنائی تھی۔

"وہ کلام جو خداوند نے بابل کی بابت اور کسدیوں کی سرزمین کی بابت یرمیاہ نبی کی معرفت فرمایا۔ تم قوموں کے درمیان بیان کرو اور اشتہار دو اور جھنڈا کھڑا کرو۔ منادی کرو۔ مت چھپاؤ۔ کہو کہ بابل لے لیا گیا بعل رسوا ہوا مردوک سراسیمہ کیا گیا ہے اس کے بت خجل ہوئے اس کی مورتیں پریشان کی گئیں کیوں کہ اتر سے قوم اس پر چڑھتی ہے جو اس کی سرزمین کو اجاڑ کرے گی۔ الخ (یرمیاہ باب ۵ آیت ۱-۳)

اور عزرا نبی کی کتاب میں بصراحت موجود ہے کہ خورس (سائرس) نے یروشلم کی ہیکل کو تعمیر کیا اور اس نے اس کی تعمیر اور عزت و حرمت کا اپنی قوم میں اعلان کرایا اور اس طرح یرمیاہ نبی کی بشارت پوری ہوئی :-

اور شاہِ فارس خورس کی سلطنت کے پہلے برس میں اس خاطر کہ خداوند کا کلام جو یرمیاہ کے منہ سے نکلا تھا پورا ہوا۔ خداوند نے شاہِ فارس خورس کا دل اُبھارا کہ اس نے اپنی تمام مملکت میں منادی کرائی اور اسے قلمبند بھی کر کے یوں فرمایا۔ شاہِ فارس خورس یُوں فرماتا ہے کہ خداوند آسمان کے خدا نے زمین کی ساری مملکتیں مجھے بخشیں اور مجھے حکم کیا ہے کہ یروشلم کے بیچ جو یہوداہ میں ہے اس کے لیے ایک مسکن بناؤں۔ پس اس کی ساری قوم میں سے کون کون ہے اس کا خدا اس کے ساتھ ہوا اور وہ یروشلم کو جو شہر یہوداہ کو جائے اور خداوند اسرائیل کے خدا کا گھر بنائے کہ وہی خدا ہے جو یروشلم میں ہے۔ الخ (عزرا باب آیت ۱-۳)

یسعیاہ نبی اور یرمیاہ نبی کی پیشین گوئیوں سے اور عزرا نبی کی کتاب میں اس بیان کردہ منادی سے جو خورس (سائرس) کی جانب سے کی گئی ہیں تین باتیں صاف اور صریح طور پر ظاہر ہوتی ہیں۔

(۱) توراۃ کی پیش گوئیاں خورس کو خدا کا چرواہا اور خدا کا مسیح بتا رہی ہیں نہ کہ سکندر کو۔

(۲) یروشلم (بیت المقدس) کے ہیکل کی تعمیر اس کی عزت و حرمت کا اعلان اس کے خدا کے گھر ہونے کا اقرار اور یہود کی آزادی خورس (سائرس) کے ہاتھوں ہوئی نہ سکندر کے۔

(۳) یرمیاہ نبی کی پیشین گوئی میں اگرچہ نام نہیں ہے لیکن یہ تصریح ہے کہ بابل کا تباہ کرنے والا اور یروشلم کو آباد

(باقی ۱۳۳ پر)

کہ جس شخص کو وہ ذوالقرنین فرما رہے ہیں کیا واقعی اس کو یہ تینوں مہم اس تفصیل کے ساتھ پیش آئیں جن کا ذکر قرآن میں موجود ہے بلکہ وہ اس کا بھی فیصلہ نہیں فرما سکے کہ اس کا اصل نام کیا ہے؟ اس کا مرکزِ حکومت کہاں تھا؟ اور اس کو ذوالقرنین کیوں کہتے ہیں؟ غرض سلف رحمہم اللہ کے یہاں ان سوالات کے جواب میں اس درجہ مختلف اور مضطرب اقوال پائے جاتے ہیں کہ قرآن کے بیان کردہ اوصاف و علامات کے پیشِ نظر ان کے ذریعہ کسی قدیم العہد بادشاہ کی شخصیت کا تعین ناممکن ہو جاتا اور

---

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۳ :

کرنے والا اُتر (شمال) سے اُٹھے گا۔ سو یہ فارس و میڈیا کا بادشاہ خورس ہی ہو سکتا ہے نہ کہ سکندر جو یونان سے (بابل کی جانب مغرب سے) اٹھا اور عزرا نبی کی تصدیق بھی اسی کی تائید کرتی ہے۔

(۴) یہ تمام پیشین گوئیاں متفق ہیں کہ خورس کی فتوحات جابرانہ و قاہرانہ انداز کی نہیں تھیں بلکہ ایک صالح اور باخدا انسان کی حیثیت سے تھیں اور کتاب مقدس کے ان صاف اور صریح بیانات کے علاوہ تاریخی حقائق بھی ان نتائج کی زبردست تائید کرتے ہیں چنانچہ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں سائرس کے متعلق یہ تصریحات موجود ہیں۔

بابل پر جب سائرس حملہ آور ہوا تو وہاں کے یہودیوں نے ایرانیوں کو نجات دہندگان اور موحدین کہہ کر پکارا اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہود کی مدد کے صلہ میں سائرس نے یہودیوں کو یروشلم اور ان کا معبد (ہیکل) واپس کر دیا اور انھیں فلسطین لوٹنے کی اجازت دیدی۔ (ج ۶ ص ۷۵۲) ایڈیشن ۹)

اب کتاب مقدس اور اس کے ان روشن تاریخی حوالوں پر نظر کیجیے اور پھر جوزیفس کی اس بد دیانتی کی داد دیجیے کہ اس نے یروشلم کی تعمیر علماء یہود کی تعظیم و تکریم اور خدا کے مسیح کے ہاتھوں یہود کی بابل سے نجات کے تمام ان معاملات کو جو کتاب مقدس نے خورس (سائرس) کے لیے مخصوص کیے تھے کس جرأت کے ساتھ سکندر مقدونی پر اس غرض سے چسپاں کر دیے کہ کسی طرح اس کا یہ مقصد کہ یہودیوں اور یونانیوں اور رومیوں کے درمیان منافرت کی خلیج کو پاٹ دیا جائے پورا ہو جائے مگر اس کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا اور یہودیوں نے ان تحریفات کی بنا پر (جیسا کہ ابھی حوالہ گزر چکا ہے) اس کو خائن اور غدار کہہ کر اس کی تاریخی کتابوں کو بھی غیر مقبول قرار دیدیا اور اگر ہم بالفرض سکندر کے معاملہ زیرِ بحث میں جوزیفس کی روایت کو صحیح بھی مان لیں تو اس کی حقیقت زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتی ہے (جیسا کہ تاریخ شاہد ہے) کہ سکندر کی یہ عادت تھی کہ جس ملک کو فتح کرتا وہاں کی پبلک کو اپنا بنانے کے لیے ملکی رسم و رواج کے مطابق عبادت کر کے یہ ثابت کرتا کہ مجھ کو بھی ان عقائد و عبادات سے ایسا ہی تعلق ہے جیسا کہ اس ملک کے رہنے والوں کو پھر کیا عجب ہے کہ یہودیوں کو متاثر کرنے کی خاطر اس نے یروشلم میں بھی یہ ڈھونگ رچایا ہو یا سائرس کی نقل اتار کر یہودیوں میں ذوالقرنین بننے کی کوشش کی ہو اگرچہ وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔

چنانچہ بستانی کی انسائیکلو پیڈیا میں ہے کہ سکندر جب مصر پہنچا تو لیبیا کے کاہنوں اور باشندوں کو خوش کرنے

(باقی ص ۱۳۵ پر)

معاملہ اپنی جگہ غیر منفصل ہوکر رہ جاتا ہے۔ مثلاً نام کے متعلق زبیر بن بکار اور ابن مردویہ (عن ابن عباسؓ) کہتے ہیں کہ عبداللہ بن ضحاک بن معد بن عدنان ہے مگر اس کے متعلق حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ یہ روایت بہت ضعیف ہے اس لیے کہ اس صورت میں وہ حضرت ابراہیمؑ کا معاصر نہیں ہو سکتا جبکہ حضرت ابراہیم اور عدنان کے درمیان چالیس واسطے ہیں۔[۱] ابن ہشام کعب احبار اور جعفر بن حبیب کہتے ہیں کہ اس کا نام مصعب بن عبداللہ یا مصعب حمیری ہے۔[۲] حافظ ابن حجر کا رجحان بھی اسی جانب ہے لیکن

---

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۴ :

کے لیے ان کے معبود (مشتری) کی پرستش کی (ملاحظہ ہو ج ۳ ص ۵۴۶)

اور انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں ہے :

بابل میں سکندر نے وہاں کے مقامی دیوتاؤں کو بھینٹ چڑھائی جیسا کہ اس نے دوسرے مقامات پر بھی اسی طرح کیا تھا (یعنی مقامی دیوتاؤں کی پرستش کی تھی) اور یہ تمام ملکوں کے مذاہب کی آمیزش آگے چل کر یونانی الحاد و بے دینی پر بڑی حد تک اثر انداز ہوئی۔ (ج ۵ ص ۱۴۱ - ایڈیشن ۹)

ہاں یہ صحیح ہے کہ کتاب مقدس کی مسطورۂ بالا پیشین گوئیوں کی صحت پر بعض عیسائی مؤرخوں نے یہ شبہ ظاہر کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ ممکن ہے کہ یہ پیشین گوئیاں جن میں خورس کا نام تک مذکور ہے واقعات کے وجود پذیر ہونے کے بعد بنائی گئی ہوں۔ لیکن اول تو اپنے اس دعوے یا شبہ پر انھوں نے قیاس و تخمین کے سوائے کوئی دلیل نہیں دی دوسرے یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ بابل کی غلامی کے دور اور بخت نصر کے توراۃ جلا ڈالنے کے واقعۂ ہائلہ کے بعد کے اس قسم کے تمام ذخیرے کے متعلق علماء یہود و نصاریٰ کا اس پر کلی اتفاق ہے کہ یہ اضافات و تحریفات سے محفوظ ہیں اور ان میں رد و بدل کے لیے کوئی سبب وجود پذیر نہیں ہوا یعنی توراۃ کے قدیم حصہ کی طرح اس پر کوئی حادثہ نہیں گزرا اگر علماء یہود و نصاریٰ کے اس جواب کو نظر انداز کرتے ہوئے ہم یہ تسلیم کیے لیتے ہیں کہ ان پیشین گوئیوں میں خورس کے نام کی تصریح بعد کو داخل کردی گئی یا ان پیشین گوئیوں کو واقعات کے مطابق بنا لیا گیا تب بھی ہمارا مطلب حاصل ہے اس لیے کہ ان پیشین گوئیوں سے یہ بات تو بغیر کسی خدشہ کے ثابت ہوگئی کہ یہودیوں میں "خورس" کے یروشلم تعمیر کرنے یہود کو آزاد کرانے اور مذہب یہود کی عظمت کرنے اور یہود کا اس کو خدا کا مسیح سمجھنے کی روایات کو اس درجہ تواتر حاصل تھا کہ شبہ کرنے والوں کے بقول یہودنے سائرس کے ساتھ خوش اعتقادی کی وجہ سے ان ثابت شدہ حقائق کو کتاب مقدس میں وحی الٰہی کی بشارت بنا ڈالا۔ لیکن اس کے برعکس سکندر مقدونی کو کسی طرح یہ حیثیت حاصل نہ ہوسکی۔

بہرحال کس قدر حیرت کی بات ہے کہ یروشلم سے متعلق جن واقعات کو صدیوں تک کتاب مقدس اور یہودیوں کی متواتر روایات میں خورس (سائرس) سے وابستہ ظاہر کیا گیا وہ چار سو برس کے بعد یک بیک جوزیفس کی زبانی سکندر کے حق میں ہو جاتے ہیں ان ھذا لشیء عجاب۔ (باقی ص ۱۳۶ پر)

[۱] فتح الباری ج ۶ [۲] مصعب یا مصعب بن عبداللہ بن قرین بن منصور بن [illegible] تاریخ طبری ج ۲ و تاریخ ابن کثیر ج ۲ و توراۃ پیدائش باب ۱۰ [illegible]

ابن عبد البر کہتے ہیں کہ مصعب سے قحطان تک چودہ پشت ہوتی ہیں اور ابراہیم علیہ السلام سے فلیج تک سات پشت ہیں حالانکہ فلیج اور قحطان دونوں بھائی اور عبر کے بیٹے ہیں[1] لہٰذا اس حساب سے یہ شخص بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا معاصر نہیں ہوسکتا اور جعفر بن حبیب کی دوسری روایت یہ ہے کہ منذر بن ابی القیس (شاہ حیرہ)[2] ذوالقرنین ہے لیکن یہ بادشاہ حضرت سلیمان (علیہ السلام) کے بھی بعد پیدا ہوا ہے اور ہمدانی نے کتاب الانساب میں اس کا نام ہمیسع (ابوالصعب) بن عمرو بن عرب بن زید بن کہلان بن سبا بن قحطان

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۵ :

سکندر مشرک تھا سکندر کے مذہب کا ذکر اگرچہ پہلے گزر چکا ہے مگر آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ وہ صرف دیوتاؤں کی پوجا ہی نہیں کرتا تھا بلکہ اس درجہ مغرور و متکبر تھا کہ یونان اور ایران کے لوگوں کو اپنے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیتا اور اپنے تئیں معبود کہلاتا تھا (دائرۃ المعارف للبستانی ج ۲ ص ۵۴۷)

اور انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں ہے :

جب سکندر باختر (BACTRA) لوٹ آیا اور اوکزیارٹس کی بیٹی رواکزانا (ROXANA) سے شادی کی تو شادی کی دعوت کے موقعہ کو غنیمت جان کر اس نے اپنے یونانی اور مقدونی پیرووں سے اپنی خدائی کا اعتراف کرانا چاہا۔ الخ (ج ص ۴۸۴)

اور مشہور محدث حافظ عماد الدین بن کثیر نے اپنی تاریخ البدایہ والنہایہ میں بروایت قتادۃ سکندر ذوالقرنین اور سکندر بن فیلبس میں فرق کرتے ہوئے سکندر مقدونی کو مشرک کہا ہے (ج ۲ ص ۱۰۶)

اسی طرح حافظ ابن حجر نے امام رازی کے قول کو بطور سند پیش کرتے ہوئے سکندر مقدونی اور اس کے وزیر ارسطاطالیس دونوں کو کافر کہا ہے (ملاحظہ ہو فتح الباری جدید ایڈیشن ج ۶ ص ۲۹۴)

اور اسلام کے ان جلیل القدر ائمہ دین کی مزید تائید انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا سے بھی ہوتی ہے چنانچہ مقالہ نگار لکھتا ہے :

"جب سکندر دریائے ستلج کے کنارہ پہنچا تو اس نے اپنی فوج کو دریا کے عبور کرنے کا حکم دیا لیکن فوج نے عبور کرنے سے انکار کر دیا اس پر سکندر نے اپنے افسروں کے سامنے مزید فتوحات کی اسکیم پیش کی لیکن یہ بے سود ثابت ہوئی۔ تب سکندر نے حسب دستور دریا کے سامنے دیوتاؤں کی بھینٹ پڑھائی اور (اپنے عقیدہ کے مطابق) دیوتاؤں کی اجازت نہ سمجھتے ہوئے پیش قدمی سے باز آیا اور واپس لوٹ گیا (ج ۱ ص ۴۸۴)

اور انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن میں ہے کہ جوزیفس کی زبانی اگرچہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاہ سکندر یروشلم گیا تھا اور اس نے یہود کے ساتھ خصوصی مراعات بھی کیں اور محکمہ خبر رسانی میں ممتاز درجے بھی دیے اور اس طرح یونانیوں اور یہودیوں میں ایک علاقہ قائم ہوگیا" تاہم یہ محقق ہے کہ یہودیوں نے ان کے کلچر اور ان کے عقائد و رسوم کو اپنے اندر داخل نہ ہونے دیا اور وہ ہمیشہ ان کو اس حیثیت سے نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھتے رہے اور یہ اس وجہ سے ہوا کہ یہودی قوم سختی کے ساتھ توحید کی

(باقی صفحہ پر)

[1] کتاب المحبر [2] [illegible]

یا ابن یشجب بن یعرب بن قحطان بتایا ہے۔ اگرچہ اس نام کا بادشاہ سبا کے خاندان سے ضرور ہو گزرا ہے لیکن حمیری (سبا) بادشاہوں کے طبقۂ اولیٰ کی تاریخ بھی سنہ ۱۲۰۰ ق م سے اوپر نہیں جاتی ...... حالانکہ معاصر ابراہیم (علیہ السلام) کو سنہ ۲۳۰۰ ق م ہونا چاہیے اور ابن ہشام نے سیرت میں دوسری روایت یہ نقل کی ہے کہ ذوالقرنین کا نام مرزبان بن مردبہ ہے اور حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ محمد بن اسحٰق کی روایت کی وجہ سے اسی کو سکندرِ اول بھی کہتے ہیں لیکن تاریخی اعتبار سے یہ نام مجہول ہے اور اس نام کا کوئی بادشاہ

---

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۶ :

قائل تھی اور اپنے مذہبی عقائد میں بہت پختہ" اور یہی وجہ ہے کہ یونانیت اور یہودیت میں کبھی اتصال نہ ہو سکا (ج ۵ ص ۹۰۹)

اور بستانی لکھتا ہے کہ سکندر مقدونی نے وفات کے وقت جو وصیت کی وہ یہ تھی کہ اس کو بتوں کے درمیان دفن کیا جائے۔

| | |
|---|---|
| ثم لما رأی ان لا رجاء له بالشفاء ولا ساعة | پھر جب سکندر نے دیکھا کہ اب زیست کی کوئی امید |
| دنت نزع خاتمه من اصبعه وسلمه الی | باقی نہیں رہی اور اس کی موت کا وقت قریب آگیا تو |
| الامیر بردیکاس واوصاه ان ینقل جثته | اس نے اپنی انگلی سے شاہی مہر نکال کر اپنے امیر |
| الی هیکل المشتری بوالحات سیوة لیدفن | بردیکاس کو دی اور اس کو وصیت کی کہ مجھ کو سیوہ کے علاقہ |
| هناك بین الاصنام۔ (ج ۳ ص ۵۴۸) | میں مشتری دیوتا کے ہیکل میں بتوں کے درمیان دفن کیا جائے۔ |

اب ان تمام حقائق کو پیشِ نظر رکھیے اور فیصلہ کیجیے کہ "مضمون نگار" کا یہ کہنا صحیح ہے کہ "سکندر مقدونی کی تاریخ کا یہ مسلّم باب ہے کہ وہ یونانیوں کے قدیم مذہب اور دیوتاؤں کی پرستش کا معتقد تھا اور یہ کہ وہ ہرگز مسلمان نہ تھا یا محترم صاحبِ استدراک" کا یہ ارشاد کہ "دعویٰ (کہ سکندر مشرک تھا) بجائے خود مخدوش و مجروح ہے"۔

اور یہ بھی انصاف طلب بات ہے کہ "صاحبِ استدراک" کے اس حوالہ کی "جو کہ جوزیفس کی قدیم تاریخ یہود سے دیا گیا ہے" محققین مؤرخین بلکہ کتاب مقدس کی نگاہ میں کیا قدر و قیمت ہے؟ کہاں مدلل واقعات و حقائق اور کہاں محض ظن و تخمین سے

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا

**سکندر کا ظلم و جبر** محترم صاحبِ استدراک "مضمون نگار کے دوسرے دعویٰ کی تردید فرماتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:۔

"سکندر کا جابر و قاہر ہونا مسلّم نہیں بہت کچھ مختلف فیہ ہے۔ تاریخ میں دونوں قسم کے اقوال ملتے ہیں کم از کم شک کا فائدہ تو اسے ملتا ہی ہے (برہان ماہ اگست سنہ ۴۱ء)

اس سلسلہ میں عرض کرنے دیجیے کہ قدیم و جدید مسلم اور عیسائی مؤرخین نے سکندر کی جو سیرت پیش کی ہے بحیثیتِ مجموعی ان سب کا حاصل یہ ہے کہ وہ جابر و قاہر تھا اور اس کو نیک سیرت اور صالح بادشاہ نہیں کہا جا سکتا لہٰذا کم از کم ایک قول تو ایسا پیش کیا جاتا جس میں اس کو نیک، عادل اور صالح تسلیم کیا گیا ہو۔

رہی یہ بات کہ اس کی تاریخ میں کوئی ایک واقعہ بھی عدل یا رحم کا موجود نہیں ہے تو اس کا انکار تو کوئی بھی نہیں کر سکتا مگر

(باقی ص ۱۳۹ پر)

۱؎ تعلیقی

تاریخوں میں مذکور نہیں ہے۔ علاوہ ازیں علماءِ سلف یہ صراحت کرتے ہیں کہ ذوالقرنین عربی الاصل ہے اور مرزبان اور مردویہ عربی نام نہیں ہیں بلکہ عجمی نام ہیں اس لیے اگر اس نام کا کوئی بادشاہ ہوگا تو وہ عجمی ہوگا نہ کہ عربی، اور وہب بن منبہ سے منقول ہے کہ اس کا نام صعب بن مرائد (تبع اول) ہے[1] لیکن یہ اس لیے صحیح نہیں کہ اول تو کوئی تبع اول کا یہ نام ہی نہیں ہے بلکہ اس کا نام حارث الرائش یا زید ہے دوسرے کوئی (حمیری) "تبع" حضرتِ ابراہیم کا معاصر نہیں ہے اور دارقطنی اور ابن ماکولا سے منقول ہے کہ

---

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۷ :
ان چند گنتی کے واقعات سے کسی کی سیرت، عادل رحیم اور صالح نہیں کہی جا سکتی ورنہ تو پھر چنگیز خاں، ہلاکو خاں اور حجاج بن یوسف کو بھی یہی مقام دیا جانا چاہیے۔ سکندر کی جابرانہ حیثیت کا اندازہ ان چند حوالوں سے کیا جا سکتا ہے ——————
انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں ہے :-

"درحقیقت اس کے دماغ کا توازن شروع ہی سے بگڑ گیا تھا، یہ ظالم اور جابر انسان جو اپنے کو خدا سمجھتا تھا، جو اپنے دوست کے سینہ میں برچھی گھونپ کر مسرور ہوتا تھا، جو ایک دوسرے دوست کو سخت ترین جسمانی ایذا پہنچا کر اس کی چیخ پر حقارت آمیز انداز میں متبسم ہوتا تھا وہ ایک عادل دماغ فرمانروا اور مدبّر ہونے سے بہت دور تھا۔" (ج ۱ ص ۴۸۵)

ہر شخص اس سے صد درجہ خوشامدانہ انداز میں بات کرنے پر مجبور تھا۔ پلوٹارک (PLOTAROK) لکھتا ہے کہ اس کو اپنی پرانی عادت یعنی انسانوں کا شکار کرنے میں بڑی تسلی و تشفی اور سکون حاصل ہوتا تھا۔" (ج ۱)

آخرکار وہ پسرگیڈا (PASARGADAE) پہنچا اور سائرس کی قبر کا پتہ لگا کر اسے کھدوایا اور لوٹا اور اس کی توہین کی" (ج ۱ ص ۴۸۴)

"(قابض ہو جانے کے بعد) پسر گیڈا میں اس کو بے شمار دولت مال و اسباب ہاتھ آیا جس کی قیمت کا اندازہ ایک کروڑ تیس لاکھ پونڈ کے قریب کیا جاتا ہے، اس دولت کو لوٹنے کے بعد اس نے شہر کے تمام مردوں اور اولادِ ذکور کو تہ تیغ کیا اور عورتوں اور اولادِ اناث کو باندیاں بنا لیا" (ج ۱ ص ۴۸۳)

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے علاوہ بستانی اور وہ تمام مسلمان مؤرخین جو اس کو زبردستی "ذوالقرنین" بنانے پر آمادہ نہیں ہیں سکندر سے متعلق اسی قسم کی روایاتِ جبر و قہر بیان کر رہے ہیں۔ پس ضرورت تھی کہ ان روایات کے مقابلہ میں کسی محقق مؤرخ کی ایک روایت ایسی بھی سامنے آ جاتی جو تخمین و قیاس سے جدا تاریخی روشنی میں اس کو نیک، صالح اور عادل بادشاہ ثابت کر سکتی مگر افسوس کہ ایسا نہیں ہے اور تمام ذخیرۂ تاریخ اس سے یکسر خالی ہے۔

رہا "شبہ کا فائدہ" تو اول تاریخی حقائق کے بعد شبہ کے فائدہ کا سوال ہی کیا ہے اور اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے تو اس کو زیادہ سے زیادہ یہ فائدہ پہنچایا جا سکتا ہے کہ سکندر کو جابر و قاہر کہنے پر سکوت اختیار کر لیا جائے نہ کہ یہ فائدہ کہ یہی ہستی کو

(باقی ص ۱۳۹ پر)

[1] کتاب التیجان لابن ہشام۔

اس کا نام ہرمس یا ہردس بن قیطون بن لنطی ہے[۱]۔ مگر یہ سخت مغالطہ ہے اس لیے کہ یہ سکندر مقدونی کے دادا کا نام ہے اور سکندر کے مغالطہ ہی میں ذکر میں آگیا ہے۔

اس تفصیل سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس امر پر اتفاق کے باوجود کہ قرآن میں مذکور ذوالقرنین حضرت ابراہیم علیہ السلام کا معاصر بادشاہ ہے جو نام سلف سے منقول ہیں ان میں سے نہ کوئی حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا معاصر ہے اور نہ سامیۂ اولیٰ میں سے بلکہ یا یمنی حمیری سلاطین کے نام ہیں اور

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۸ :

جس کا نیک، صالح اور عادل ہونا تک مشتبہ ہو قرآن عزیز کا ذوالقرنین بنا دیا جائے کہ جس کی منقبت میں قرآن عزیز رطب اللسان ہے اس کو تو بلاشبہ تاریخی صحائف میں روزِ روشن کی طرح صالح و عادل ثابت ہونا چاہیے۔

سکندر کا مغرب کی طرف اقدام | تیسری بات "مضمون نگار" نے یہ کہی تھی کہ سکندر کی تاریخی مہمات کے متعلق یہ مسلمات میں سے ہے کہ وہ مغرب کی جانب نہیں بڑھا" چنانچہ "صاحبِ استدراک" اس کو بھی مخدوش و مجروح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"سکندر کی ابتدائی فتوحات تاریخ کو مسلم ہے کہ شمال و مغرب ہی کی جانب حاصل ہوئی تھیں۔"

(برہان ماہ اگست ۴۱ء)

اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ سکندر کی شمالی جانب میں فتوحات کا انکار تو "مضمون نگار" نے بھی نہیں کیا البتہ مغربی جانب میں سلسلۂ فتوحات و سیاحت کے بڑھنے کا ضرور انکار کیا ہے "صاحبِ استدراک" اس کی تردید میں ارشاد فرماتے ہیں:

"اور مقدونیہ کے کنارے مغرب میں ہی وہ جھیل ہے جس کا پانی اتنا گندہ ہے کہ سیاہی مائل ہو گیا ہے اور وہیں سورج ڈوبتا نظر آتا ہے: وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِي عَيْنٍ حَمِئَةٍ کا پورا مصداق۔ (برہان، اگست ۴۱ء)

مگر یہ دلیل "کوہ کندن و کاہ برآوردن" سے زیادہ وقیع نہیں ہے۔ اس لیے کہ "مضمون نگار" کا یہ مقصد تو ہرگز نہ تھا کہ سکندر جس نے شمال اور مشرق میں ہزاروں میل تک زبردست فتوحات حاصل کیں اور ملکوں، بلاد، شہروں کو مسخر کیا وہ مغرب کی جانب اپنے دارالسلطنت مقدونیہ کے کنارہ تک بھی نہیں گیا۔

پس اس جھیل تک سکندر کا پہنچنا جو مقدونیہ کے کنارہ ہی پر ہے ایسی کونسی عظیم الشان مہم تھی جس کا ذکر قرآن عزیز نے اس اہمیت کے ساتھ کیا ہے اور جس سے صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایسی مغربی مہم کا ذکر کیا جا رہا ہے جو ذوالقرنین کے مرکزی دارالسلطنت سے سینکڑوں یا ہزاروں میل دور اس حد پر پہنچ گئی تھی جہاں صحراؤں اور پہاڑوں کی مسافت طے کرنے کے بعد پانی کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ مقدونیہ کے کنارہ کی جھیل اوکریڈا جس جگہ واقع ہے وہاں تو صبح و شام خدا کی ہزاروں مخلوق کا شب و روز ہی گذر ہوتا رہتا تھا اور وہ مغرب کے کسی آخری حصہ میں بھی واقع نہیں ہے بلکہ اطراف و جوانب کے شہروں اور ملکوں کے درمیان واقع ہے تو یہ کونسی ایسی جگہ تھی جس کا ذکر قرآن اس طرح کرتا ہے: حَتّٰى إِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِي عَيْنٍ حَمِئَةٍ پس محض جھیل کے پانی کے گندہ اور سیاہی مائل ہونے کی

(باقی ص ۱۴۰ پر)

[۱] تاریخ ابن کثیر ج ۲۔

یا عجمی بادشاہوں کے نام اور ان میں اس درجہ اختلاف ہے کہ چند علماء سلف کا کسی ایک پر اتفاق نہیں اور اسی بناء پر حافظ ابن حجر صرف یہ فرما کر خاموش ہو گئے کہ چند اشعارِ عرب اور بعض اقوال سے راجح یہ معلوم ہوتا ہے کہ ذوالقرنین کا نام صعب تھا۔ لیکن خود صعب کی شخصیت کے متعلق جو اختلافِ اقوال ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے معاصر نہ ہونے کا جو اشکال ہے اس کا کوئی حل انھوں نے نہیں کیا۔
پھر نام کی طرح اس کے لقب "ذوالقرنین" کے متعلق بھی یہی اضطراب موجود ہے اور اس لقب کی

---

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۹ :
وجہ سے یہ جھیل کسی طرح بھی قرآنِ عزیز کی اس آیت کا مصداق نہیں بن سکتی۔
چنانچہ مفسرینِ قرآن بالاتفاق اس آیت کی تفسیر وہی کرتے ہیں جو ہم نے بیان کی ہے یعنی ذوالقرنین مغرب کی جانب دُور تک بڑھتا ہوا ایسے مقام پر پہنچ گیا جہاں صحراؤں اور پہاڑوں کا سلسلہ ختم ہو کر سمندر شروع ہو جاتا ہے البتہ سمندر کا وہ حصہ ایسا تھا جہاں پانی گدلا اور سیاہ ہو گیا تھا اور سورج غروب ہوتے وقت یوں معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ سیاہ گدلے چشمۂ پانی میں ڈوب رہا ہے۔
چنانچہ سید محمود آلوسی "بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ" کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔
ای منتھی الارض من جھۃ المغرب (۱۱۶) یعنی مغرب کی جانب میں زمین کے آخری حصہ تک جب پہنچا
اور محدث ابن کثیرؒ ابن جریرؒ امام رازی اور قدیم و جدید تمام مفسرین یہی تفسیر بیان فرماتے ہیں پس صاحبِ استدراک کی یہ تفسیر نہ صرف یہ کہ صحیح نہیں بلکہ قرآنِ عزیز کے بیان کردہ مقصد کے منافی ہے۔
درحقیقت اس آیت کا مصداق یہ ہے کہ ذوالقرنین مغرب کی جانب فتوحات کرتا ہوا جب تمام ایشیاء کوچک کو بحرِ شام سے بحرِ اسود تک قبضہ میں کر چکا تو وہ آگے بڑھتا ہوا مغربی ساحل تک پہنچ گیا۔ نقشہ میں دیکھنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ایشیائے کوچک کے مغربی ساحل میں چھوٹے چھوٹے خلیج پیدا ہو گئے ہیں اور بحرِ ایجین کے ساحلی مقام پر جا کر یہ گہرے سیاہ رنگ کی صورت میں نظر آتے ہیں اور ساحل پر کھڑے ہونے والے کو سورج اس کے اندر ڈوبتا نظر آتا ہے اور مغربی ساحل کی یہ مہم سائرس ہی کو نصیب ہوئی ہے۔ سکندر کو نصیب نہیں ہوئی۔ اب صاحبِ استدراک چاہتے ہیں کہ اسے گھر بیٹھے ہی مقدونیہ کے کنارہ اس خوش قسمتی کا مصداق بنا دیں مگر یہ کسی طرح ممکن نظر نہیں آتا۔
نیز صاحبِ استدراک "سکنر کیڈا" جھیل کا جائے وقوع مناستر سے پچاس میل مغرب میں (یوگوسلاویہ) میں بتا کر اگرچہ اس کا بُعدِ مسافت ظاہر فرمانا چاہتے ہیں مگر بہرحال ہے وہ سکندر کے دارالسلطنت مقدونیہ کے کنارہ ہی۔
یہ ہیں وہ خدشات اور اسبابِ جرح جو "صاحبِ استدراک" نے تکلیف گوارا فرما کر "مضمون نگار" کے تین مسلّمات پر عائد فرمائے ہیں اب قارئینِ کرام بنظرِ انصاف خود غور فرمائیں کہ تاریخ کی روشنی میں "مضمون نگار" کے "مسلّماتِ ثلاثہ" صحیح ہیں یا صاحبِ استدراک کے "خدشات و جرح" بہت ہیں۔ "اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى"
اس کے بعد صاحبِ استدراک یہ تحریر فرماتے ہیں "جزم کے ساتھ کسی کی بھی تعیین کرنا دشوار ہے اس لیے کہ

(باقی ص ۱۴۱ پر)

وجہ میں جس قدر بھی احتمالات ہو سکتے تھے وہ سب ہی منقول و مذکور ہیں۔ فہرست ملاحظہ ہو:

(۱) ذوالقرنین اس لیے کہا گیا کہ وہ روم و فارس دو مملکتوں کا مالک تھا اور "قرن" جس کے معنی سینگ کے ہیں بطور استعارہ کے طاقت و حکومت کے معنی میں استعمال ہوا ہے یعنی دو حکومتوں کا والی اور مالک۔ یہ رائے اہلِ کتاب کی جانب منسوب ہے اور بعض مفسرین کا رجحان بھی اسی جانب ہے۔

(۲) وہ فتوحات کرتا ہوا اقصائے مشرق و مغرب تک پہنچا اور دونوں جہات میں بہت سے

---

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۰ :

قرآن مجید کی بتائی ہوئی علامات کا مصداق تمام تر اب تک کوئی نہیں ملا ہے۔ (برہان ماہ اگست)

مضمون نگار نے بھی ذوالقرنین کی تعیین پر بحث کرتے ہوئے یہی لکھا ہے کہ اس سب کچھ لکھنے کے بعد بھی بحث و تحیص کا دروازہ بند نہیں ہے مگر پھر تعجب یہ ہے کہ ایسی صورت میں صاحبِ استدراک کو مضمون نگار کے مضمون کی فوری تردید کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ شاید صاحبِ استدراک کے نزدیک وہ اہم ضرورت یہ تھی' فرماتے ہیں۔ لیکن جہاں تک ارجحیت کا تعلق ہے سکندر مقدونی کا نمبر' جس کی طرف ہمارے متقدمین اس کثرت سے گئے ہیں کہ کسی سے پیچھے نہیں "

گویا صاحبِ استدراک اس غلط فہمی میں ہیں کہ علماء متقدمین کی اکثریت اس جانب ہے کہ سکندر مقدونی ہی ذوالقرنین ہے حالانکہ یہ بہت بڑا مغالطہ ہے جس کو جلد رفع ہونا چاہیے۔

اہلِ نظر سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ ذوالقرنین کے متعلق مختلف اقوال میں سے علماء سلف (متقدمین کی اکثریت کا دعوٰی کسی جانب بھی نہیں کیا جا سکتا اور اگر ان کے تمام اقوال کو جمع کر کے خلاصہ نکالا بھی جائے تو دو باتیں ثابت ہوتی ہیں ایک یہ کہ ان کے نزدیک شاید راجح یہ ہے کہ وہ ایک قدیم بادشاہ تھا اور اس کا نسب سامیینِ اولیٰ سے ملتا ہے اور وہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا معاصر تھا۔ دوسری یہ کہ جن بعض علماء نے یہ کہا ہے کہ ذوالقرنین سکندر ہے ان کی مراد سکندر مقدونی سے نہیں ہے بلکہ وہ حضرتِ مسیحؑ سے دو ہزار برس پہلے سکندر رومی کو اس کا مصداق تسلیم کرتے اور رومی اور مقدونی کو دو جدا جدا ہستیاں مانتے ہیں اور ان دونوں باتوں کی تصدیق کے لیے تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۱۶۷) فتح الباری (ج ۶ ص ۲۹۴ و ۲۹۵) بخاری کتاب احادیث الانبیاء' البدایہ والنہایہ یعنی تاریخ ابن کثیر (ج ۲ ص ۱۰۵ و ۱۰۶) اور کتاب البیان قابلِ مراجعت ہیں اور حافظ عماد الدین ابن کثیر نے تو البدایہ والنہایہ (ج ۲ ص ۱۰۵ و ۱۰۶) میں متقدمین کی اس دوسری بات کو واضح کرتے ہوئے صاف صاف تحریر فرمایا ہے:

"حضرتِ قتادہ فرماتے ہیں کہ ذوالقرنین سکندر ہی ہے اور اس کا باپ پہلا قیصر گزرا ہے اور وہ سام بن نوح علیہ السلام کی اولاد سے تھا۔ لیکن دوسرا ذوالقرنین' پس وہ سکندر بن فلپس مقدونی یونانی مصری ہے جس نے اسکندریہ آباد کیا اور جو روم کی تاریخ بناتا ہے اور یہ دوسرا اسکندر پہلے سکندر سے بہت طویل زمانہ کے بعد ہوا ہے اور ہم نے اس پر اس لیے تنبیہ کی کہ بہت سے لوگ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ یہ دونوں سکندر ایک ہی ہیں

(باقی ص ۱۴۲ پر)

ممالک پر قابض و مسلط ہوا۔ یہ زہری کا قول ہے۔

(۳) اس کے سر میں دونوں جانب سینگ کے مشابہ تانبے کے سے غدود اُبھرے ہوئے تھے یہ وہب بن منبہ کی رائے ہے۔

(۴) اُس کی زُلفیں دراز تھیں اور وہ ہمیشہ اپنے بالوں کو دو حصّے کرتا اور اُن کی پٹیاں گوندھ کر دونوں کاندھوں پر ڈالے رکھتا تھا ان دونوں کو "قرن" سے تشبیہ دے کر اس کو یہ لقب دیا گیا۔ یہ قول

---

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۱ :

اور یہ گمان کر بیٹھے کہ قرآن میں جس سکندر کا ذکر ہے وہ اسکندر ہے جس کا وزیر ارسطو ہے اور اس غلط فہمی کی وجہ سے بہت بڑی خطا اور عریض و طویل فساد برپا ہو جاتا ہے پس بلاشبہ پہلا سکندر مومن، صالح اور عادل بادشاہ تھا اور اس کے وزیر خضر علیہ السلام تھے اور دوسرا اسکندر مشرک تھا اور اس کا وزیر ارسطو فلسفی تھا اور ان کے درمیان دو ہزار سال سے زائد کا زمانہ ہے اور ان دونوں کا فرق صرف ایسے غبی پر ہی مشتبہ رہ سکتا ہے جو حقائقِ امور سے ناواقف ہو۔"

اب صاحبِ استدراک غور فرمائیں کہ ان کا یہ کہنا "سکندر یونانی کی جانب ہمارے متقدمین اس کثرت سے گئے ہیں" کہاں تک درست ہے؟ ہاں ہمیں یہ تسلیم ہے کہ اس سخت مغالطہ میں کہ "سکندر مقدونی ہی ذوالقرنین ہے صرف صاحبِ استدراک ہی تنہا نہیں ہیں بلکہ مؤرخینِ اسلام میں سے بعض اچھے اچھے مؤرخوں کو یہ دھوکا ہو گیا اور انھوں نے اس سکندرِ قدیم کو جو در اصل سکندر نہیں بلکہ حمیری سامی بادشاہ تھا سکندر مقدونی سمجھ لیا اور ذوالقرنین والا تمام قصہ اس کے ساتھ چسپاں کر دیا اور جب اس کے جسمِ حکومت اور شخصیت پر قبائے ذوالقرنین راست نہ آ سکی تو دور از کار تاویلات کے ذریعہ اس پر موزوں کرنے کی سعیِ ناکام کی، اور زیادہ تعجب یہ ہے کہ امام رازی جیسا بزرگ بھی اس سے متأثر ہوئے بغیر نہ رہا اور غالباً اس کی ابتداء مشہور مفسر و مؤرخ ابن جریر سے ہوئی۔

علماءِ سلف اور متقدمین کی اکثریت کے مسلک کی توضیح کے بعد لائق صاحبِ استدراک خود غور فرمائیں کہ کیا اس کے بعد بھی ان کا ازراہِ طعن یہ فرمانا کہ جب سے تحقیق اور روشن خیالی کا معیار ہی یہ قرار پا گیا ہے کہ اگلے ماہرینِ فن کے ساتھ رشتۂ اتحاد و توافق کا نہیں بلکہ انکار و تردید کا قائم رکھا جائے ذوالقرنین کے اسکندر ہونے سے مسلسل انکار ہونے لگا ہے۔" (صدق ۳ راگست ۱۹۴۲ء) کسی حد تک بھی درست ہو سکتا ہے، ہم اس کے جواب میں انھیں صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی "ایاك والظن فان بعض الظن اثم" یاد دلانا چاہتے ہیں۔

صاحبِ استدراک فرماتے ہیں کہ ہم نے ذوالقرنین کے سکندر مقدونی ہونے سے انکار کر کے اکابرِ سلف کے ساتھ انکار و تردید کا رشتہ قائم کیا ہے حالانکہ انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ سکندر مقدونی کے انکار میں اکابرِ تفسیر و حدیث حضرت عمر، حضرت علی، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن عباس، مجاہد، شعبی، حافظ ابن تیمیہ، ابن قیم، ابن کثیر، ابن حبان، حافظ ابن حجر،

(باقی ص ۱۴۳ پر)

حسن بصری کی جانب منسوب ہے۔

(۵) اُس نے ایک جابر بادشاہ کو یا اپنی قوم کو توحید کی دعوت دی، بادشاہ یا قوم نے غضبناک ہو کر اس کے سر کے ایک جانب ایسی سخت چوٹ لگائی کہ وہ مرگیا، اس کے بعد دوبارہ زندہ ہو کر پھر تبلیغ کا فرض انجام دیا، اس مرتبہ دوسری جانب چوٹ مار کر قوم نے اس کو شہید کر دیا۔ اس ضرب سے اس کے سر پر جو دو نشان پڑ گئے تھے اس وجہ سے اس کو یہ لقب دیا گیا، یہ توجیہ حضرت علیؓ کی جانب منسوب ہے۔

(۶) وہ نجیب الطرفین تھا اس لیے والدین کی نجابت کو قرنین کے ساتھ تشبیہ دی گئی اور "ذوالقرنین" لقب ہوا۔

(۷) اس نے اس قدر طویل عمر پائی کہ انسانی دنیا کے دو قرن (صدیوں) تک زندہ رہا۔

(۸) وہ جب جنگ کرتا تھا تو بیک وقت دونوں ہاتھوں سے ہتھیار چلاتا بلکہ دونوں رکابوں سے بھی ٹھوکر لگاتا تھا۔

(۹) اس نے زمین کی تاریکی اور روشنی دونوں حصوں کی سیاحت کی۔

(۱۰) وہ ظاہر و باطن دونوں علوم کا حامل تھا۔[1]

لیکن پہلی توجیہ تو اس قیاس پر مبنی ہے کہ سکندر مقدونی ہی ذوالقرنین ہے اور دوسری توجیہ کی بنیاد ایک ناقابلِ اعتماد روایت پر ہے جو سفیان ثوری اور مجاہد سے منقول ہے، اس میں ہے کہ

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۲ :

شیخ بدر الدین عینی، امام نووی، قرطبی وغیرہ سب ہی غریب مضمون نگار کے ہم نوا اور صاحب استدراک کی رائے کے مخالف ہیں، البتہ صرف ابن جریر طبری اور امام رازی ضرور مقدونی کو ذوالقرنین بتا رہے ہیں مگر ساتھ ہی امام صاحب یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اس قول پر بہت قوی اعتراضات وارد ہوتے ہیں، لیکن صاحب استدراک کی نگاہ میں وہ خود تو اکابر سلف کے مؤید ہیں اور غریب مضمون نگار اکابر کا مخالف ہے، والی اللہ المشتکی۔

[1] فتح الباری ج ۶ و تاریخ ابن کثیر ج ۲ ؛ دائرۃ المعارف بستانی ج ۸ ص ۴۱۱۔

چار بادشاہ وہ ہیں جنھوں نے تمام عالم پر حکومت کی ہے ان میں سے دو مسلمان ہیں اور دو کافر، حضرت سلیمان (علیہ السلام) ذوالقرنین اور نمرود و بخت نصر[1] یہ روایت اس لیے معلول ہے کہ اگر تھوڑی دیر کے لیے یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ حضرت سلیمان (علیہ السلام) اور ذوالقرنین دونوں کی حکومت تمام عالم پر رہی ہے، اگرچہ تاریخی حیثیت سے یہ صحیح نہیں ہے" تب بھی نمرود اور بخت نصر کے جو مفصل حالات کتبِ تواریخ میں محفوظ ہیں وہ اس روایت کے مضمون کا انکار کرتے ہیں اس لیے کہ ان دونوں بادشاہوں کی حکومت شام، عراق، مصر، حجاز اور فارس کے علاوہ بالواسطہ یا بلاواسطہ دنیا کے کسی حصہ پر بھی ثابت نہیں ہے اور آخر الذکر بادشاہ کا زمانہ تو بلحاظ عہدِ تاریخ اتنا قریب ہے کہ اس کی حکومت اور رقبۂ حکومت کی تفاصیل تو معاصرانہ شہادتوں اور تاریخی روایتوں اور حفریات کے اکتشافات کی بنا پر بہت مشہور اور واضح ہیں اس لیے یہ روایت بھی قابلِ حجت نہیں ہے اور تیسری توجیہ سے متعلق جو روایت ہے اس کو حافظ ابن حجر نے مُنکر اور ابن کثیر نے ضعیف اور ناقابلِ اعتماد کہا ہے[2] اور چوتھی توجیہ جو حسن بصری کی جانب منسوب ہے محض قیاسی ہے اور پانچویں توجیہ جو حضرت علیؓ سے منقول ہے اس کے متعلق حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ اس کے دو طریقِ روایت میں سے ایک ضعیف اور ناقابلِ اعتبار ہے، دوسرا طریقہ اگرچہ صحیح ہے لیکن اس کے متن پر یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ اس میں یہ الفاظ ہیں: لم یکن نبیا ولا ملکا "ذوالقرنین نہ نبی تھے اور نہ فرشتہ" حالانکہ اسی روایت کی ابتدا میں ہے "بعثه الله الی قومه" "اللہ تعالیٰ نے اس کو اس کی قوم کی جانب مبعوث کیا تھا" یہ جملہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ وہ نبی تھے، البتہ حافظ نے اس اشکال کے جواب میں ایک کمزور سا جواب یہ کہہ کر دے دیا۔ "الا ان یحمل البعث علی غیر رسالۃ النبوۃ" "مگر یہ کہ یوں کہہ دیا جائے کہ اس کی بعثت نبوۃ کے طور پر نہیں تھی۔"[3]

ہمارے نزدیک اس پر یہ اہم اشکال بھی وارد ہوتا ہے کہ قرآنِ عزیز نے ذوالقرنین کے حاکمانہ اقتدار کے متعلق جو تفصیلات دی ہیں یہ روایت ان کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی وہ کہتا ہے کہ ذوالقرنین

---

[1] تاریخ ابن کثیر ج ۲ و فتح الباری ج ۶ [2] تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۱۰۳ و فتح الباری ج ۶ [3] فتح الباری ج ۶

وسیع مملکت کا مالک اور کامیاب بادشاہ ہو گزرا ہے، مگر یہ روایت اس کو صرف ایک مبلغ ثابت کرتی ہے جس کی قوم تک نے اس کو تسلیم نہیں کیا اور اس کے درپے آزار رہے، علاوہ ازیں حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کی روایت میں اس کے متعلق جو معجزانہ واقعہ مذکور ہے اگر یہ صحیح تھا تو قرآن عزیز کس طرح اس کو فروگذاشت کر سکتا تھا جب کہ یہ ذوالقرنین کی عظمت کو چند در چند بلند کرتا ہے؟ اس لیے یہ توجیہ بھی جرح اور ضعف سے محفوظ نہیں ہے اور ممکن ہے کہ حضرت علیؓ کا یہ قول قرآن میں مذکور ذوالقرنین کے سوا کسی دوسری شخصیت سے متعلق ہو اور نیچے کے راویوں نے اپنے فہم سے اس واقعہ کے ساتھ چسپاں کر دیا ہو اور ساتویں اور نویں ہر دو توجیہات کو ابن کثیر نے "منکر" یعنی ناقابل اعتماد کہا ہے[1] اور چھٹی، آٹھویں اور نویں توجیہات محض اٹکل کے تیر اور بے سند ہیں۔[2]

یہ ہیں وہ اقوال جو یا بلحاظِ نقل ضعیف اور منکر ہیں اور یا بے سند محض اٹکل کے تیر ہیں اسی بنا پر حافظ ابن حجر تو ان کو فقط نقل کرنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں اور ان اقوال میں سے بھی کسی ایک قول کو ترجیح نہیں دیتے جو ان کے نزدیک بلحاظِ روایت و نقل سقم سے پاک ہیں۔ البتہ حافظ ابن کثیر نے زہری کے قول کو راجح کہا ہے یعنی وہ چونکہ مشرق اور مغرب دونوں حدود تک پہنچا اور ان کے درمیان کا مالک رہا ہے اس لیے ذوالقرنین کہلایا" یہ بات اگرچہ کسی حد تک صحیح ہو سکتی ہے لیکن مشارق الارض و مغاربہا کے مفہوم میں وہی کلام ہے جو ہم ابھی بیان کر آئے ہیں اور آئندہ تفصیل کے ساتھ اس پر بحث کریں گے۔

علماءِ سلف سے ذوالقرنین کے نام اور لقب سے متعلق جو اقوال منقول ہیں اور جن سے اس کی شخصیت کے تعین میں مدد لی جاتی ہے ان کا حال تو آپ تفصیل کے ساتھ معلوم کر چکے، اب ذوالقرنین کے بعض حالات کا جو تذکرہ اس ضمن میں پایا جاتا ہے وہ بھی تعارض و اضطراب سے خالی نہیں ہے، مثلاً ازرقی کہتے ہیں کہ ذوالقرنین نے حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھ پر ایمان قبول کیا اور پھر ابراہیم و اسمٰعیل (علیہما السلام) کے ہمراہ کعبہ کا طواف کیا۔[3] اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۲ [2] فتح الباری ج ۶ و البدایۃ النہایہ ج ۲۔ [3] البدایہ والنہایہ ج ۲۔

مکہ میں حاضر ہو کر مسلمان ہوا اور علی بن احمد کی روایت میں ہے کہ ذوالقرنین جب حج کے ارادہ سے نکلا تو پیادہ پا روانہ ہوا اس کی اطلاع حضرتِ ابراہیم (علیہ السلام) کو ہوئی تو وہ اس کے استقبال کے لیے نکلے اور اس کے لیے دعاء خیر کی" یہ روایت ذوالقرنین کو قدیم الاسلام ثابت کرتی ہے۔

اسی طرح تعیینِ شخصیت میں کوئی اس کو سامیۂ اولیٰ میں سے بیان کرتا ہے اور کوئی حمیری بادشاہوں میں سے اور کوئی خضر (علیہ السلام) کو اس کا وزیر کہہ کر خضر کی عمر کو حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کے عہد سے حضرتِ موسیٰ (علیہ السلام) کے عہد تک دراز ثابت کرتا ہے حالانکہ حضرتِ موسیٰ (علیہ السلام) کے حالات میں ثابت کیا جا چکا ہے کہ اس قسم کی تمام روایات غیر مستند اور اہلِ کتاب سے ماخوذ ہیں۔

غرض ذوالقرنین کے نام اس کے لقب کی وجہ تسمیہ اور تعیینِ شخصیت کے متعلق علماء سلف کے یہاں اس قدر مختلف اور مضطرب روایات پائی جاتی ہیں کہ ان کو سامنے رکھ کر ذوالقرنین کی تاریخی شخصیت کا پتہ لگانا ناممکن ہو جاتا ہے اور حافظ ابن حجر کے اس ارشاد کے باوجود :

| | |
|---|---|
| فهذه الآثار يشد بعضه | پس یہ آثار ایک دوسرے کو مضبوط بناتے اور قوت |
| بعضا ويدل على قدم | پہونچاتے ہیں اور ذوالقرنین کے قدیم العہد ہونے پر |
| عهد ذي القرنين ۔ | دلالت کرتے ہیں ۔ |

یہ اشکال حل نہیں ہوتا کہ جب کہ حضرتِ ابراہیم (علیہ السلام) اور ان کے عہد کے کافر بادشاہ نمرود کے حالات و واقعات قرآن کے علاوہ سیر و تاریخ کی کتابوں کے ذریعہ بھی بہت زیادہ روشنی میں آچکے ہیں اور بائبل بھی اکثر حالات کو روشنی میں لاتی ہے تو اگر ذوالقرنین عہدِ ابراہیمی کی ایسی عظیم الشان ہستی تھی تو ان چند مختصر اور منتشر آثار کے علاوہ اس کے حالات و واقعات کیوں تاریخی حیثیت سے اس طرح سامنے نہیں آئے جس سے اس کی شخصیت صاف طور پر نمایاں نظر آتی نیز حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کے عہد سے وابستہ ایسے جلیل القدر انسان کا ذکر قرآن نے کیوں واقعاتِ ابراہیم (علیہ السلام) کے سلسلہ میں نہیں کیا اور سورۂ کہف میں اس جانب کیوں اشارہ تک نہیں کیا گیا۔ کیا یہ بات قابلِ تعجب نہیں ہے کہ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کے مخالف کافر بادشاہ کی مخالفت اور حق و باطل کے

درمیان معرکہ آرائی کا تو قرآن شد و مد کے ساتھ ذکر کرے مگر مشارق و مغاربِ ارض پر حکمراں ایسے بادشاہ کا اس سلسلہ میں کوئی ذکر نہ کیا جائے جو حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے ہاتھ پر ایمان لایا اُن کی اطاعت و فرماں برداری کا اظہار کر کے ان کا موئید ثابت ہوا اس لیے یہ کہنا شاید بیجا نہ ہو گا کہ قرآن، مرفوع احادیث، توراۃ اور تاریخ میں عہدِ ابراہیمی کے اندر یا اس کے قریب کسی ایسے بادشاہ کا ثبوت نہیں ملتا جس کا ذکر سورۂ کہف میں " ذوالقرنین " کہہ کر کیا گیا ہے اور جو اقوال و آثار اس سلسلہ میں مذکور ہیں وہ اس شخصیت کی تاریخی حیثیت ثابت کرنے سے قاصر ہیں۔

**متاخرین کی رائے**

علماءِ متاخرین میں سے بعض علماء نے تو اسی غلط بات کو اختیار کر لیا کہ سکندر (مقدونی) ہی قرآن میں مذکور ذوالقرنین ہے اور بعض علماء نے فقط علماءِ سلف کے قول کو نقل کرنے پر اکتفا کیا ہے اور اس کے خطاء و صواب پر کوئی توجہ نہیں فرمائی اور بعض نے بغیر کسی دلیل کے یمن کے حمیری بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ کو زیرِ بحث ذوالقرنین فرما دیا۔

مگر ان سب اقوال سے جدا مولانا ابوالکلام نے اس سلسلہ میں جو تحقیق فرمائی ہے البتہ وہ ضرور قابلِ توجہ ہے بلکہ دلائل و براہین کی قوت کے لحاظ سے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ان کی تحقیق بلاشبہ صحیح اور قرآن کے بیان کردہ اوصاف اور تاریخی حقائق کی مطابقت کے پیشِ نظر ہر طرح لائقِ ترجیح ہے۔

تفسیری مطالب کے سلسلہ میں ہم کو موصوف کے ساتھ شدید اختلاف بھی رہتا ہے اور اتفاق بھی لیکن اس خاص مسئلہ میں چونکہ ان کی رائے علماءِ سلف سے بالکل مختلف تھی اس لیے کڑی تنقیدی نظر کی محتاج تھی چنانچہ کافی غور و خوض اور گہری نظر کے بعد اس کی صحت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے اور جب کہ یہ طے شدہ امر ہے کہ علماءِ سلف کی جلالتِ قدر اور علمی عظمت و برتری کے باوجود علمی تحقیق کا دروازہ بند نہیں ہے اور قرآن و حدیث کی روشنی میں علماءِ متاخرین نے علماءِ متقدمین سے سینکڑوں مسائلِ علمی میں اختلافِ رائے کا اظہار کیا ہے خصوصاً تاریخی مباحث میں اور جدید ذرائعِ معلومات نے ایسے انکشافات کیے ہیں جن کے ذریعہ ہم بہت سے ایسے مسائل کو آسانی حل کر لیتے ہیں۔ جو علماءِ سلف کے زمانہ میں لاینحل رہے ہیں تو ہم کو مولانا آزاد کی اس تحقیق کا خواہ تاریخی حقائق کے لحاظ سے وہ کتنی ہی

وقیع کیوں نہ ہو" محض اس لیے انکار نہیں کر دینا چاہیے کہ وہ ان کی اپنی تحقیق ہے۔

مولانا آزاد نے اس سلسلہ میں جو تحقیق فرمائی ہے وہ اپنی جگہ قابلِ مراجعت ہے اور اس طویل مضمون کا یہاں نقل کرنا قطعاً غیر مناسب ہے البتہ ہم اپنی کاوش و تحقیق سے جس حد تک اس کے ساتھ مطابقت کر سکتے ہیں اس ہی کو سپردِ قلم کرنا موزوں خیال کرتے ہیں۔[1]

**یہود و قریش اور انتخابِ سوالات**

ایک مرتبہ پھر اس روایت پر غور فرمائیے جو محمد بن اسحاق اور شیخ جلال الدین سیوطی نے نقل فرمائی ہے اور جس کا حاصل یہ ہے کہ اصحابِ کہف اور ذوالقرنین کے متعلق مشرکینِ مکہ نے جو سوالات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیے وہ دراصل یہود مدینہ کی تلقین پر کیے گئے تو اب قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہود کو ان واقعات سے ایسی کیا دلچسپی تھی کہ جس کی بنیاد پر انھوں نے ان کا انتخاب کیا اور ان کے صحیح جوابات کو پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے دعویٰ نبوت و رسالت کی صداقت کا معیار ٹھہرایا۔ اصحابِ کہف سے متعلق تو تفصیل کے ساتھ گذشتہ صفحات میں بحث آچکی ہے لیکن ذوالقرنین کے بارے میں کیوں سوال کیا گیا اس کا جواب یہ ہے کہ یہود نے اس سوال میں درحقیقت ایک ایسی شخصیت کا انتخاب کیا ہے جو اُن کی مذہبی زندگی کے سلسلہ میں بہت ہی زیادہ اہمیت رکھتی ہے اور جس کو وہ اپنی ملی و اجتماعی حیات میں کسی وقت بھی فراموش نہیں کر سکتے کیونکہ اس شخصیت کی بدولت بنی اسرائیل نے بابل کی غلامی سے نجات پائی اور ان کے قومی مرکز قبلۂ صلوٰۃ اور مقدس مقام یروشلم (بیت المقدس) ہر قسم کی تباہی اور بربادی کے بعد اسی کے ہاتھوں دوبارہ آباد ہوا چنانچہ ان اہم امور کی بنا پر یہود کے نزدیک وہ نجات دہندہ" خدا کا مسیح اور خدا کا چرواہا کہلایا کیونکہ ان کے نبیوں کے مقدس صحیفوں میں اس کے متعلق یہی القاب درج تھے اور اس کی عظمت کا اظہار کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے سوالات میں اس شخصیت کے مسئلہ کو بھی منتخب کیا بلکہ اسی کو زیادہ اہمیت دی جیسا کہ قرآن کے اسلوبِ بیان یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِی الْقَرْنَیْنِ سے واضح ہوتا ہے، وہ سمجھتے تھے کہ جب کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ دعوے

[1] اس مسئلہ کی پوری تحقیق میں ہم کو مولانا آزاد کے اس حصۂ بیان سے سخت اختلاف ہے جو انھوں نے علماءِ سلف کے خلاف یاجوج و ماجوج کے آخری خروج کے متعلق تحریر فرمایا ہے اس لیے کہ یہ حصۂ تحقیق بلاشبہ باطل ہے، یہ بحث عنقریب ذکر میں آئے گی۔

کرتے ہیں کہ وہ خدا کے سچے پیغمبر ہیں اور اس کے تمام سچے پیغمبروں کے دین کو اور اپنے دین کو ایک ہی دین سمجھتے ہیں خصوصاً انبیاء بنی اسرائیل کی عظمت و عزت اور ان کی صداقت و حقانیت کا اظہار فرماتے ہیں پس اگر وہ حقیقۃً خدا کے سچے پیغمبر ہیں تو "اُمّی" ہونے کے باوجود ضرور وحی الٰہی کے ذریعہ اس شخص کے واقعات پر روشنی ڈال سکیں گے جس کی وجہ سے مہبطِ انبیاءِ بنی اسرائیل (یروشلم) اور انبیاء بنی اسرائیل اور قوم بنی اسرائیل کو ایک بت پرست بادشاہ کی غلامی اور تباہ کاریوں سے نجات ملی اور جو خدا کے کلمہ کو بلند کرنے میں انبیاء بنی اسرائیل کا معاون و مددگار ثابت ہوا۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے سنہ ۶۰۰ ق م میں عراق میں دو عظیم الشان حکومتیں اپنے قاہرانہ و جابرانہ تسلط کے ساتھ قائم تھیں، ایک آشوری حکومت اور اس کا دارالحکومت نینوئی تھا اور دوسری بابلی حکومت اور اس کا دارالحکومت بابل تھا۔ لیکن سنہ ۶۱۲ ق م میں نینوئی کی حکومت کو زوال آ گیا اور اب بابلی حکومت بلاشرکتِ غیرے دونوں حکومتوں کے مقبوضات کی مالک اور وقت کی بہت بڑی طاقت بن گئی۔ یہی زمانہ تھا جب کہ بابل کے تخت پر بخت نصر (بنوکدنذر)[۱] سریر آرائے سلطنت ہوا۔ یہ بادشاہ ذاتی طور پر بھی بہت بہادر اور صاحبِ تدبیر تھا مگر ساتھ ہی سخت جابر و ظالم بھی تھا۔ کتبِ تاریخ میں مشہور ہے کہ یہ صرف ملکوں کو فتح ہی نہیں کرتا تھا بلکہ قوموں کو غلام بنا کر بھیڑوں کی طرح بابل کو لے جاتا اور بڑے بڑے متمدن اور بے نظیر شہروں کو برباد کر کے کھنڈر چھوڑ جاتا تھا۔

ادھر ایک عرصہ سے بنی اسرائیل کی روحانی، اخلاقی اور اجتماعی زندگی کو گھن لگ چکا تھا اور بداعمالیوں اور بدکرداریوں نے اس درجہ ان کو ذلیل و خوار کر دیا تھا کہ جو انبیاء (علیہم السلام) ان کی رشد و ہدایت کے لیے مبعوث ہوتے اور ان کی بدکرداریوں پر ان کو وعظ و نصیحت اور تنبیہ کرتے تو یہ ان کو قتل کر دینے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے نتیجہ یہ نکلا کہ بخت نصر خدا کا عذاب بن کر ان پر چڑھ آیا اور ایک لاکھ سے زیادہ بنی اسرائیل کو غلام بنا کر بکریوں کے گلّہ کی طرح ہنکا لے گیا اور بیت المقدس

[۱] اس نام کا [illegible] تلفظ منقول ہے [illegible] بنوکدنذر

جیسے خوب صورت اور مقدس شہر کی اینٹ سے اینٹ بجادی یہ حادثہ بنی اسرائیل کے لیے ایسا ہوش ربا تھا کہ اس نے ان کی اجتماعی اور انفرادی زندگی کو تباہ و برباد کر ڈالا اور وہ انتہائی مایوسی کی حالت میں بابل کے اندر غلامانہ زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو گئے۔[1]

بنی اسرائیل پر گذرے ہوئے ان واقعات کی خبر اگرچہ انبیاء بنی اسرائیل میں سے حضرت یسعیاہ (شعیا) اور حضرت یرمیاہ (علیہما السلام) نے وحی والہام کے ذریعہ پیش آنے سے قبل ہی سنادی تھی مگر اس زمانہ میں وہ اپنی نافرمانیوں میں اس درجہ سرشار و سرمست تھے کہ انھوں نے ان پیشین گوئیوں کی مطلق پرواہ نہیں کی، اب جب کہ یہ ہولناک واقعات سر پر سے گذرنے لگے تو ان کی آنکھیں کھلیں مگر ایسے وقت کھلیں کہ رنج و افسوس اور حزن و ملال سب بیکار تھا اور کوئی ترکیب نہیں تھی کہ وہ اس عذاب سے نجات پاسکیں۔

لیکن ان تمام مایوسیوں کی سخت اور ہولناک تاریکی میں ان کے لیے اگر کوئی شعاع امید باقی تھی تو وہ ان ہی انبیاء علیہم السلام کی پیشین گوئیوں کا وہ حصہ تھا جس میں حضرت یسعیاہ نبی نے تقریباً ایک سو ساٹھ سال قبل اور حضرت یرمیاہ نبی نے ساٹھ سال قبل یہ بشارت بھی دی تھی کہ بیت المقدس کی تباہی سے ستر سال کے بعد بنی اسرائیل دوبارہ اپنے وطن میں آزاد ہو کر واپس آجائیں گے اور خدا کا ایک مسیح (مبارک) خدا کا چرواہا (نگہبان) کہ جس کا نام خورس ہوگا وہ بنی اسرائیل کی نجات اور یروشلم کی دوبارہ آبادی کا باعث بنے گا اور اس کے ہاتھوں یہود کی اجتماعی زندگی کا نیا دور شروع ہوگا۔

بخت نصر جب بیت المقدس کے تمام اسرائیلیوں کو غلام بنا کر بابل لے گیا تو ان میں بعض انبیاء بنی اسرائیل بھی تھے جو بابل جا کر اپنے حکیمانہ اقوال اور کریمانہ اخلاق کی وجہ سے اس درجہ ہر دلعزیز بنے کہ دشمن بھی ان کی عزت کرنے پر مجبور ہوا چنانچہ حضرت دانیال (علیہ السلام) بابلی حکومت کے آخری دور میں مشیر خاص تھے۔

اب جبکہ وہ وقت قریب آیا کہ بنی اسرائیل غلامی سے نجات پائیں تو ان ہی برگزیدہ نبی (دانیال)

---

[1] واقعہ کی تفصیلات بیت المقدس کے عنوان میں زیر بحث آچکی ہے۔

کو الہام و مکاشفہ کے ذریعہ اس نجات دہندہ کو ایک تمثیل کی شکل میں دکھایا گیا اور ساتھ ہی جبرئیل علیہ السلام (ناموس اکبر) نے دانیال نبی کو اس کی تعبیر بھی بتائی جو اسی خورس کے حق میں تھی جس کا ذکر یسعیاہ نبی کی پیشین گوئی میں آچکا تھا۔

**ذوالقرنین اور انبیاء بنی اسرائیل کی پیشین گوئیاں**

یہود کے نجات دہندہ خدا کے مسیح اور اس کے چرواہے کے متعلق وہ پیشین گوئیاں کیا ہیں جن کو دیکھ کر یہود بابل کی سرزمین میں انتہائی مایوسیوں کے باوجود اس وقت کے لیے چشم براہ تھے؟ پہلے ان کو نقل کر دیا جائے تاکہ زیر بحث مسئلہ کے لیے تحقیق کی جانب قدم اٹھایا جا سکے۔ سب سے پہلے اس سلسلہ میں حضرت یسعیاہ (علیہ السلام) کی پیشین گوئی سامنے آتی ہے جو یہودیوں کے یوم نجات سے ایک سو ساٹھ سال قبل سنائی گئی تھی:

"اے اسرائیل تجھ کو مجھے فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ میں نے تیری خطاؤں کو بادل کی مانند اور تیرے گناہوں کو گھٹا کی مانند مٹا ڈالا میری طرف پھر آ کہ میں نے تیرا فدیہ دیا ہے ارے اے آسمانو گاؤ کہ خداوند نے یہ کیا ...... خداوند تیرا نجات دینے والا جس نے تجھے رحم میں بنا ڈالا یوں فرماتا ہے کہ میں خداوند سب کا بنانے والا ہوں، میں نے ہی اکیلا آسمانوں کو تانا اور آپ تنہا زمین کو فرش کیا ہے۔ دروغ گوؤں کے نشانوں کو باطل ٹھیراتا اور فال گیروں کو دیوانہ بناتا ہوں اور حکمت والوں کو رد کر دیتا اور ان کی حکمت کو حماقت ٹھیراتا ہوں جو اپنے بندہ کے کلام کو ثابت کرتا اور اپنے رسولوں کی مصلحت کو پورا کرتا ہوں جو یروشلم کی بابت کہتا ہوں کہ وہ آباد کی جائیگی اور یہوداہ کے شہروں کی بابت کہ وہ بنائے جائیں گے اور میں اس کے ویران مکانوں کو تعمیر کروں گا جو سمندر کو کہتا ہوں کہ سوکھ جا اور میں تیری ندیاں سکھا ڈالوں گا جو خورس کے حق میں کہتا ہوں کہ وہ میرا چرواہا ہے اور وہ میری ساری مرضی پوری کرے گا اور یروشلم کی بابت کہتا ہوں کہ وہ بنائی جائے گی اور ہیکل کی بابت کہ اس کی بنیاد ڈالی جائے گی۔

خداوند اپنے مسیح خورس کے حق میں یوں فرماتا ہے کہ میں نے اس کا داہنا ہاتھ پکڑا کہ امتوں کو اس کے قابو میں کروں اور بادشاہوں کی کمریں کھلوا ڈالوں اور دہرائے ہوئے دروازے اس کے لیے

کھول دوں اور وہ دروازے بند نہ کیے جائیں گے۔ میں تیرے آگے چلوں گا اور ٹیڑھی جگہوں کو سیدھا کروں گا۔ میں پیتل کے دروازوں کے جدا جدا پٹوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا اور لوہے کے بینڈوں کو کاٹ ڈالوں گا اور میں گاڑے ہوئے خزانے اور پوشیدہ مکانوں کے گنج تجھے دوں گا۔ تاکہ تو جانے کہ میں خداوند اسرائیل کا خدا ہوں۔ جس نے تیرا نام لے کے بُلایا ہے میں نے اپنے بندہ یعقوب اور اپنے برگزیدہ اسرائیل کے لیے تجھے تیرا نام صاف صاف لے کے بُلایا۔ میں نے تجھے مہربانی سے پکارا گو کہ تو مجھ کو نہیں جانتا۔[۱]

اور دوسری پیشین گوئی حضرت یرمیاہ (علیہ السلام) کی ہے جو بشارت کے وقوع سے تقریباً ساٹھ سال پہلے کی گئی تھی۔

وہ کلام جو خداوند نے بابل کی بابت اور کسدیوں کی سرزمین کی بابت یرمیاہ نبی کی معرفت فرمایا تم قوموں کے درمیان بیان کرو اور اشتہار دو اور جھنڈا کھڑا کرو، منادی کرو۔ مت چھپاؤ کہو کہ بابل لے لیا گیا۔ بعل رسوا ہوا۔ مرودک سراسیمہ کیا گیا۔ اس کے بت خجل ہوئے اس کی مورتیں پریشان کی گئیں۔ کیوں کہ اُتر سے ایک قوم اس پر چڑھتی ہے جو اس کی سرزمین کو اجاڑ کرے گی یہاں تک کہ کوئی اس میں نہ رہے گا وہ بھاگ گئے ہیں وہ روانہ ہوئے [illegible] کیا حیوان ان دنوں میں اور اسی وقت خداوند کہتا ہے بنی اسرائیل آئیں گے وہ اور بنی یہوداہ ایک ساتھ وہ روتے ہوئے چلے جائیں گے [illegible] اپنے خداوند کو ڈھونڈیں گے وہ اس طرف متوجہ ہو کے صیہون کی راہ پوچھیں گے کہ آؤ ہم آپ ہی خداوند سے مل کے اس کے ساتھ ایک ابدی عہد کریں جو کبھی فراموش نہ ہو.....[۲]

بابل میں سے بھاگو اور کسدیوں ابابلیوں کی سرزمین سے نکلو اور ان بکریوں کے مانند ہو جو گلوں کے آگے آگے جاتی ہیں کہ دیکھو میں اُتر (شمال) کی سرزمین سے بڑی قوموں کے ایک گروہ کو برپا کروں گا اور بابل پہ لے آؤں گا۔[۳]

قوموں کو مادیون (میڈیا) کے بادشاہوں کو اور اس کے حاکموں کو اس کے ملکوں کو اور

---

[۱] یسعیاہ نبی کا صحیفہ باب ۴۵ آیت ۲-۱ ۔ باب ۵۰ آیات ۵-۱ [۲] باب ۵۰ آیت ۹-۸

اس کی سلطنت کی ساری سرزمین کو مخصوص کرو کہ اس پر چڑھیں" لے

"رب الافواج یوں کہتا ہے کہ بابل کے بھاری شہر کی دیواریں سراسر ڈھا دی جائیں گی اور اس کے بلند پھاٹک آگ سے جلا دیے جائیں گے" ئے

اور دانیال (علیہ السلام) کا خواب یا مکاشفہ یہ تھا:۔

"بیل شازار (بخت نصر کا جانشین) بادشاہ کی سلطنت کے تیسرے سال میں مجھ دانی ایل کو ایک رویا نظر آئی بعد اس کے جو شروع میں مجھے نظر آئی تھی اور میں نے عالم رویت میں دیکھا اور جس وقت میں نے دیکھا ایسا معلوم ہوا کہ میں سوسن کے قصر میں تھا جو صوبہ عیلام میں ہے پھر میں نے رویت کے عالم میں دیکھا کہ میں اولائی کی ندی کے کنارہ پر ہوں تب میں نے اپنی آنکھیں اٹھا کے نظر کی تو کیا دیکھتا ہوں کہ ندی کے آگے ایک مینڈھا کھڑا ہے جس کے دو سینگ تھے اور وہ دو سینگ اونچے تھے لیکن ایک دوسرے سے بڑا تھا اور بڑا دوسرے کے پیچھے اٹھا ہوا میں نے اس مینڈھے کو دیکھا کہ پچھم اتر دکھن کی طرف سینگ مارتا تھا یہاں تک کہ کوئی جانور اس کے سامنے کھڑا نہ ہو سکا نہ کوئی اس کے ہاتھ سے چھڑا سکا پھر وہ جو چاہتا تھا کرتا تھا یہاں تک کہ وہ بہت بڑا ہو گیا اور میں اس سوچ میں تھا کہ دیکھا کہ ایک بکرا پچھم کی سمت سے آکر تمام روئے زمین پر ایسا پھرا کہ زمین کو بھی نہ چھوا اور اس بکرے کے دونوں آنکھوں کے بیچوں بیچ ایک عجیب طرح کا سینگ تھا اور وہ اس دو سینگ والے مینڈھے کے پاس جسے میں نے ندی کے سامنے کھڑا دیکھا آیا اور اپنے زور کے قہر سے اس پر دوڑ گیا اور میں نے اسے دیکھا کہ وہ مینڈھے کے قریب پہنچا اور اس کا غضب اس پر بھڑکا اور مینڈھے کو مارا اور اس کے دونوں سینگ توڑ ڈالے اور مینڈھے کو قوت نہ تھی کہ اس کا سامنا کرے" ئے

اور دانیال (علیہ السلام) کے مکاشفہ اور رویا کی تعبیر یہ ہے:

اور ایسا ہوا کہ جب مجھ دانی ایل نے یہ رویت دیکھی تھی اور اس کی تعبیر کی تلاش کرتا تھا تو دیکھا کہ

---

لے باب ۵۱ آیات ۵۰ ئے باب ۵۱ آیت ۵۸ ئے دانی ایل باب ۸ آیات ۸-۱۔

میرے سامنے کوئی کھڑا تھا جس کی صورت آدمی کی سی تھی اور میں نے ایک آدمی کی آواز سنی کہ اولائی کے درمیان پکار کے کہا کہ اے جبرئیل اس شخص کو اس رویت کے معنی سمجھا چنانچہ وہ ادھر جہاں میں کھڑا تھا نزدیک آیا اور جب پہنچا تو میں ڈر گیا اور اوندھے منہ گرا۔ پھر اس نے مجھے کہا اے آدم زاد سمجھ کیونکہ یہ رویت آخری زمانہ میں انجام ہوگی ........ اور کہا کہ دیکھ میں تجھے سمجھاؤں گا کہ قہر کے آخر میں کیا ہوگا کیونکہ مقررہ وقت پر ہی کام کا انجام ہوگا وہ مینڈھا جسے تو نے دیکھا کہ اس کے دو سینگ ہیں سو مادہ (میڈیا) اور فارس کا بادشاہ ہے۔ اور وہ بالوں والا بکرا یونان کا بادشاہ اور وہ بڑا سینگ جو اس کی آنکھوں کے درمیان ہے سو اس کا پہلا بادشاہ ہے۔[1]

اور یرمیاہ نبی کی کتاب میں ہے:

کیونکہ خداوند یہ کہتا ہے کہ جب بابل میں ستر برس گذر چکیں گے تو میں تمھاری خبر لینے آؤں گا اور تمھیں اس مکان میں پھر لانے سے اپنی اچھی بات تم پر قائم کروں گا۔

خداوند کہتا ہے اور میں تمھاری اسیری کو موقوف کراؤں گا اور تمھیں ساری قوموں میں سے اور سب جگہوں میں سے جن میں میں نے تم کو ہانک دیا ہے جمع کروں گا۔ خداوند کہتا ہے اور میں تمھیں اس مکان میں جہاں سے میں نے تمھیں اسیر کرا کے بھیجا پھر لے آؤں گا۔"[2]

اور عزرا کی کتاب میں ہے:

اور شاہِ فارس خورس کی سلطنت کے پہلے برس میں اس خاطر کہ خداوند کا کلام جو یرمیاہ کے منہ سے نکلا تھا پورا ہو۔ خداوند نے شاہِ فارس خورس کا دل ابھارا کہ اس نے اپنی تمام مملکت میں منادی کرائی اور اسے قلمبند بھی کر کے یوں فرمایا شاہِ فارس خورس یوں فرماتا ہے کہ خداوند آسمان کے خدا نے زمین کی ساری مملکتیں مجھے بخشیں اور مجھے حکم کیا ہے کہ یروشلم کے بیچ جو یہوداہ میں ہے اس کے لیے ایک مسکن بناؤں پس اس کی ساری قوم میں سے تمھارے درمیان کون کون ہے

---

[1] دانی ایل باب ۸ آیات ۲۱-۱۵ [2] یرمیاہ باب ۲۹ آیات ۱۴-۱۰

اس کا خدا اس کے ساتھ ہو اور وہ یروشلم کو کہ شہر یہوداہ ہے جائے اور خداوند اسرائیل کے خدا کا گھر بنائے کہ وہی خدا ہے جو یروشلم میں ہے[۱]

اور خورس بادشاہ ہی خداوند کے گھر کے ان برتنوں کو جنھیں بنوکد نذر یروشلم میں سے لے گیا اور اپنے دیوتاؤں کے گھر میں رکھا تھا نکال لایا اور شاہ فارس خورس نے انھیں خزانچی متردات کے ہاتھ سے نکلوایا اور اس نے انھیں یہوداہ کے امیر شیشبضر کو گن دیا[۲]

اور زکریا نبی کی کتاب میں ہے:

رب الافواج یوں فرماتا ہے کہ دیکھ وہ شخص جس کا نام "شاخ" ہے اور وہ اپنی جگہ سے اگے گا اور وہ خداوند کی ہیکل کو ... ہاں وہی خداوند کی ہیکل کو بنائے گا اور وہ صاحب شوکت ہوگا[۳]

ان واضح اوصاف پیشین گوئیوں کی اگر تحلیل کی جائے تو ان سے حسب ذیل اہم امور ثابت ہوتے ہیں:

(۱) جس ہستی نے بنی اسرائیل کو بابل کی غلامی سے نجات دی اس کا نام خورس تھا اور وہ فارس اور میڈیا دو ملکوں کا متفقہ بادشاہ تھا۔

(۲) دانیال نبی کے مکاشفہ اور جبریل علیہ السلام کی تعبیر نے ان دو حکومتوں کے اتحاد کی بنا پر ہی خورس کو دو سینگوں والا (ذوالقرنین) بادشاہ کہا اور اسی تخیل کی بنا پر بنی اسرائیل میں اس کا لقب ذوالقرنین مشہور ہوا۔

(۳) انبیاء بنی اسرائیل کے صحیفوں میں اس بادشاہ کو خدا کا مسیح، بنی اسرائیل کا نجات دہندہ اور خدا کا چرواہا کہا گیا ہے۔

(۴) یہودیوں میں قومی عصبیت اور نسلی تعصب کے شدید سے شدید تر ہونے کے باوجود ان ہی واقعات کی بنیاد پر وہ غیر اسرائیلی شخص کو ایسے اوصاف سے یاد کرتے ہیں جو صرف اپنے انبیاء کے حق میں ہی کہنے کے عادی ہیں۔

(۵) واقعات تاریخی نے یہ ثابت کر دیا کہ انبیاء علیہم السلام کی پیشین گوئیوں کے مطابق خورس ہی نے

---

[۱] عزرا کی کتاب باب ۱ آیات ۳-۱ ۔ [۲] ایضاً باب ۱ آیات ۔۔۔ [۳] زکریا نبی کی کتاب باب ۶ ۔ آیت ۱۲ ۔

یہودیوں کو بابل کی غلامی سے نجات دلائی اور بیت المقدس کو دوبارہ آباد کیا۔

(۶) یسعیاہ نبی کے صحیفہ میں اس کو اتر سے آنا بتایا گیا ہے خورس بابل سے اتر (شمال) ہی کی جانب (فارس و میڈیا) سے آیا تھا اس لیے وہی اس پیشین گوئی کا مصداق ہے۔

(۷) زکریا نبی کی پیشین گوئی میں اس کو "اُگنے والی شاخ" بتایا گیا ہے اس سے یہ مطلب ہے کہ اس کی نمو اور اس کا ظہور غیر معمولی صورتِ حالات میں ہوگا جیسا کہ عموماً ایسی شخصیتوں کے متعلق خدائے تعالیٰ کی جانب سے ہوتا رہا ہے کہ جن سے اس کو کوئی خاص کام لینا ہوتا ہے۔

**خورس اور تاریخی شواہد** ان اجزاء پر بحث کرنے سے قبل چند تاریخی شواہد بھی پیشِ نظر رکھنے ضروری ہیں جن کا اس معاملہ سے خاص تعلق ہے۔

محققینِ تاریخ نے فارس کی تاریخ کو تین عہدوں میں تقسیم کیا ہے ایک حملۂ اسکندر سے پہلے کا عہد، دوسرا طوائف الملوکی کا عہد اور تیسرا ساسانی سلاطین کا عہد اور یہ بھی تسلیم کر لیا گیا ہے کہ ان تینوں عہدوں میں سے فارس کی عظمت اور اس کے عروج کا عہد خورس (سائرس) کے عہدِ حکومت سے شروع ہوتا ہے اور اس عہد کے حالات فارس کے رقیب یونان کے مؤرخین کے ذریعہ سے ہی روشنی میں آسکے ہیں جن میں سے بعض سائرس کے معاصر بھی ہیں اس بادشاہ کو یہودی، خورس، یونانی سائرس، فارسی گورش اور کے ارش اور عرب کیخسرو کہتے ہیں۔

عرب مؤرخین کے یہاں بھی حکومت فارس کے یہ تین عہد جدا جدا نظر آتے ہیں، چنانچہ ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں ان تینوں عہدوں کے متعلق جو اشارات کئے ہیں وہ بھی اسی کی تائید کرتے ہیں کیونکہ وہ طوائف الملوکی سے قبل کے حالات میں کسریٰ فارس کے درباری عظمت و شوکت کا جس طرح ذکر کرتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بلاشبہ یہ دور حکومت فارس کے عروج و عظمت کا دور تھا وہ فرماتے ہیں کہ طوائف الملوک کا وسطی عہد فارس کے لیے بہت خراب اور زوال کا عہد تھا۔

لیکن اردشیر بن بابک ساسانی نے اس کو ختم کر کے فارس کو اسی عروج پر دوبارہ پہنچا دیا جس عروج پر پہلے عہد (عہدِ خورس) میں تھا۔

| | |
|---|---|
| فاستمر الأمر كذلك قريباً من خمسمائة | اور ملوک الطوائف کا یہ عہد تقریباً پانچ سو سال تک |
| سنة حتی کان اردشیر بن بابك من | رہا تا آنکہ اردشیر بن بابک ساسانی نے ظہور کیا تب اس نے |
| بنی ساسان فاعاد ملکهم الی ماکان علیه | کھوئے ہوئے ملکوں کو واپس لیا اور پہلے عہد کی حالت پیدا |
| ورجعت الممالك برمتها الیه [1] | کر دی اور تمام تقسیم شدہ حصہ ملک پھر ایک مستقل حکومت کا جزو ہو گئے۔ |

اسی طرح ابن عبد البر نے "القصد والامم" میں ان ہر سہ عہدوں کا ذکر کرتے ہوئے افریدون اور منوچہر کے تذکرہ میں یہ فرمایا ہے:

| | |
|---|---|
| وهذه الطبقة الاولی الی ان غلب | فارس کے بادشاہوں کا یہ پہلا طبقہ ہے جو دارا پر |
| الاسکندر دارا ورتب ملوك الطوائف | سکندر کے حملہ تک شمار ہوتا ہے درمیان میں ملوک الطوائف |
| ثم ملکت الاکاسرة اولهم | کا دور رہا اور اس کے بعد شاہانِ کسریٰ کا زمانہ ہے |
| اردشیر بن بابك [2] | جو اردشیر سے شروع ہوتا ہے۔ |

سنہ ۶۲۲ء ق م میں بابل و نینوی کی حکومتیں بہت عروج و اقبال پر تھیں اور خورس سے قبل اسی دور میں ایران کی حکومت دو جدا جدا حصوں پر تقسیم تھی۔ شمال مغربی حصہ کو میڈیا (ماہات) کہتے تھے اور مغربی حصہ کو فارس اور دونوں حصوں میں قبائلی سردار حکومت کرتے تھے اور یہ قبائلی حکومتیں ان کے زیر اثر اور تابع تھیں لیکن سنہ ۶۱۲ ق م جب نینوی کی آشوری حکومت تباہ ہو گئی تو اگرچہ میڈیا آزاد ہو گیا اور قبائلی حکومت کی جگہ آہستہ آہستہ شاہی حکمرانی کی داغ بیل پڑنے لگی تھی تاہم بابل کے بادشاہ بخت نصر کے قاہرانہ اقتدار کے سامنے ایران کے ابھرنے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا مگر ان ہی حالات کے اندر سنہ ۵۵۹ ق م میں قدرت نے ایکے می نیز یا ہخامنش خاندان کی ایک غیر معمولی ہستی کو نمایاں کیا کہ جو ابتداء میں اگرچہ ایک چھوٹی سی ریاست انشان کا رئیس تھا مگر سنہ ۵۵۹ ق م حیرت زا طور پر اس کے عدل و انصاف، سیاست و تدبر، خدا ترسی و حلم نے فارس اور ماہات دونوں حکومتوں کو بغیر جنگ و جدل کے اس کے قبضہ میں دیدیا اور دونوں حکومتوں کے قبائلی حکمرانوں نے برضا و رغبت اس کو اپنا بادشاہ تسلیم کر لیا یہی وہ ہستی ہے جس کو اہل فارس گورش یا کے ارش اور یہود خورس

[illegible]

کہتے ہیں۔

مغربی مہم

خورس نے جب فارس اور میڈیا کی حکومتوں کو متحد کر کے فرماں روائی کا اعلان کیا تو اس سے قریب ہی زمانہ میں اس کو ایک "مغربی مہم" پیش آئی اور اس وجہ سے پیش آئی کہ خورس سے بہت پہلے میڈیا اور ایران کے مغرب میں واقع حکومت لیڈیا "ایشیاء کوچک" کے درمیان رقیبانہ جنگ رہتی تھی۔ مگر خورس کے معاصر لیڈیا کے بادشاہ کرڈیس کے باپ نے خورس (گورش) کے نانا استیاگس کے باپ سے صلح کر لی تھی اور باہم ازدواجی رشتہ قائم کر کے مستقل طور سے جنگ کا خاتمہ کر دیا تھا لیکن اب جب کہ خورس نے فارس اور میڈیا دونوں کو متحد کر کے ایک مضبوط سلطنت قائم کر لی تو ایشیاء کوچک کا بادشاہ کرڈیس اس کو برداشت نہ کر سکا اور اس نے باپ کے کیے ہوئے تمام عہد و پیمان کو توڑ کر میڈیا پر حملہ کر دیا تب گورش بھی مجبوراً اپنے دارالحکومت ہمدان سے تیزی کے ساتھ آگے بڑھا اور دو ہی جنگوں کے بعد تمام ایشیاء کوچک پر قبضہ کر لیا چنانچہ مشہور یونانی مؤرخ ہیروڈوٹس کہتا ہے کہ گورش کی یہ مہم ایسی عجیب اور معجزانہ تھی کہ پٹیریا کے معرکہ سے صرف چودہ دن کے اندر اس نے لیڈیا کے مستحکم اور مضبوط دارالحکومت کو مسخر کر لیا اور کرڈیس قید ہو کر مجرم کی حیثیت میں اس کے سامنے کھڑا نظر آیا۔ اب اگرچہ بحرِ اسود تک تمام ایشیاء کوچک اس کے زیرِ نگیں تھا مگر پھر بھی وہ آگے بڑھتا چلا گیا یہاں تک کہ مغربی ساحل پر جا پہنچا یعنی دارالحکومت سے چودہ سو میل فاصلہ طے کر کے مغربی جانب جا کھڑا ہوا۔

اہلِ جغرافیہ کہتے ہیں کہ لیڈیا کا دارالحکومت سارڈیس مغربی ساحل کے قریب تھا اور ایشیاء کوچک کے مغربی ساحل کی حالت یہ ہے کہ یہاں سمرنا کے قریب چھوٹے چھوٹے جزیرے نکل آنے کی وجہ سے تمام ساحل جھیل کی طرح بن گیا ہے اور بحرِ ایجین کے اس ساحل کا پانی خلیج کی وجہ سے بہت گدلا رہتا ہے اور شام کے وقت سورج غروب ہوتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ایک گدلے حوض میں ڈوب رہا ہے۔

مؤرخین کہتے ہیں کہ خورس نے اگرچہ "ایشیاء کوچک" کو مردانہ وار فتح کر لیا لیکن وقت کے دوسرے

بادشاہوں کی طرح اس نے ممالک مفتوحہ پر ظلم روا نہیں رکھا اور نہ ان کو وطن سے بے وطن کیا حتیٰ کہ سارڈیس کی پبلک کو یہ بھی محسوس نہیں ہونے دیا کہ یہاں کوئی انقلاب رونما ہو گیا ہے۔ انقلاب ہوا مگر فقط شخصیت کا یعنی ان کو کرڈیس کی جگہ خورس جیسا عادل بادشاہ مل گیا چنانچہ ہیرو ڈوٹس لکھتا ہے:-

سائرس (خورس) نے اپنی فوج کو حکم دیدیا کہ دشمن کی فوج کے سوا اور کسی انسان پر ہاتھ نہ اٹھایا جائے اور دشمن کی فوج میں سے بھی جو کوئی نیزہ جھکا دے اسے ہرگز قتل نہ کیا جائے اور کرڈیس اگر تلوار بھی چلائے تب بھی اس کو کوئی گزند نہ پہنچائی جائے۔[1]

نیز حکومت کے متعلق اس کا عقیدہ وہی تھا جو ایک صالح اور نیک بادشاہ کا ہونا چاہیے چنانچہ یونانی مؤرخ کی سیاز لکھتا ہے:

اس کا عقیدہ یہ تھا کہ دولت بادشاہوں کے ذاتی عیش و آرام کے لیے نہیں ہے بلکہ اس لیے ہے کہ رفاہِ عام کے کاموں میں صرف کی جائے اور ماتحتوں کو اس سے فائدہ پہونچے۔[2]

مشرقی مہم | یہی مؤرخ ہیرو ڈوٹس بیان کرتا ہے کہ گورش نے ابھی بابل کو فتح نہیں کیا تھا کہ اس کو ایران کے مشرق میں ایک اہم معرکہ آرائی پیش آئی کیونکہ مشرقِ بعید کے بعض وحشی اور صحرانشین قبائل نے سرکشی اور بغاوت کی تھی اور یہ باختر (بکٹیریا) کے قبائل تھے اور بعض تاریخی حوالجات سے یہ تصریح بھی ملتی ہے کہ جس مقام کو آج کل مکران کہتے ہیں اس جگہ کے خانہ بدوش قبائل نے یہ سرکشی کی تھی یہ مقام بلاشبہ ایران کے لیے مشرقِ بعید کا حکم رکھتا ہے اس لیے کہ اس کے بعد پہاڑ ہیں جنھوں نے آگے بڑھنے کے لیے راہ روک دی ہے۔

تیسری (شمالی) مہم | بابل کی فتح کے علاوہ تاریخ گورش کی ایک اور مہم کا ذکر کرتی ہے اور یہ ایران سے شمال کی جانب پیش آئی۔ اس مہم میں وہ بحرِ کاسپین (خزر) کو داہنی جانب چھوڑتا ہوا کاکیشیا کے پہاڑی سلسلہ تک پہنچا ہے۔ ان ہی پہاڑوں میں اس کو ایک درہ ملا ہے جو دو پہاڑوں کے درمیان پھاٹک کی طرح نظر آتا ہے۔ اس مقام پر جب وہ پہنچا ہے تو ایک قوم نے اس سے یاجوج ماجوج

[illegible]

قبائل کے تاراج کی شکایت کی ہے کہ وہ اس درہ میں سے نکل کر حملہ آور ہوتے اور تاخت و تاراج کرکے ہم کو برباد و تباہ کر ڈالتے ہیں چنانچہ اس نے لوہا اور تانبا استعمال کرکے اس پھاٹک کو بند کر دیا اور دھات کی ایک سد قائم کر دی جس کے آثار و نشان اس وقت بھی موجود ہیں' چنانچہ ہیرو ڈوٹس اور زنیوفن دونوں یونانی مؤرخ تصریح کرتے ہیں کہ گورش نے فتح لیڈیا کے بعد سیتھین قوم کے وحشی حملوں کی روک تھام کے لیے خاص انتظامات کیے۔

اور یہ حقیقت عن قریب واضح ہو جائے گی کہ گورش کے زمانہ میں یاجوج و ماجوج قبائل میں سے بھی سیتھین تھے جو حملہ آور ہو کر قریب کی آبادیوں کو تاخت و تاراج کرتے رہتے تھے۔

فتح بابل | اب جب کہ گورش یا خورس کی فتوحات اس درجہ وسیع ہو چکی تھیں کہ ایران کے مغرب اقصیٰ میں وہ بحر شمال سے لے کر بحیرۂ اسود (بحر الجین) کے آخری ساحل تک قابض تھا اور مشرق اقصیٰ میں مکران کے پہاڑوں تک بلکہ دارا کے رقبۂ حکومت کی تفاصیل کو مستند مان لیا جائے تو دریائے سندھ تک فتح کر چکا تھا[1] اور شمال میں کاکیشیا کے پہاڑی سلسلہ تک حکمراں تھا تو اس کو عراق کی مشہور اور متمدن گر قاہر و جابر حکومت بابل کی جانب متوجہ ہونا پڑا چنانچہ اس کی تفصیل بھی تاریخ ہی کی زبانی سُنیے۔

خورس سے تقریباً پچاس برس پہلے بابل کی حکومت پر بنوکد نذر (بخت نصر) نظر آتا ہے اور اس زمانہ کے ضمنی عقائد کے مطابق وہ نہ صرف بادشاہ تھا بلکہ بابلی اصنام میں سے سب سے بڑے صنم کا مظہر اور دیوتا بھی سمجھا جاتا تھا اور اس لیے اس کا حق تھا کہ وہ جس حکومت کو چاہے اپنے قہر و غضب کا شکار بنا کر اس کے باشندوں کو ہولناک اور سخت عذاب میں مبتلا کرے' ان کو ہلاک کرے یا غلام بنا کر ان پر وحشیانہ مظالم کو روا رکھے۔ اس لیے اس بادشاہ کے مظالم بے پناہ اور اس کے تسخیر ممالک کا طریقہ سخت وحشیانہ تھا جیسا کہ گذشتہ سطور میں بیان ہو چکا ہے اس نے اپنے دور حکومت میں یروشلم (بیت المقدس) پر تین مرتبہ حملے کیے اور فلسطین تباہ و برباد کر کے تمام باشندوں کو مویشیوں کی طرح ہنکا کر بابل لے گیا' ایک یہودی مؤرخ جوزیفس کہتا ہے "کوئی سخت سے سخت بے رحم قصائی بھی اس وحشت و خونخواری کے ساتھ بھیڑوں کو مذبح میں نہیں لے جاتا جس طرح بنوکد نذر نے اسرائیل کو

[1] دائرۃ المعارف بستانی ج ۴ (ایران)

بابل میں ہنکا کر لے گیا[1]

بابل کی حکومت آشوری حکومت کی تباہی کے بعد اور بھی زیادہ مضبوط اور قاہر سلطنت ہوگئی تھی اور اس زمانہ میں قرب وجوار کی طاقتوں میں کسی کو بھی یہ جرأت نہیں تھی کہ وہ اس جابر حکومت کے قہر وظلم کا استیصال کر سکیں لیکن فتح بیت المقدس کے کچھ عرصہ بعد بخت نصر مرگیا اور اس کا جانشین نایونی دس مقرر ہوا مگر اس نے حکومت کا تمام بار شاہی خاندان کے ایک شخص بیل شازار پر ڈال دیا، یہ شخص اگرچہ بہت عیاش اور ظالم تھا مگر بخت نصر کی طرح بہادر اور جری نہیں تھا اُسکے زمانہ میں بنی اسرائیل کے قیدیوں میں سے حضرت دانیال (علیہ السلام) نے اپنی حکیمانہ فراست سے بابلی دربار کو اس درجہ مسخر کر لیا تھا کہ وہ حکومت کے مشیرِ خاص سمجھے جاتے تھے۔ حضرتِ دانیال نے بیل شازار کو بار بار اس کے مظالم اور عیاشانہ زندگی کے خلاف تہدید وتنبیہ کی مگر اس نے کچھ شنوائی نہیں کی حتیٰ کہ انھوں نے حکومت کے معاملات سے کنارہ کشی کرلی۔

توراۃ کے بیان کے مطابق اسی زمانہ میں یہ واقعہ پیش آیا کہ بیل شازار نے اپنی ملکہ کے اکسانے پر ایک شب یہ حکم دیا کہ یروشلم سے جو ہیکل کے مقدس ظروف بخت نصر نے لوٹ کر لایا تھا وہ لائے جائیں اور ان میں شراب پلائی جائے یہ جشن ہو ہی رہا تھا کہ کسی غیبی ہاتھ نے بادشاہ کے سامنے دیوار پر ایک نوشتہ لکھ دیا۔ توراۃ میں ہے:

اسی گھڑی میں کسی آدمی کے ہاتھ کی انگلیاں ظاہر ہوئیں اور انھوں نے شمعدان کے مقابل بادشاہی محل کی دیوار کے گچ پر لکھا اور بادشاہ نے ہاتھ کا وہ سرا جو لکھتا تھا دیکھا تب بادشاہ کا چہرہ متغیر ہوا اور اس کے اندیشوں نے اسے گھبرا دیا...... اور نوشتہ جو لکھا گیا سو یہ ہے منے منے تقیل اوفرسین[2]۔

تب شاہ نے گھبرا کر نجومیوں اور فال گیروں کو بلایا مگر کوئی اس کا مطلب نہ بتا سکا آخر ملکہ کے مشورہ سے دانیال (علیہ السلام) کو بلایا انھوں نے اوّل اس کے مظالم اور اس کی عیاشی کیخلاف

---

[1] دائرۃ المعارف للبستانی (بابل) [2] دانیال کا صحیفہ باب ۵ آیات ۲۵-۵۔

پند و نصیحت فرمائی، پھر بتایا کہ تو نے چونکہ بیت المقدس کے ظروف کی توہین کرکے اس ظلم کی تکمیل کر دی اس لیے نوشتہ کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے تیری مملکت کا حساب کیا اور اسے تمام کر ڈالا تو ترازو میں تولا گیا اور کم نکلا تیری مملکت پارہ پارہ ہوئی اور مادیوں اور فارسیوں کو دیدی گئی"۔[۱]

ادھر یہ واقعہ پیش آیا کہ اہلِ بابل عرصہ سے بیل شازار کے مظالم سے چھٹکارا پانے کی تجویزیں سوچ رہے تھے کہ ان کے بعض سرداروں نے یہ مشورہ کیا کہ قریب کی زبردست طاقت ایران سے مدد حاصل کی جائے اور اس کے عادل فرماں روا سے یہ عرض کیا جائے کہ وہ ہم کو بیل شازار کے مظالم سے نجات دلائے اور اس کو یہ اطمینان دلایا جائے کہ اہلِ بابل ہر طرح اس کی مدد کرنے کو آمادہ ہیں، چنانچہ ۵۴۲ ق م بابلی سرداروں کا ایک وفد خورس کے پاس اس وقت پہنچا جب کہ وہ اپنی مشرقی مہم میں مصروف تھا۔ خورس نے ان کا خیر مقدم کیا اور ان کو اطمینان دلایا کہ وہ اپنی اس مہم سے فارغ ہو کر ضرور بابل پر حملہ کرے گا اور ان کو بیل شازار جیسے ظالم و عیاش بادشاہ سے نجات دلائیگا۔

خورس جب اپنی مہم سے فارغ ہو گیا تو حسب وعدہ اس نے بابل پر حملہ کر دیا۔

تمام مؤرخین باتفاق رائے کہتے ہیں کہ اس عہد میں بابل سے زیادہ ناقابلِ تسخیر کوئی مقام نہیں تھا اس لیے کہ اس کی شہر پناہ اس درجہ تہ در تہ موٹی اور مستحکم تھی کہ کوئی فاتح اس کی تسخیر کی جرأت نہیں کر سکتا تھا لیکن خورس کی عدل گستری اور رحم کے حالات دیکھ کر بابل کی رعایا خود اس درجہ اس کی گرویدہ تھی کہ حکومتِ بابل کا ایک گورنر گوب ریاس خود اس کے ہمراہ تھا اور بقول ہیروڈوٹس اس ہی نے دریا میں نہر کاٹ کر اس کا بہاؤ دوسری جانب کر دیا اور دریا کی جانب سے فوج شہر میں داخل ہو گئی اور خورس کے وہاں تک پہنچنے سے پہلے ہی شہر فتح ہو گیا اور بیل شازار مارا گیا۔[۲]

**خورس کا مذہب** خورس کے مذہب کے متعلق توراۃ اور تاریخ دونوں متفق ہیں کہ جس طرح اس نے ایران

---

[۱،۲] اس مقام پر توراۃ نے دارا کو فاتحِ بابل کہا ہے یہ سخت التباس ہے جو توراۃ کے بیان میں پیدا ہو گیا ہے اور جگہ جگہ خورس کی جگہ دارا اور دارا کی جگہ خورس کا ذکر کرکے معاملہ کو خلط ملط کر دیا ہے در اصل بابل کو پہلے خورس ہی نے فتح کیا ہے اس کے بعد جب اہلِ بابل نے بغاوت کر دی تو دارا نے دوبارہ حملہ کرکے اس بغاوت کو فرو کیا۔

کے منقسم حصوں اور چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو متحد کر کے ایک بڑی شاہنشاہیت قائم کی اور دوسروں کی سطوت و حکومت کے تابع ہونے کی بجائے بابل و نینوی کی زبردست طاقتوں کو اپنا تابعِ فرمان بنایا اور جس طرح وقت کے جابر و قاہر شاہنشاہوں کے برعکس اس نے عدل و رحم پر اپنی حکومت کو مستحکم اور استوار کیا اسی طرح وہ دین و مذہب کے بارے میں بھی ایران کے مروجہ مذہب کے خلاف دینِ حق کا تابع اور ایمان باللہ اور توحیدِ الٰہی کا داعی تھا۔

چنانچہ عزرا (عزیر علیہ السلام) کی کتاب میں تعمیر بیت المقدس سے متعلق اس کا یہ واضح اور صاف اعلان مذکور ہے:

اور شاہِ فارس خورس کی سلطنت کے پہلے برس میں اس خاطر کہ خداوند کا کلام جو یرمیاہ کے منہ سے نکلا تھا پورا ہو خداوند نے شاہِ فارس خورس کا دل ابھارا کہ اس نے اپنی تمام مملکت میں یہ منادی کرائی کہ اور اسے قلم بند بھی کرایا فرمایا "شاہِ فارس خورس یوں فرماتا ہے کہ خداوند آسمان کے خدا نے زمین کی ساری مملکتیں مجھے بخشیں اور مجھے حکم کیا ہے کہ یروشلم کے بیچ جو یہوداہ میں ہے اس کے لیے ایک مسکن بناؤں۔ پس اس کی قوم میں سے تمہارے درمیان کون کون ہے؟ اس کا خدا اس کے ساتھ ہو اور وہ یروشلم کو جو شہر یہوداہ ہے جائے اور خداوند اسرائیل کے خدا کا گھر بنائے کہ وہی خدا ہے جو یروشلم میں ہے۔[1]

مجھ خورس بادشاہ نے خدا کے گھر کی بابت جو یروشلم میں ہے حکم کیا کہ وہ گھر اور وہ مکان جہاں قربانیاں کرتے ہیں بنایا جائے اور خدا کے گھر کے سنہرے اور روپہلے برتن بھی جنھیں بنوکدنضر یروشلم کی ہیکل میں سے نکال لایا اور یروشلم کی ہیکل میں اپنی اپنی جگہ میں پہنچائے جائیں اور خدا کے گھر میں رکھے جائیں۔[2]

خورس کی منادی اور نوشتہ کے نشان زدہ جملوں کو پڑھیے اور پھر فیصلہ کیجیے کہ ان مضامین میں صرف یہ اعلان نہیں ہے کہ یہود کو نجات دلا کر بیت المقدس کی تعمیر کی بھی اجازت دی جاتی ہے بلکہ اس سے زیادہ یہ بھی ہے کہ مجھ کو خدا نے یہ حکم کیا ہے کہ میں اس کا گھر دوبارہ تعمیر کروں اور یہ کہ خدا

[1] باب ۱ آیات ۱-۴ [2] باب ۶ آیات [illegible]

اسی ہستی کا نام ہے جو یروشلم کا خدا ہے اور بیت المقدس خدا کا مقدس گھر ہے۔

اب اسی کے ساتھ اس کے جانشین دارائے اوّل کا وہ فرمان بھی ملاحظہ ہو جو یہودیوں کی اس عرضی کے جواب میں دیا گیا ہے جس میں بعض صوبہ داروں کی شکایت کی کہ وہ بیت المقدس کی تعمیر میں آڑے آتے ہیں" دارا لکھتا ہے :

"پس نہر پار کے صوبہ دار تتنی اور شتر بوزنی اور ان کے افارسکی رفیق جو نہر پار ہوں. تم وہاں سے دور ہو جاؤ تم اس بیت اللہ کے کام میں دست اندازی مت کرو' یہودیوں کا ناظم اور یہودیوں کے بزرگ لوگ خدا کے گھر کو اس کی جگہ تعمیر کریں ....... پر وہ خدا جس نے اپنا نام وہاں رکھا ہے سب بادشاہوں اور لوگوں کو جو اس حکم کو بدل کے خدا کا وہ گھر جو یروشلم میں ہے بگاڑنے کو ہاتھ بڑھاتے ہوں غارت کرے. میں دارا حکم دے چکا اس پر جلد عمل کرنا چاہیے"۔ [1]

اس فرمان میں دارا نے بلند آہنگی کے ساتھ یہ ظاہر کیا ہے کہ بیت المقدس بلاشبہ بیت اللہ ہے اور وہ بددعا کرتا ہے کہ بادشاہ ہو یا معمولی شخص جو بھی اس بیت اللہ کو خراب کرنے کا ارادہ کرے' خدا اس کو غارت کر دے۔

توراۃ کی ان صاف اور واضح شہادتوں کے بعد' جو خورس کا مسلمان ہونا ظاہر کرتی ہیں' اب چند تاریخی شہادتیں بھی قابلِ مطالعہ ہیں :

دارا نے اپنے زمانۂ حکومت میں ایک اہم تاریخی کام یہ کیا ہے کہ پہاڑوں کی مضبوط چٹانوں پر کتبے نقش کرا دیے ہیں جو اُس کے اور خورس کے عہدِ زریں کو روشنی میں لاتے ہیں۔ ان مختلف کتبات میں سے ایک کتبہ ایران کے مشہور شہر اصطخر میں دریافت ہوا ہے' یہ کتبہ قدیم تاریخ کا نادر ذخیرہ سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ اس میں دارا نے اپنے تمام مفتوحہ ممالک اور صوبوں کے نام تک گنا دیے ہیں اور ایسی تفصیلات دی ہیں جن سے اس کے مذہب و عقیدہ اور طریقِ حکومت تک پر روشنی پڑتی ہے' چنانچہ اسی کتبہ میں دارا کا یہ عقیدہ مذکور ہے :۔

[1] عزرا باب ۶۔

"خدائے برتر اہور موزدہ ہے اسی نے زمین پیدا کی' اسی نے آسمان بنایا' اسی نے انسان کی سعادت بنائی اور وہی ہے جس نے دارا کو بہتوں کا تنہا حکمراں اور آئین ساز بنایا۔"

"اہور موزدہ نے اپنے فضل وکرم سے مجھے بادشاہت دی اور اسی کے فضل سے میں نے زمین میں امن واماں قائم کیا' میں اہور موزدہ سے دعا کرتا ہوں کہ مجھے' میرے خاندان کو اور ان تمام ملکوں کو محفوظ رکھے اے اہور موزدہ میری دعا قبول کر!"

"اے انسان! اہور موزدہ کا تیرے لیے حکم ہے کہ برائی کا دھیان نہ کر' صراطِ مستقیم کو نہ چھوڑ' گناہ سے بچتا رہ۔"[1]

دارا کے کتبات میں اصطخر کے کتبہ سے بھی زیادہ اہمیت اس کے کتبہ بے ستون کو حاصل ہے اس میں اس کے گوماتہ مجوسی کی بغاوت اور اپنے سریر آرائے سلطنت ہونے کا واقعہ تفصیل کے ساتھ تحریر کیا ہے۔

دارا نے اس کتبہ میں گوماتہ کو موگوش (مجوسی) اور اس کے مقابلہ میں کامیابی حاصل ہونے کو اہور موزدہ کے فضل کی جانب منسوب کیا ہے اور ہیروڈوٹس اور دوسرے یونانی مؤرخ یہ اور اضافہ کرتے ہیں کہ دارا کے خلاف یہ بغاوت میڈیا (ایران) کے قدیم مذہب کے پیرووں (مجوسیوں) کی جانب سے ہوئی تھی' دارا کے زمانہ میں گوماتہ کے علاوہ پر اورتیش اور چترت خمہ اور مجوسیوں (موگوشی) نے علمِ بغاوت بلند کیا اور دارا کے ہاتھ سے پہلا ہمدان میں اور دوسرا اردبیل میں قتل ہوا۔[2]

پھر خورس اور دارا کے "مومن" ہونے اور ایران کے قدیم مذہب "مجوسی" سے بیزار رہنے پر سب سے بڑی شہادت دارا کا وہ تبلیغی اعلان ہے جو اس نے دانیال (علیہ السلام) کے دشمنوں کے خلاف اس وقت شائع کیا تھا جب کہ دانیال نبی کو ان کے دشمنوں نے شیرِ ببر کے سامنے ڈال دیا تھا اور دانیال معجزانہ طور پر صحیح وسالم بچ گئے تھے:

تب دارا بادشاہ نے ساری قوموں اور گروہوں اور اہلِ لغت کو جو روئے زمین پر بستے تھے

---

[1] ترجمان القرآن ماخوذ از سجاد البن سن' فاؤ گریٹ مناریز آف دی انشینٹ ایسٹرن۔ [2] دائرۃ المعارف بستانی (ایران)

نامہ لکھا" تمہاری سلامتی ترقی پائے۔ میں یہ حکم کرتا ہوں کہ میری مملکت کے ہر ایک صوبے کے لوگ دانی ایل کے خدا کے آگے ترساں ولرزاں ہوں کیونکہ یہ وہی زندہ خدا ہے جو ہمیشہ قائم ہے اور اس کی سلطنت لازوال ہے اور آخر تک رہے گی وہی چھڑاتا اور بچاتا ہے اور آسمان اور زمین میں وہی نشانیاں دکھلاتا اور عجائب و غرائب کرتا ہے اسی نے دانی ایل کو شیر ببر دن کے پنجے سے چھڑایا ہے۔ پس یہ دانی ایل دارا کی سلطنت اور خورس فارسی کی سلطنت میں کامیاب رہا"[1]

ان تاریخی مصادر سے یہ بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ دارا اور اس کے پیشرو خورس کا مذہب ایران کے قدیم مذہب" موگوش"[2] (مجوسی مذہب) سے جدا اور مخالف تھا اور یہ کہ دارا جس ہستی کو اہورموزدہ کہہ کر پکارتا ہے اور اس کے جو اوصاف بیان کرتا ہے اس سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اور اس کا پیشرو "دینِ حق" پر تھے اور عربی کا "اللہ" سریانی کا "الوہیم" اور عبرانی کا "ایل" اور ایران کا "اہورموزدہ" ایک ہی مقدس ہستی کے نام ہیں کیونکہ دارا کہتا ہے کہ وہی یکتا اور بے ہمتا ہے اور وہی خالقِ کائنات ہے اور خیر و شر تنہا اسی کے ہاتھ میں ہے نیز وہ توحیدِ خالص پر ایمان کیساتھ ساتھ آخرت پر ایمان رکھتا اور صراطِ مستقیم کی تلقین اور گناہوں سے اجتناب کی تعلیم کا اظہار کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ عقائد کی یہ تفصیلات مجوسی مذہب کے بالکل خلاف ہیں اور اسی لیے دارا مجوسیوں پر کامیابی حاصل کرنے کو اہورموزدہ کا فضل و کرم قرار دیتا ہے۔

رہا یہ امر کہ خورس اور دارا وقت کے کس مذہبِ حق کے پیرو تھے تو اس کا جواب مختصر سی تمہید کے بعد بآسانی دیا جا سکتا ہے۔

**ایرانِ قدیم کا مذہب**

ادیان و مذاہب کی تاریخ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وسطِ ایشیا کی آرین قوموں کا مذہبی تخیل بنیادی طور پر ہمیشہ سے مشترک رہا ہے اور یہ سب مظاہرِ قدرت کے پرستار اور اصنام پرستی کے ذریعہ اس عقیدہ کے علَم بردار نظر آتے ہیں پھر آہستہ آہستہ آسمان پر سورج

[1] دانیاں کی کتاب باب ۶ آیات ۲۸-۲۵ [2] موگوش فارسی لفظ ہے اور مجوش اس کا معرب ہے۔

کو اور زمین پر آگ کو تقدیس کا درجہ دیا جاتا ہے کیونکہ ان کی نگاہ میں یہی دونوں روشنی اور حرارت کے مبدا ہیں اور روشنی اور حرارت ہی عالم کے تمام نظام میں کارفرما ہیں چنانچہ قدیم یونان، ہندوستان اور ایران وغیرہ کے مذاہب میں یہ چیز مشترک نظر آتی ہے البتہ جزئیات میں یہ فرق رہا ہے کہ مثلاً یونان اور ہندوستان کے ضمنی عقائد میں دیوتاؤں کو اچھائی اور برائی دونوں پر قدرت حاصل ہے لیکن ایران کے اصنامی عقائد کی بنیاد اس پر قائم ہے کہ کائنات کا تمام نظام دو مخالف قوتوں کی کارفرمائی میں ہے ایک خیر اور نیکی کے دیوتا ہیں جو خیر اور تمام بھلائی کے مالک و متصرف ہیں اور دوسرے شر اور بدی کے دیوتا ہیں جن سے صرف بدی اور برائی کا صدور ہوتا ہے یعنی خالقِ خیر ایک جدا قوت ہے اور خالقِ شر دوسری قوت اور تمام عالم پر ان ہی دو متضاد قوتوں کی حکومت ہے اور ان ہی کے تصادم پر نظامِ کائنات میں خیر و شر کا غلبہ ہوتا رہتا ہے اس لیے ان کے یہاں خدائے واحد کا کوئی تصور ہی نہیں ہے اور چونکہ وہ خیر کو روشنی اور شر کو تاریکی خیال کرتے ہیں اسلیے آگ کو روشنی کا مبدا قرار دے کر یزداں (خیر کا دیوتا) کی قربت حاصل کرنے کے لیے قابلِ پرستش سمجھا گیا اور آتش پرستی کو مذہب کا جزِ اعظم بنایا گیا۔

چنانچہ فارس اور میڈیا یعنی ایران کا یہی قدیم مذہب تھا جس کے پیرو موگوش (مجوس) کہے جاتے تھے۔

**ایران اور مذہب زردشت**

لیکن تقریباً ۵۵ ق م اور ۵۸۳ ق م کے درمیان شمال مغربی ایران یعنی قفقاز اور آذربیجان کے اس نواح میں جو وادی ارس کے نام سے مشہور ہے ایک ملہم من اللہ ہستی کا ظہور ہوا یہ ابراہیم زردشت کی شخصیت تھی، انھوں نے ایران کے مجوسیوں میں دینِ الٰہی کا اعلان کیا اور رشد و ہدایت اور دعوت و تبلیغ کا فرض انجام دیا۔

انھوں نے بتایا کہ کائنات میں خیر و شر کے دیوتاؤں کا تصور باطل ہے بلکہ سارے عالم پر صرف ایک ہی ہستی بلا شرکتِ غیرے مالک اور متصرف ہے وہ یکتا اور بے ہمتا ہے، قدیر و حلیم ہے، نور و قدوس ہے۔ اور یہ اہورمزدہ کی پاک ہستی ہے، یہی تمام کائنات کی خالق ہے تم جن کو خیر کے دیوتا

سمجھتے ہو وہ دیوتا نہیں بلکہ اہورموزدہ کی مخلوق اور اس کے حکم سے امورِ خیر کے کارپرداز امشاسپند (فرشتے) ہیں اور تم نے جن کو شر کا دیوتا سمجھ لیا ہے وہ سرتاسر باطل کے سوا کچھ نہیں بلکہ یہاں شر کا مرکز اسی اہورموزدہ کی مخلوق "اہرمن" (شیطان) کی ہستی ہے، یہی انسانوں کے دلوں میں شر کو بھڑکا کر تاریکی کی جانب لے جاتی ہے "انسان" ان دو متضاد اثرات میں گھرا ہوا ہے اور اہورموزدہ نے اس کو اپنے سچے نبیوں کے ذریعہ روشنی اور تاریکی دونوں کے اثرات سے بخوبی آگاہ کر دیا ہے، پس آگ کی پرستش محض گمراہی ہے اور انسانی شقاوت و سعادت کا معاملہ صرف اسی دنیا تک محدود نہیں ہے بلکہ اس عالم کے علاوہ ایک دوسرا عالم (آخرت) ہے اور وہاں دو جداجدا مقامات ایک نکوکاروں کے لیے اور دوسرا بدکاروں کے لیے ہے اس لیے ہم کو گناہوں سے پرہیز کرنا اور نیکی کو اختیار کرنا چاہیے اور اپنے اخلاق کو بہتر بنانا چاہیے۔

یہ تھی ابراہیم زردشت کی وہ تعلیم جس کے متعلق آج عرب اور یورپ کے محقق مورخین کا اتفاق ہے کہ اواخر چھٹی صدی قبل مسیح میں یہ آواز ازردشت کی زبانی میڈیا اور فارس کے قدیم مذہب کے خلاف ایران میں سنی گئی۔ ؎

یہی مورخین یہ بھی کہتے ہیں کہ ابراہیم زردشت دانیال اکبر یا یرمیاہ (علیہما السلام) کے شاگرد اور فیض یافتہ تھے اور ایران کے قدیم مذہب کی ہدایت کے لیے مبعوث کیے گئے۔

ابراہیم زردشت کی تعلیم "دینِ حق کی تعلیم" تھی اس کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ ان پر نازل شدہ الہامی کتاب "اَوِستا" کے مضامین کی ابتدا ایسے ہی جملوں سے ہوتی ہے جن کا مفہوم سچی الہامی کتابوں میں مشترک پایا جاتا ہے یعنی شیطانی وساوس سے پناہ اور خدائے رحمان و رحیم کی مدح و ثنا، چنانچہ قرآن سے قبل کی الہامی کتابوں کی طرح "اَوِستا" بھی محرف ہو چکی ہے تاہم اس میں یہ جملے اب بھی محفوظ ہیں جن سے مضامین کی ابتدا ہوتی ہے اور دساتیرِ آسمانی میں ان کو اس طرح نقل کیا گیا ہے:

(۱) ہوزایم فرمزدان ہزہزماس ہرشیور ہردیور "پناہیم بیزداں (اہورموزدہ) ازمش زشت د

---

؎ حاشیہ تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۴۸ ویونیورسل ہسٹری آف دی ورلڈ مقالہ پروفیسر گرنڈی ج ۲ ص ۱۱۳۔

خوئے بدگمراہ کنندہ براہ ناخوب برندہ رنج دہندہ آزار رسانندہ (یعنی شیطان)"

(۲) فرشید شمتاسی ہرشندہ ہرشنگر زمریان فراہید ورت بنام ایزد بخشایندہ بخشائش گر مہربان دادگر"

اب اگر اسی کے ساتھ خورس (کیخسرو) اور داریوش (دارا) کے ان بیانات کو بھی پیش نظر رکھا جائے جو توراۃ میں بیت المقدس کی تعمیر سے متعلق ہیں اور ان کتبات کی عبارات کو بھی نظر انداز نہ کیا جائے جو دارا کی جانب سے منقوش کیے گئے ہیں اور جن میں مجوسی عقائد کے خلاف خدائے واحد کی حمد و ثنا بیان کی گئی ہے تو پھر یہ دعویٰ حقیقت بن کر سامنے آجاتا ہے کہ خورس اس کے بیٹے کیقباد دوم[1] (کم بی سیز) اور دارا کا مذہب بلاشبہ ایران کے قدیم مذہب (مجوسی مذہب) کے خلاف دینِ حق کا مذہب تھا اور جب کہ تحقیق سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ ابراہیم زردشت اور خورس (کے ارش) کا زمانہ ایک رہا ہے اور خورس اور دارا کے عقائد زردشت کی تعلیم کے عین مطابق ہیں تو اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ خورس پہلا بادشاہ ہے جس نے ایران کے قدیم مذہب (مجوسی مذہب) کے خلاف اس دینِ حق کو قبول کیا اور کچھ تعجب نہیں کہ یہود کو خورس کے ساتھ اس درجہ شغف کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ خورس ایسے مذہب کا پیرو تھا جو ان کے نبی دانیال اکبر یا یرمیاہ (علیہما السلام) کے شاگرد اور فیض یافتہ ہادی (زردشت) کی جانب منسوب ہے۔

مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ زردشت کی تعلیمِ حق کو ایران زیادہ دیر تک قائم نہ رکھ سکا اور دارا پر حملۂ اسکندر کے بعد یعنی ایران کے پہلے عہدِ تاریخی کے ختم پر وہ بھی مسخ اور محرف کر دیا گیا چنانچہ مؤرخین کا بیان ہے کہ ۳۳۰ء ق م کے بعد زردشتی مذہب کا انحطاط شروع ہو گیا اور ایک جانب روم و یونان کے خارجی اثرات نے اس کو متاثر کیا اور دوسری جانب ایران کے قدیم مذہب "مجوس" نے دوبارہ سر اٹھایا اور نتیجہ یہ نکلا کہ دارا کے قتل کے بعد ہی اس کے اصل خدوخال بگڑنے لگے اور اس میں تحریف و مسخ کا سلسلہ شروع ہو گیا اور آہستہ آہستہ قدیم مجوسی مذہب کے امتزاج کے ساتھ اس نے ایک نئی شکل اختیار کر لی اور اب یہی مجوسی مذہب کے نام سے موسوم ہے۔

ایرانیوں (پارسیوں) کا اپنا بیان ہے کہ جب سکندر مقدونی نے اصطخر پر حملہ کیا تو اس نے

[1] کم بی سیز (کیقباد) ... کا بھی۔

شہر کو آگ لگادی اور اس میں زردشت کا مقدس صحیفہ "اوستا" جل کر راکھ ہوگیا گویا بیت المقدس پر حملے کے وقت جو معاملہ بخت نصر نے یہود کی مقدس کتاب توراۃ کے ساتھ کیا وہی سکندر نے اوستا کے ساتھ کیا اور اس طرح دونوں مذاہب کے مقدس صحیفے دنیا سے مفقود ہوگئے۔

پھر تقریباً پانچ سو سال کے بعد ایران کے تیسرے تاریخی عہد میں ساسانی حکومت کے بانی اردشیر بابکانی نے از سرِ نو "اوستا" کو مرتب کرایا پس ظاہر ہے کہ اب یہ صحیفہ اصل "اوستا" نہیں ہے بلکہ قدیم ایرانی مذہب یا یونانی مذہب اور زردشتی مذہب کا ایک معجونِ مرکب ہے بلکہ اس کے نمایاں عقائد و اعمال بیشتر قدیم مجوسیت ہی سے ماخوذ نظر آتے ہیں تاہم اس صحیفہ کا جو ناقص اور محرف حصہ آج پارسیوں کے ہاتھ میں ہے اس میں اصل مذہب کی جھلک اب بھی کہیں کہیں نظر آتی ہے جس کے بعض حوالجات ہم اصحاب الرس کے واقعہ میں نقل کر چکے ہیں۔

مسلمانوں نے جب خیر القرون میں ایران کو فتح کیا تو ان کو ان ہی پیروانِ زردشت سے واسطہ پڑا جو صحیح دینِ زردشتی چھوڑ کر قدیم مجوسی مذہب پر واپس ہو چکے تھے اور ان میں ایک نبی اور اس کی کتاب کے تصور کے علاوہ کوئی بات زردشتی مذہب کی باقی نہیں رہی تھی اور اسی بنا پر قرآن نے بھی ان کو "مجوس" ہی کہہ کر ذکر کیا ہے اس لیے متقدم عرب مؤرخین نے یہ سمجھ لیا کہ مجوسی مذہب اور زردشتی مذہب ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں اس کے باوجود بعض متقدم محقق اور اصحاب سیرۃ اس قدر پتہ دے سکے ہیں کہ ایران میں دو مذاہب نے یکے بعد دیگرے اپنا اثر قائم کیا ہے۔[1] ایران اول صابی مذہب رکھتا تھا اور اس کے بعد اس نے زردشتی مذہب قبول کر لیا۔ لغتِ عرب میں "صابی" کے معنی "بددین" کے ہیں چنانچہ قریشِ مکہ اسی بنا پر اپنے خیال میں مسلمانوں کو "صابی" کہا کرتے تھے۔ اس لیے "صابی" سے ان حضرات کی مراد غالباً اسی مذہبِ قدیم سے ہے جو آتش پرستی، بُت پرستی اور دیوتا پرستی پر قائم تھا۔

---

[1] کیوں کہ اس جدید مرکب مذہب میں بھی آتش پرستی مذہب کی بنیاد تھی اور اس کا پجاری اور مہنت اب بھی مغ ہی کہلاتا تھا اور مغ، موگوش اور مجوس ایک ہی شے ہے۔

متاخرین علما میں سے شاہ عبدالقادر نور اللہ مرقدہٗ بھی تردد کے ساتھ المجوس کی تفسیر میں ارشاد فرماتے ہیں "مجوس آگ پوجتے ہیں اور ایک نبی کا نام بھی لیتے ہیں معلوم نہیں پیچھے بگڑے یا سرے غلط ہیں" مگر آج عرب اور یورپ کے محققینِ اہلِ تاریخ بغیر کسی تردد کے دلائل و براہین کی روشنی میں اس حقیقت کا اعلان کرتے ہیں کہ زردشت کا مذہب ایران کے قدیم مذہب سے جدا "دینِ حق" تھا جس میں مظاہر پرستی، اصنام پرستی، آتش پرستی سب ممنوع تھی اور خدائے واحد کی پرستش کے سوا کسی کی پرستش جائز نہیں تھی۔

چنانچہ مصر کے مشہور عالم فرج اللہ زکی نے اس قول کی پُرزور تردید کی ہے[۱] جس میں یہ کہا گیا ہے کہ زردشت نے اول پرمیاہ (علیہ السلام) کی شاگردی کی مگر جب کسی بات پر یرمیاہ نبی اس سے خفا ہو گئے تو وہ ان سے جدا ہو گیا اور آتش پرستی کا ایک نیا مذہب ایجاد کر لیا۔ ابن کثیر نے بھی اس قول کو "قیل" کہہ کر نقل کیا ہے یعنی وہ بھی اس کو قابلِ اعتماد نہیں سمجھتے۔

**ذوالقرنین اور قرآنِ عزیز**

ذوالقرنین کی شخصیت کے بارے میں اگرچہ دو اہم مباحث یعنی "ذوالقرنین سے متعلق توراۃ کی پیشین گوئیاں اور تاریخی شہادتیں" سپردِ قلم ہو چکیں لیکن ابھی ایک اہم مسئلہ یہ باقی ہے کہ کیا وہ شخصیت جس کے لیے توراۃ اور تاریخ سے روایات و شہادات پیش کی گئی ہیں درحقیقت قرآن میں مذکور ذوالقرنین ہی کی شخصیت ہے تو اس کے جواب سے قبل قرآنِ عزیز کی ان آیات کو پیش کر دینا ضروری ہے جو سورۂ کہف میں اس واقعہ سے متعلق بیان کی گئی ہیں تاکہ بعد میں تطبیق کا مسئلہ بخوبی واضح ہو سکے۔

قرآنِ عزیز (سورۂ کہف) میں ذوالقرنین کا واقعہ اس طرح مذکور ہے:۔

| | |
|---|---|
| وَيَسْـَٔلُونَكَ عَنْ ذِى الْقَرْنَيْنِ | اے پیغمبر! تم سے ذوالقرنین کا حال دریافت کرتے ہیں تم کہہ دو |
| قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَيْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا ؕ | میں اس کا کچھ حال تمھیں (کلامِ الٰہی میں) پڑھ کر سنا دیتا ہوں |
| اِنَّا مَكَّنَّا لَهٗ فِى الْاَرْضِ وَاٰتَيْنٰهُ | ہم نے اسے زمین میں حکمرانی دی تھی نیز اس کے لیے ہر طرح کا |
| مِنْ كُلِّ شَىْءٍ سَبَبًا ۙ فَاَتْبَعَ سَبَبًا | ساز و سامان مہیا کر دیا تھا۔ تو (دیکھو) اس نے (پہلے) ایک مہم |

[۱] حاشیہ تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۴۰۔

حَتّٰىٓ اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا
تَغْرُبُ فِيْ عَيْنٍ حَمِئَةٍ وَّوَجَدَ
عِنْدَهَا قَوْمًا ۗ قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ
اِمَّآ اَنْ تُعَذِّبَ وَاِمَّآ اَنْ تَتَّخِذَ
فِيْهِمْ حُسْنًا ۝ قَالَ اَمَّا مَنْ ظَلَمَ
فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ ثُمَّ يُرَدُّ اِلٰى
رَبِّهٖ فَيُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّكْرًا ۝
وَاَمَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ
جَزَآءَ ۨ الْحُسْنٰى ۚ وَسَنَقُوْلُ لَهٗ
مِنْ اَمْرِنَا يُسْرًا ۝ ثُمَّ اَتْبَعَ
سَبَبًا ۝ حَتّٰىٓ اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ
وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰى قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَلْ
لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا ۝ كَذٰلِكَ ۭ
وَقَدْ اَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا ۝
ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ۝ حَتّٰىٓ اِذَا بَلَغَ
بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمَا
قَوْمًا ۙ لَّا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ قَوْلًا ۝
قَالُوْا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِنَّ يَاْجُوْجَ
وَمَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ
فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلٰٓي اَنْ
تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدًّا ۝

کے لیے سازو سامان کیا (اور مہم کی طرف چل کھڑا ہوا) یہاں تک کہ
(چلتے چلتے) سورج کے ڈوبنے کی جگہ پہونچ گیا وہاں اسے سورج
ایسا دکھائی دیا جیسے ایک سیاہ دلدل کی جھیل میں ڈوب جاتا ہے اور
اس کے قریب ایک گروہ کو بھی آباد پایا ہم نے کہا اے ذوالقرنین (اب
یہ لوگ تیرے اختیار میں ہیں) تو چاہے انھیں عذاب میں ڈالے چاہے
اچھا سلوک کر کے اپنا بنالے۔ ذوالقرنین نے کہا ہم ناانصافی کرنیوالے
نہیں جو سرکشی کرے گا اسے ضرور سزا دیں گے پھر اسے اپنے پروردگار
کی طرف لوٹنا ہے وہ (بداعمالوں کو) سخت عذاب میں مبتلا کرے گا اور
جو ایمان لائے گا اور اچھے کام کرے گا تو اس کے بدلے اسے بھلائی
ملے گی اور ہم اسے ایسی ہی باتوں کا حکم دیں گے جس میں اس کیلیے راحت
و آسانی ہو اس کے بعد اس نے پھر تیاری کی اور (پورب) کی طرف
نکلا یہاں تک کہ سورج نکلنے کی آخری حد تک پہنچ گیا اس نے دیکھا
سورج ایک گروہ پر نکلتا ہے جس سے ہم نے کوئی آڑ نہیں رکھی یہ حال
یونہی تھا اور جو کچھ ذوالقرنین کے پاس تھا اس کی ہمیں پوری خبر ہے
اس نے پھر سازو سامان تیار کیا اور دوسری مہم میں نکلا یہاں تک کہ (دو
پہاڑوں کی) دیواروں کے درمیان پہنچ گیا وہاں اس نے دیکھا پہاڑوں
کے اس طرف ایک قوم آباد ہے جس سے بات کہی جائے تو کچھ نہیں سمجھتی۔
اس قوم نے (اپنی زبان میں) کہا اے ذوالقرنین یاجوج اور ماجوج اس
ملک میں آکر لوٹ مار کرتے ہیں کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ آپ ہمارے اور ان کے
درمیان ایک روک بنا دیں اور اس غرض سے ہم آپکے لیے کچھ خراج مقرر
کر دیں ذوالقرنین نے کہا میرے پروردگار نے جو کچھ میرے قبضہ میں

| | |
|---|---|
| قَالَ مَا مَكَّنِّي فِيهِ رَبِّي خَيْرٌ | دے رکھا ہے وہی میرے لیے بہتر ہے (تمہارے خراج کا محتاج نہیں) مگر تم اپنی |
| فَأَعِينُونِي بِقُوَّةٍ أَجْعَلْ | قوت سے (اس کام میں) میری مدد کرو میں تمہارے اور یاجوج وماجوج کے |
| بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْمًا ۝ | درمیان ایک مضبوط دیوار کھڑی کر دوں گا (اس کے بعد اس نے حکم دیا) لوہے |
| آتُونِي زُبَرَ الْحَدِيدِ حَتَّىٰ | کی سلیں میرے لیے مہیا کر دو۔ پھر جب (تمام سامان مہیا ہو گیا اور دونوں |
| إِذَا سَاوَىٰ بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ | پہاڑوں کے درمیان دیوار اٹھا کر ان کے برابر بلند کر دی تو حکم دیا (بھٹیاں |
| قَالَ انفُخُوا حَتَّىٰ إِذَا جَعَلَهُ | سلگاؤ اور) اسے دھونکو پھر جب (اس قدر دھونکا گیا کہ) بالکل آگ کی طرح |
| نَارًا قَالَ آتُونِي أُفْرِغْ عَلَيْهِ | لال ہو گئی تو کہا گلا ہوا تانبا لاؤ اس پر انڈیل دیں چنانچہ (اسی طرح) ایک ایسی |
| قِطْرًا ۝ فَمَا اسْطَاعُوا أَن يَظْهَرُوهُ | سد بن گئی کہ نہ تو (یاجوج وماجوج) اس پر چڑھ سکتے تھے نہ اس میں سرنگ لگا |
| وَمَا اسْتَطَاعُوا لَهُ نَقْبًا ۝ قَالَ | سکتے تھے ذوالقرنین نے (تکمیل کار کے بعد) کہا یہ جو ہوا تو (فی الحقیقت) |
| هَٰذَا رَحْمَةٌ مِّن رَّبِّي ۝ | میرے پروردگار کی مہربانی ہے جب میرے پروردگار کی فرمائی ہوئی بات |
| فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ رَبِّي جَعَلَهُ | ظہور میں آئیگی تو وہ اسے ڈھا کر ریزہ ریزہ کر دیگا اور میرے پروردگار کی فرمائی |
| دَكَّاءَ ۝ وَكَانَ وَعْدُ رَبِّي حَقًّا ۝ | ہوئی بات سچ ہے ٹلنے والی نہیں اور اس دن ہم ایسا کریں گے کہ ان میں |
| وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَمُوجُ | ایک زمرہ دوسری قوم پر موجوں کی طرح آپڑیں گی اور صور پھونکا جائے گا |
| فِي بَعْضٍ وَنُفِخَ فِي الصُّورِ | نرسنگھا (صور) پس اکٹھا کریں گے ہم ان کو۔ |
| فَجَمَعْنَاهُمْ جَمْعًا (کہف پ ۱۶ ع) | |

---

قرآن عزیز کی ان آیات میں ذوالقرنین کا جو واقعہ مذکور ہے اگر اس کو ان واقعات کے ساتھ تطبیق دیجیے جو گذشتہ صفحات میں توراۃ اور تاریخ قدیم کے حوالجات سے نقل کیے گئے ہیں تو آپ خود یہ فیصلہ دیں گے کہ تاویلات تخمینی قیاس آرائیوں اور غیر معلوم احتمالات سے محفوظ رہ کر ذوالقرنین کا اطلاق خورس کے سوا اور کسی شخصیت پر نہیں ہوتا۔

مگر اس فیصلہ کی حقیقت پر عبور حاصل کرنے کے لیے ازبس ضروری ہے کہ سورۂ کہف کی زیر مطالعہ آیات کے مطالب کا تجزیہ کرکے ان کے ساتھ خورس سے متعلق تاریخی واقعات کی مطابقت کو

واضح اور روشن کر دیا جائے۔

پس ذوالقرنین کے متعلق قرآنِ عزیز نے کن حقائق کا اظہار کیا ہے اور خورس سے متعلق واقعات کس طرح ان حقائق کے ساتھ مطابقت رکھتے ہیں بطورِ ذیل میں ترتیب وار قابلِ مطالعہ ہیں:

(۱) قرآنِ عزیز کا اسلوبِ بیان کہتا ہے کہ اس نے ذوالقرنین کا واقعہ دوسروں کے سوال کرنے پر بیان کیا ہے اور سوال کرنے والوں نے اسی لقب کے ساتھ اس کو یاد کیا ہے۔ قرآن نے اپنی جانب سے یہ لقب تجویز نہیں کیا "یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِی الْقَرْنَیْنِ قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَیْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا" (اے پیغمبر!) تم سے ذوالقرنین کا حال دریافت کرتے ہیں تم کہہ دو! میں اس کا کچھ حال تمہیں (کلام الٰہی میں) پڑھ کر سناتا ہوں"

(تطبیق (۱) صحیح روایات سے یہ ثابت ہو چکا کہ یہ سوال یہودیوں کی تلقین سے قریش کرتے کیا تھا سوال میں یہ مذکور تھا کہ ایسے بادشاہ کا حال بتاؤ جو مشرق و مغرب میں پھر گیا اور جس کو توراۃ میں صرف ایک جگہ اس لقب سے یاد کیا گیا ہے اور توراۃ یہ کہتی ہے کہ دانیال (علیہ السلام) کے مکاشفہ میں ایران کے ایک بادشاہ کو ایسے مینڈھے کی شکل میں دکھایا گیا جس کے دو سینگ نمایاں تھے اور جبریل فرشتے نے اس دو سینگوں والے مینڈھے (ذوالقرنین) کی تعبیر یہ دی کہ اس سے وہ بادشاہ مراد ہے جو فارس اور میڈیا دو بادشاہتوں کا مالک ہوگا اور یسعیاہ نبی کی پیشین گوئی اور تاریخ دونوں اس پر متفق ہیں کہ ایران کا یہ بادشاہ خورس تھا جس نے فارس اور میڈیا دونوں کو ملا کر شاہنشاہی کی یہودیوں کو اس سے اس لیے دلچسپی تھی کہ ان کے انبیاء علیہم السلام کے الہامات کے مطابق وہ ان کا نجات دہندہ تھا چنانچہ یہودیوں کا دیا ہوا یہ لقب "ذوالقرنین" خود ایران کے شاہی خاندان میں اس درجہ مشہور و مقبول ہوا کہ انھوں نے خورس کے مرنے کے بعد اس کا مجسمہ بنایا تو اس میں بھی تاریخی یادگار کے طور پر دانیال علیہ السلام کے خواب کو مصور کر کے دکھایا اور چونکہ یسعیاہ نبی کے صحیفہ میں ایک جگہ اس کو عقاب بھی کہا گیا ہے:

"میں خدا ہوں اور مجھ سا کوئی نہیں جو ابتدا سے انتہا تک احوال اور قدیم وقتوں کی باتیں جو اب تک

پوری نہیں ہوئیں' بتاتا ہوں اور جو کہتا ہوں میری مصلحت قائم رہے گی اور میں اپنی ساری مرضی پوری کروں گا جو عقاب کو پورب سے لاؤں گا اس شخص کو جو میرے ارادوں کو پورا کریگا۔[1]

اس لیے اصطخر کے قریب خورس کا جو سنگی مجسمہ نکلا ہے اس کو اس مجموعی تخیل ہی پر بنایا گیا ہے کہ اس کے سر کے دونوں جانب دو سینگ ہیں اور سر پر ایک عقاب ہے اور خورس کے سوا دنیا کے کسی بادشاہ کے متعلق یہ تخیل موجود نہیں ہے۔

پس یہ دلیل ہے اس امر کی کہ یہود کو اپنے نجات دہندہ خدا کے مسیح اور خدا کے چرواہے کے ساتھ اس درجہ دلچسپی تھی کہ انھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا معیار اس بادشاہ کے واقعات کے علم کو قرار دیا اور اسی کے پیش نظر قرآن نے اس بادشاہ (خورس) کا مناسب حال ذکر کیا۔

(۲) قرآن کہتا ہے کہ وہ بہت صاحب شوکت بادشاہ تھا اور خدا نے اس کو ہر قسم کے سازوسامانِ حکومت سے نوازا تھا۔ اِنَّا مَكَّنَّا لَهٗ فِي الْاَرْضِ وَاٰتَيْنٰهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا ہم نے اس کو حکمرانی عطا کی اور اس کے لیے ہر طرح کا سازوسامان مہیا کر دیا تھا۔

(ت-۲) خورس (گورش) کے متعلق توراۃ اور قدیم وجدید تاریخی حوالوں سے یہ ثابت ہو چکا کہ اس نے نہ صرف ایران کی مختلف قبائلی حکومتوں کو ہی ایک شاہنشاہی میں منسلک کر دیا تھا بلکہ بابل و نینوٰی کی عظیم الشان حکومتوں پر بھی قابض ہو کر اپنی جغرافیائی حیثیت میں ایسی وسیع مملکت کا مالک ہو گیا تھا کہ خدائے تعالیٰ نے اس کو تمام سازوسامانِ زندگی وحکومت سے مالا مال کر دیا۔

(۳) قرآن کہتا ہے کہ ذوالقرنین نے تین قابلِ ذکر مہم سر کی ہیں۔

(ت-۳) معتبر تاریخی شہادتیں ثابت کرتی ہیں کہ خورس نے تین قابلِ ذکر مہم سر کیں۔

(۴) قرآن کہتا ہے کہ ذوالقرنین نے پہلے پچھم (مغرب) کی جانب ایک مہم سر کی فَاَتْبَعَ سَبَبًا حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِيْ عَيْنٍ حَمِئَةٍ "پس اس نے (ایک مہم کے لیے) سازوسامان کیا اور پچھم کی جانب نکل کھڑا ہوا یہاں تک کہ (چلتے چلتے) سورج کے ڈوبنے کی جگہ پہنچا وہاں اسے سورج ایسا دکھائی دیا جیسے ایک سیاہ دلدل میں ڈوب جاتا ہے۔"

[1] باب ۴۶ آیات ۱۱-۹۔

(ت - ۴) یونانی مؤرخ ہیروڈوٹس اور بعض دوسرے مؤرخین کے حوالے سے یہ ثابت ہوچکا ہے کہ خورس کو سب سے پہلی اور اہم مہم کی جانب پیش آئی جب کہ لیڈیا (ایشیاء کوچک) کے بادشاہ کرڈیس کے غدارانہ طرزِ عمل کے خلاف اس کو لیڈیا پر حملہ کرنا پڑا یہ مقام ایران سے جانبِ مغرب واقع ہے اور اس کا دارالحکومت "سارڈیس" ایشیاء کوچک کے آخری مغربی ساحل کے قریب تھا۔ بقول ہیروڈوٹس خورس کی یہ مہم ایسی معجزانہ انداز میں تھی کہ وہ مغرب کی جانب فتوحات کرتا ہوا چودہ روز کے اندر ایشیاء کوچک کے آخری ساحل پر جا کھڑا ہوا اور سارڈیس جیسے محکم و مضبوط شہر کو تسخیر کر لیا اب اس کے سامنے سمندر کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ سمرنا کے قریب بحرِ ایجین (AEGANSEA) کا یہی وہ ساحل ہے جو اپنے اندر بہت سے چھوٹے چھوٹے جزیرے رکھنے کی وجہ سے جھیل بن گیا ہے اور اس کا پانی بہت گدلا رہتا ہے اور شام کے وقت جب سورج ڈوبتا ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے گویا سیاہ دلدل میں ڈوب رہا ہے "تَغْرُبُ فِي عَيْنٍ حَمِئَةٍ"

(۵) قرآن کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وہاں کی قوم پر ذوالقرنین کو ایسا غلبہ دے دیا تھا کہ وہ جس طرح چاہے ان کے ساتھ معاملہ کرے، چاہے ان کی بغاوت کی پاداش میں ان کو سزا دے اور چاہے تو ان کے ساتھ حسنِ سلوک کر کے ان کو معاف کر دے "وَوَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ إِمَّآ أَنْ تُعَذِّبَ وَإِمَّآ أَنْ تَتَّخِذَ فِيهِمْ حُسْنًا"

(ت - ۵) تاریخی حوالوں اور ہیروڈوٹس اور زینوفن کے تاریخی اقوال سے یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ خورس (کے ارش) نے لیڈیا کو فتح کر کے عام بادشاہوں کی طرح اس کو برباد نہیں کیا بلکہ عادل، نیک اور صالح بادشاہ کی طرح عفو کا اذنِ عام کر دیا اور ان کو بے وطن نہیں ہونے دیا۔ بلکہ کرڈیس کی گرفتاری کے سوا یہ بھی محسوس نہیں ہونے دیا کہ یہاں کوئی انقلابِ حکومت ہوا ہے، البتہ کرڈیس کی جراَتِ مردانہ کے امتحان کے لیے اوّل اس کو چتا میں جلانے کا حکم دیا مگر جب وہ مردانہ وار چتا کے اندر بیٹھ گیا تو اس کو بھی معاف کر دیا اور اس کے ساتھ اعزاز و اکرام کے ساتھ پیش آیا۔

(۶) قرآن نے ذوالقرنین کا جو مقولہ نقل کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ "مومن" بھی تھا اور

عادل وصالح" بھی، وہ کہتا ہے" قَالَ اَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ ثُمَّ يُرَدُّ اِلٰى رَبِّهٖ فَيُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّكْرًا ۝ وَاَمَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ جَزَآءَ ۨ الْحُسْنٰى ۚ وَسَنَقُوْلُ لَهٗ مِنْ اَمْرِنَا يُسْرًا ۝ " ذوالقرنین نے کہا ہم ناانصافی کرنے والے نہیں ہیں۔ جو سرکشی کرے گا اسے ضرور سزا دیں گے پھر اسے اپنے پروردگار کی طرف لوٹنا ہے وہ (بداعمالوں کو) سخت عذاب میں مبتلا کرے گا۔ اور جو ایمان لائے گا اور اچھے کام کرے گا تو اس کے بدلہ میں اس کو بھلائی ملے گی اور ہم اسے ایسی ہی باتوں کا حکم دیں گے جس میں اس کے لیے آسانی و راحت ہو۔"

(ت - ٦) توراۃ میں خورس کا یروشلم سے متعلق فرمان اور دارا کے کتبات و اعلانات مذکورۂ توراۃ، "اُوستا" کی اندرونی شہادات اور تاریخی بیانات یہ سب شہادتیں ناقابلِ انکار حد تک یہ ثابت کرتی ہیں کہ خورس اور دارا مومن تھے اور وقت کے سچے دین کے پیرو بلکہ اس کے مبلغ و منادتھے، وہ ابراہیم زردشت کے متبع 'خدائے واحد کے پرستار اور آخرت کے قائل تھے اور اُن کا دین انبیاءِ بنی اسرائیل ہی کی تعلیم کی ایک شاخ کی حیثیت رکھتا تھا جو دارا کے بعد بہت ہی جلد محرّف و مسخ ہو کر رہ گیا۔

(۷) قرآن کہتا ہے کہ ذوالقرنین نے دوسری مہم مشرق (پورب) کی جانب سر کی اور وہ چلتے چلتے جب سورج نکلنے کی آخری حد پر پہنچا تو اس کو وہاں خانہ بدوش قبائل سے واسطہ پڑا ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ۝ حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰى قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا ۝ اس کے بعد اُس نے پھر تیاری کی اور پورب کی طرف نکلا یہاں تک کہ سورج نکلنے کی آخری حد تک پہنچ گیا۔ اس نے دیکھا سورج ایک ایسے گروہ پر نکلتا ہے جس سے ہم نے کوئی آڑ نہیں رکھی ہے۔

(ت - ۷) تاریخ کہتی ہے کہ خورس کو دوسری قابلِ ذکر مہم مشرق (پورب) کی جانب پیش آئی جبکہ مکران کے خانہ بدوش قبائل نے سرکشی کی جو کہ اس کے دارالحکومت سے اقصائے مشرق میں پہاڑی علاقہ تک آباد تھے اور جن سے متعلق مہم کی تفصیلات گذشتہ صفحات میں بیان کی جا چکیں۔

اِس جگہ یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ قرآنِ عزیز نے ذوالقرنین کی مغربی اور مشرقی قابلِ ذکر مہمات

کے لیے "مَغرِبَ الشَّمسِ" اور "مَطلِعَ الشَّمسِ" کی تعبیر اختیار کی ہے' اس سے بعض حضرات کو یہ غلط فہمی ہوگئی کہ ذوالقرنین ساری دنیا کا بلاشرکتِ غیرے حکمراں بن گیا تھا اور اس نے دنیا کے دونوں جانب کے آخری رُبعِ مسکون تک اپنے قبضہ میں کر لیا تھا حالانکہ یہ تاریخی واقعات کے لحاظ سے کسی بھی بادشاہ کے لیے ثابت نہیں ہے اور نہ قرآن نے اس مقصد کے لیے یہ تعبیر اختیار کی ہے بلکہ اس کی صاف اور واضح مراد یہ ہے کہ ذوالقرنین اپنے مرکزِ حکومت کے لحاظ سے اقصاءِ مغرب اور اقصاءِ مشرق تک پہنچا ہے اور مغرب میں وہ اس حد تک پہنچ گیا تھا جہاں خشکی کا سلسلہ ختم ہو کر سمندر شروع ہو جاتا ہے اور مشرق میں اس حد تک پہنچا کہ وہاں خانہ بدوش قبائل کے سوا کوئی شہری آبادی نہیں تھی۔ یہ مطلب اس درجہ واضح ہے کہ اگر بے دلیل غلط فہمی کی وجہ سے مسطورہ بالا قول منقول نہ ہوتا تو ہر شخص زبان کے محاورہ کے لحاظ سے یہی سمجھتا جو ہم نے سمجھا ہے' چنانچہ آج بھی ہم ہندوستان میں رہتے ہوئے اقصاءِ مشرق اور اقصاءِ مغرب سے دور دراز ملک مراد لیتے ہیں جو ہمارے مشرق و مغرب میں واقع ہیں اور ان الفاظ کو اس بات میں منحصر نہیں کر دیتے کہ مشرق و مغرب کے وہ کنارے مراد ہیں جن کے بعد معمورۂ عالم کا کوئی حصہ بھی باقی نہ رہا ہو' البتہ دلائل یا قرائن کے ذریعہ کبھی کبھی یہ معنی بھی مراد ہو جاتے ہیں۔

اقصائے مغرب و مشرق کی اس اصطلاح کو جو قرآن نے ذوالقرنین کے سلسلہ میں بیان کی ہے اگر اور گہری نظر سے دیکھا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ذوالقرنین (خورس) سے متعلق توراۃ نے چونکہ یہی تعبیر کی تھی اس لیے بہت ممکن ہے کہ قرآن نے سائلین کو اس کا واقعہ سنانے کے وقت اسی اصطلاح کو اختیار کرنا پسند کیا ہو۔ دیکھیے یسعیاہ نبی کے صحیفہ میں خورس کے حق میں بعینہٖ یہی تعبیر موجود ہے:

> خداوند اپنے خورس کے حق میں یوں فرماتا ہے ..... میں نے اپنے بندے یعقوب اور اپنے برگزیدہ اسرائیل کے لیے تجھے تیرا نام صاف صاف لے کے بلایا۔ میں نے تجھے مہربانی سے پکارا گو کہ تو مجھے نہیں جانتا میں ہی خداوند ہوں اور کوئی نہیں' میرے سوا کوئی خدا نہیں' میں نے تیری کمر باندھی اگرچہ تو نے مجھے نہیں پہچانا تاکہ لوگ سورج کے

نکلنے (مطلع الشمس) کی اطراف سے سورج غروب ہونے (مغرب الشمس) کی اطراف تک جانیں کہ میرے سوا کوئی نہیں میں ہی خداوند ہوں اور میرے سوا کوئی نہیں [۱]

اور زکریا نبی کے صحیفہ میں بنی اسرائیل کے متعلق کہا گیا ہے:

رب الافواج فرماتا ہے کہ دیکھو میں اپنے لوگوں کو سورج کے نکلنے (مطلع الشمس) کے ملک سے اور سورج کے غروب ہونے (مغرب الشمس) کے ملک سے چھڑا لوں گا اور میں انھیں لاؤں گا اور وہ (بنی اسرائیل) یروشلم کے درمیان سکونت کریں گے۔ [۲]

ظاہر ہے کہ ان دونوں مقامات میں "مطلع الشمس" اور "مغرب الشمس" سے معمورۂ عالم کے دونوں جانب کے آخری کونے مراد نہیں ہیں بلکہ جن کا ذکر ہے ان کی حکومت یا مقامِ سکونت سے مشرقی اور مغربی جہات مراد ہیں۔

(۸) قرآن کہتا ہے کہ ذوالقرنین کو تیسری قابلِ ذکر مہم پیش آئی اور جب وہ ایسے مقام پر پہنچا جہاں دو پہاڑوں کی پھانکیں ایک درہ بناتی تھیں تو ان کے ورے اس کو ایک ایسی قوم سے واسطہ پڑا جو اس کی زبان اور بولی سے ناواقف تھی انھوں نے ذوالقرنین پر (کسی طرح) یہ واضح کیا کہ ان پہاڑوں کے درمیان سے نکل کر ہم کو یاجوج و ماجوج ستاتے اور زمین میں فساد انگیزی کرتے ہیں، کیا آپ ہماری اتنی مدد کریں گے کہ ہم سے مالی ٹیکس لے کر ان دو پہاڑوں کے درمیان ایک سد بنا دیں تاکہ ان کے اور ہمارے درمیان وہ حدِ فاصل ہو جائے اور روک بن جائے۔ ذوالقرنین نے کہا میرے پاس خدا کا دیا سب کچھ ہے اس کی مجھے اجرت کی ضرورت نہیں البتہ اس کے بنانے میں میری مدد کرو۔ ان لوگوں نے ذوالقرنین کے حکم سے لوہے کے ٹکڑے جمع کیے اور ان سے ذوالقرنین نے دونوں پہاڑوں کے درمیان "سد" بنا دی اور پھر تانبا پگھلا کر اس آہنی دیوار کو مستحکم کر دیا۔

(ت۔ ۸) تاریخ کی ناقابلِ انکار شہادتوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ خورس کو جانبِ شمال میں ایک قابلِ ذکر مہم پیش آئی جس میں کاکیشیا (جبل قوقایا کوہِ قاف) کے پہاڑی سلسلے میں ایسے دو پہاڑوں کے قریب ایک قوم ملی جن کی پھانکوں کے درمیان قدرتی درہ تھا اور پہاڑ کی دوسری جانب

سے سنتھیئین قبائل کے جنگلی اور غیر مہذب لٹیرے دل کے دل آکر اس قوم پر حملہ کرتے اور لوٹ مار کر کے درہ کے راستہ واپس ہوجایا کرتے تھے خورس جب اس جگہ پہنچا تو اس آبادی کے لوگوں نے حملہ آور لٹیروں کی شکایت کرتے ہوئے اس سے پہاڑوں کے درمیان "سد" (دیوار) بنادینے کی درخواست کی خورس نے ان کی درخواست کو منظور کیا اور لوہے اور تانبے سے ملا کر ایک سد قائم کر دی جس کو وقت کے گاگ اور میگاگ غیر مہذب (سنتھیئین) قبائل اپنی درندگی اور خونخواری کے باوجود نہ توڑ سکے اور نہ اس کے اوپر سے اتر کر حملہ آور ہو سکے اور اس طرح پہاڑوں کے درے کی آبادی ان کے حملوں سے محفوظ ہو گئی۔

اگرچہ غیر مہذب قبائل کے حملوں کے تحفظ کی خاطر دنیا کے مختلف حصوں میں ایسی متعدد چھوٹی اور بڑی سد (دیواریں) بنائی گئی ہیں لیکن ایسی سد جو لوہے اور تانبے سے مخلوط دو پہاڑوں کی پھانکوں کے درمیان بنائی گئی ہو خورس کی بنائی ہوئی اس سد کے سوا جو کاکیشیا (جبل قوقا) میں پائی جاتی ہے کوئی سد دنیا میں اب تک دریافت نہیں ہوئی اس لیے دلائل کی روشنی میں یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ قرآن نے ذوالقرنین کی سد کے متعلق جو تفصیلات دی ہیں اس کے پیش نظر خورس ہی ذوالقرنین ہے اور درۂ داریال ہی کی سد قرآن کی تفصیلات کے مطابق ہے۔

یاجوج و ماجوج کون ہیں اور سد کی حقیقت کیا ہے چونکہ یہ دو زیر تحقیق مسائل ابھی بحث میں نہیں آئے اس لیے ذوالقرنین سے متعلق مطابقتِ قرآن کا یہ پہلو ہنوز تشنۂ دلیل ہے۔ لہٰذا سطورِ ذیل میں ان دونوں مسائل پر سیر حاصل بحث کی جاتی ہے تاکہ اصل حقیقت اپنے تمام پہلوؤں کے اعتبار سے پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے۔

**یاجوج و ماجوج** ذوالقرنین کی شخصیت کو زیر بحث لانے کے بعد دوسرا مسئلہ یاجوج و ماجوج کی تعیین کا ہے۔ مفسرین اور مؤرخینِ اسلام نے رطب و یابس روایات کا وہ تمام ذخیرہ نقل کر دیا ہے جو اس سلسلہ میں بیان کی گئی ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ چند روایات کے علاوہ اس سلسلہ کی تمام روایات خرافات و هفوات کا مجموعہ ہیں جو عقلاً و نقلاً کسی طرح لائقِ اعتماد نہیں ہیں اور اسرائیلیات

کالایعنی طومار ہیں۔

ان تمام روایات میں قدرِ مشترک یہ ہے کہ یاجوج وماجوج ایک ایسے قبائل کا مجموعہ ہیں جو جسمانی اور معاشرتی اعتبار سے عجیب وغریب زندگی کے حامل ہیں مثلاً وہ بالشت ڈیڑھ بالشت یا زیادہ سے زیادہ ایک دراع کا قد رکھتے ہیں اور بعض غیر معمولی طویل القامت ہیں اور ان کے دونوں کان اتنے بڑے ہیں کہ ایک اوڑھنے اور دوسرا بچھانے کے کام میں آتا ہے۔ چہرے چوڑے چکلے اور قد کے ساتھ غیر متناسب ہیں ان کی غذا کے لیے قدرت سال بھر میں دو مرتبہ سمندر سے ایسی مچھلیاں نکال کر پھینک دیتی ہے جن کے سر اور دُم کا فاصلہ اس قدر طویل ہوتا ہے کہ دس روز و شب اگر کوئی شخص اس پر چلتا رہے تب اس فاصلہ کو قطع کر سکتا ہے یا ایک ایسا سانپ ان کی خوراک ہے جو پہلے قرب وجوار کے تمام بری جانوروں کو ہضم کر جاتا ہے اور پھر قدرت اس کو سمندر میں پھینک دیتی ہے اور وہ وہاں میلوں تک بحری جانوروں کو چٹ کر لیتا ہے اور پھر ایک بادل آتا ہے اور فرشتہ اس عظیم الجثہ اژدہے کو اٹھا کر اس پر رکھ دیتا ہے اور بادل اس کو ان قبائل میں لے جا کر ڈال دیتا ہے اور یہ کہ یاجوج وماجوج ایک ایسی برزخی مخلوق ہیں جو آدم علیہ السلام کے صلب سے تو ہیں مگر حوا (علیہا السلام) کے بطن سے نہیں ہیں۔

ان روایات کو نقل کرتے ہوئے یاقوت نے معجم البلدان میں یہ رائے ظاہر کی ہے:

| | |
|---|---|
| ولست اقطع بصحة ما اوردته لاختلاف الروايات فيه والله اعلم بصحته وعلى كل حال فليس في صحة امر السد ريب . الخ (ج ۵ ص ۵۳) | اور میں نے جو کچھ روایات نقل کی ہیں ان کے اختلافات کے پیش نظر میں کسی طرح ان کی صحت کو باور نہیں کر سکتا اور اس معاملہ کی اصل حقیقت کا حال خدا ہی خوب جانتا ہے اور بہرحال اس میں ذرا سا بھی شبہ نہیں کہ جہاں تک سد کا معاملہ ہے اس کے صحیح ہونے میں مطلق شک کی گنجائش نہیں ہے۔ |

اور حافظ عماد الدین ابن کثیر البدایہ والنہایہ میں یہ ارشاد فرماتے ہیں:

| | |
|---|---|
| ومن زعم ان ياجوج وماجوج خلقوا من نطفة آدم حين احتلم | اور جس شخص نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ یاجوج اور ماجوج حضرت آدمؑ کے ایسے نطفہ سے پیدا ہوئے ہیں جو احتلام کی حالت میں نکلا اور |

فاختلط بتراب فخلقوا من ذلك
وانهم ليسوا من حواء فهو قول حكاه
الشيخ ابوزكريا النووي في شرح مسلم
وغيره وضعفوه وهو جدير بذالك
اذ لادليل عليه بل هو مخالف لما ذكرناه
من ان جميع الناس اليوم من ذرية نوح
بنص القرآن هكذا من زعم انهم على اشكال
مختلفة واطوال متباينة جدا
فمنهم من هو كالنخلة السحوق و
منهم من هو غاية في القصر ومنهم
من يفترش اذنا من اذنيه ويتغطى
بالاخرى فكل هذه بلا دليل ورجم
بالغيب بغير برهان والصحيح انهم
من بني ادم وعلى اشكالهم
وصفاتهم۔ (ج ۲ ص ۱۱۰)

مٹی میں رل مل گیا اور یہ مخلوق وجود میں آ گئی اور یہ حضرت حواؑ کے
بطن سے نہیں ہیں تو یہ ایک قول ہے جس کو شیخ ابوزکریا نووی نے
شرح مسلم میں حکایت کیا ہے اور ان کے علاوہ علماء نے اس کی تغلیط
کی ہے اور بلاشبہ یہ قول اس قابل ہے کہ اس کو صحیح نہ سمجھا جائے
اس لیے کہ یہ قطعاً بے دلیل بات ہے بلکہ اس قول کے بالکل خلاف
ہے جو ابھی ہم بیان کر چکے ہیں کہ نص قرآن سے یہ ثابت ہے کہ
کائنات کی موجودہ انسانی مخلوق کا ہر فرد حضرت نوحؑ کی اولاد
میں سے ہے۔ اس طرح یہ قول بھی غلط اور بے دلیل ہے کہ یاجوج
وماجوج عجیب عجیب مختلف شکلوں اور متضاد قد و قامت کی
مخلوق ہیں بعض ان میں سے اتنے لانبے ہیں کہ گویا کھجور کا بہت
طویل درخت ہے اور بعض بہت ہی کوتاہ قامت اور بعض کے
کان ایسے ہیں کہ ایک کو وہ بچھا لیتے اور دوسرے کو اوڑھ لیتے ہیں
سو یہ تمام اقوال قطعاً بے دلیل اور محض اٹکل کے تیر ہیں اور صحیح
بات یہ ہے کہ وہ عام بنی آدم کی طرح ہیں اور ان ہی کی طرح
شکل و صورت اور جسمانی اوصاف رکھتے ہیں۔

اور اپنی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں:-

وهذا قول غريب جداً لادليل عليه
لا من عقل ولا من نقل ولا يجوز
الاعتماد ههنا على ما يحكيه بعض
اهل الكتاب لما عندهم من الاحاديث
المفتعلة۔ (ج ۳ ص ۲۰، سورۂ کہف)

اور یہ قول بلاشبہ ایک اچنبا قول ہے کہ جس کے لیے نہ عقلی دلیل
ہے اور نہ نقلی اور بعض اہل کتاب نے جو اس سلسلہ میں حکایات
بیان کی ہیں اس مقام پر کسی طرح ان پر بھروسہ کرنا درست نہیں
ہے اس لیے کہ ان کے یہاں تو اس قسم کے من گھڑت قصوں
کی کوئی کمی نہیں ہے۔

اور دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں :۔

وقد ذكر ابن جرير هٰهنا عن وهب بن منبه اثرا طويلا عجيبا في سير ذي القرنين وبنائه السد وكيفية ما جرى له وفيه طول وغرابة ونكارة في اشكالهم وصفاتهم وطولهم وقصر بعضهم وآذانهم[1]

اور ابن جریر نے اس مقام پر وہب بن منبہ سے ذوالقرنین کی سیاحت اور سد کی تعمیر اور اس سے متعلق کیفیات کے بارہ میں ایک طویل و عجیب اثر نقل کیا ہے در اصل وہ ایک طویل اور اچنبی داستان ہے اور اس میں ان (یاجوج و ماجوج) کی شکلوں صورتوں ان کے طویل و کوتاہ ہونے اور ان کے کانوں کے متعلق اچنبی اور غیر معقول باتیں ہیں۔

اور حافظ ابن حجر عسقلانی اس عجیب و غریب قول کی تردید کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں :۔

ووقع في فتاوى الشيخ محي الدين يأجوج ومأجوج من اولاد آدم لا من حواء عند جماهير العلماء فيكون اخوانا لاب كذا قال ولم نر هذا عن احد من السلف الا عن كعب الاحبار ويرده الحديث المرفوع انهم من ذرية نوح ونوح من ذرية حواء قطعا[2]

اور شیخ محی الدین (نووی) کے فتاویٰ میں مذکور ہے کہ یاجوج اور ماجوج حضرت آدم کی نسل سے تو ہیں مگر حضرت حوا کے بطن سے نہیں ہیں جمہور علماء کا یہی خیال ہے اور اس طرح وہ حوا کے بطن سے بنی آدم کے علاتی بھائی ہیں مگر ہم نے کعب احبار کے علاوہ سلف میں سے کسی ایک شخص کو بھی اس کا قائل نہیں پایا اور اس قول کو وہ حدیث مرفوع قطعاً رد کرتی ہے جس میں یاجوج اور ماجوج کو نوح علیہ السلام کی نسل سے بتایا گیا ہے اور حضرت نوح بلاشبہ حضرت حواء کے بطن سے ہیں۔

اور دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں :۔

وقد اشار النووي وغيره الى حكاية من زعم ان آدم نام فاحتلم فاختلط منيه بتراب فتولد منه ولد يأجوج ومأجوج من نسله وهو

اور نووی اور بعض دوسروں نے ایک ایسے شخص کی بیان کردہ حکایت کی جانب اشارہ کیا ہے جو یہ کہتا ہے کہ آدم خواب میں تھے کہ ایک مرتبہ ان کو احتلام ہو گیا اور ان کے قطرات منی مٹی میں مل مل گئے بس اس سے یاجوج اور ماجوج کی نسل مخلوق ہو گئی تو یہ قول

[1] ج ۶ ص ۱۷۲ - [2] فتح الباری ج ۱۳ ص ۹۱ -

قول منکر اجداً لا اصل لہٗ الا عن بعض اھل الکتاب[1] جو سرتاسر بے ہودہ اور بے اصل ہے اور بعض اہلِ کتاب کی حکایت کے سوائے اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے

اور حافظ ابن کثیر اپنی تاریخ میں تحریر فرماتے ہیں:

ثم ھم من ذریۃ نوح لان اللّٰہ تعالٰی اخبرانہٗ استجاب بعبدہٖ نوح فی دعائہٖ علی اھل الارض بقولہٖ (رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا) وقال تعالٰی (فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَصْحٰبَ السَّفِيْنَةِ) وقال (وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِيْنَ)[2] پھر وہ (یاجوج و ماجوج) نوح علیہ السلام کی ذریت میں سے ہیں اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو یہ اطلاع دی ہے کہ اس نے اہلِ زمین کے متعلق نوح کی یہ دعا قبول کرلی (اے رب تو زمین پر کسی کافر کو باقی نہ چھوڑ) اور پھر حق تعالیٰ نے فرمایا (پس ہم نے اس کو اور کشتی والوں کو نجات دی) اور پھر فرمایا اور ہم نے اس کی ذریت ہی کو باقی رہنے والوں میں چھوڑا)

وجہِ استدلال یہ ہے کہ جب کہ قرآنِ عزیز ان آیات میں یہ تصریح کرتا ہے کہ حضرتِ نوحؑ کی بددعا کے بعد بنی آدم میں سے حضرتِ نوحؑ اور اصحابِ کشتی یا دوسرے الفاظ میں حضرتِ نوحؑ کی ذریت اور چند مسلمانوں کے علاوہ کسی کو زندہ اور باقی نہیں چھوڑا اور اب دنیائے انسانی حضرتِ نوحؑ ہی کی اولاد ہے تو پھر یہ کہنا کہ یاجوج اور ماجوج بنی آدم میں سے ایک مستقل مخلوق ہے اور ذریتِ نوحؑ میں سے نہیں ہے قطعاً بے بنیاد اور بے اصل ہے اور اس کی تائید میں حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ اگر یہ حواؑ کے بطن سے نہ تھے اور اس لیے ذریتِ نوحؑ میں سے بھی نہیں تھے تو طوفانِ نوحؑ میں یہ مخلوق کہاں تھی اور نصِ قرآنی کے خلاف یہ کیسے محفوظ رہی؟

اور حضرتِ قتادہ سے جو منقول ہے وہ بھی اس قول کو رد کرتا ہے:

ویاجوج وماجوج قبیلتان من ولد یافث بن نوح (الحدیث)[3] اور عبدالرزاق نے کتاب التفسیر میں قتادہ سے نقل کیا ہے کہ یاجوج اور ماجوج دو قبیلے ہیں جو یافث بن نوح کی نسل سے ہیں۔

---

[1] فتح الباری ج ۶ ص ۲۹۵۔ [2] البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۱۱۰۔ [3] فتح الباری ج ۶ ص ۲۹۷۔ یہ دعویٰ کہ موجودہ کل کائنات صرف نوح کی ذریت ہے قابلِ غور ہے۔

اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایات ہے کہ یاجوج وماجوج حضرت نوح کی نسل سے ہیں اور اگرچہ اس کی سند میں فی الجملہ ضعف ہے مگر اس کے مطاوع اور مؤید بعض دوسری صحیح روایات ہیں چنانچہ حافظ ابن حجر نے بخاری کی اس مرفوع روایت کے متعلق جو حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے منقول ہے یہ خیال ظاہر کیا ہے:

| | |
|---|---|
| الغرض منه هنا ذكر ياجوج | امام بخاری کی اس روایت بیان کرنے کی غرض یہ ہے کہ یاجوج و |
| وماجوج والاشارة الى كثرتهم | ماجوج کا حال بیان کیا جائے اور ان کی کثرت تعداد کی جانب اشارہ |
| وان هذه الامة بالنسبة اليهم | ہے اور یہ کہ امت محمدیہ (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے مقابلہ میں وہ ہزار و |
| نحو عشر عشر العشر وانهم من | گنا زیادہ ہیں اور یہ ثابت کرنا ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کی طرح |
| ذرية آدم رداً على من قال | نسل آدم میں شامل ہیں اس سے ان لوگوں کا رد کرنا مقصود ہے جو |
| خلاف ذلك (فتح الباری ج ص ۲۹۰) | اس کے خلاف ان کو عام انسانی مخلوق سے جدا مانتے ہیں۔ |

یہ چند نقول ہیں ان محققین کے ذخیرۂ اقوال سے جو حدیث تفسیر اور علم تاریخ کی ماہر ہستیاں ہیں۔ ان اقوال سے یہ بات قطعاً واضح اور صاف ہو جاتی ہے کہ یاجوج وماجوج عام دنیا انسانی کی طرح ربع مسکوں کے باشندے اور ان کی نسل بنی آدم کی عام نسل کی طرح ہے اور وہ کوئی عجوبۂ روزگار مخلوق نہیں ہیں اور نہ برزخی مخلوق اور اس قسم کی جو روایات پائی جاتی ہیں ان کا اسلامی روایات سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے بلکہ اسرائیلیات کے بے سروپا ذخیرہ کا جزو ہیں اور ان تمام روایات کا سلسلہ کعب احبار پر جا کر ختم ہوتا ہے جو یہودی النسل ہونے کی وجہ سے ان قصوں کے بہت بڑے عالم تھے اور اسلام لانے کے بعد یا تو تفریح کے طور پر ان کو سنایا کرتے تھے اور یا اس لئے کہ اس رطب ویابس میں سے جو دور از کار باتیں ہوں وہ رد کر دی جائیں اور جن سے قرآن اور احادیث نبوی کی تائید ہوتی ہو ان کو ایک تاریخی حیثیت میں لے لیا جائے مگر نقل کرنے والوں نے اس حقیقت پر نظر نہ رکھتے ہوئے اس پورے طومار کو "غرق مئے ناب اولیٰ" کا مصداق تھا اسی طرح نقل کرنا شروع کر دیا جس طرح حدیث [illegible] اور متاخرین میں وہ

بے نظیر ہستیاں نہ پیدا ہوتیں جنھوں نے روایات واحادیث کے تمام ذخیرے کو نقد وتبصرہ کی کسوٹی پر پرکھ کر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دیا تو نہ معلوم آج اسلام کو کس قدر بے پناہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔

پس اس وضاحت کے بعد اب یہ دیکھنا چاہیے کہ یاجوج و ماجوج کا مصداق کون سے قبائل ہیں اور ان قبائل کا کائناتِ انسانی کے ساتھ کیا تعلق رہا ہے؟ یہ مسئلہ درحقیقت ایک معرکۃ الآراء مسئلہ ہے اور اقوامِ عالم کی بہت سی قوموں پر اثرانداز ہے۔ نیز سورۂ انبیاء کی آیت "حَتّٰٓى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ" سے اس کا گہرا تعلق ہے۔

بہرحال اس سے پہلے کہ ہم اس مسئلہ پر کچھ لکھیں مقدمہ اور تمہید کے طور پر یہ معلوم ہونا چاہیے کہ انسانی آبادی کے تمام گوشوں میں جو چہل پہل اور رونق نظر آتی ہے اور ربعِ مسکون جس طرح بنی آدم سے آباد ہے اور تمدن و حضارت کی نیرنگیوں سے گل زار بنا ہوا ہے ان کی ابتداء بدوی اور صحرائی قبائل سے ہوئی ہے اور یہی قبائل صدیاں گذر جانے اور اپنے اصل مرکز سے جدا ہو جانے کے بعد تمدن و حضارت کے بانی بنتے اور متمدن قومیں شمار ہوتے رہے ہیں۔

تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ دنیا کی قوموں کے سب سے بڑے سرچشمے کہ جہاں سے سیلاب کی طرح امنڈ امنڈ کر انسانی آبادی پھیلی اور پھلی پھولی ہے اور مختلف ملکوں اور زمین کے مختلف خطوں میں جا کر بسی ہے صرف دو ہیں ایک حجاز اور دوسرا چینی ترکستان یا کاکیشیا کا وہ علاقہ جو شمال مشرق میں واقع ہے اور سطحِ زمین کا مرتفع اور بلند حصہ شمار ہوتا ہے۔

حجاز ان تمام اقوام و قبائل کا سرچشمہ ہے جو سامی النسل یا سمیٹک (SEMETIC) کہلاتی ہیں۔ یہ قبائل ہزاروں سال سے اس بے آب و گیاہ سرزمین سے طوفان کی طرح اٹھتے اور بگولہ کی طرح دنیا کے مختلف حصوں پر پھیلتے رہے ہیں اور بدوی اور صحرائی زندگی کے گہوارہ سے نکل کر زبردست تمدن اور عظیم الشان حضارت و شہرت کے بانی قرار پائے۔

عادِ اولیٰ اور عادِ ثانیہ (ثمود) اسی سرزمین سے اٹھے اور اپنی عظیم الشان صناعی اور پُرسطوت

حکومت وصولت کے ذریعہ صدیوں تک تمدن و حضارت کے علم بردار رہے جدیس طسم اور اسی قسم کے دوسرے قبائل بھی جو آج امم بائدہ (ہلاک شدہ) کہلاتے ہیں اسی خاک کے پروردہ تھے۔ اذواءمین (شاہانِ حمیر) اور عمالقہ مصر و شام و عراق کے جلال و جبروت اور وسعتِ سلطنت کا یہ عالم تھا کہ ایک عرصہ تک فارس اور روم بلکہ ہندوستان کے بعض حصے بھی ان کے احکام کے محکوم اور ان کی حکومت کے باج گذار رہ چکے ہیں۔ غرض سامی النسل اقوام و قبائل خواہ بدوی اور صحرائی ہوں یا حضری اور متمدن شہری سب اسی خاکِ حجاز (عرب) کے ذرات تھے جو اپنی وسعت کے بعد آپس میں اس قدر اجنبی ہو گئے تھے کہ بدوی اور شہری بلکہ فراعنۂ مصر (عمالقہ) اور اذواءمین (سلاطین حمیر) اور عرب مستعربہ اسمٰعیلی عربوں کے درمیان مطابقت پیدا کرنی بھی مشکل ہو گئی تھی اور اگر نسلی امتیازات و خصوصیات اور زبان کی بنیادی یک رنگی ان کے باہم پیوند نہ لگاتی تو تاریخ کے کسی گوشہ کی بھی یہ ہمت نہ تھی کہ وہ ابھر کر ان کی اخوتِ باہمی کا درس دے سکتا۔

اسی طرح قبائل و اقوامِ عالم کا دوسرا سمندر اور بحرِ ناپید اکنار چینی ترکستان اور منگولیا کا وہ علاقہ رہا ہے جو شمال مشرق میں واقع ہے اور سطحِ زمین کا بلند اور مرتفع حصہ ہے۔

اس مقام سے بھی ہزاروں سال کے عرصہ میں سینکڑوں قبائل اُٹھے اور دنیا کے مختلف گوشوں تک پہونچے اور وہاں جا کر بس گئے۔ یہیں سے انسانوں کی موجیں اٹھیں اور وسطِ ایشیا میں جا گریں۔ یہیں سے یورپ پہنچیں اور یہیں سے ہندوستان اور شمالِ مغرب تک پھیلتی چلی گئیں۔ ہندوستان میں بس جانے والوں نے اپنا تعارف آرین کے ساتھ کرایا۔ وسطِ ایشیا میں بسنے والوں نے "ایریانہ" کہلا کر اپنے علاقہ کا نام ایران مشہور کیا۔ یورپ میں ہن گاتھ ڈانڈیال وغیرہ ان ہی قبائل کے نام پڑے اور بحرِ اسود سے دریا ڈینوب تک بسنے والے سنتھین کہلائے اور یورپ اور ایشیا کے ایک بڑے حصہ پر چھا جانے والے رشین کے نام سے مشہور ہوئے۔

یہ قبائل جب اپنے مرکز سے چلے تھے تو صحرائی وحشی اور بدوی تھے لیکن اپنے مرکز سے ہٹ کر جب دوسرے مقامات پر پہنچے اور حضارت و تمدن سے آشنا ہوئے یا ضرورت نے آشنا کرایا

تو نئے نئے ناموں سے پکارے گئے۔ حتیٰ کہ اپنے مرکز کی ابتدائی حالت سے اس قدر بُعد ہو گیا کہ مرکز میں بسنے والے وحشی قبائل اور ان کے درمیان کوئی یکسانیت باقی نہ رہی بلکہ ایک ہی اصل کی دونوں شاخیں ایک دوسرے کی حریف بن گئیں اور شہری اقوام کے لیے ان کے ہم نسل وحشی قبائل مستقل خطرہ ثابت ہونے لگے جو آئے دن شہریوں پر تاخت و تاراج کرتے اور لوٹ مار کرکے پھر اپنے مرکز کی جانب واپس ہو جاتے تھے۔

بہر حال تاریخ کے اوراق اس کے شاہد ہیں کہ عہدِ تاریخی کے قبل سے پانچویں صدی مسیح تک اس علاقہ سے جو آج کل منگولیا تاتار کہلاتا ہے اسی قسم کے انسانی طوفان اُٹھتے رہے ہیں اور ان کے قریب اور ہمسایہ قوم "چینی" ان کے بڑے دو قبائل کو "موگ" اور "یوچی" کہتے رہے ہیں۔ پس یہی "موگ" ہے جو تقریباً چھ سو برس قبل مسیح یونان میں میگ اور میگاگ بنا اور عربی میں ماجوج ہوا اور غالباً یہی "یواچی" یونانی میں یوگاگ اور عبرانی اور عربی میں جوج اور یاجوج کہلایا لیکن جب یہ قبائل دنیا کے مختلف حصوں میں جا کر آباد ہوئے اور بہت سے قبائل پہلے کی طرح اپنے مرکز ہی میں وحشی اور صحرائی بنے رہے تو اس اختلافِ تمدن و معیشت نے ایسی صورت اختیار کر لی کہ ان قبائل کے وحشی اور صحرائی جنگجو تو اسی طرح یاجوج (گاگ GOG) اور ماجوج (میگاگ MAGOG) کے نام سے موسوم رہے مگر متمدن اور شہری قبائل نے مقامی خصوصیات و امتیازات کے ساتھ ساتھ اپنے ناموں کو بھی بھلا دیا اور نئے نئے ناموں سے شہرت پائی اور پھر یہ تقسیم اس طرح قائم ہو گئی کہ تاریخ کے عہد میں بھی اس کو باقی رکھا گیا اور وسطِ ایشیا کے ایرانی ایشیائی اور یورپین روسی اور دیگر یورپین قومیں اور ہندوستان کے آرین اصل کے اعتبار سے منگولین (یعنی موگ۔ ماجوج اور یواگ یاجوج) نسل ہونے کے باوجود تاریخ میں ان ناموں سے یاد نہیں کیے جاتے اور یاجوج و ماجوج کا نام صرف ان ہی قبائل کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہے جو اپنی گذشتہ حالتِ وحشت و بربریت اور غیر متمدن زندگی میں اپنے مرکز کے اندر موجود ہیں اور مختلف صدیوں میں قتل و غارت اور لوٹ مار کرنے کیلیے اپنی ہم نسل متمدن اقوام پر حملے کرتے رہے ہیں اور ان ہی کے وحشیانہ حملوں کی حفاظت کے لیے اور

مشرقی تاخت و تاراج سے بچنے کے لیے مختلف اقوام نے مختلف دیواریں اور سد قائم کیں اور ان ہی میں سے ایک وہ سد ہے جو ذوالقرنین نے ایک قوم کے کہنے پر دو پہاڑوں کے درمیان لوہے اور تانبے سے ملا کر تیار کی تاکہ وہ یاجوج اور ماجوج کے مشرقی حملوں سے محفوظ ہو جائے۔

یاجوج و ماجوج کا ذکر توراۃ میں بھی ہے چنانچہ حزقیل علیہ السلام کے صحیفہ میں یوں کہا گیا ہے:

اور خداوند کا کلام مجھ کو پہنچا اور اس نے کہا کہ اے آدم زاد تو جوج کے مقابل جو ماجوج کی سرزمین کا ہے اور روش اور مسک اور توبال کا سردار ہے اپنا منہ کر اور اس کے برخلاف نبوت کر اور کہہ کہ خداوند یہوداہ یوں کہتا ہے کہ دیکھ اے جوج روش اور مسک اور توبال کے سردار میں تیرا مخالف ہوں اور میں تجھے سزا دوں گا اور تیرے جبڑوں میں بنسیاں دیکر میں تیرا مخالف ہوں[۱] جوج روش اور مسک اور توبال کے سردار اور میں تجھے پلٹ دوں گا[۱]

اور میں یاجوج پر اور ان پر جو جزیروں میں بے پروائی سے سکونت کرتے ہیں ایک آگ بھیجوں گا[۲]

اور اس دن یوں ہوگا کہ میں وہاں اسرائیل میں جوج کو ایک گورستان دوں گا یعنی رہ گذروں کی وادی جو سمندر کے پورب ہے اور اس کے رہ گذروں کی راہ بند ہوگی اور وہ وہاں جوج کو اور اس کی جماعت کو گاڑ دیں گے اور اسے ہامون جوج کی وادی نام رکھیں گے[۳]

ان حوالوں میں جوج ماجوج روش مسک اور توبال کا ذکر ہے اور ان کو خدا کا مخالف بتایا گیا ہے اور مظلوموں کو یہ بشارت دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو پھرا دے گا اور ان کے جبڑوں میں بنسیاں ڈالیگا تاکہ وہ پلٹ جائیں اور یہ کہ قیامت کے قریب ان وحشی اور ظالم قبائل کو تباہ و برباد کر دیا جائے گا اور ان کی موت سے عرصہ تک رہ گذروں کے لیے راہیں بند ہو جائیں گی۔

ان ناموں کی تفصیل میں توراۃ کے مفسرین یہ کہتے ہیں کہ جوج سے مراد گاگ (GOG) ہے اور ماجوج سے میگاگ (MAGOG) اور روش سے روس (RUOSIA) اور مسک سے مراد ماسکو

---

ماروں گا الخ[۱] [۱] حزقیل باب ۳۸ آیت ۱-۳

[۱] حزقیل باب ۳۹ آیت ۱ [۲] ایضاً باب ۳۹ آیت ۶ [۳] ایضاً باب ۳۹ آیت ۱۱۔

(MOSCOW) اور توبال سے بحرِ اسود کا بالائی علاقہ مراد ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ توراۃ کی شہادت بھی اس سے اتفاق کرتی ہے کہ لفظ یاجوج اور ماجوج ان ہی قبائل کے لیے مخصوص ہوگیا تھا جو منگولیا اور کاکیشیا سے لے کر دور تک مشرق میں پھیلتے چلے گئے تھے اور یہ کہ حزقیل علیہ السلام کے زمانہ تک روس (RUSSIA) کا علاقہ تہذیب وتمدن اور حضارت سے عاری اور وحشی قبائل کا موطن اور مسکن تھا اور قتل وغارت گری کا پیشہ کرتا تھا اور ظلم وستم ان کا روزمرہ کا مشغلہ تھا لہٰذا حضرت حزقیل علیہ السلام کی پیشین گوئیوں میں یہ بشارت دی گئی۔ وہ وقت قریب ہے جب کہ ان قبائل کی تاخت و تاراج کا یہ سلسلہ ایک عرصہ تک کے لیے بند ہوجائے گا۔ اس پیشین گوئی میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ جوج شمال کی جانب سے آئے گا تاکہ لوٹ مار کرے اور یہ کہ ماجوج پر اور جزیروں میں بسنے والوں پر سخت تباہی آئے گی اور یہ کہ اسرائیلی بھی ماجوج کے مقابلہ میں حصہ لیں گے۔

اب اگر تاریخ کا مطالعہ کیجیے تو آپ پر یہ بخوبی واضح ہوجائے گا کہ تقریباً ایک ہزار قبل مسیح سے بحرِ خزر اور بحرِ اسود کا علاقہ وحشی اور خونخوار قبائل کا مرکز بنا ہوا ہے جو مختلف ناموں کے ساتھ موسوم ہوتے رہے ہیں بالآخر ان میں سے ایک زبردست قبیلہ نمودار ہوتا ہے جو تاریخ میں سیتھین کے نام سے مشہور ہے۔ یہ وسطِ ایشیا سے بحرِ اسود کے شمالی کناروں تک پھیلا ہوا ہے اور اطراف میں مسلسل حملے کرتا رہتا اور متمدن اقوام پر تباہی لاتا رہتا ہے۔ یہ زمانہ بابل و نینویٰ کے عروج اور آشوریوں کے تمدن کے آغاز کا زمانہ تھا پھر تقریباً ساڑھے چھ سو قبل مسیح میں ان کے ایک بڑے زبردست گروہ نے اپنی بلندیوں سے اتر کر ایران کا تمام مغربی حصہ تہ وبالا کر ڈالا۔

اب ۵۲۹ قبل مسیح میں، سائرس (کیخسرو) کا ظہور ہوتا ہے اور یہی وہ زمانہ ہے جب کہ اس کے ہاتھوں بابل کی تباہی، بنی اسرائیل کی آزادی اور میڈیا و فارس کی دو سلطنتوں کی ایک جا طاقت کا نظارہ سامنے آتا ہے اور ٹھیک حزقیل علیہ السلام کی پیشین گوئی کے خصوصی امتیازات اس کے ہاتھوں ظہور پذیر ہوتے ہیں اور سیتھینین قبائل کے مغربی حملوں سے حفاظت کے لیے اس کے ہاتھوں وہ سد قائم ہوتی ہے جس کا ذکر بار بار آرہا ہے۔

بہرحال ان تمام تاریخی مصادر سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ چکی ہے کہ حزقیل علیہ السلام کی پیشین گوئی کے مطابق وہ یاجوج وماجوج جن کی حفاظت کے لیے سائرس (ذوالقرنین) نے سد تیار کی یہی سقیتین قبائل تھے جو ابھی تک اپنی وحشیانہ خصائص وخصائل کے اسی طرح حامل تھے جس طرح ان کے پیشرو اپنے مرکز میں رہتے ہوئے ان امتیازات کے ساتھ یاجوج وماجوج کہلاتے رہے تھے اور یہ دراصل ایک مزید ثبوت ہے اس دعویٰ کے لیے کہ ذوالقرنین سائرس (کیخسرو) ہی تھے۔

یاجوج وماجوج کے متعلق جس قدر بحث اس وقت تک کی جا چکی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ کوئی عجیب الخلقت مخلوق نہیں ہیں بلکہ دنیاء انسانی کی عام آبادی کی طرح وہ بھی حضرت نوح (علیہ السلام) کی ذریت میں سے ہیں اور یہ کہ یاجوج وماجوج منگولیا (تاتار) کے ان وحشی قبائل کو کہا جاتا رہا ہے جو یورپ اور روس کی اقوام کے منبع ومنشا ہیں اور چونکہ ان کی ہمسایہ قوم ان قبائل میں سے دو بڑے قبیلوں کو موگ اور یوچی کہتی تھی اس لیے یونانیوں نے ان کی تقلید میں ان کو میگ یا میگاگ اور یوگاگ کہا اور عبرانی اور عربی میں تصرف کرکے ان کو یاجوج وماجوج سے یاد کیا گیا۔

اب ان تاریخی حقائق کی تائید میں عرب مؤرخین اور محقق مفسرین ومحدثین کی تحقیق بھی قابلِ مطالعہ ہے تاکہ گذشتہ سطور میں جو کچھ لکھا گیا اس کی تصویب ہو سکے۔

حافظ عماد الدین ابن کثیر اپنی تاریخ میں تصریح فرماتے ہیں:-

| | |
|---|---|
| ویافث ابو الترك فیاجوج وماجوج | اور یافث تاتاریوں کا نسلی باپ ہے پس یاجوج ماجوج تاتاریوں |
| طائفة من الترك وهم مغول المغول | ہی کی ایک شاخ ہیں اور یہ منگولیا کے قبائل کے منگول ہیں |
| وهم اشد بأسا واكثر فسادا من | اور دوسرے تاتاریوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ طاقتور |
| هؤلاء۔ (البدایہ والنہایہ ج۲ ص۱۰) | اور بہت زیادہ فسادی اور لوٹ مار مچانے والے ہیں۔ |

اور اپنی تفسیر میں بھی اسی کی تائید فرماتے ہوئے یہ ثابت کرتے ہیں کہ یہ قبائل یافث بن نوح

کی نسل سے ہیں اور ان کا مولد و وطن منگولیا کا وہی علاقہ ہے جہاں سے قوموں کے طوفان اٹھے اور اٹھ کر یورپ وغیرہ میں جاکر بسے ہیں۔

اور ابن اثیر نے کامل میں یہ تحریر فرمایا ہے:۔

| | |
|---|---|
| وقد اختلف الاقوال فیهم والصحیح | یاجوج ماجوج کے متعلق مختلف اقوال ہیں اور صحیح قول یہ |
| انهم نوع من الترك لهم شوكته | ہے کہ وہ تاتاریوں ہی میں سے ایک قسم کے تاتاری ہیں۔ |
| وفیهم شر وهم كثیرون وكانوا | وہ بہت طاقتور ہیں اور ان میں شر و فساد کا مادہ بہت ہے |
| یفسدون فیما یجاورهم من الارض | اور وہ بہت بڑی تعداد رکھتے ہیں اور قرب و جوار کی زمین |
| ویخربون ما قدروا علیه من البلاد | میں فساد پھیلاتے اور جس بستی پر قابو پاجاتے اس کو برباد |
| یؤذون من یقرب منهم (ج ۱ ص ۶۸) | کر ڈالتے تھے اور پڑوسیوں کو ایذا پہنچاتے رہتے تھے۔ |

اور سید محمود آلوسی روح المعانی میں لکھتے ہیں:۔

| | |
|---|---|
| ان یاجوج وماجوج قبیلتان من | یاجوج ماجوج یافث بن نوح علیہ السلام کی اولاد میں سے |
| ولد یافث بن نوح علیه السلام | دو قبیلے ہیں اور وہب بن منبہ اسی پر یقین |
| وبه جزم وهب بن منبه وغیره | رکھتے ہیں اور متاخرین میں سے اکثر کی یہی رائے |
| واعتمده كثیر من المتاخرین (ج ۱۶ ص[1]) | ہے۔ |

اور آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں:۔

| | |
|---|---|
| وفی كلام بعضهم ان الترك منهم | اور بعض کہتے ہیں کہ ترک (تاتاری) ان ہی میں سے |
| لما اخرجه ابن جریر وابن مردویه | ہیں جیسا کہ ابن جریر اور ابن مردویہ نے سدی سے |
| من طریق السدی من اثر قوی | ایک قوی اثر نقل کیا ہے کہ ترک (تاتاری) یاجوج و |
| الترك سریة من سرایا یاجوج وماجوج[2] | ماجوج کی شاخوں میں سے ایک شاخ ہیں۔ |
| وفی روایة عن عبدالرزاق عن قتادة ان | اور عبدالرزاق نے حضرت قتادہ سے روایت |
| یاجوج وماجوج ثنتان وعشرون قبیلة[2] | کی ہے کہ یاجوج اور ماجوج بائیس قبائل کا مجموعہ ہیں۔ |

[1] ج ۱۶ ص ۲۱ ۔ [2] ج ۱۳ ص ۹۰۔

اس کے علاوہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں یاجوج و ماجوج سے متعلق جو کچھ نقل فرمایا ہے وہ بھی نقولِ بالا کی ہی تائید کرتا ہے[1] اور علامہ طنطاوی اپنی تفسیر جواہر القرآن میں لکھتے ہیں :۔

"یاجوج و ماجوج اپنی اصل کے اعتبار سے یافث بن نوح کی اولاد میں سے ہیں اور یہ نام لفظ "اجیج النار" سے ماخوذ ہے جس کے معنی آگ کے شعلہ اور شرارہ کے ہیں گویا ان کی شدت اور کثرت کی طرف اشارہ ہے اور بعض اہلِ تحقیق نے ان کی اصل پر بحث کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ مغلوں (منگولیوں) اور تاتاریوں کا سلسلۂ نسب ایک شخص "ترک" نامی پر پہونچتا ہے اور یہی شخص ہے جس کو ابوالفداء ماجوج کہتا ہے۔ پس اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یاجوج و ماجوج سے مراد منگولین اور تاتاری قبائل ہی ہیں، ان قبائل کا سلسلہ ایشیاء کے شمالی کنارہ سے شروع ہو کر تبت اور چین سے ہوتا ہوا محیط منجمد شمالی تک چلا گیا ہے اور غربی جانب ترکستان کے علاقہ تک پھیلا ہوا ہے، فاکہۃ الخلفاء اور ابن مسکویہ کی تہذیب الاخلاق اور رسائل اخوان الصفاء ان سب نے یہی کہا ہے کہ یہی قبائل یاجوج و ماجوج کہلاتے ہیں[2]۔

اور ابنِ خلدون نے اپنی تاریخ کے مقدمہ میں یاجوج و ماجوج کے مستقر اور اس کی جغرافیائی حیثیت کو اس طرح واضح کیا ہے:

ساتویں اقلیم کے نویں حصہ میں مغرب کی جانب ترکوں کے وہ قبائل آباد ہیں جن کو قفجاق اور چرکس کہا جاتا ہے اور مشرق کی جانب یاجوج کی آبادیاں اور ان دونوں کے درمیان کوہِ قاف حدِ فاصل ہے جس کا ذکر گذشتہ سطور میں ہو چکا ہے کہ وہ بحرِ محیط سے شروع ہوتا ہے جو چوتھی اقلیم کے مشرق میں واقع ہے اور اس کے ساتھ ساتھ شمال کی جانب اقلیم کے آخر تک چلا گیا ہے اور پھر بحرِ محیط (ATLANTIC) سے جدا ہو کر شمال مغرب میں ہوتا ہوا یعنی مغرب کی جانب جھکتا ہوا پانچویں اقلیم کے نویں حصہ میں داخل ہو جاتا ہے۔ یہاں سے وہ پھر اپنی پہلی سمت کو مڑ جاتا ہے حتیٰ کہ ساتویں اقلیم کے نویں حصہ میں داخل ہو جاتا ہے اور یہاں پہونچ کر جنوب سے شمال مغرب کو ہوتا ہوا گیا ہے اور اسی سلسلۂ کوہ کے درمیان "سدِ سکندری" واقع ہے۔ اور ساتویں اقلیم کے نویں حصہ کے وسط ہی میں وہ "سدِ سکندری" ہے جس کا ابھی ہم ذکر کر آئے ہیں اور جس کی اطلاع قرآن نے بھی دی ہے۔

اور عبداللہ بن خرداذبہ نے اپنی جغرافیہ کی کتاب میں واثق باللہ (خلیفۂ عباسی) کا وہ خواب نقل کیا ہے جس میں اس نے یہ دیکھا تھا کہ "سد" کھل گئی ہے چنانچہ وہ گھبرا کر اٹھا اور دریافتِ حال کے لیے "سلام ترجمان" کو روانہ کیا اور اس نے واپس آکر اسی سد کے حالات و اوصاف بیان کیے۔

اور ساتویں اقلیم کے دسویں حصہ میں ماجوج کی بستیاں ہیں جو مسلسل آخر تک چلی گئی ہیں یہ حصہ بحرِ محیط کے ساحل پر واقع ہے جو اس کے مشرقی شمالی حصہ کو اس طرح گھیرے ہوئے ہے شمال میں تو طول میں چلا گیا ہے اور بعض مشرقی حصہ میں عرض میں گیا ہے[1]

ابن خلدون نے یاجوج و ماجوج اور سد کے متعلق اسی طرح اقلیم رابع، اقلیم خامس اور اقلیم سابع کی بحث میں بھی ضمناً بیان کیا ہے بلکہ اقلیم رابع میں یہ بھی تصریح ہے:-

| | |
|---|---|
| وعلی قطعۃ من البحر المحیط هنالك | اور اقلیم رابع کے جزو عاشر کا ایک حصہ بحرِ محیط کے اوپر |
| هو جبل یاجوج وماجوج وهٰذا الامم | واقع ہے اور یہ جبل یاجوج و ماجوج ہے اور یاجوج و ماجوج |
| کلها من شعوب الترك[2] | تمام قبائل ترک ہیں۔ |

گذشتہ بحث میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ منگولیا یا کاکیشیا کے یہ قبائل جب تک اپنے مرکز میں رہتے ہیں یاجوج و ماجوج کہلاتے ہیں اور جب وہاں سے نکل کر کہیں بس جاتے اور صدیوں بعد متمدن ہو جاتے ہیں تو پھر وہ اس نام کو بھلا دیتے ہیں اور دوسرے بھی ان کو اس وحشیانہ امتیاز سے یاد نہیں کرتے کیونکہ پھر یہ اپنے مرکز سے اس قدر اجنبی ہو جاتے ہیں کہ مرکز کے وحشی قبائل ان کو بھی اپنا حریف بنا لیتے اور ان پر غارت گری کرتے رہتے ہیں اور یہ بھی اپنے ہی ہم نسل مرکزی وحشی قبائل سے اسی طرح خوف کھانے لگتے ہیں جس طرح دوسرے قبائل، چنانچہ اس مسئلہ کی تائید حافظ عماد الدین ابن کثیر کی اس عبارت سے بھی ہوتی ہے تحریر فرماتے ہیں:-

| | |
|---|---|
| "حَتّٰٓی اِذَا بَلَغَ بَیْنَ السَّدَّیْنِ وهما | سدین سے مراد وہ دو پہاڑ ہیں جو ایک دوسرے کے مقابل |

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۹۷، بحث الاقلیم السادس۔ یہ واضح رہے کہ جبل قوقایا کوہ قاف اور جبال کاکیشیا ایک ہی چیز ہیں۔ (مؤلف)

[2] ایضاً ص ۱۷۔

جبلان متناوحان بینهما ثغرۃ ۔۔۔ ہیں اور ان کے درمیان ثنگاف ہے۔ اسی ثنگاف
یخرج منہا یاجوج وماجوج علی بلاد ۔۔۔ سے یاجوج و ماجوج ترکوں کے شہروں پر آپڑتے
الترک فیعیثون فیہا فساداً ۔۔۔ اور ان میں فساد مچا دیتے اور کھیتوں اور نسلوں کو ہلاک
ویھلکون الحرث والنسل[1] ۔۔۔ اور برباد کر ڈالتے تھے۔

یعنی یاجوج و ماجوج بھی اگرچہ منگولی (تاتاری) ہیں مگر پہاڑوں کے درے پر جو تاتاری قبائل اپنے مرکز سے ہٹ کر آباد ہو گئے تھے اور متمدن بن گئے تھے ہم نسل ہونے کے باوجود دونوں میں اس قدر تفاوت ہو گیا کہ ایک دوسرے سے ناآشنا بلکہ حریف بن گئے اور ایک ظالم کہلائے اور دوسرے مظلوم اور ان ہی قبائل نے ذوالقرنین سے سد بنانے کی فرمائش کی۔

اور بعض عرب مؤرخین نے تو "ترک" کی وجہ تسمیہ ہی یہ بیان کر دی کہ یہ وہ قبائل ہیں جو یاجوج و ماجوج کے ہم نسل ہونے کے باوجود سد سے ورے آباد تھے اور اس لئے جب ذوالقرنین نے سد قائم کی اور ان کو اس میں شامل نہیں کیا تو اس چھوڑ دیے جانے کی وجہ سے وہ "ترک" کہلائے۔[2]

یہ وجہ تسمیہ اگرچہ ایک لطیفہ ہے تاہم اس امر کا ثبوت ضرور بہم پہنچاتی ہے کہ متمدن قبائل تمدن وحضارت کے بعد اپنے ہم نسل مرکزی قبائل سے اجنبی ہو جاتے تھے اور وہ یاجوج و ماجوج نہیں کہلاتے تھے اور لفظ یاجوج و ماجوج صرف ان ہی قبائل کے لیے مخصوص ہو گئے ہیں جو اپنے مرکز میں سابق کی طرح ہنوز وحشت و بربریت اور درندگی کے ساتھ وابستہ ہیں۔

**سد** | یاجوج و ماجوج کے اس تعین کے بعد دوسرا مسئلہ "سد" کا سامنے آتا ہے یعنی وہ "سد" کس جگہ واقع ہے جو ذوالقرنین نے یاجوج و ماجوج کے فتنہ و فساد کو روکنے کے لیے بنائی اور جس کا ذکر قرآن عزیز میں بھی کیا گیا ہے۔

تعیین سد سے پہلے یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہیے کہ یاجوج و ماجوج کی تاخت و تاراج اور شر و فساد کا دائرہ اس قدر وسیع تھا کہ ایک طرف کاکیشیا کے نیچے بسنے والے ان کے ظلم و ستم سے نالاں تھے تو دوسری جانب تبت اور چین کے باشندے بھی ان کی شمالی دستبرد سے محفوظ نہ تھے

[1] تفسیر ج ۲ ص ۱۰۳ جدید ایڈیشن۔ [2] البدایہ والنہایہ ج ۲۔

اس لیے صرف ایک ہی غرض کے لیے یعنی قبائل یاجوج وماجوج کے شر وفساد اور لوٹ مار سے بچنے کے لیے مختلف تاریخی زمانوں میں متعدد "سد" تعمیر کی گئیں۔ ان میں سے ایک "سد" وہ ہے جو دیوارِ چین کے نام سے مشہور ہے، یہ دیوار تقریباً ایک ہزار میل طویل ہے، اس دیوار کو منگولی آتکوو وہ کہتے ہیں اور ترکی میں اس کا نام بوقورقہ ہے۔

دوسری سد وسطِ ایشیا میں بخارا اور ترمذ کے قریب واقع ہے اور اس کے محلِ وقوع کا نام دربند ہے، یہ سد مشہور مغل بادشاہ تیمور لنگ کے زمانہ میں موجود تھی اور شاہِ روم کے ندیم خاص سیلابر جرجرمنی نے بھی اس کا ذکر اپنی کتاب میں کیا ہے اور اندلس کے بادشاہ کسٹیل کے قاصد کلاویجو نے بھی اپنے سفرنامہ میں کیا ہے، یہ ۱۴۰۳ء میں اپنے بادشاہ کا سفیر ہو کر جب تیمور صاحبقراں کی خدمت میں حاضر ہوا ہے تو اس جگہ سے گذرا ہے، وہ لکھتا ہے کہ باب الحدید کی "سد" موصل کے اس راستے پر ہے جو سمرقند اور ہندوستان کے درمیان واقع ہے۔[۱]

تیسری "سد" روسی علاقہ داغستان میں واقع ہے، یہ بھی دربند اور باب الابواب کے نام سے مشہور ہے اور بعض مؤرخین اس کو "الباب" بھی لکھ دیتے ہیں، یاقوت حموی نے معجم البلدان میں، ادریسی نے جغرافیہ میں اور بستانی نے دائرۃ المعارف میں اس کے حالات کو بہت تفصیل کے ساتھ لکھا ہے اور ان سب کا خلاصہ یہ ہے:-

"داغستان میں دربند ایک روسی شہر ہے، یہ شہر بحرِ خزر (کاسپین) غربی کے کنارہ واقع ہے، اس کا عرض البلد ۳-۴۳ شمالاً اور طول البلد ۱۵-۴۸ شرقاً ہے اور اس کو دربند انوشیرواں بھی کہتے ہیں اور باب الابواب کے نام سے بہت مشہور ہے اور اس کے اطراف وجوانب کو قدیم زمانہ سے چہار دیوار گھیرے ہوئے ہیں جن کو قدیم مؤرخین ابواب البانیہ کہتے آئے ہیں اور اب یہ خستہ حالت میں ہے اور اس کو باب الحدید اس لیے کہتے ہیں کہ اس کی سد کی دیواروں میں لوہے کے بڑے بڑے پھاٹک لگے ہوئے تھے۔"[۲]

اور جب اسی باب الابواب سے مغرب کی جانب کاکیشیا کے اندرونی حصوں میں بڑھتے ہیں تو ایک

درہ ملتا ہے جو درۂ داریال کے نام سے مشہور ہے اور یہ کاکیشیا کے بہت بلند حصوں سے گزرا ہے،
یہاں ایک چوتھی سد ہے جو قفقاز یا جبلِ قوقا یا جبلِ قاف کی سد کہلاتی ہے اور یہ سد دو پہاڑوں
کے درمیان بنائی گئی ہے۔ بستانی اس کے متعلق لکھتا ہے:

اور اسی کے قریب ایک اور سد ہے جو غربی جانب بڑھتی چلی گئی ہے غالباً اس کو اہلِ فارس
نے شمالی بربروں سے حفاظت کی خاطر بنایا ہوگا کیونکہ اس کے بانی کا صحیح حال نہیں معلوم ہو سکا۔
بعض نے اس کی نسبت سکندر کی جانب کردی اور بعض نے کسریٰ نوشیرواں کی جانب اور
یاقوت کہتا ہے کہ یہ تانبا پگھلا کر اس سے تیار کی گئی ہے[1]

اور انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں بھی دربند کے مقالہ میں اس آہنی دیوار کا حال قریب قریب
اسی کے بیان کیا گیا ہے۔[2]

چونکہ یہ سب دیواریں شمال ہی میں بنائی گئی ہیں اور ایک ہی ضرورت کے لیے بنائی گئی ہیں،
اس لیے ذوالقرنین کی بنائی ہوئی سد کے تعین میں سخت اشکال پیدا ہو گیا ہے اور اسی لیے ہم
مؤرخین میں اس مقام پر سخت اختلاف پاتے ہیں اور اس اختلاف نے ایک دلچسپ صورت اختیار
کرلی ہے اس لیے کہ دربند کے نام سے دو مقامات کا ذکر آتا ہے اور دونوں مقامات میں سد یا دیوار
بھی موجود ہے اور غرضِ بنا بھی ایک ہی نظر آتی ہے۔

تو اب دیوارِ چین کو چھوڑ کر باقی تین دیواروں کے متعلق قابلِ بحث یہ بات ہے کہ ذوالقرنین
کی سد ان تینوں میں سے کون سی ہے اور اس سلسلہ میں جس دربند کا ذکر آتا ہے وہ کون سا ہے۔

مؤرخینِ عرب میں سے مسعودی، قزوینی، اصطخری، حموی سب اسی دربند کا ذکر کر رہے ہیں جو بحرِ
خزر پر واقع ہے، وہ کہتے ہیں کہ اس شہر میں داخل ہونے سے پہلے بھی دیوار ملتی ہے اور شہر کے بعد
بھی دیوار ہے اگرچہ ایک دیوار چھوٹی ہے اور دوسری بڑی، مگر شہر سد یا دیواروں سے گھرا ہوا ہے
اور ایران کے لیے یہ مقام خاص اہمیت رکھتا ہے اور دیوار سے پرے بسنے والے قبائل کی زد سے
بچاتا ہے، البتہ ابو الفضل اور بعض اس سے ناقل مؤرخین کو یہ غلطی ہوگئی کہ انھوں نے بخارا اور ترمذ

کے قریب دربند کو اور بحرِ خزر کے قریب دربند کو ایک سمجھ کر ایک کے حالات کو دوسرے کے ساتھ خلط کر دیا ہے۔

مگر ادریسی نے دونوں کی جغرافیائی حالت کو مفصل اور جدا جدا بیان کر کے اس خلط کو دور کیا اور اصل حقیقت کو بخوبی واضح کر دیا ہے۔

اس کے باوجود حال کے بعض اہلِ قلم کو اس غلطی پر اصرار ہے کہ سدِ ذوالقرنین یا سدِ سکندری کے سلسلہ میں جس سد کا ذکر آتا ہے اس سے بحرِ خزر یا بحرِ قزوین کا دربند مراد نہیں ہے بلکہ بخارا و ترمذ کے قریب جو دربند حصار کے علاقہ میں واقع ہے وہ مراد ہے۔[1]

بہرحال یہ مؤرخین بحرِ خزر اور کاکیشیا کے علاقہ دربند (باب الابواب) کی دیوار کے متعلق یہ واضح کرتے ہیں کہ قرآنِ عزیز میں جس سد کا ذکر ہے وہ یہی ہے مگر یہ بھی تصریح کرتے ہیں کہ کوئی اس کو سدِ سکندری کہتا ہے اور کوئی سدِ نوشیروانی غرض دربند کے متعلق جب بھی مؤرخین کو غلط ہو جاتا ہے تو کوئی نہ کوئی محقق اس کو دور کر کے یہ ضرور واضح کر دیتا ہے کہ سدِ ذوالقرنین کا تعلق اس دربند سے ہے جو کاکیشیا میں بحرِ خزر کے کنارہ واقع ہے، اس دربند سے نہیں ہے جو بخارا اور ترمذ کے قریب واقع ہے۔

چنانچہ وہب بن منبہ فرماتے ہیں:۔

قرآنِ عزیز میں جو "بین السدین" آیا ہے تو سدین سے مراد جبلین ہے یعنی دو پہاڑ کہ جن کے درمیان سد قائم کی گئی ہے، پہاڑ کی یہ دونوں چوٹیاں بہت بلند ہیں اور ان کے پیچھے بھی آبادیاں ہیں اور ان کے سامنے بھی اور یہ دونوں منگولین سرزمین کے اس آخری کنارہ پر واقع ہیں جو آرمینیہ اور آذربیجان کے متصل ہے۔[2]

اور علامہ ہروی فرماتے ہیں:۔

یہ دو پہاڑ کہ جن کے درمیان ذوالقرنین کی سد قائم ہے تاتاری قبائل کے ورے واقع ہیں۔ (یعنی سد اُن کو اس جانب آنے سے روکنے کے لیے بنائی گئی ہے) [3]

---

[1] صدق ۱۸ اگست ۱۹۳۸ء مضمون "سدِ سکندری" [2] و [3] تفسیر البحر المحیط ابوحیان اندلسی ج ۶ ص ۱۶۳۔

اور امام رازی تحریر فرماتے ہیں:۔

زیادہ صاف بات یہ ہے کہ ان دو پہاڑوں کا جاء وقوع جانب شمال میں ہے اور (تعیین میں) بعض نے کہا ہے کہ وہ دو پہاڑ آرمینہ اور آذربیجان کے درمیان واقع ہیں اور بعض نے کہا کہ تاتاری قبائل کی سرزمین کا جو آخری کنارہ ہے وہاں واقع ہیں۔

اور طبری نے اپنی تاریخ میں بیان کیا ہے کہ شاہِ آذربیجان نے جبکہ وہ اس کو فتح کر چکا تھا ایک شخص کو خزر (بحر فردین) کے اطراف سے بلایا کہ وہ صاحب آذربیجان کو بالمشافہ سد کے حالات سُنائے، اس نے بتایا کہ دو پہاڑوں کے درمیان ایک بلند سد ہے اور اس کے اس جانب بہت بڑی خندق ہے جو نہایت گہری ہے۔

اور ابن خرداذبہ نے کتاب المسالک والممالک میں بیان کیا ہے کہ واثق باللہ نے ایک خواب دیکھا تھا کہ گویا اس نے اس سد کو کھول ڈالا ہے اس خواب کی بناء پر اس نے اپنے بعض عمال کو اس کی تحقیق کے لیے بھیجا تاکہ وہ اس کا معائنہ کریں سو یہ لوگ باب الابواب سے آگے بڑھے اور ٹھیک سد کے مقام پر پہنچ گئے انھوں نے واثق باللہ سے آکر بیان کیا کہ یہ سد لوہے کے ٹکڑوں سے بنائی گئی ہے جس میں پگھلا ہوا تانبا شامل کیا گیا ہے اور اس کا آہنی دروازہ مقفل ہے پھر جب انسان وہاں سے واپس ہوتا ہے تو راہنما اس کو ایسے چٹیل میدانوں میں پہنچاتے ہیں جو سمرقند کے محاذات میں واقع ہیں۔[1]

اور ریحان بیرونی کہتے ہیں کہ اس تعارف کا مقتضا یہ ہوا کہ وہ زمین کے ربع شمال مغربی میں واقع ہے۔

اور سید محمود آلوسی روح المعانی میں لکھتے ہیں:۔

یہ دو پہاڑ ارض متعین جہتِ شمالی میں واقع ہیں اور کتاب حزقیل علیہ السلام میں حرج کے متعلق جو یہ لکھا ہے کہ وہ شمال کی جانب سے آخری دنوں میں آئیں گے اس سے بھی یہی مراد ہے اور کاتب چلپی کا میلان بھی اسی جانب ہے اور بعض کہتے ہیں کہ اس سے آرمینہ اور آذربیجان

[1] تفسیر کبیر ج ۵ ص ۵۱۳، طبری ص ۲۵۶۔

کے پہاڑ مراد ہیں اور قاضی بیضاوی کی رائے بھی یہی ہے اور بعض نے تو یہاں تک کہہ دیا۔ کہ حضرت عبداللہ بن عباس سے بھی یہی روایت ہے اگرچہ اس قول کا تعاقب کیا گیا ہے اور اس کی صحت میں کلام ہے' ان اقوال سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان حضرات کے نزدیک اس کا مصداق باب الابواب (دربند بحر قزوین) ہے حالانکہ ان ہی مؤرخین کے نزدیک اس کا بانی کسریٰ نوشیرواں ہے[1]

اور ابن ہشام ترک کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ان میں سے ایک جماعت مسلمان ہو گئی تھی اس لیے جب ذوالقرنین نے آرمینیہ میں (یعنی ان پہاڑوں میں جو آرمینیہ سے آگے دُور تک چلے گئے ہیں) سد بنانی شروع کی تو ان کو سد کے اس جانب چھوڑ دیا پس اس ترک کرنے پر وہ "ترک" کہلائے "ترکھم فسموا الترك لذالك"[2]

اور حضرتِ استاذ علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری (نور اللہ مرقدہٗ) عقیدۃ الاسلام میں تحریر فرماتے ہیں:-

"قرآن عزیز نے ذوالقرنین کے تیسرے سفر کی جہت کا ذکر نہیں کیا اور قرینہ یہ بتاتا ہے کہ وہ شمال کی جانب تھا اور اسی جانب اس کی سد ہے جو قفقاز کے پہاڑوں کے درمیان واقع ہے' اور جس غرض کے لیے ذوالقرنین نے سد بنائی تھی اسی غرض کے لیے اور بادشاہوں نے بھی سد تعمیر کی ہیں۔ مثلاً چینیوں نے دیوارِ چین بنائی جس کو منگولین انکورہ اور ترک بوقورقہ کہتے ہیں۔ صاحبِ ناسخ التواریخ نے اس کا مفصل ذکر کیا ہے اور اسی طرح بعض عجمی بادشاہوں نے دربند (باب الابواب) کی سد کی تعمیر کی اور اسی طرح اور سد بھی ہیں جو شمال ہی کی جانب ہیں"[3]

اور انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں کاکیشیا کے علاقہ یا بحر قزوین کے کنارہ واقع دربند (باب الابواب) کے متعلق جو مقالہ ہے اس میں تحریر ہے:-

یہاں جو دربند ہے یزدگرد اول نے دوبارہ صاف کرایا اور اس کی مرمت کرائی' اس دیوار کو سکندرِ اعظم کی جانب منسوب کیا جاتا ہے[4]

[1] خلاصہ روح المعانی ج ۔ ص ۳۵۔ [2] کتاب التیجان۔ [3] ملخص عقیدۃ الاسلام فی حیوۃ عیسیٰ علیہ السلام ص ۱۹۶۔ [4] ج ۱ ص ۹۴۳۔

اور دوسری جگہ بحرِ خزر کے متعلق تحریر ہے :۔

"رسالہ اخوان الصفا میں جو بحرِ یاجوج و ماجوج کا ذکر آیا ہے تو اس سے مراد بحرِ کاسپین یعنی بحرِ خزر ہے۔"[1]

پس عرب مؤرخین، محدثین، مفسرین اور محققینِ تاریخ کے ان حوالجات سے چند امور ثابت ہوتے ہیں :۔

(۱) کوئی ایک مؤرخ بھی یہ صراحت نہیں کرتا کہ دربند ضلع حصار کی سد "سدِ سکندری" ہے۔

(۲) ابو الفداء اور بعض مؤرخین کو دربند کے متعلق یہ خلط ہو گیا ہے کہ وہ بحرِ قزوین والے دربند کا ذکر شروع کرتے ہیں اور پھر ترمذ و بخارا والے دربند (حصار) کے ساتھ اس کو ملا دیتے ہیں اور دونوں کے درمیان امتیاز کرنے سے قاصر رہے ہیں۔

(۳) باقی تمام محققین مؤرخین ہوں یا محدثین و مفسرین امتیاز کے ساتھ یہ تصریح کر رہے ہیں کہ جو سد "سدِ سکندری" کے نام سے مشہور ہے وہ وہی ہے جو بحرِ قزوین کے قریب دربند (باب الابواب) میں واقع ہے۔

چنانچہ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا اور انسائیکلو پیڈیا آف اسلام اور دائرۃ المعارف بستانی میں بھی (جو کہ جدید و قدیم تحقیق کا ذخیرہ ہیں) یہی ہے۔ حتیٰ کہ برٹانیکا جلد ۱۳ ص ۵۲۶ طبع یازدہم میں جو دربند ضلع حصار کا مختصر حال بیان کیا ہے اس میں بھی اس سد کو سدِ سکندری نہیں بتایا بلکہ اس کے برعکس بحرِ قزوین والے دربند کی سد کے متعلق یہ کہا ہے کہ اس کی نسبت سکندر کی جانب کی جاتی ہے اور اس لیے سدِ سکندری کے نام سے مشہور ہے۔

(۴) وہب بن منبہ ابو حیان اندلسی صاحبِ ناسخ التواریخ (جو ایران کا درباری مؤرخ ہے) بستانی اور حضرت علامہ سید محمد انور شاہ نے دربند بحرِ قزوین کے متعلق یہ توجہ دلائی ہے کہ سدِ ذوالقرنین اس دربند بحرِ قزوین میں نہیں ہے بلکہ اس سے بھی اوپر قفقاز کے آخری کنارہ پر پہاڑوں کے درمیان واقع ہے چنانچہ مولانا ابو الکلام نے اپنی تفسیر میں اس کا "درہ داریال" کے نام سے ذکر کیا ہے۔

اب ان چاروں باتوں سے تھوڑی دیر کے لیے قطع نظر کر لیجیے اور اس مسئلہ میں بھی سابق کی طرح

[1] ص ۱۱۴۲ بحث یاجوج

قرآن عزیز ہی کو حَکَم بنائیے تاکہ معاملہ واضح سے واضح تر ہو جائے۔

سدِ ذوالقرنین کے متعلق قرآن عزیز نے دو باتیں صاف صاف بیان کی ہیں ایک یہ کہ وہ سد دو پہاڑوں کے درمیان تعمیر کی گئی ہے اور اس نے پہاڑوں کے درمیان اس "درہ" کو بند کر دیا ہے، جہاں سے ہو کر یاجوج و ماجوج اس جانب کے بسنے والوں کو تنگ کرتے تھے حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ (ای بین الجبلین) وَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمَا قَوْمًا ۙ لَّا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ قَوْلًا قَالُوْا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِنَّ يَاْجُوْجَ وَمَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ "یہاں تک کہ جب ذوالقرنین دو پہاڑوں کے درمیان پہنچا تو ان دونوں کے اس طرف ایک ایسی قوم کو پایا جن کی بات وہ پوری طرح نہیں سمجھتا تھا، وہ کہنے لگے اے ذوالقرنین بلاشبہ یاجوج و ماجوج اس سرزمین میں فساد مچاتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ وہ سد چونے یا اینٹ گارے سے نہیں بنائی گئی ہے بلکہ لوہے کے ٹکڑوں سے تیار کی گئی ہے جس میں تانبا پگھلا ہوا شامل کیا گیا تھا۔ اَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْمًا اٰتُوْنِيْ زُبَرَ الْحَدِيْدِ ۭ حَتّٰۤى اِذَا سَاوٰى بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ قَالَ انْفُخُوْا ۭ حَتّٰۤى اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا ۙ قَالَ اٰتُوْنِيْٓ اُفْرِغْ عَلَيْهِ قِطْرًا "میں تمہارے اور ان کے (یاجوج و ماجوج کے) درمیان ایک موٹی دیوار قائم کر دوں گا تم میرے پاس لوہے کے ٹکڑے لا کر دو یہاں تک کہ پہاڑ کی دونوں چانکوں (چوٹیوں) کے درمیان جب دیوار کو برابر کر دیا تو اس نے کہا کہ دھونکو، یہاں تک کہ جب دھونک کر اس کو آگ کر دیا، کہا لاؤ میرے پاس پگھلا ہوا تانبہ کہ اس پر ڈالوں"[۲]

قرآن عزیز کی بتائی ہوئی ان دونوں صفات کو سامنے رکھ کر اب ہم کو یہ دیکھنا چاہیے کہ بغیر کسی

---

[۱] سدین کی تفسیر میں امام بخاری نے ترجمۃ الباب میں روایت کا ایک ٹکڑا نقل کیا ہے اس میں ہے "ایک شخص نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی یا رسول اللہ میں نے سد کو دیکھا ہی نہیں ہے جیسے یمنی چادر" مثل المحبر والمجر" آپ نے فرمایا تو نے ضرور اس کو دیکھا ہے۔ قال قد رأیتہ۔

یہ روایت بھی اس پر دلالت کرتی ہے کہ اس شخص نے لوہے تانبے سے مخلوط بنی ہوئی دیوار کو دیکھا کیونکہ حبرہ کے معنی اس ندی کے آتے ہیں جو دانتوں پر جمی ہوئی نظر آتی ہے اور یمنی چادریں سیاہ اور زرد یا سیاہ اور سرخ مخلوط دھاری دار ہوتی تھیں اس روایت کے موصول ہونے نہ ہونے میں کلام ہے جو فتح الباری میں قابلِ مراجعت ہے۔ [۲] و [۳] الجواہر طنطاوی ج ۱ ص ۱۹۸۔

تاویل کے ان کا مصداق کون سی سد ہو سکتی ہے اور کس سد پر یہ صفات ٹھیک صادق آتی ہیں۔

سب سے پہلے ہم اس سد پر بحث کرنا چاہتے ہیں جو دربند (حصار) میں واقع ہے۔ اس سد کے حالات ساتویں صدی کے ایک چینی سیاح نے ہی نہیں بیان کیے بلکہ جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں، شاہ رُخ کے جرمنی مصاحب سیلد برجر اور ہسپانوی سفیر کلاویجو نے بھی پندرھویں صدی عیسوی کے اوائل میں اس کا مشاہدہ کیا ہے اور انھوں نے بھی یہ کہا ہے کہ یہاں آہنی پھاٹک لگے ہوئے ہیں، مگر مؤرخین یہ بھی تصریح کرتے ہیں کہ یہ سد (دیوار) پتھر اور اینٹ کی بنی ہوئی ہے اور آہنی دروازوں کے علاوہ دیوار کسی جگہ بھی لوہے اور تانبے سے بنی ہوئی نہیں ہے اور لوہے کے پھاٹکوں کی وجہ سے اسکو بھی اسی طرح درہ آہنی کہتے ہیں جس طرح دربند (بحرِ قزوین) کو درہ آہنی کہا جاتا ہے۔

نیز یہ دیوار جس طرح پہاڑوں کے درمیان میں چلی گئی ہے اسی طرح اس کا ایک حصہ سطح زمین پر بھی بنایا گیا ہے ایسا نہیں ہے کہ وہ صرف دو پہاڑوں کی پھانکوں (چوٹیوں) کے درمیان ہی میں قائم کی گئی ہو۔

پس اس دیوار کو سدِ ذوالقرنین کہنا قرآنی تصریحات کے قطعاً خلاف ہے اور غالباً اسی وجہ سے کسی ایک مؤرخ نے بھی (جو کہ دربند) حصار اور دربند (بحرِ قزوین) کے درمیان امتیاز کر سکے ہیں) اس دیوار (سد) کو سدِ ذوالقرنین یا سدِ سکندری نہیں کہا۔

مگر تعجب ہے محترم مدیر صاحب صدق سے کہ انھوں نے قرآنی تصریحات کو سامنے رکھے بغیر تمام مؤرخین کے خلاف یہ دعویٰ کر دیا کہ دربند (حصار) کی دیوار (سد) ہی "سدِ سکندری" یعنی سدِ ذوالقرنین ہے۔ شاید وہ اس جدت کے لیے اس لیے مجبور ہوئے ہیں کہ ایک تو اُن کا مسلک یہ ہے کہ سکندر مقدونی ہی ذوالقرنین ہے اور دوسرے اس جانب میں سکندر کی فتوحات کی آخری حد اسی علاقہ تک ہے جیسا کہ ۱۸ اگست ۱۹۴۱ء کے صدق کی اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے:۔

"سکندرِ اعظم اپنی تیسری فوج کشی میں اسی علاقہ تک گیا تھا"

ظاہر ہے کہ ان دو باتوں کی صراحت کے بعد وہ مجبور ہیں کہ دربند (حصار) کی سد ہی سدِ ذوالقرنین

تسلیم کریں۔ مگر اس سے زیادہ یہ ظاہر ہے کہ اس سد پر نہ قرآنِ عزیز کی بیان کردہ صفات ہی کا اطلاق ہوتا ہے اور نہ کوئی مؤرخ ہی اس کو سد سکندری یا سدِ ذوالقرنین کہتا ہے اور بالفرض اگر اس کو سکندر کی تعمیر تسلیم بھی کر لیا جائے تو بھی وہ سدِ ذوالقرنین کسی طرح نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ قرآنی صفات کے مطابق نہیں ہے۔

اس کے بعد دوسرا نمبر دربند (بحرِ قزوین) کی دیوار (سد) کو زیر بحث لانے کا ہے اس کے متعلق یہ تو معلوم ہو چکا کہ اس کو عرب باب الابواب اور الباب کہتے ہیں اور اہل فارس دربند اور درہ آہنی نام رکھتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ بڑی کثرت سے مؤرخین اس دربند کی دیوار (سد) کو "سد سکندری" کہتے چلے آئے ہیں مگر محققین یہ بھی کہتے چلے آئے ہیں کہ بانی کا صحیح حال معلوم نہیں ہے البتہ اس کو سدِ سکندری بھی کہہ دیتے ہیں اور کاکیشین وال (کاکیشیا کی دیوار) اور دیوارِ نوشیرواں بھی۔

لیکن ہم اس بحث کو مؤخر کرتے ہوئے کہ اس کے متعلق یہ اضطراب بیانی کیوں ہے اس سد کو سدِ ذوالقرنین جب ہی مان سکتے ہیں کہ یہ قرآنِ عزیز کے بیان کردہ ہر دو صفات کے مطابق پوری اترے مگر افسوس کہ ایسا نہیں ہے اس لیے کہ اس دیوار کے عرض و طول اور اس کے حجم کی تفصیلات دیتے ہوئے تمام مؤرخین یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اس دیوار کا بھی بہت بڑا حصہ سطح زمین پر تعمیر کیا گیا ہے اور آگے بڑھ کر پہاڑ پر بھی بنایا گیا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی مانتے ہیں کہ اگرچہ یہ دیوار بعض جگہ دوہری بھی ہے اور اس میں متعدد لوہے کے پھاٹک بھی ہیں جن میں سے بعض بعض پہاڑوں کے درمیان قائم ہیں اور پہاڑوں پر اس کے استحکامات بھی بہت ہیں۔ تاہم یہ دیوار لوہے کے ٹکڑوں اور تانبے سے نہیں بنائی گئی بلکہ عام دیواروں کی طرح پتھر اور چونہ ہی سے بنائی گئی ہے پس اس کا بانی کوئی شخص بھی ہو اس دیوار کو سدِ ذوالقرنین کہنا کسی طرح صحیح نہیں ہے اب اس کو "سدِ سکندری" کہنا سو ہمیں اس سے انکار کی کوئی ضرورت نہ ہوتی اگر تاریخی حقائق اس دعوے کا ساتھ دیتے مگر حیرت اور تعجب کی بات یہ ہے کہ یہی مؤرخین جب سکندر مقدونی کا ذکر کرتے اور اس کی وسعتِ فتوحات کو زیر بحث لاتے ہیں تو ان میں سے کوئی ایک بھی یہ نہیں کہتا کہ سکندرِ اعظم کاکیشیا تک پہنچا ہے اور بقول مولانا ابو الکلام:

لیکن جب سکندر کے تمام فوجی اعمال خود اس کے عہد میں اور خود اس کے ساتھیوں نے قلمبند کر دیے ہیں اور اُن میں کہیں بھی کاکیشیا کے استحکامات کی تعمیر کا اشارہ نہیں ملتا تو پھر کیوں کر ممکن ہے کہ اس طرح کی توجیہات قابلِ اطمینان تسلیم کر لی جائیں [1]

یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ سکندرِ اعظم کی جانب یہ انتساب صحیح ہے۔

امریکہ کے ایک مشہور جغرافیہ داں کریم (CRAM) نے اپنے جغرافیہ کریمس یونیورسل اٹلس (CRAMES UNIWERSAL AITLAS.) میں سکندرِ اعظم کی سلطنت ۳۳۱-۳۸۱ھ قیام کا جو مکمل نقشہ تیار کیا ہے اس میں بھی کاکیشیا کا علاقہ اس کی فتوحات سے سیکڑوں میل دور نظر آتا ہے۔

بہر حال اکثر مؤرخین تو اس کا بانی نوشیرواں کو بتاتے ہیں اور جوزیفس سکندر کو اس کا بانی قرار دیتا ہے مگر بیان کردہ تاریخی حقایق کے پیشِ نظر نہ تو نوشیرواں کی نسبت صحیح ہے اور نہ سکندرِ اعظم کی، اور اگر ان دونوں میں سے کسی کی نسبت کو بالفرض صحیح بھی مان لیا جائے تب بھی اس کو سدِ ذوالقرنین کہنا حقائقِ قرآنی سے آنکھیں بند کر لینا ہوگا، پس دربند (حصار ہو یا دربندِ بحرِ خزر) دونوں کی "سد" سدِ ذوالقرنین نہیں ہے۔

تیسری قابلِ ذکر وہ سد ہے جو دربند (قزوین) یا کاسپین داں کے مغرب جانب میں ایک درہ کو بند کرتی ہے، درہ بند سے مغرب کی جانب کاکیشیا کے اندرونی حصّوں میں آگے بڑھتے ہوئے ملتا ہے اور درۂ داریال کے نام سے مشہور ہے اور قفقاز اور تفلس کے درمیان واقع ہے، یہ درہ کاکیشیا کے بہت بلند حصّوں سے ہو کر گذرا ہے اور قدرتی طور پر پہاڑ کی دو بلند چوٹیوں سے گھرا ہوا ہے اس کو فارسی میں درۂ آہنی اور ترکی میں دامر کپو کہتے ہیں۔

اس درہ کے متعلق گذشتہ صفحات میں امام رازی کی تفسیر سے اس تشریح کے بعد یہ دو پہاڑ جن کے درمیان سد واقع ہے "قفقاز میں ہے" ہم ابن خرداد کی کتاب المسالک کا یہ حوالہ نقل کر چکے ہیں کہ واثق باللہ نے جب اپنے خواب کی تعبیر کے پیشِ نظر سدِ ذوالقرنین کی تحقیق کے لیے تحقیقاتی وفد (ریسرچ کمیشن) مقرر کیا اور اس نے باب الابواب (دربند) سے آگے چل کر جب اس کا

مشاہدہ کیا ہے تو یہ تصریح کی ہے کہ یہ دیوار تمام کی تمام لوہے اور پگھلے ہوئے تانبے سے بنائی گئی ہے' اصل الفاظ یہ ہیں: "ان الواثق باللہ رائی فی المنام کانہ فتح ھذا الردم فبعث بعض الخدم الیہ لیعاینوہ فخرجوا من باب الابواب حتی وصلوا الیہ وشاھدوہ فوصفوا انہ بناء من لبن من حدید مشدود بالنحاس المذاب وعلیہ باب مقفل"[1]

پس جب کہ آج کے مشاہدے سے بھی یہ ثابت ہے کہ داریال کا یہ درہ پہاڑوں کی دو چوٹیوں کے درمیان گھرا ہوا ہے اور تاریخی حقائق بھی اس کو تسلیم کرتے اور واضح کرتے ہیں نیز واثق باللہ کے

---

[1] دربند نامہ کاظم بک ص ۲۱ یہاں یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ بعض معاصر بزرگ زیرِ بحث سد کے متعلق یہ شک ظاہر کرتے ہیں کہ یاقوت نے واثق باللہ کے تحقیقاتی وفد کی تفصیلات دیتے ہوئے یہ بیان کیا ہے کہ اس سفر کی آمد و رفت میں چھ ماہ صرف ہوئے پس اگر ذوالقرنین کی سد درہ داریال کی سد ہوتی تو بغداد سے کاکیشین (کوہ قاف) کی راہ ایسی طویل نہیں ہے کہ یہ وفد اتنی مدت میں واپس آتا۔

مگر یہ "شک" صرف ایک قیاسی مغالطہ ہے اس لیے کہ اول تو یاقوت حموی نے اس واقعہ کی تفصیلات کو خود ہی اہمیت نہیں دی اور ایک داستان کی طرح اس کا ذکر کر دیا ہے جیسا کہ سلام ترجمان سے منقول اس داستان کو نقل کرنے کے بعد کہتا ہے:۔

| | |
|---|---|
| قد کتبت من خبر السد ماوجدتہ | میں نے سد کے حالات میں ان واقعات کو لکھ دیا ہے جن کو |
| فی الکتب ولست اقطع بصحۃ ما | میں نے کتابوں میں لکھا پایا اور میں نے یہ جو کچھ بھی نقل کیا ہے |
| اوردتہ لاختلاف الروایات فیہ | میں ہرگز اس پر یقین نہیں کرتا کیوں کہ اس سلسلہ میں مختلف |
| واللہ اعلم بصحتہ۔ | روایات ہیں جن کی صحت پر یقین نہیں کیا جا سکتا |

(معجم البلدان ج ۵)

دوسرے مدتِ سفر کی اس تصریح پر جب کچھ کہا جا سکتا تھا کہ اس کے ساتھ یہ تفصیلات بھی بیان کی جاتیں کہ ذرائع رسل و رسائل کیا تھے' درمیانی مقامات میں آمد و رفت کے موقعوں پر کس قدر قیام رہا اور مقام مطلوب میں مدت قیام کیا رہی؟ جب کہ عراق سے کاکیشس (جبل قوقایا) کی پہاڑیوں تک تقریباً آٹھ سو نو سو میل کی ایک طرفہ مسافت ہے علاوہ ازیں اس واقعہ کا ذکر ابن خلدون' ابن خرداذبہ' ابن کثیر (رحمہم اللہ) جیسے محقق مؤرخین و جغرافیہ داں بھی کرتے ہیں اور اس کے باوجود وہ یہ دعویٰ کرتے نظر آتے ہیں کہ واثق باللہ کا یہ وفد اسی زیرِ بحث سد تک گیا ہے اور واپس ہو کر اسی کے حالات اس نے خلیفہ کو سنائے ہیں۔

کیشن نے اپنا یہ مشاہدہ بیان کیا ہے کہ یہ دیوار لوہے اور پگھلے ہوئے تانبے سے تیار کی گئی ہے بلاشبہ یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ یہی دیوار وہ سدِ ذوالقرنین ہے جس کا ذکر قرآن عزیز نے سورۂ کہف میں کیا ہے کیونکہ قرآن عزیز کے بتائے ہوئے دونوں وصف صرف اسی دیوار پر منطبق ہوتے ہیں اسی لیے وہب، ابوحیان، ابن خرداد، علامہ انور شاہ اور مولانا آزاد جیسے محققین کی یہی رائے ہے کہ سدِ ذوالقرنین قفقاز کے اسی درہ کی سد کا نام ہے۔

ان تصریحات کے بعد اب ہم کو کہنے دیجیے کہ درۂ داریال کی یہ سد سائرس (گورش یا کیخسرو) کی تعمیر کردہ ہے اور جیسا کہ ہم یاجوج و ماجوج کی بحث میں بیان کر چکے ہیں، یہ ان وحشی قبائل کے لیے اس نے بنائی تھی جو کاکیشیا کے انتہائی علاقوں سے آکر اور اس درہ میں سے گذر کر قفقاز کے پہاڑوں کے اس طرف بسنے والوں پر لوٹ مار مچاتے تھے اور یہ وہی سیتھین قبائل تھے جو سائرس کے زمانہ میں حملہ آور ہو رہے تھے اور اس وقت کے یاجوج و ماجوج کا مصداق یہی قبائل تھے اور ان ہی کی روک تھام کی ضرورت سے سائرس نے ایک قوم کی شکایت پر یہ "سد" تیار کی اور ارمنی نوشتوں میں اس سد کا جو قدیم نام پھاک کورائی "(کور کا درہ) لکھا چلا آتا ہے، اس کور سے مراد غالباً گورش ہے جو سائرس ہی کا فارسی نام ہے۔

اور اس کے قریب دربند (بحر خزر) کی دیوار اس کے بعد اسی غرض سے کسی دوسرے بادشاہ نے بنوائی ہے اور انوشیرواں نے اپنے زمانہ میں اس کو دوبارہ صاف اور درست کرایا ہے جیسا کہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے حوالہ سے ہم ابھی نقل کر چکے ہیں۔

اور ان تینوں دیواروں (سد) میں سے سکندر کی بنائی ہوئی کوئی ایک سد بھی نہیں ہے اس لیے کہ سکندر کی فتوحات کی تاریخ جو کہ سامنے ہے اس سے کسی طرح یہ ثابت نہیں ہوتا کہ سکندر کو اس غرض کے لیے کسی سد قائم کرنے کی ضرورت پیش آئی ہو کیونکہ اس کی حکومت کے سارے دور میں یاجوج و ماجوج قبائل کا کوئی حملہ تاریخ میں موجود نہیں ہے اور نہ دربند (حصار) تک پہنچنے پر کسی قوم کا اس قسم کے وحشی قبائل سے دوچار ہونا اور سکندر سے اس کی شکایت کرنا تاریخی

حقائق میں کہیں نظر آتا ہے۔

البتہ یہ بات ضرور قابلِ غور ہے کہ آخر دربند (بحرِ قزوین یا بحرِ خزر) کی دیوار کے متعلق سدِ سکندری کیوں مشہور ہوا سو اس مسئلہ کے تمام حقائق کو پیشِ نظر رکھنے کے بعد بآسانی اس کا یہ حل سمجھ میں آجاتا ہے کہ چونکہ اس مسئلہ کا تعلق یہود کی مذہبی روایات سے بہت زیادہ وابستہ ہے اور اسی لیے یہود کے سوال پر قرآنِ عزیز نے بھی اس کا ذکر کیا ہے تو اس بدعت اور غلط انتساب کی ابتدا بھی وہیں سے ہوئی ہے اور سب سے پہلے جوزیفس نے اس کے متعلق یہ بلا دلیل بیان کیا کہ یہ سد سدِ سکندری ہے اور وہیں سے یہ روایت چل گئی اور مؤرخینِ اسلام میں سے محمد بن اسحاق نے بھی چونکہ سکندر یونانی کو ذوالقرنین بتایا اس لیے مسلمانوں نے بھی اس سد کو سدِ سکندری کہنا شروع کر دیا اور آخر کار اس انتساب نے شہرت حاصل کر لی۔

مذکورہ بالا سد کے متعلق اگرچہ اکثر عرب مؤرخین یہی کہتے جاتے ہیں کہ وہ انوشیرواں کی بنائی ہوئی ہے مگر محققین کی رائے یہ ہے کہ اس کے بانی کا صحیح علم حاصل نہیں ہو سکا البتہ تاریخی قیاسات سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاید اس کی مرمت اور درستی انوشیرواں نے اپنے زمانہ میں کرائی ہو اور اسی وجہ سے وہ انوشیرواں کی جانب منسوب کر دی گئی ہو۔ بہرحال یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اس سد کو سدِ سکندری کہنا ایک افواہی انتساب سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا نیز سکندر مقدونی جو انگریزی تاریخوں میں گریٹ الیگزنڈر کہا جاتا ہے کسی طرح "ذوالقرنین" نہیں ہو سکتا اور نہ "سدِ ذوالقرنین" سے اس کا کوئی تعلق ہے۔

**یاجوج و ماجوج کا خروج**

ذوالقرنین یاجوج و ماجوج اور سد کی بحث کے بعد سب سے زیادہ اہم مسئلہ یاجوج و ماجوج کے اس خروج کا ہے جس کا ذکر قرآنِ عزیز نے کیا ہے اور اس مسئلہ کی ا، ہت اس لیے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ اس مسئلہ کا تعلق علاماتِ قیامت سے ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ خروجِ یاجوج و ماجوج کا مسئلہ کہ جس کی خبر قرآنِ عزیز نے بطور پیشین گوئی کے دی ہے ایسا مسئلہ نہیں ہے کہ جس کو محض ظنی قیاسات سے حل کر لیا جائے اور جب کہ اس مسئلہ کا تعلق قرآنِ عزیز کے "اخبارِ مغیبات" سے ہے تو پھر اس کے متعلق فیصلہ کرنے کا حق بھی قرآنِ عزیز ہی کو پہنچتا ہے نہ کہ ظن و تخمین کو قرآنِ عزیز

نے اس واقعہ کو سورۂ کہف اور سورۂ انبیاء میں بیان کیا ہے اور اس مسئلہ سے متعلق جو کچھ بھی ہے وہ صرف اِن دو سورتوں میں مذکور ہے۔

سورۂ کہف میں یہ واقعہ اس طرح مذکور ہے :-

فَمَا اسْطَاعُوْٓا اَنْ يَّظْهَرُوْهُ وَمَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا ۔ قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّيْ ۚ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّيْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ ۚ وَكَانَ وَعْدُ رَبِّيْ حَقًّا ۔ (سورۂ کہف پ ع)

پس نہیں طاقت رکھتے وہ (یاجوج و ماجوج) اس سد پر چڑھنے کی اور نہ وہ اس میں سوراخ کرنے کی طاقت رکھتے ہیں (ذوالقرنین) نے کہا یہ میرے پروردگار کی رحمت ہے پھر جب میرے رب کا وعدہ آئے گا تو اس کو گرا کر ریزہ ریزہ کر دیگا اور میرے پروردگار کی فرمائی ہوئی بات سچ ہے۔

اور سورۂ انبیاء میں اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا گیا ہے :-

حَتّٰٓى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ ۔ وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَاِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ يٰوَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا بَلْ كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۔ (انبیاء پ ع)

یہاں تک کہ جب کھول دیے جائیں گے یاجوج اور ماجوج اور وہ زمین کی بلندیوں سے دوڑتے ہوئے اتر آئیں گے اور خدا کا سچا وعدہ قریب آجائے تو اس وقت اچانک ایسا ہوگا کہ جن لوگوں نے کفر کیا ہے ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی اور پکار اٹھیں گے، ہائے کم بختی ہماری کہ ہم بے خبر رہے۔

ان دونوں مقامات میں قرآن عزیز نے ایک تو یہ بتایا ہے کہ جس زمانہ میں ذوالقرنین نے یاجوج و ماجوج پر سد قائم کی تو اس کے استحکام کی یہ حالت تھی کہ یہ قومیں نہ اس کو پھاند کر اس جانب آسکتی تھیں اور نہ اس میں سوراخ پیدا کر کے اس کو عبور کر سکتی تھیں اور سد کی اس مضبوطی اور پائیداری کو دیکھ کر ذوالقرنین نے خدائے تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور یہ کہا کہ یہ سب کچھ خدا کی رحمت کا کرشمہ ہے کہ اس نے مجھ سے یہ نیک خدمت کرا دی۔

اور دوسری بات یہ بیان کی ہے کہ جب قیامت کا زمانہ قریب ہوگا تو یاجوج و ماجوج بے شمار

فوج در فوج نکل کر دنیا میں پھیل جائیں گے اور لوٹ مار اور تباہی و بربادی مچا دیں گے۔

ان دونوں باتوں سے عام طور پر مفسرین نے یہ سمجھا ہے کہ یاجوج و ماجوج "سدِ ذوالقرنین" میں اس طرح محصور ہو گئے ہیں کہ یہ "سد" قیامت تک اسی طرح صحیح و سالم کھڑی رہے گی اور جب یاجوج و ماجوج کے خروج کا وقت آئے گا اور وہ قیامت کے قریب اور علاماتِ قیامت میں سے ہو گا تو اس وقت یکبارگی "سد" گر کر ریزہ ریزہ ہو جائے گی اور اس لیے انھوں نے دونوں مقامات میں اسی کے مطابق آیات کی تفسیر کی ہے چنانچہ انھوں نے سورۂ انبیاء کی اس آیت کا: "حَتّٰۤی اِذَا فُتِحَتْ یَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ" کا یہ ترجمہ کر کے "یہاں تک کہ جب یاجوج و ماجوج سد توڑ کر کھول دیے جائیں گے" اس ارشادِ الٰہی کو ذوالقرنین کے اس مقولہ کے ساتھ جوڑ دیا جو کہف میں مذکور ہے "فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّیْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ" پھر میرے رب کا وعدہ آئے گا تو وہ اس کو ریزہ ریزہ کر دے گا۔

مگر آیات کے سیاق و سباق اور ان کے مفہوم پر غائر نظر ڈالنے سے یہ تفسیر آیاتِ قرآنی کا حق ادا نہیں کرتی۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ قرآن عزیز نے سورۂ کہف میں تو صرف اسی قدر ذکر کیا ہے کہ یاجوج و ماجوج پر جب ذوالقرنین نے سد تعمیر کر دی تو اس کے استحکام کا ذکر کرتے ہوئے یہ بھی کہہ دیا کہ جب میرے خدا کا وعدہ آجائے گا تو یہ سد ریزہ ریزہ ہو جائے گی اور خدا کا وعدہ برحق ہے اور اس کے خلاف ہونا محال و ممتنع ........

مگر اس جگہ یاجوج و ماجوج کے اس خروج کا کوئی ذکر نہیں ہے جو قیامت کے قریب وقوع میں آئے گا اور ہو تا بھی کیسے کیونکہ یہ تو ذوالقرنین کا اپنا مقولہ ہے جو سد کے مستحکم اور مضبوط ہونے کے سلسلہ میں کہا گیا ہے اور خروجِ یاجوج و ماجوج ان اخبارِ مغیبات میں سے ہے جو علاماتِ ساعت کے طور پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے بیان کیا گیا ہے اور نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے اقوامِ عالم کے لیے ایک تنبیہ ہے کہ خدا کی یہ زمین اپنے آخری لمحات میں ایک سخت اور ہولناک عالمگیر حادثہ سے دوچار ہونے والی ہے۔

اور سورۂ انبیاء میں صرف یہ مذکور ہے کہ قیامت کے قریب یاجوج وماجوج کا خروج ہوگا اور وہ بہت سرعت کے ساتھ بلندیوں سے پستی کی جانب فساد برپا کرنے کے لیے اُمنڈ پڑیں گے اور اس جگہ سد کا اور سد کے ریزہ ریزہ ہوکر اس سے یاجوج وماجوج کے نکلنے کا قطعاً کوئی تذکرہ نہیں ہے اور لفظ "فُتِحَتْ" سے ایسا سمجھنا محض قیاسی وتخمینی ہے جیسا کہ عن قریب واضح ہوگا۔

پس سورۂ کہف اور سورۂ انبیاء دونوں میں اس واقعہ سے متعلق آیات کا صاف اور سادہ مطلب یہ ہے کہ سورۂ کہف میں تو پہلے اس واقعہ کی تفصیلات سُنائی گئی ہیں جن کے متعلق یہود نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے براہِ راست خود یا مشرکینِ مکہ کے واسطہ سے سوال کیا تھا کہ ذوالقرنین کی شخصیت کے متعلق اگر کوئی علم رکھتے ہو تو اس کو ظاہر کرو۔ قرآن عزیز یعنی وحی الٰہی نے ان کو بتایا کہ ذوالقرنین ایک نیک اور صالح بادشاہ تھا اس نے تین مہمیں قابلِ ذکر سر کیں ایک مشرقِ اقصیٰ کی اور دوسری مغربِ اقصیٰ کی اور تیسری شمال کی جانب اور اس تیسری مہم میں اس کو ایک ایسی قوم سے سابقہ ہوا جس نے یاجوج وماجوج کی تباہ کاریوں کا شکوہ کرتے ہوئے اپنے اور ان کے درمیان سد قائم کر دینے کا مطالبہ کیا ذوالقرنین نے ان کے مطالبہ کو اس طرح پورا کیا کہ اس جانب وہ جس درہ سے نکل کر حملہ آور ہوا کرتے تھے اس کو لوہے کی تختیوں اور پگھلے ہوئے تانبے سے بند کر دیا اور دو پہاڑوں کے درمیان درہ پر ایک بہترین سد قائم کر دی اور ساتھ ہی شکرِ خدا بجالاتے ہوئے اس نے یہ بھی ظاہر کیا کہ یہ سد اس قدر مستحکم اور مضبوط ہے کہ اب یاجوج وماجوج نہ اس میں سوراخ کر سکیں گے اور نہ اس پر چڑھ کر ادھر آسکیں گے لیکن میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ یہ سد ہمیشہ کے لیے اسی طرح رہے گی بلکہ خدا کو جب تک منظور ہے یہ اسی طرح قائم ہے اور وہ چاہے گا کہ یہ روک باقی نہ رہے تو یہ ٹوٹ پھوٹ جائے گی اور خدا کا وعدہ یعنی ہر شے کی طرح سد کا بھی فنا ہوجانا پورا ہوکر رہے گا۔

یہود نے چونکہ صرف ذوالقرنین کے متعلق سوال کیا تھا اس لیے سورۂ کہف میں اسی کے متعلق تفصیل سے بتایا گیا اور یاجوج وماجوج کا محض ضمنی تذکرہ آگیا اور سورۂ انبیاء میں اللہ تعالیٰ مشرکین کا

رد کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جو بستیاں ہلاک کر دی گئیں اب ان کے باشندے دنیا میں زندہ نہیں واپس آئیں گے ہاں جب قیامت آجائے گی اور وہ جب آئے گی کہ اس سے پہلے یاجوج وماجوج کا فتنہ پیش آئے گا تب البتہ میدانِ حشر میں سب دوبارہ زندہ کر کے رب العٰلمین کے سامنے جواب دہ ہونے کے لیے جمع کیے جائیں گے۔

پھر چونکہ اس جگہ یاجوج وماجوج کے خروج کو قیامت کی علامت بیان کر کے اہمیت دی گئی ہے اس لیے اس کے نکلنے کو سد کے ٹوٹنے اور ریزہ ریزہ ہونے کے ساتھ متقید نہیں کیا بلکہ سرے سے سد کا ذکر ہی نہیں کیا بلکہ یہ کہا کہ جب ان کے خروجِ موعود کا وقت آجائے گا تو سرعت کے ساتھ بلندیوں سے پستی کی جانب امنڈ پڑیں گے اور تمام اقطاع و امصار میں پھیل جائیں گے۔

پس ان مجموعہ آیات سے دو باتیں معلوم ہوئیں: ایک یہ کہ "سدِ ذوالقرنین" یاجوج وماجوج کے خروج سے پہلے ضرور ٹوٹ پھوٹ چکی ہو گی دوسرے یہ کہ یاجوج وماجوج کے موعود خروج کا وہ وقت ہو گا کہ قیامت کا وقت بالکل قریب ہو جائے اور اس کے بعد "نفخ صور" ہی کا مرحلہ باقی رہ جائے۔ اس وقت یاجوج وماجوج کے تمام قبائل بے پناہ سیلاب کی طرح امنڈ پڑیں گے اور تمام کائنات میں فسادِ عظیم برپا کریں گے۔

بہرحال ذوالقرنین کے مقولہ اِذَا جَآءَ وَعۡدُ رَبِّیۡ جَعَلَہٗ دَکَّآءَ میں "وعد" سے یاجوج وماجوج کا خروجِ موعود مراد نہیں ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ ایک وقت ایسا ضرور آئے گا کہ بلاشبہ سد کا انداک ہو جائے گا اور وہ ٹوٹ پھوٹ جائے گی اور سورۂ انبیاء میں خدائے تعالیٰ کے ارشاد "فُتِحَتۡ یَاۡجُوۡجُ وَمَاۡجُوۡجُ" میں فتح سے یہ مراد نہیں ہے کہ وہ سد توڑ کر نکل آئیں گے بلکہ مراد یہ ہے کہ وہ اس کثرت سے فوج در فوج نکل پڑیں گے گویا کہیں بند تھے اور آج کھول دیے گئے ہیں۔

چنانچہ اہلِ عرب لفظ "فتح" کو جب جاندار اشیاء کے لیے استعمال کرتے ہیں تو اس سے یہ مراد ہوتی ہے کہ یہ کسی گوشہ میں الگ تھلگ پڑی ہوئی تھی اور اب اچانک نکل پڑی اس لیے جب کوئی شخص کہتا ہے "فتح الجراد" تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ٹڈیاں کسی جگہ بند تھیں اور اب انکو کھول دیا گیا

بلکہ یہ معنی مراد ہوتے ہیں کہ ٹڈی دل کسی پہاڑی گوشہ میں الگ پڑا تھا کہ اب اچانک فوج در فوج باہر نکل پڑا۔

پس یہاں بھی یہ بتایا گیا ہے کہ یاجوج وماجوج جیسے عظیم الشان قبائل جو عرصہ سے بایں کثرت و اژدہام دنیا کے ایک الگ گوشہ میں پڑے ہوئے تھے اس دن اس طرح امنڈ آئیں گے کہ گویا بند تھے اور اب اچانک کھول دیے گئے۔

سورۂ کہف اور سورۂ انبیاء کی زیر بحث آیات کی تفسیر راس المحدثین حضرت استاذ علامہ سید محمد انور شاہ نور اللہ مرقدہٗ نے بھی عقیدۃ الاسلام میں یہی فرمائی ہے اور بلاشبہ یہ تفسیر بغیر کسی تاویل کے صحیح اور درست ہے اور اس سلسلہ کے بہت سے خدشات کو دور کرنے کے لیے مفید۔

حضرت شاہ صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

وینبغی ان یعلم ان قول ذی
القرنین "ھٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّیْ
فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّیْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ
وَكَانَ وَعْدُ رَبِّیْ حَقًّا" قول من
جانبہ لا قرینۃ علی جعلہ منہ
من اشراط الساعۃ ولعلہ لا علم
لہ بذلک وانما اراد وعد انہ کالہ
...... فان قولہ تعالیٰ بعد ذلک
وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ یَوْمَئِذٍ یَّمُوْجُ
فِیْ بَعْضٍ للاستمرار التجددی نعم
قولہ تعالیٰ حَتّٰٓی اِذَا فُتِحَتْ یَاْجُوْجُ
وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ

اور یہ بات سمجھنے کے قابل ہے کہ ذوالقرنین کا یہ قول "ھٰذَا
رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّیْ الآیۃ" اس کا اپنا قول ہے اور کوئی قرینہ
سیاق وسباق میں ایسا موجود نہیں ہے جس سے سد کے
ریزہ ریزہ ہونے کے واقعہ کو علامات قیامت میں سے شمار
کیا جائے اور شاید ذوالقرنین کو یہ علم بھی نہ ہو کہ اشراط
ساعت میں سے خروج یاجوج وماجوج بھی ہے اور اس نے
"وعدُ ربی" سے صرف اس کا کسی وقت میں ٹوٹ پھوٹ جانا
مراد لیا ہو پس اس صورت میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد "ہم نے
کر چھوڑا ان کو اس دن سے اس حالت میں کہ بعض بعض پر
امنڈ رہے ہیں" استمرار تجددی پر دلالت کرتا ہے یعنی برابر
ایسا ہوتا رہے گا کہ ان میں سے بعض قبائل بعض پر حملہ آور
ہوتے رہیں گے حتیٰ کہ خروج موعود کا آجائے ہاں

| | |
|---|---|
| يَنْسِلُونَ " هو من اشراط الساعة لكن ليس فيه للردم ذكر فاعلم الفرق | اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد جو کہ سورۂ انبیاء میں ہے "حَتّٰی إِذَا فُتِحَتْ" تو البتہ یہ بلاشبہ علاماتِ قیامت میں سے ہے لیکن اس میں سد کا قطعاً کوئی ذکر نہیں ہے پس اس فرق کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے۔ (ص ۲۰۱) |

اور پھر اس کو تفصیل کے ساتھ بیان فرماتے ہوئے آخر میں ارشاد فرماتے ہیں :-

| | |
|---|---|
| واعلموا ان ما ذکرته ليس تاويلا فى القران بل زيادة شيئ من التاريخ والتجربة بدون اخراج لفظ من موضوعه (۲۰۳) | اور یہ یاد رہے کہ میں نے ان آیات کی تفسیر میں جو کچھ کہا، وہ قرآن میں تاویل نہیں ہے بلکہ قرآنِ عزیز کے کسی لفظ کو اس کے اپنے موضوع سے نکالے بغیر تاریخ اور تجربہ کے پیش نظر مزید اظہارِ حال ہے۔ |

عام مفسرین نے بیان کردہ تفسیر سے الگ سورۂ کہف اور انبیاء دونوں کی آیاتِ متعلقہ کے واقعات کو اشراطِ ساعت میں شمار کرتے ہوئے جو تفسیر فرمائی ہے غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے سامنے ترمذی اور مسندِ احمد کی ایک مرفوع حدیث ہے جو حضرتِ ابوہریرہؓ سے روایت ہے اور جس کا ترجمہ یہ ہے:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یاجوج وماجوج روزانہ ذوالقرنین کی سد کو کھودتے رہتے ہیں اور جب سورج نکلنے کا وقت قریب ہو جاتا ہے تو آپس میں کہتے ہیں کہ اب کام ختم کرو اب یہ اس قابل ہو گئی ہے کہ کل تم اس کو کھود کر گرا سکو گے، مگر جب وہ اگلے روز پھر اس کام پر واپس آتے ہیں تو سد کو اصلی حالت سے بھی زیادہ مضبوط اور مستحکم پاتے ہیں، یہ اسی طرح ہوتا رہتا ہے مگر جب ان کی معین مدت کا وقت پورا ہو جائے گا اور اللہ تعالیٰ کو یہ منظور ہوگا کہ اب وہ انسانی دنیا پر چھا جائیں تو اس روز بھی سابق کی طرح اس کو کھودیں گے اور جب سورج نکلنے کا وقت قریب ہوگا تو کام لینے والے کام کرنے والوں سے کہیں گے اب واپس جاؤ کل انشاء اللہ اس کو کھود کر برابر کر سکو گے، اور آج چونکہ انشاء اللہ کہہ دیا اس لیے جب واپس آئیں گے تو اپنی محنت کو درست پائیں گے اور اس وقت وہ باقی محنت کر کے سد کو گرا دیں گے اور لوگوں پر نکل پڑیں گے۔ اور تمام روئے زمین کا پانی پی جائیں گے اور لوگ ان کے خوف سے قلعوں اور پناہ گاہوں میں چھپ جائیں گے پھر وہ دنیا

کو مغلوب سمجھ کر آسمان پر تیر پھینکیں گے کہ خدا اور عالمِ بالا سے جنگ کر کے اس کو بھی مغلوب کریں، اللہ تعالیٰ ان کے تیروں کو خون آلود کر کے واپس کرے گا تو وہ سمجھیں گے کہ ہم عالمِ بالا پر بھی غالب آگئے، پھر اللہ تعالیٰ ان کی گردن میں گلٹیاں پیدا کر دے گا جس سے وہ خود بخود مر جائیں گے۔

(ترمذی سورۂ کہف)

مگر ترمذی نے اس حدیث کو بیان کر کے حدیث کی حیثیت پر یہ حکم لگایا ہے کہ :-

| | |
|---|---|
| ھذا حدیث حسن غریب انما نعرف من ھذا الوجہ مثل ھذا | یہ حدیث حسن غریب ہے اور ہم اسی طریقہ سند سے ایسی ہی اجنبی باتیں جانا کرتے ہیں۔ |

یعنی ان کے نزدیک یہ روایت اپنے اعتبار سے منکر اور اجنبی روایت ہے اور حافظ عماد الدین ابن کثیر اس روایت کو نقل کر کے اس پر یہ حکم لگاتے ہیں :

اس حدیث میں مضمون کے لحاظ سے نکارت (اجنبیا) ہے اور اس کو مرفوع کہنا یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرنا غلط ہے، اصل بات یہ ہے کہ ٹھیک اسی قسم کی ایک اسرائیلی کہانی کعب احبار سے منقول ہے اور اس میں بھی یہ سب باتیں اسی طرح مذکور ہیں، معلوم ایسا ہوتا ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے جو کہ اکثر کعب احبار سے اسرائیلی قصے سنا کرتے تھے اس کو ایک اسرائیلی کہانی کے طور پر بیان کیا ہوگا جس کو نیچے کے راوی نے یہ سمجھا کہ حضرت ابو ہریرہؓ کی یہ روایت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے درحقیقت یہ راوی کا وہم ہے اور کچھ نہیں ہے۔

اس حدیث کے متعلق میں نے یہ جو کچھ کہا ہے میرا اپنا خیال ہی نہیں ہے بلکہ امام حدیث احمد بن حنبل بھی یہی فرماتے ہیں۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۱۰۵)

ترمذی، ابن کثیر اور امام احمد کی ان تصریحات کے بعد اس روایت کی حیثیت ایک اسرائیلی قصہ سے زیادہ نہیں رہ جاتی، لہٰذا مفسرین کا محض اس روایت کی بناء پر سورۂ کہف کی زیرِ بحث آیات کی یہ تفسیر کرنا کہ سدِ ذوالقرنین ٹھیک اس وقت ریزہ ریزہ ہوگی جب کہ اشراطِ ساعت میں سے موعود خروجِ یاجوج و ماجوج پیش آئے گا صحیح نہیں ہے۔

اور اگر ان کی تفسیر کا یہ حصہ صحیح مان لیا جائے تو پھر بھی وہ مذکورہ بالا روایت کے تسلیم کر لینے کے بعد قرآنِ عزیز کی آیت کے تعارض سے سبکدوش نہیں ہو سکتے اس لیے کہ قرآنِ عزیز (کہف) میں سد کے متعلق ذوالقرنین کا یہ مقولہ نقل کیا گیا ہے " فَمَا اسْطَاعُوْٓا اَنْ یَّظْهَرُوْهُ وَمَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا " اور اس کا مطلب تمام مفسّرین نے بالاتفاق یہ بیان کیا ہے کہ یاجوج و ماجوج اس سد میں کسی قسم کے ردوبدل پر قادر نہیں ہیں چنانچہ امام احمد اور ابن کثیر اس کی شرح میں فرماتے ہیں :-

انهم لم یتمکنوا من نقبه ولا نقب شيئ منه ۔

بلا شبہ اب یعنی بناء سد کے وقت یاجوج و ماجوج اس میں سوراخ کرنے یا کسی حصہ کو بھی کھودنے پر قادر نہیں رہے ۔

تو اب مفسّرین اس روایت کے ان جملوں کے تعارض کو کس طرح دور فرمائیں گے جن میں یہ صراحت ہے کہ وہ اس کو کھود کر یا چاٹ کر گرنے کے قریب کر دیتے ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ صحیح حدیث کے تعارض کو کس طرح دور کر دیں گے جن کو امام بخاری نے بسندِ صحیح روایت کیا ہے :-

ایک مرتبہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خوابِ راحت سے بیدار ہوئے تو یہ حالت تھی کہ چہرۂ مبارک سُرخ تھا اور یہ ارشاد فرما رہے تھے : لا اله الا الله ویل للعرب من شر قد اقترب فتح الیوم من ردم یاجوج وماجوج مثل هذا وحلق ' قلت یارسول الله انهلك وفینا الصالحون قال نعم اذا کثر الخبث ۔

لا اله الا الله عرب کے لئے ہلاکت ہے اس شر سے جو قریب آرہا ہے آج یاجوج و ماجوج پر قائم شدہ سد اس طرح کھول دی گئی ہے اور انگوٹھے پر انگلی رکھ کر اور گول حلقہ بنا کر دکھایا۔ حضرتِ زینب بنت جحش فرماتی ہیں۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا ہم ایسی حالت میں ہلاک ہو جائیں گے جب کہ ہم میں صالحینِ امت بھی موجود ہوں گے ' ارشاد فرمایا بے شک ایسا ہو گا اگر امت میں خبائث کی کثرت ہو جائے گی "

(بخاری و مسلم عن الزہری باب الفتن)

اس روایت میں یہ تصریح ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ " سد میں حلقہ انگشت کی مقدار سوراخ ہو گیا ہے اور مفسّرین کی اس تفسیر کے مطابق قیامت کے موعود وقت سے قبل یہ ناممکن ہے ۔

پس اگر یہ کہا جائے کہ اس صحیح بلکہ اصح روایتِ حدیثی میں "فتح" سے مراد شر اور فتنوں کا شیوع ہو اور اس کو استعارہ کے طور پر "فتح ردم" کہہ دیا گیا تو سورۂ انبیاء کی آیت میں "فتحت" کے معنی میں یہ اصرار کیوں ہے کہ اس سے سد ٹوٹ کر کھلنا مراد ہے حالانکہ اس جگہ ردم یا سد کا تذکرہ تک نہیں اور کیوں نہ اس سے بھی استعارہ مراد لیا جائے اور کیوں وہ تفسیر نہ کی جائے جو ہم ابھی نقل کر چکے ہیں۔

اور اگر حدیث میں حقیقی نقب کا ذکر ہے تو یہ سورۂ کہف کی اس تفسیر کے خلاف اور معارض ہے جو مفسرین نے عام طور پر بیان کی ہے کہ سد کا یہ استحکام قیامت کے موعود وقت تک یوں ہی رہیگا اور سد کا اس سے قبل ٹوٹنا پھوٹنا ناممکن ہے۔

لیکن عام تفسیر کے برعکس اگر حضرت شاہ صاحب کی تفسیر کے مطابق ان دونوں مقامات کی تفسیر کی جائے کہ جس کی فی الجملہ تائید امام احمد اور محدث ابن کثیر کے اقوال سے بھی ہوتی ہے تو یہ سب مشکلات خود بخود دور ہو جاتی ہیں اور آیات کا مطلب اور حدیث کا مقصد بآسانی سمجھ میں آ جاتا ہے چنانچہ ابن کثیر آیت "وَمَا اسْتَطَاعُوا لَهُ نَقْبًا" کی تفسیر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

| | |
|---|---|
| ای فی ذٰلك الزمان لان هٰذه | یعنی وہ (یاجوج و ماجوج) اس زمانہ میں سد کے متعلق ہر قسم کے |
| صیغة خبر ماض فلا ینفی وقوعه | رد و بدل سے بے بس ہو گئے ہیں اس لیے کہ استطاعوا کا صیغہ |
| فیما یتقبل باذن الله لهم فی | زمانہ ماضی کی اطلاع کے لیے وضع کیا گیا ہے بس اس آیت |
| ذٰلك قدرًا وتسلیطهم علیه | میں اس بات کی ہرگز نفی نہیں نکلتی کہ زمانہ مستقبل میں اللہ تعالیٰ |
| بالتدریج قلیلاً قلیلاً حتی یتم | ان کو اس پر قدرت دیدے کہ وہ آہستہ آہستہ اور تدریجی |
| الاجل وینقضی الامر المقدور | طور پر اس سد کو توڑ پھوڑ ڈالیں تاکہ وہ وقت موعود آپہنچے جس کی خبر |
| فیخرجون کما قال الله تعالیٰ | سورۂ انبیاء میں دی گئی ہے اور امر مقدر پورا ہو جائے اور تب وہ |
| وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ | یک لخت یلغار کر کے اس طرح نکل پڑیں گے جس طرح سورۂ انبیاء کی |
| (البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۱۱۲) | اس آیت میں خبر دی گئی ہے۔ "وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ" |

غرض اس عبارت کا مفہوم بھی وہی ہے جو حضرت شاہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ سے منقول ہو چکا ہے

اور بغیر کسی تاویل کے آیت وَمَا اسْتَطَاعُوْا الآیہ کا صاف طور پر یہی مطلب متعین ہو جاتا ہے کہ یہ ذوالقرنین کے زمانہ کی کیفیت خود ان ہی کی زبانی بیان ہو رہی ہے یہ مطلب کسی طرح بھی نہیں ہے کہ ذوالقرنین کی سد یاجوج وماجوج کے خروجِ موعود سے پہلے ٹوٹ ہی نہیں سکتی۔

اور یہ مطلب ہو بھی کیسے سکتا ہے جب کہ یاجوج وماجوج صرف ایک اس درہ سے ہی نکل کر غارت گری نہیں کرتے تھے بلکہ کاکیشیا کے اس درّہ سے چین کے علاقہ منگوریا تک ان کے خروج کے بہت سے مقامات تھے پس اگر ان کے لیے سد ذوالقرنین نے درۂ داریال کی راہ ہمیشہ کے لیے مسدود کر دی تھی تو دوسرے مقامات سے ان کا خروج کیوں نہیں ہو سکتا تھا؟

اسی لیے حضرت شاہ صاحب نے آیت "وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَمُوجُ فِي بَعْضٍ" کی تفسیر یہی کی ہے کہ ذوالقرنین کے اس واقعہ میں چونکہ یاجوج وماجوج پر اس جانب سے روک قائم ہو جانے کا تذکرہ ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے ذوالقرنین کے مقولہ کے بعد اپنی جانب سے اس آیت میں یہ ارشاد فرمایا ہے کہ اے مخاطبین تم جن یاجوج وماجوج قبائل کے متعلق یہ باتیں سن رہے ہو یہ بھی سن لو کہ ہم نے ان قبائل کے لیے یہ مقدر کر دیا ہے کہ وہ آپس میں اُلجھتے رہیں گے اور موج در موج باہم دست بگریباں ہوتے رہیں گے حتیٰ کہ وہ وقت آجائے جب کہ قیامت بپا ہونے میں نفخِ صور کے علاوہ اور کوئی مرحلہ باقی نہ رہے، اور سورۂ انبیاء میں یہ ارشاد فرمایا کہ "نفخِ صور" سے پہلے قیامت کی اشراط وعلامات میں سے ایک شرط یا علامت یہ پیش آئے گی کہ یاجوج وماجوج کے تمام قبائل اپنے نکلنے کے ہر مقام سے ایک ساتھ امنڈ آئیں گے اور دنیا کی عام غارت گری کے لیے اپنی مقامی بلندیوں سے تیزی کے ساتھ اُترتے ہوئے کائنات کے گوشہ گوشہ میں پھیل جائیں گے "مِنْ كُلِّ حَدَبٍ يَنْسِلُوْنَ" الحدب لغت میں اوپر سے نیچے جھکنے کو کہتے ہیں اس لئے "حدب" کے معنی اونچے مقام سے نیچے اُترنے کے ہوتے ہیں اور "نسلان" عربی لغت میں پھیلنے کو کہتے ہیں اس لیے "ینسلون" کے معنی یہ ہوئے کہ وہ اس سرعت کے ساتھ اُمنڈ آئیں گے کہ یہ معلوم ہو گا گویا وہ کسی ٹیلے سے پھسل رہے ہیں چنانچہ مفرداتِ امام راغب اور نہایہ ابن اثیر میں "حدب" اور "نسل و نسلان" کی بحث میں یہی لغوی تفصیل مذکور ہے۔

لہٰذا اس تفسیر سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ قرآنِ عزیز نے یاجوج و ماجوج کے خروج موعود کی جو کیفیت بیان فرمائی ہے وہ ان ہی قبائل پر منطبق ہوتی ہے جو بحر کاسپین سے لیکر منچوریا تک پھیلے ہوئے ہیں اور جو دنیا کی بہت بڑی آبادی کے محور ہیں اور جائے وقوع کے اعتبار سے عام سطح آبادی سے اس قدر بلند حصہ زمین پر مقیم ہیں کہ جب کبھی نکل کر متمدن اقوام پر حملہ آور ہوتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا اوپر سے نیچے کو پھسل رہے ہیں پس آئندہ بھی جب اشراطِ ساعت کی شکل میں ان کا آخری خروج ہوگا تو ان کے تمام قبائل کا سیلاب ایک ہی دفعہ امنڈ آئے گا اور ایسا معلوم ہوگا کہ انسانوں کے سمندر کا بند ٹوٹ گیا ہے اور وہ اپنے مقامات کی ہر بلندی سے نیچے کی جانب بہہ پڑا ہے۔

قرآنِ عزیز کی آیات زیرِ بحث کی یہ تفسیر الفاظ اور جملوں کو ان کے لغوی معنی سے اِدھر اُدھر ہٹائے اور ان میں تاویل کئے بغیر اس قدر لطیف ہے کہ جس سے وہ بہت سے شکوک و شبہات یکقلم دفع ہو جاتے ہیں جو اس سلسلہ میں مفسّرین کو پیش آئے ہیں اور ان کو حل کرنے کے لیے غیر جاذب تاویلات کرنی پڑی ہیں۔ نیز مدعیانِ نبوت کو ان تاویلات سے فائدہ اٹھا کر الحاد و زندقہ پھیلانے کا موقعہ میسر آگیا ہے۔

سورۂ کہف اور سورۂ انبیاء کی آیات کی اِس تفسیر کے بعد اب حدیثِ بخاری کا مرحلہ باقی رہ جاتا ہے کہ اس کی کیا مراد ہے؟ تو حدیث "ویل للعرب من شر قد اقترب" اس بات پر توصاف دلالت کرتی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو رویا میں "جو نبی کے لیے وحی کی طرح صحیح اور حجت ہوتا ہے" یہ دکھایا گیا کہ سدِ یاجوج و ماجوج میں رخنہ پڑ جانے سے ایسا سخت حادثہ پیش آنے والا ہے جو عرب کے لیے ہولناک ثابت ہوگا لیکن یہ بات پوری طرح وضاحت کے ساتھ سامنے نہ آسکی کہ "فتح ردم یاجوج وماجوج" میں لفظ "فتح" سے حقیقی معنی مراد ہیں کہ واقعی یاجوج و ماجوج کی سد میں سے انگوٹھے اور انگلی کے بنائے ہوئے حلقہ کی مقدار میں شگاف ہو گیا ہے یا پیشین گوئیوں کی طرح اس پیشینگوئی میں بھی "فتح" اور "حلق تسعین" کو استعارہ کی شکل میں بیان کیا گیا ہے، نیز یہ کہ اس جملہ کا پہلے جملہ "ویل للعرب" سے کوئی ربط ہے یا یہ الگ الگ دو مستقل باتیں ہیں۔

ان دونوں مسئلوں کے متعلق اہلِ تحقیق کی رائے مختلف ہے اور چونکہ اس رویاء صادقہ کی تعبیر خود ذاتِ اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم) سے یا صحابہ رضی اللہ عنہم کے آثار سے بسندِ صحیح منقول نہیں ہے اس لیے محدثین اور اربابِ سیر نے یہ کوشش فرمائی ہے کہ وہ اس حدیث کے مصداق کو تقریبی طور پر تعین فرمائیں۔

شیخ بدر الدین عینی فرماتے ہیں کہ "ویل للعرب" کے جملہ میں ان شرور و فتن کی جانب اشارہ کیا گیا ہے جو آپ کی وفات کے بعد ہی امت میں رونما ہونے شروع ہو گئے اور جن کا نتیجہ یہ نکلا کہ امت میں سب سے پہلے عرب (قریشی حکومت) کی طاقت کا خاتمہ ہو گیا اور جن کی ہلاکتوں کا پہلا شکار اہلِ عرب ہی ہوئے اور بعد میں ان کا اثر تمام امتِ مرحومہ پر پڑا۔

اور ردم (سد) میں انگلی اور انگوٹھے کے بنائے ہوئے حلقہ کی مقدار رخنہ پیدا ہو جانے کا ذکر تقریبی ہے یعنی یہ مقصد نہیں ہے کہ واقعی اتنا چھوٹا سا رخنہ پڑ گیا ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ سد ذوالقرنین کے استحکامات کی مدت ختم ہو گئی اور اب اس میں رخنہ پڑنے کی ابتداء ہو چلی ہے گویا اب وہ آہستہ آہستہ شکست و ریخت ہو جائے گی [1]

حافظ ابن حجر عسقلانی بھی قریب قریب یہی فرماتے ہیں، لکھتے ہیں کہ اس واقعہ کی جانب اشارہ ہے جو رویاء صادقہ کے بعد قتلِ عثمان رضی اللہ عنہ کی شکل میں ظاہر ہوا اور پھر متواتر فتن اور شرور کا سلسلہ جاری ہو گیا جن کا نتیجہ یہ نکلا کہ عرب (قریشی حکومت) تمام اقوام کے لیے ایسے ہو گئے جیسا کہ کھانے کے پیالہ پر کھانے والے جمع ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ایک حدیث میں اس تشبیہ کا ذکر بھی موجود ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

> وہ زمانہ قریب ہے کہ تم پر قومیں اس طرح ایک دوسرے کو دعوت دیں گی جس طرح کھانے کے بڑے پیالہ پر کھانے والے ایک دوسرے کو دعوت دیتے ہیں۔ (فتح الباری ج ۱۳ ص ۹۱)

قرطبی کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے مخاطب عرب ہی ہیں اور رخنۂ سد کے متعلق دونوں محدثین کا رجحان اسی جانب معلوم ہوتا ہے کہ اس سے حقیقی رخنہ مراد نہیں ہے بلکہ یہ ایک تشبیہ ہے۔

[1] عمدۃ القاری ج ۱۱ ص ۲۳۵۔

ان ہر دو محدثین کی تفصیلات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک "ویل للعرب" والا جملہ جو شرور و فتن سے متعلق ہے اور "فتح ردم" کے جملہ میں ایک ہی بات بیان کی گئی ہے۔ اور یہ دونوں جملے اس طرح آپس میں مربوط ہیں کہ دونوں کو ایک ہی حادثہ سے متعلق سمجھا جائے۔

اور حافظ عماد الدین بن کثیر اس بارہ میں کوئی فیصلہ کن رائے نہیں رکھتے اور متردد ہیں کہ زیر بحث حدیث "فتح من ردم یاجوج وماجوج" میں فتح سے حقیقی فتح (کھل جانا) مراد ہے یا استعارہ ہے کسی آئندہ ایسے حادثہ سے جو یاجوج وماجوج کے ہاتھوں پیش آنے والا ہے اور جس کا اثر براہ راست عرب (حکومت قریش) پر پڑے گا۔ لیکن کرمانی شارح بخاری بعض علماء سے نقل کرتے ہیں کہ وہ اس پوری حدیث کو ایک ہی معاملہ سے متعلق سمجھتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ اس میں یاجوج وماجوج کے ایسے حادثہ کا ذکر کیا گیا ہے جس کا ظہور قیامت کی علامت سے جدا درمیانی وقفہ میں پیش آنے والا ہے اور جو باعث ہوگا عرب کے زوال کا اور "فتح ردم" استعارہ ہے اس بات سے کہ جو حادثہ آئندہ رونما ہونے والا ہے اس کی ابتداء ہوگئی ہے اور یہ وہ حادثہ تھا جو مستعصم باللہ خلیفہ عباسی کے زمانہ میں "فتنۂ تاتار" کے نام سے برپا ہوا اور جس نے عرب طاقت کا خاتمہ کرکے رکھ دیا۔[1]

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ یاجوج وماجوج قبائل کی اس تاخت و تاراج کے بعد جس کا ذکر ذوالقرنین کے واقعہ کے ضمن میں آیا ہے تاریخ میں ان قبائل کا پھر کوئی یادگار حملہ مذکور نہیں ہے۔ البتہ ساتویں صدی عیسوی میں ان کے لیے ذوالقرنین کی یہ روک بیکار ہوگئی اور انھوں نے بحرِ خزر اور بحرِ اسود کے اس درہ کے علاوہ جو ان پر بند کر دیا گیا تھا بحیرۂ یورال اور بحرِ خزر کا درمیانی راستہ پالیا نیز ادھر سدِ ذوالقرنین کے استحکامات میں بھی فرق آنا شروع ہوگیا تھا اور اس طرح ذوالقرنین کے بعد اب یاجوج وماجوج کے ایک نئے فتنہ کا آغاز ہو چلا تھا اور صدیوں سے ان خاموش قبائل فتنہ جو میں پھر حرکت شروع ہوگئی تھی۔

لہٰذا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو رویاء صادقہ میں یہ دکھا دیا گیا کہ اگرچہ ابھی وقت دور ہے جبکہ قیامت کے قریب تمام قبائل یاجوج وماجوج عالمِ انسانیت پر چھا جائیں گے لیکن وہ وقت قریب ہے جبکہ

[1] عمدۃ القاری ج ۱۱۔

ذوالقرنین کے بعد ان کا ایک اہم خروج پھر ہوگا اور وہ عرب کی طاقت اور فرمانروائی کی بربادی کا پیش خیمہ ثابت ہوگا اور اسی خروج کو اس طرح حسی طور پر دکھایا گیا کہ گویا (سد) دیوار میں ایک چھوٹا سا سوراخ ہو گیا ہے اور آہستہ آہستہ وہ دیوار گر کر منہدم ہو جانے والی ہے۔

چنانچہ زمانۂ نبوی میں یہ وہ وقت تھا کہ ان قبائل میں سے چند منگولین قبائل نے اپنے مرکز سے نکل کر قرب وجوار میں پھیلنا اور چھوٹے چھوٹے حملے کرنا شروع کر دیا تھا اور آخر کار چھٹی صدی ہجری میں چنگیز خاں ان کا قائد بن گیا اور اس نے منتشر قبائل کو ایک جگہ جمع کرنا شروع کیا اور پھر اس کے بیٹے اوکتائی خاں نے ایک بے پناہ طاقت کے ساتھ اٹھ کر مغرب وجنوب پر حملہ کر دیا اور ۶۵۶ھ میں آخر ہلاکو خاں کے ہاتھوں بغداد کی عرب خلافت کا خاتمہ ہو گیا اور اس نے "خلافتِ عربیہ" کو تہ وبالا کر ڈالا۔ تو یوں سمجھئے کہ جس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس خود علاماتِ قیامت میں سے سب سے بڑی علامت ہے یعنی آپؐ خاتم النبیین ہیں اور پھر بھی قیامت کے وقت میں اور ذاتِ اقدس میں کافی غیر متعین فاصلہ ہے اسی طرح یہ فتنہ تاتار بھی علامتِ قیامت "خروجِ یاجوج وماجوج" کا ایک ابتدائی نشان ہے اور جس طرح خروجِ دجال وقتلِ دجال اور نزولِ عیسیٰ علیہ السلام قیامت کی قریبی علامات ہیں اسی طرح سورۂ انبیاء میں ذکر کردہ خروج یاجوج وماجوج بھی علاماتِ قیامت میں قریبی اور آخری علامت یا آخری شرط ہے پس "فتح ردم" میں ان کی ابتدائی حرکت کی جانب اشارہ ہے جو رویائے صادقہ کے وقت شروع ہو چکی تھی اور "ویل للعرب" سے اس نتیجہ کا اظہار ہے جو عرب حکومت کے خاتمہ پر منتج ہوا ہے۔

لیکن شیخ بدرالدین عینی نے بخاری کی شرح عمدۃ القاری میں کرمانی کے بیان کردہ اس قول کی تردید کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ تاتاری فتنہ کا بانی چنگیز خاں اور اس کا بیٹا ہلاکو خاں تھا اور ان کو یاجوج وماجوج میں سے سمجھنا صحیح نہیں ہے لہٰذا اس حدیث کا مصداق اس فتنہ کو قرار دینا بھی غلط ہے۔ بہرحال حدیث "ویل للعرب" کی ان مختلف توجیہات سے جب کہ یہ بات ظاہر ہو گئی کہ اس روایت کے مصداق کا تعین خود حدیث سے نہیں ہوتا بلکہ محدثین نے قرائن اور الفاظِ حدیث کی نشست کو

پیشِ نظر رکھ کر اپنی جانب سے مصداق متعین کرنے کی سعی فرمائی ہے اور پھر اس میں بھی اختلاف رائے رہا ہے تو اب ان ہی کے بتائے ہوئے اصول کو سامنے رکھ کر ہم بھی کچھ کہنے اور حدیثِ زیرِ بحث کے مقصد کو متعین کرنے کا حق رکھتے ہیں اگرچہ دوسرے اقوال کی طرح وہ بھی غیر منصوص اور قابلِ رد و قبول ہوگا۔

حدیثِ زیرِ بحث میں مستقبل میں پیش آنے والے جس فتنہ اور شر کی خبر دی گئی ہے اس کے دو جملے بہت اہم ہیں ایک "ویل للعرب من شر قد اقترب" عرب کے لیے ہلاکت ہے اس شر سے جو بلاشبہ قریب آلگا ہے" اور دوسرا "فتح الیوم من ردم یاجوج وماجوج وحلق تسعین" آج کے دن یاجوج وماجوج کی سد سے انگوٹھے اور انگلی کے گول دائرہ کی مقدار میں کھول دیا گیا ہے" اور ان ہر دو جملوں کے درمیان واو عطف بھی نہیں ہے۔

لہٰذا الفاظِ حدیث پر کافی غور و خوض کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ حدیث میں مسطورہ بالا ہر دو اقوال کی گنجائش ہے۔ یعنی حدیث کا پہلا جملہ یہ پتہ دیتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسے اہم شر کی اطلاع دے رہے ہیں جس کا اثر یہ ہوگا کہ عرب کے لیے سخت ہلاکت کا سامنا ہوگا اور "خلافتِ قریش" زوال پذیر ہو جائے گی۔

اور دوسرا جملہ یا پہلے جملہ کی تائید میں پیش کیا گیا ہے اور یہ بتایا جا رہا ہے کہ اس امت میں جو اہم فتنے برپا ہونے والے ہیں اور جن کا ابتدائی اثر عرب کی ہلاکت کی شکل میں ظاہر ہوگا۔ ان فتنوں کے رونما ہونے کے لیے حسی علامت اس طرح سامنے آگئی ہے کہ یاجوج وماجوج پر بنائی ہوئی مستحکم سدِ ذوالقرنین میں رخنہ پڑنا شروع ہو گیا اور اس کی شکست و ریخت ہونے لگی۔ گویا یہ رخنہ آئندہ اسلامی طاقت یا عرب طاقت میں جلد رخنہ پڑ جانے کے لیے ایک علامت ہے۔ چنانچہ یہ فتنہ حضرتِ عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت سے شروع ہو کر مختلف فتنوں کے بعد چند صدیوں میں قریشی حکومت کی ہلاکت و تباہی پر جا کر ٹھیرا اور اس طرح حدیث کی پیشین گوئی پوری ہوئی۔

پس اس شکل میں "فتح ردم" آئندہ فتنوں اور شروں کے پیش آنے کی ایک علامت ہے جو امتِ

اسلامیہ میں برپا ہوکر قربِ قیامت میں موعود خروجِ یاجوج وماجوج پر جاکر ختم ہوجائیں گے اور اس کے بعد دنیا کے درہم وبرہم ہوجانے سے قیامت ہوجائے گی۔

یا یوں کہیے کہ دوسرا جملہ پہلے جملہ کی صرف تائید ہی نہیں ہے بلکہ اس کی تفسیر ہے اور پہلا جملہ درحقیقت نتیجہ اور ثمرہ ہے دوسرے جملہ کا اور مطلب یہ ہے کہ عرب (قریشی حکومت) کی ہلاکت کا وقت آپہنچا۔ گویا یاجوج وماجوج کا وہ بندہ جو ذوالقرنین نے بہت مستحکم باندھا تھا اس میں اب رخنہ پڑگیا اور معنیً اس میں شکست وریخت شروع ہوگئی اور یہ تمہید ہے اس فتنہ کی جو اسی جانب سے اٹھے گا اور قریشی حکومت کا خاتمہ کردے گا۔

پس اس تعبیر کے لحاظ سے تاتاری فتنہ کی وہ تاریخ سامنے لائی جائے گی جو گذشتہ صفحات میں پیش کی گئی ہے اور جس میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح حدیث کی بیان کردہ پیشین گوئی کے مطابق اس فتنہ کی ابتداء دورِ رسالت سے شروع ہوگئی تھی اور پھر کس طرح وہ خلیفۂ عباسی مستعصم باللہ کے دورِ حکومت میں قریشی حکومت کے استیصال کا باعث ہوئی۔

پس اگر ان دونوں جملوں کے درمیان جو ربط اور تعلق ہے اس میں اس قدر وسعت تسلیم کرلی جائے کہ وہ محدثین کی بتائی ہوئی توجیہ یعنی اہم شرور وفتن کا شیوع اور کرمانی کا بیان کردہ ایک قول کے مطابق توجیہ" یعنی فتنہ تاتار کا وجود" ان دونوں توجیہات کو حاوی ہوسکے تو ایسا تسلیم کرلینے میں نہ شرعی قباحت لازم آتی ہے اور نہ تاریخی اور زیر بحث حدیث کا مصداق بہت زیادہ فہم کے قریب آجاتا ہے۔

رہا شیخ بدرالدین نور اللہ مرقدہٗ کا یہ ارشاد کہ چنگیز خانی تاتاری یاجوج وماجوج نہیں کہلائے جاسکتے تو یہ شیخ کا تسامح ہے اس لیے کہ یاجوج وماجوج کے تعین کی بحث میں محققین محدثین اور مؤرخین نے جن قبائل اور ان کے مواطن کو محقق قرار دیا ہے اور خود شیخ موصوف نے بھی جن کو بڑی حد تک تسلیم فرمایا ہے، ان ہی قبائل میں سے ایک شاخ ان تاتاریوں کی بھی ہے جو چنگیز خانی کہلائے اور یہ اپنے دورِ بربریت ووحشت میں ان ہی جگہوں میں آباد رہے ہیں اور وہیں سے ان کا خروج ہوا ہے جن پر سدِ ذوالقرنین

قائم کی گئی تھی۔

بہرحال سورۂ کہف اور سورۂ انبیاء کی زیر بحث آیات کی اس تفسیر کے درمیان جو ہم نے حضرت علامہ انور شاہ نور اللہ مرقدہٗ اور حافظ حدیث عماد الدین بن کثیر کے حوالجات سے بیان کی ہے اور اس حدیث کی پیشین گوئی کے مصداق متعین کرنے والی مسطورہ بالا توجیہات کے درمیان کسی قسم کا بھی تعارض پیدا نہیں ہوتا اور زیر بحث آیات و روایات کے مصداق اپنی اپنی جگہ صاف اور واضح ہو جاتے ہیں اور ایسا کرنے میں نہ رکیک تاویلات کا سہارا لینے کی ضرورت پیش آتی ہے اور نہ ایک لمحہ کے لئے بھی اس کو تفسیر بالرائے یا قابل اعتراض جدت کہا جا سکتا ہے بلکہ یہ جو کچھ بھی ہے سلف صالحین اور محدثین و ارباب سیر کے مختلف اقوال میں ترجیح راجح کے اصول کو کارفرما بنا کر ایک ایسی معتدل راہ ہے جو نصوص قرآنی اور صحیح روایات حدیثی کے درمیان تطبیق کی راہ کہلائی جاتی اور سلفاً عن خلفٍ مقبول و محمود رہی ہے۔

اس ضمن میں یہ بات بھی پیش نظر رہنا ضروری ہے کہ حدیث مسطورہ بالا میں حلقہ کی مقدار پڑ جانے کا جو تذکرہ ہے اس کے متعلق محدثین کی یہ رائے ہے۔ کہ استعارہ و تشبیہ مراد ہو یا حسی رخنہ، بہر دو صورت حلقہ کی مقدار رخنہ کا ذکر تقریبی ہے نہ کہ تحدیدی یعنی یہ مطلب ہے کہ سد میں رخنہ پڑنا شروع ہو گیا' یہ مراد نہیں ہے کہ واقعی ایک حلقہ کی مقدار ہی رخنہ پڑا ہے چنانچہ گزشتہ صفحات میں ہم ابن کثیر سے اس سلسلہ میں نقول پیش کر چکے ہیں۔

اس سلسلہ میں مولانا ابو الکلام آزاد نے ترجمان القرآن میں اور بعض دوسرے علماء نے کتب سیرت میں اس امر کی کوشش کی ہے کہ سورۂ انبیاء کی ان آیات کا مصداق جن میں یاجوج و ماجوج کے موعود خروج کا ذکر کیا گیا ہے "حَتّٰٓی اِذَا فُتِحَتْ یَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ یَّنْسِلُوْنَ" فتنۂ تاتار کو بنا کر ہمیں قصہ کو ختم کر دیں اور اس کا امارت ساعت و علامت قیامت سے کوئی تعلق باقی نہ رہنے دیں۔

مگر ہمارے نزدیک قرآن عزیز کا سیاق و سباق ان کی اس تفسیر یا توجیہ کا قطعاً ابا اور انکار

کرتا ہے اور یہ اس لئے کہ سورۂ انبیاء میں اس واقعہ کو جس ترتیب سے بیان کیا ہے وہ یہ ہے:

| | |
|---|---|
| وَحَرٰمٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَآ اَنَّهُمْ | اور مقرر ہو چکا ہے ہر ایک ایسی بستی پر کہ جس کو ہم نے |
| لَا يَرْجِعُوْنَ ۝ حَتّٰٓى اِذَا فُتِحَتْ | ہلاک کر دیا ہے کہ اس کے بسنے والے واپس نہ ہونگے |
| يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ | یہاں تک کہ کھول دیے جائیں یاجوج و ماجوج اور |
| حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ ۝ وَاقْتَرَبَ | وہ ہر بلندی سے دوڑتے ہوئے امنڈ پڑیں اور قریب |
| الْوَعْدُ الْحَقُّ فَاِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ | آجائے سچا وعدہ پھر اُس وقت حیرانی سے کھلی کی کھلی |
| اَبْصَارُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يٰوَيْلَنَا | رہ جائیں آنکھیں منکروں کی اور کہیں ہائے ہماری |
| قَدْ كُنَّا فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا بَلْ | بدبختی کہ ہم بے خبر رہے اس (قیامت) سے بلکہ ہم ظلم |
| كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۝ (انبیاء پ ۱۷ ع ۶) | و شرارت میں سرشار رہے۔ |

ان آیات میں آیت زیر بحث "حَتّٰٓى اِذَا فُتِحَتْ" (الآیہ) سے پہلی آیت میں یہ بیان کیا جارہا ہے کہ مرنے والوں کی موت کے بعد اب ان کے لیے اس دنیا میں دوبارہ زندگی نہیں ہے اور آیت زیر بحث میں یہ کہا گیا ہے کہ موت کے بعد دوبارہ زندگی کا وقت جن علامت و آیات کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے یا جن پر معلق کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ یاجوج و ماجوج کے تمام قبائل اپنی پوری طاقت کے ساتھ بیک وقت اپنے مراکز سے نکل کر تیزی سے تمام دنیا پر چھا جائیں اور اس سے متصل آیت میں مزید یہ کہا گیا کہ پھر اس کے بعد قیامت بپا ہو جائے گی اور تمام شخص اپنی زندگی کے نیک و بد انجام دیکھنے کے لیے میدانِ حشر میں جمع ہو جائیں گے اور ناکام اپنی ناکامی پر حسرت و یاس کرتے رہ جائیں گے۔

پس آیت زیر بحث کے سیاق و سباق نے یہ بات بخوبی واضح کر دی کہ اس مقام پر یاجوج و ماجوج کے ایک ایسے خروج کی اطلاع دی گئی ہے جس کے بعد شر و فتن کا کوئی سلسلہ بلکہ دنیا کی ہستی کا کوئی سلسلہ باقی نہیں رہ جائے گا اور صرف قیامت بپا ہو جانے یعنی نفخِ صور کی دیر باقی رہ جائے گی جو اس واقعہ کی تکمیل کے بعد عمل میں آجائے گی۔

لہٰذا آیت کے سیاق وسباق سے قطع نظر کرتے ہوئے اور حدیث "ویل للعرب من شر قد اقترب" کا مصداق "فتنۂ تاتار" کو متعین کرتے ہوئے سورۂ انبیاء کی اس آیت کو آخری علامتِ ساعت سے نکال کر فتنۂ تاتار پر محمول کر لینا ہرگز ہرگز صحیح نہیں ہو سکتا۔ نیز جمہور سلف صالحین کی مسلّمہ توجیہ کے قطعاً خلاف ہے۔

ممکن ہے کہ اس میں توجیہ کے ناقلین وقائلین ہمارے اس اعتراض کو ہم پر ہی پلٹ دیں اور یہ فرمائیں کہ اسی طرح سورۂ کہف میں بھی آیت "اِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّیْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ" میں "وعد" سے کیوں قیامت مراد لی جائے جب کہ اس کے بعد ہی آیت "وَنُفِخَ فِی الصُّوْرِ" موجود ہے جو بلاشبہ قیامت کی آخری علامت ہے اور کیوں نہ کہا جائے کہ اس آیت سے یہ مراد ہے کہ یاجوج وماجوج نفخِ صور تک سد کے اندر محصور اور بند رہیں گے اور نفخِ صور کے قریب یک بیک سد گر جائیگی اور وہ نکل پڑیں گے۔

تو اس کے متعلق ہماری یہ گذارش ہے کہ یہ اعتراض اپنی اس تقریر کے ساتھ ہرگز ہم پر وارد نہیں ہوتا اس لیے کہ سورۂ کہف کی اِن آیات کی تفسیر کرتے ہوئے ہم پہلے ہی یہ واضح کر چکے ہیں کہ ان آیات میں سب سے پہلے "یَسْئَلُوْنَكَ عَنْ ذِی الْقَرْنَیْنِ" سے شروع کر کے "وَكَانَ وَعْدُ رَبِّیْ حَقًّا" تک ذوالقرنین کا واقعہ بیان کیا گیا ہے یعنی آیت "فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّیْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ" میں ذوالقرنین کا مقولہ نقل کیا گیا ہے اللہ تعالیٰ کا اپنا ارشاد نہیں ہے اس لیے یہاں "وَعْدُ" سے "وعدۂ قیامت" مراد نہیں ہے بلکہ کسی تعمیر کی تخریب کا مقدر و معین وقت مراد ہے جس کی تعیین کو ذوالقرنین نے اپنی جانب سے تخمینی طور پر متعین کرنے کی بجائے مردِ مومن اور مردِ صالح کی طرح خدا کی مرضی کے حوالہ کر دیا ہے۔

اور چونکہ ذوالقرنین کے واقعہ میں ضمنی طور سے یاجوج وماجوج کا بھی ذکر آگیا تھا اس لیے اس کے خاتمہ پر اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے بھی یاجوج وماجوج کا مختصر ذکر فرمایا اور آیت "وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ یَوْمَئِذٍ یَّمُوْجُ فِیْ بَعْضٍ وَّنُفِخَ فِی الصُّوْرِ" میں یہ بیان کیا کہ جن یاجوج وماجوج کا ذکر

تم نے ابھی ذوالقرنین کے واقعہ میں سُنا ان کو ہم نے شر اور فتنہ کی اس زندگی میں اس طرح کر چھوڑا ہے کہ وہ برابر فساد اور چپقلش باہمی میں مصروف رہیں گے اور یہ سلسلہ اس وقت تک قائم رہے گا کہ صور پھونک دیا جائے گا اس دن وہ سب جمع کیے جائیں گے اور اس دن جہنم کافروں پر پیش کی جائے گی۔

گویا سورۂ انبیاء میں تو یاجوج وماجوج کا ذکر مستقل حیثیت رکھتا ہے اور وہاں بتانا ہی یہ منظور ہے کہ ان کا اجتماعی خروج قیامت کی آخری علامات میں سے ایک نمایاں علامت ہے، اور سورۂ کہف میں اُن کا تذکرہ صرف ضمنی ہے اور اُن کے فساد اور شر انگیزی کے خصوصی واقعہ کی مناسبت سے ان کی باہمی فساد انگیزیوں اور مختلف اوقات میں موج در موج چپقلشوں کی وارداتوں کا ذکر اس انداز میں کر دیا گیا کہ ان کے موعود خروج کی جانب بھی اشارہ ہو جائے۔

غرض سورۂ کہف کی زیرِ بحث آیات کا سیاق و سباق یعنی ان سے پہلی اور بعد کی آیات کا ہرگز یہ تقاضا نہیں ہے کہ ذوالقرنین کے مقولہ "إِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّي جَعَلَهُۥ دَكَّآءَ" میں "وعد" سے مراد وعدۂ قیامت لیا جائے اور وہ معنی بیان کیے جائیں جو معترض نے ہماری بیان کردہ سورۂ انبیاء کی تفسیر کے مقابلہ میں پیش کیے ہیں۔

الحاصل جن معاصر مفسرین نے سورۂ انبیاء کی زیرِ بحث آیات کا مصداق فتنۂ تاتار کو بتایا ہے اور اس کی تائید میں بخاری کی مشہور حدیث "ویل للعرب من شر قد اقترب" الخ کو پیش کیا ہے ان کی یہ تفسیر غلط ہے اور حدیث سے اس کی تائید قطعاً بے محل ہے بلکہ بخاری و مسلم کی دوسری صحیح احادیث جو کتاب الفتن میں مذکور ہیں اس تفسیر کے خلاف صاف صاف یہ بیان کرتی ہیں کہ علاماتِ قیامت میں جب آخری علامات رونما ہوں گی تو پہلے حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا آسمان سے نزول ہوگا اور دجال کا سخت فتنہ برپا ہوگا اور آخر کار حضرت عیسیٰؑ کے ہاتھوں وہ مارا جائے گا اور پھر کچھ عرصہ کے بعد یاجوج وماجوج کا موعود خروج ہوگا جو تمام دنیا پر شر و فساد کی صورت میں چھا جائے گا اور پھر کچھ وقفہ کے بعد نفخِ صور ہوگا اور یہ کارخانۂ دُنیا

درہم و برہم ہو جائے گا۔[1]

یہ بھی واضح رہے کہ یہ اور اسی قسم کی دوسری صحیح اور اصح روایات سے ان تینوں (جھوٹے مدعیانِ نبوت) کے دعووں کا بھی ابطال ہو جاتا ہے اور ان کے کذب صریح کی رسوائی آشکارا ہو جاتی ہے جو اپنی نبوت کی صداقت کی تعمیر یہ کہہ کر تیار کرتے ہیں کہ انگریز اور روس یاجوج و ماجوج ہیں اور جب کہ ان کا خروج ہو چکا اور وہ عالم کے اکثر حصوں پر قابض ہو چکے تو اب یسوع مسیح کی آمد ضروری ہو گئی لہٰذا وہ موعود مسیح (عیسیٰؑ) ہم ہیں کیونکہ جب شرط موجود ہے تو مشروط کیوں موجود نہ ہو۔

کسی جھوٹے مدعیِ نبوت کی یہ دلیل اگرچہ خود تارِ عنکبوت سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی اور اس لیے درخورِ اعتنا بھی نہیں ہے تاہم عوام کو غلط فہمی سے محفوظ رکھنے کے لیے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اس مدعی کے بیان کردہ یہ دونوں دعوے جو دلیل کے دو مقدموں کے طور پر بیان کیے گئے ہیں غلط اور ناقابلِ قبول ہیں اور اس لیے ان سے پیدا شدہ نتیجہ بھی بلاشبہ باطل اور مردود ہے۔

پہلا دعویٰ یا مقدمہ تو اس لئے غلط ہے کہ ہم نے یاجوج و ماجوج کی بحث میں تفصیل کے ساتھ حدیث و تاریخ سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ یاجوج و ماجوج کا اطلاق صرف ان ہی قبائل پر ہوتا رہا ہے جو اپنے اصل مرکز میں بہ طریقِ وحشت و بربریت مقیم ہیں اور ان میں سے جو افراد یا قبائل مرکز چھوڑ کر دنیا کے مختلف حصوں میں بس گئے اور آہستہ آہستہ متمدن بن گئے ہیں وہ تاریخ کی نظر میں یاجوج و ماجوج نہیں کہلاتے بلکہ اپنے بعض امتیازاتِ خصوصی کے پیشِ نظر نئے نئے ناموں سے موسوم ہو گئے اور اپنے اصلی اور نسلی مرکز سے اس قدر اجنبی ہو گئے ہیں کہ وہ اور یہ دو مستقل جدا جدا قومیں بن گئیں اور ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے۔ اسی طرح قرآن اور حدیث کے مطالعہ سے بھی یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ ان ہی قبائل کو یاجوج و ماجوج کہتا ہے جو اپنی بربریت اور وحشت کے ساتھ عام دنیا سے الگ اپنے مرکز میں گوشہ گیر ہیں۔

[1] بخاری کتاب الفتن ج ۲

اور اسی اصول پر دوسرا دعویٰ یا مقدمہ بھی باطل ہے کہ انگریز اور روس بلکہ یورپین حکومتوں کا تسلط اور قبضہ یاجوج وماجوج کا خروج ہے اور یہ اس لیے کہ ایک تو ابھی ذکر ہو چکا کہ متمدن اقوام کو یاجوج وماجوج کہنا ہی غلط ہے دوسرے اس لیے کہ یاجوج وماجوج کے اس فتنہ وفساد کے پیشِ نظر جس کا ذکر ذوالقرنین کے واقعہ میں سورۂ کہف میں مذکور ہے اور صحیح احادیث کی تصریحات کے مطابق ان کا وہ خروج بھی جس کا ذکر سورۂ انبیاء میں کیا گیا ہے اور جس کو علاماتِ قیامت میں سے ٹھیرایا ہے ایسے ہی فساد وشر کے ساتھ ہوگا جس کا تعلق تمدن وحضارت سے دور کا بھی نہ ہو اور جو خالص وحشیانہ طرز وطریق پر برپا کیا جائے، کہاں سائنس کی ایجادات وآلات کا طریقۂ جنگ اور کہاں غیر متمدن وحشیانہ جنگ وپیکار؟ شتّان بینہما۔

اور یہ بات اس لیے بھی واضح ہے کہ متمدن اقوام کی جنگ وپیکار کتنی ہی وحشیانہ طرز وطریق اختیار کیے ہوئے کیوں نہ ہو بہر حال سائنس اور حرب وضرب کے اصول کے مطابق ہوتی ہیں اور یہ سلسلہ اقوام وامم میں ہمیشہ سے جاری ہے اس لیے اگر اس قسم کے جابرانہ وقاہرانہ تسلط اور قبضہ کے متعلق قرآن کو پیشین گوئی کرنی تھی تو اس کی تعبیر کے لیے ہرگز یہ طریقہ اختیار نہ کیا جاتا جو یاجوج وماجوج کے خروجِ موعود کے سلسلہ میں سورۂ انبیاء میں اختیار کیا گیا ہے بلکہ ان کی ترقی نُما بربریت کی جانب ضروری اشارات یا تصریحات کا ہونا لازم تھا۔[۱]

الحاصل احادیثِ صحیح اور آیاتِ قرآنی کی مطابقت کے ساتھ ساتھ جب مسئلہ زیرِ بحث پر غور وفکر کیا جاتا ہے تو بصراحت یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس علامت سے قبل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول از آسمان ضروری ہے نہ یہ کہ پہلے یاجوج وماجوج کا خروج ہوگا اور پھر مسیح علیہ السلام کی

---

[۱] رہا یہ امر کہ آج جبکہ کاکیشیا کا تمام علاقہ متمدن ہو چکا اور یہاں کی بیشتر آبادی مسلمان ہے تو قریب بہ قیامت یاجوج وماجوج کا خروج اس علاقہ سے کس طرح ہوگا' اس کا جواب یہ ہے کہ گذشتہ صفحات میں یہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا جا چکا ہے کہ کاکیشیا کے اس حصہ سے چین وتبت تک کے تمام ساحلی اور پہاڑی علاقوں کا سلسلہ ان ہی وحشی قبائل کا مسکن رہا ہے اور آج بھی ہے پس ان ہی علاقوں کے مختلف حصوں سے بے تعداد وحشی انسان وقتِ موعود پر نکل کر دنیائے انسانی کو تاراج کرنے کے لیے پھیل جائیں گے۔

آمد کا انتظار کیا جائے چنانچہ صحیح مسلم کی ایک طویل حدیث میں مذکور ہے :۔

فبینما هو کذلك اذ بعث الله
المسیح ابن مریم فینزل عند
المنارة البیضاء شرقی دمشق
بین مهرودتین واضعاً کفیه
علی اجنحة ملکین اذا طأطأ
رأسه قطر واذا رفعه تحدر
منه جمان کاللؤلؤ فلا یحل لکافر
یجد ریح نفسه الا مات ونفسه
ینتهی حیث ینتهی طرفه
فیطلبه حتی یدرکه بباب
لُدّ فیقتله ثم یأتی عیسی ابن
مریم قوم قد عصمهم الله منه
فیمسح عن وجوههم ویحدثهم
بدرجاتهم فی الجنة فبینما هو
کذلك اذ اوحی الله الی عیسی
انی قد اخرجت عباداً لی
لا یدان لاحد بقتالهم فحرز
عبادی الی الطور ویبعث الله
یاجوج وماجوج وهم من کل
حدب ینسلون ۝ [1]

واقعات یہاں تک پہنچیں گے کہ اللہ تعالیٰ حضرت مسیح بن مریم
(علیہ السلام) کو بھیجے گا اور وہ (جامع) دمشق کے سپید مشرقی منارہ
کے نزدیک اس طرح اتریں گے کہ زعفرانی رنگ کی دو چادروں میں
ملبوس اور فرشتوں کے بازوؤں پر ہاتھوں کا سہارا دیے ہوئے
ہوں گے جب سر کو جھکائیں گے تو پانی ٹپکنے لگے گا اور جب سر
اُٹھائیں گے تو اس سے پانی کے قطرات اس طرح گرنے لگیں گے
گویا ہار سے موتی ٹوٹ کر گر رہے ہیں یعنی آسمان پر غسل کرکے فوراً
ہی نزول ہوگا جہاں تک ان کا سانس جائے گا کافر کی موت کا
باعث ہوگا اور اُن کا سانس ان کی حدِ نظر تک پہنچے گا پھر اُتر کر
وہ دجال کا پیچھا کریں گے اور وہ اس کو بیت المقدس کے قریب
بستی لُد کے دروازہ پر پائیں گے اور قتل کردیں گے پھر حضرت
عیسیٰ علیہ السلام ان لوگوں کے پاس تشریف لائیں گے جن کو
اللہ تعالیٰ دجال کے فتنہ سے محفوظ رکھے گا اور ان کے غبار آلودہ
چہروں کو مس کرتے ہوئے ان کو جنت میں جو درجات ملیں گے
اس کے متعلق باتیں کریں گے، حالات یہاں تک پہنچیں گے کہ اللہ
تعالیٰ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) پر وحی کرے گا کہ اب میں اپنے بندوں
میں سے ایک ایسی قوم کو نکالتا ہوں جن سے جنگ کرنے کی دنیا میں
کسی کے اندر طاقت نہیں ہے لہٰذا تم میرے تمام بندوں کو طور
پر لے جاؤ اس کے بعد اللہ تعالیٰ یاجوج و ماجوج کو نکالے گا
جو تیزی کے ساتھ دوڑتے ہوئے آئیں گے اور ہر بلند جگہ سے نکل پڑیں گے۔

[1] مسلم کتاب الفتن۔

پس یاجوج وماجوج کا خروج کسی حال میں بھی ان اقوام پر صادق نہیں آسکتا جو تمدن اور حضارت کی راہوں سے قاہرانہ اور جابرانہ جنگ و پیکار کے ذریعہ سے دنیا پر غالب و قابض ہوتی رہی ہیں اور کسی شخص کو بھی یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ یاجوج وماجوج قبائل کی تاریخی بحث سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اور جدید نبی بن کر اسلام کے اساسی اور بنیادی مسئلہ ختم نبوت کے خلاف تشکیلِ نبوت کی جدید طرح ڈالے اور اس طرح اسلام میں رخنہ انداز ہو کر دوست نما دشمن بنے۔

**کیا ذوالقرنین نبی تھے**

ذوالقرنین کی تعیین کے بعد یہ مسئلہ بھی اہمیت رکھتا ہے کہ یہ واضح ہو جائے کہ ذوالقرنین نبی ہیں یا ایک نیک نہاد بادشاہ؟ سلفِ صالحین اور متاخرین کی اکثریت اسی جانب ہے کہ ذوالقرنین صالحین میں سے ہیں اور نیک نفس بادشاہ اور وہ نبی یا رسول نہیں۔

چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اس روایت میں کہ جس میں ذوالقرنین کی وجہ تسمیہ بیان کی گئی ہے اُن کا یہ قول مصرح موجود ہے:-

لم یکن نبیا ولا ملکا (الحدیث' فتح الباری ج ۶ ص ۲۹۵) ذوالقرنین نہ نبی تھے اور نہ فرشتہ۔

کان رجلا احب اللہ فاحبہ الخ وہ ایک انسان تھے جنھوں نے اللہ تعالیٰ کو محبوب رکھا پس اللہ تعالیٰ نے بھی اُن کو محبوب رکھا۔

حافظ ابن حجر نے اس روایت کو نقل کر کے اس کی توثیق کی ہے اور کہا ہے کہ میں نے اس روایت کو حافظِ حدیث ضیاء الدین مقدسی کی کتاب مختارہ کی احادیث سے بسندِ صحیح سُنا ہے اور پھر فرماتے ہیں کہ اس روایت میں ذوالقرنین کے متعلق یہ الفاظ بھی مذکور ہیں:-

بعثہ اللہ الی قومہ[1] اللہ تعالیٰ نے اس کو اس کی قوم کی طرف بھیجا۔

اس سے یہ اشکال ہوتا ہے کہ لفظ "بعث" تو نبوت و رسالت کے لیے بولا جاتا ہے پھر نبوت کے انکار کے کیا معنی؟ اس کے بعد خود ہی یہ جواب دیا ہے کہ "بعث" یہاں اپنے عام معنی میں ہے جو نبی اور غیر نبی دونوں کے لیے بولا جا سکتا ہے اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں:-

[1] فتح الباری ج ۶ ص ۲۹۵۔

وقیل کان من الملوک وعلیہ الاکثر۔ (فتح)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ تھا اور اکثر کی یہی رائے ہے۔

حضرتِ علیؓ کے علاوہ حضرتِ عبداللہ بن عباسؓ کا بھی یہی مسلک ہے کہ ذوالقرنین نبی نہ تھے بلکہ ایک نیک اور صالح بادشاہ تھے:۔

عن ابن عباس قال کان ذوالقرنین ملکاً صالحاً رضی اللہ عملہ واثنی علیہ فی کتابہ وکان منصوراً۔ (البدایہ والنہایہ ج۲ ص۱۰۳)

حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ ذوالقرنین نیک اور صالح بادشاہ تھا اللہ تعالیٰ نے اس کے اعمال کو پسند فرمایا اور اپنی کتاب (قرآن) میں اس کی تعریف فرمائی اور وہ فاتح وکامیاب بادشاہ تھا۔

اسی طرح حضرتِ ابوہریرہؓ بھی ذوالقرنین کو صالحین میں سے مانتے تھے۔[1]

البتہ حضرت عبداللہ ابن عمرو بن العاص کی جانب یہ نسبت کی جاتی ہے کہ وہ ذوالقرنین کو نبی مانتے تھے:

عن مجاھد عن عبداللہ بن عمرو قال کان ذوالقرنین نبیاً (فتح ج ۶ ص۲۹۵)

عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ذوالقرنین نبی تھے۔

اور حافظ ابن حجرؒ اس روایت کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ قرآن کا ظاہر یہی بتاتا ہے مگر ان تمام اقوال کو نقل کرنے کے بعد فیصلہ کچھ نہیں دیتے لیکن حافظ عمادالدین ابن کثیرؒ ان اقوال کو نقل کرنے کے ساتھ ساتھ اپنا فیصلہ یہ دیتے ہیں:۔

والصحیح انہ کان ملکاً من ملوک العادلین۔ (فتح ج ۶ ص۲۹۵)

اور صحیح یہ ہے کہ ذوالقرنین عادل بادشاہوں میں سے تھا۔

اور حضرتِ استاذ علامہ محمد انور شاہ نور اللہ مرقدہٗ کی تحقیق بھی یہی ہے چنانچہ عقیدۃ الاسلام میں تحریر فرماتے ہیں:۔

بل ملک اٰخر من الصالحین ینتھی نسبہ الی العرب الساميين الاولین۔

کہ وہ ایک اور نیک بادشاہوں میں سے تھا اور اس کا نسب قدیم سامیوں پر پہنچتا ہے۔

[1] تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۱۰۳۰ [illegible] ص ۱۵۰۔

پس ان نقول کے پیشِ نظر مولانا آزاد کا یہ فرمانا:

"تو صحابہ و سلف سے جو تفسیر منقول ہے وہ یہی ہے کہ ذوالقرنین نبی تھا۔ الخ"[1]

اپنے عموم کے اعتبار سے صحیح نہیں ہے کیونکہ بیشتر سلفِ صالحین ذوالقرنین کی نبوت کے قائل نہیں ہیں بلکہ ان کو ایک بادشاہ کی حیثیت میں تسلیم کرتے ہیں البتہ بعض سلف کی رائے میں وہ نبی تھے۔

اسی طرح متاخرین میں ابن کثیر کے متعلق یہ کہنا بھی غلط فہمی پر مبنی ہے کہ وہ ذوالقرنین کے نبی ہونے کی تائید میں ہیں اس لیے کہ سطورِ بالا میں ابنِ کثیر سے جو کچھ منقول ہے وہ قطعاً اس کے خلاف ہے، معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ابنِ کثیر نے اپنی تاریخ میں اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے ذوالقرنین اور خضر کا جو ایک جگہ ساتھ ساتھ ذکر کیا ہے اور اس میں خضر کی نبوت کی توثیق فرمائی ہے تو اس جگہ شاید ضمائر کے مرجع میں مولانائے موصوف کو مغالطہ ہوگیا ہے چنانچہ ابن کثیر تحریر فرماتے ہیں:

فان الاول کان عبداً مؤمناً صالحاً وملکاً عادلاً وکان وزیرہ الخضر وقد کان نبیاً علیٰ ما قررناہ قبل ھذا۔ (تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۱۰۶)

اس لیے کہ اول (یعنی ذوالقرنین) ایک عبدِ مومن اور صالح تھا اور عادل بادشاہ اور اس کے وزیر خضر علیہ السلام تھے اور وہ (خضر) اس تحقیق کے مطابق جو ہم سابق میں بیان کرچکے ہیں بے شک نبی تھے۔

بہرحال حضرت علیؓ، ابن عباسؓ، ابوہریرہؓ، امام رازیؒ، ابن کثیرؒ اور ان کے علاوہ سلفِ صالحین اور متاخرین کی اکثریت اسی کی قائل ہے کہ ذوالقرنین نبی نہیں تھے بلکہ عادل صالح بادشاہ تھے پس جب کہ صحابہ اور سلفِ صالحین بلکہ متاخرین میں سے بھی اکثر اسی جانب ہیں کہ ذوالقرنین نبی نہ تھے تو جمہور کا یہ رجحان بلاشبہ اس امر کی دلیل ہے کہ آیت "قُلْنَا یٰذَا الْقَرْنَیْنِ" میں خدائے تعالیٰ کی مخاطبت ذوالقرنین کے ساتھ اسی قسم کی ہے جیسا کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی والدہ کے قصہ میں "اَوْحَیْنَآ" کے اندر ہے:۔

وَاَوْحَیْنَآ اِلٰٓی اُمِّ مُوْسٰٓی اَنْ اَرْضِعِیْهِ۔

اور ہم نے موسٰیؑ کی والدہ پر وحی کی کہ تو اس (موسٰی) کو دودھ پلانا منظور کرلے۔

[1] ترجمان القرآن ج ۲ ص ۴۴۲

اور یقیناً ان حضرات کا منطوق پر مفہوم کو ترجیح دینا بے وجہ نہیں ہے، خصوصاً جب کہ اس مخاطبت کو نہ "اَوْحَيْنَا" سے تعبیر کیا گیا اور نہ "اَنْزَلْنَا" سے اور نہ "قُلْنَا" کے علاوہ ذوالقرنین سے متعلق آیات میں کوئی ایسا مؤید موجود ہے جو "قُلْنَا" کی خطابت کو خطابتِ وحی قرار دیتا ہو۔

لہٰذا راجح مذہب یہی ہے کہ ذوالقرنین نبی نہیں تھے بلکہ عادل اور صالح بادشاہ تھے۔

بصائر (۱) مطالبِ قرآن کی بصیرت کے لیے جس طرح لغتِ عرب معانی، بلاغت و بیان صرف و نحو احادیث اور آثارِ صحابہؓ جیسے علوم کی معرفت ضروری ہے اسی طرح صحیح علمِ تاریخ کی معرفت ضروری ہے چنانچہ گذشتہ اقوام و امم کے حالات و واقعات کا علم حاصل کر کے ان سے عبرت و بصیرت حاصل کرنے کی ترغیب خود قرآنِ عزیز نے پُرزور اسلوبِ بیان کے ساتھ دی ہے۔ ارشاد ہے:

| | |
|---|---|
| قُلْ سِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ ثُمَّ انْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ۝ | کہہ دیجیے، زمین کی سیاحت کرو پھر دیکھو جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا۔ |
| قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ۝ | بے شبہ تم سے پہلے (خدا کی مقرر کردہ) راہیں گذر چکی ہیں پس زمین کی سیر کرو پھر دیکھو جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا۔ |

(۲) جہاں تک اسلام کے بنیادی مسائل کا تعلق ہے اس میں "سلفِ صالحین" کا مسلک ہی بغیر چون و چرا دلیلِ راہ ہے اور اس سے تجاوز زیغ و گمراہی ہے لیکن جہاں تک قرآن کے لطائف و نکات، معارف و علوم، اسرار و غوامض اور علمی و تاریخی مطالب کا تعلق ہے اس کے لیے کسی زمانہ میں بھی درِ تحقیق بند نہیں ہے۔ چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ مبارک ہے:

| | |
|---|---|
| فلا تنقضی عجائبہ | قرآن کے لطائف و حکم کبھی ختم ہونے والے نہیں ہیں۔ |

خصوصاً جبکہ تاریخی مطالب کے حصول کے لیے آج کے ذرائعِ معلومات قدیم علومِ تاریخ کے ذرائع سے زیادہ وسیع ہو چکے ہیں تو سلفِ صالحین کے مسلکِ قدیم پر قائم رہتے ہوئے قرآنی حقائق

اور اس کے تاریخی مباحث کی تفصیلات و جزئیات میں اقوالِ سلف کا پابند نہ رہتے ہوئے، قرآن کی تائید کے لیے قدیم تحقیق اٹھانا سلفِ صالحین کا اقتدار ہے نہ کہ ان کے مسلک سے انحراف، کیا کوئی اہلِ علم اور صاحبِ نظر اس حقیقت کا انکار کر سکتا ہے کہ اِن مطالبِ تفسیری کے علاوہ جن کے متعلق دلائل سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ یہ ارشاداتِ نبویؐ ہیں صحابہ (رضی اللہ عنہم) کے ذاتی اقوال کے خلاف یا ان سے جدا تابعین اور تبعِ تابعین کے اقوال بہ کثرت کتبِ تفسیر میں مذکور ہیں اور متاخرین علماءِ تفسیر متقدمین کے اقوال پر نقد و جرح کرتے اور اختلافِ رائے رکھتے نظر آتے ہیں اور ان میں سے ہر شخص کی تحقیق قرآنِ عزیز کے مطالب کی خدمت ہی سمجھی جاتی ہے، البتہ اہلیت شرط ہے اور جو شخص بھی اس خدمت کے لیے اقدام کرے اس کا فرض ہے کہ فیما بینی و بین اللہ یہ غور و فکر کرے کہ وہ جس مسئلہ میں کوئی راہ اختیار کرتا ہے حقیقت میں اس کے تمام مالۂ اور ماعلیہ سے واقف ہے یا نہیں اور یہ کہ اُس کی اِس تحقیق سے قرآن کی مزید تائید ہی ہوتی ہے اور سلفِ صالحین کے بُنیادی مسلکِ قویم سے قطعاً تجاوز لازم نہیں آتا۔

(۲) عدل و ظلم کی حکومت کے درمیان ہمیشہ سے یہ امتیازی فرق چلا آتا ہے کہ عادل حکومت کا نصب العین رعایا اور عوام (پبلک) کی خدمت ہوتا ہے اور اس لیے عادل بادشاہ کا شاہی خزانہ رفاہِ عام اور پبلک خدمات اور ان کی خوش حالی کے لیے ہوتا ہے اور وہ اپنی ذات پر ضروری حاجات سے زیادہ اس میں سے صرف نہیں کرتا اور نہ عوام کو ٹیکسوں کی کثرت سے پریشان حال بناتا ہے اس کے برعکس جبر و ظلم کی حکومت کا منشاء بادشاہ اور حکومت کا اقتدار، ذاتی تعیش اور اس کا استحکام ہوتا ہے اس لیے وہ نہ رعایا کے دُکھ درد کی پرواہ کرتا ہے اور نہ ان کی راحت و آرام کا خیال رکھتا ہے ... اس سلسلہ میں اگر کچھ ہو بھی جاتا ہے تو وہ حکومت کے مفاد و مصالح کے پیشِ نظر ضمنی ہوتا ہے نیز اس حکومت میں رعایا ہمیشہ ٹیکسوں کے بوجھ سے دبی رہتی اور اس مُلک کی اکثریت افلاس و غربت ہی کا شکار رہتی ہے۔

ذوالقرنین چونکہ ایک صالح اور عادل بادشاہ تھا اس لیے اس نے شمالی سیاحت میں اس قوم سے ٹیکس لینے سے انکار کر دیا جو یاجوج و ماجوج پر سد بنانے کے سلسلہ میں دینا چاہتے تھے اور اس نے صاف کہا کہ خدا نے مجھ کو حکومت و ثروت اس لیے نہیں دی کہ میں اس کو ذاتی تعیش پر صرف کروں بلکہ صرف اس لیے عطا فرمائی ہے کہ اس کے ذریعہ سے مخلوقِ خدا کی خدمت انجام دوں۔ نیز اس نے جو ملک بھی فتح کیا اس کی رعایا پر عفو و کرم ہی کی بارش کی اور کبھی اُن کو نہیں ستایا۔



# اصحاب الکہف و الرقیم

## سنہ ؁ء (تخمیناً)

قرآن عزیز اور اصحاب الکہف و الرقیم ۔ کہف و رقیم؟
واقعہ کی حیثیت ۔ تفسیری حقائق ۔ نتائج و عبر

**قرآن عزیز اور اصحاب الکہف والرقیم**

ابن اسحٰق بروایت ابن عباس (رضی اللہ عنہما) نقل کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ قریش مکہ میں یہ مشورہ ہوا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ بہت سنگین ہوتا جارہا ہے اس لیے ایسا کوئی یقینی فیصلہ ہونا چاہیے کہ یہ صادق ہیں یا کاذب تاکہ ہم ان کے متعلق اپنی آخری رائے پر عمل کرسکیں، بہتر یہ ہے کہ اس مسئلہ کو یہودِ مدینہ سے حل کیا جائے کیونکہ وہ خود کو اہل کتاب کہتے اور اس قسم کے معاملات میں صاحبِ بصیرت ہیں۔ قریش نے اس غرض سے نضر بن حارث اور عقبہ بن معیط پر مشتمل ایک وفد علماءِ یہود کے پاس بھیجا۔ علماءِ یہود نے ان سے کہا کہ تم اُن سے تین باتیں دریافت کرو اگر وہ صحیح صحیح جواب دیں تو بلاشبہ وہ خدا کے سچے رسول ہیں تم کو ہرگز اُن کی مخالفت نہیں کرنی چاہیے اور اگر وہ صحیح جواب نہ بتا سکیں تو تم کو اختیار ہے جو چاہو ان کے ساتھ کرو۔ وہ تین سوال یہ ہیں: ذوالقرنین کا واقعہ کیا ہے؟ اصحابِ کہف کون تھے اور اُن پر کیا گزرا؟ روح کی حقیقت بیان کیجیے؟ وفد نے مکہ جا کر صنادید قریش سے صورتِ حال کہہ سنائی اور قریش نے اس بات کو بہت پسند کیا اور خدمتِ اقدس میں حاضر ہو کر آپ سے تینوں سوالات کیے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کا جواب وحی آنے پر دوں گا چنانچہ جب وحی کے ذریعہ آپ کو ان واقعات کی حقیقت سے آگاہ کر دیا گیا تب آپ نے ان کے سامنے سورۂ کہف

تلاوت کر کے واقعات کی حقیقت اُن پر واضح کر دی :-

| | |
|---|---|
| اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ | کیا تم نے یہ گمان کر لیا ہے کہ اصحاب کہف و رقیم (کا معاملہ) |
| وَالرَّقِيْمِ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا ۝ | ہماری نشانیوں میں سے کوئی عجیب (معاملہ) ہے جبکہ |
| اِذْ اَوَى الْفِتْيَةُ اِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوْا | چند نوجوان پہاڑ کے غار میں پناہ گیر ہو گئے تھے اور یہ |
| رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ | دعا مانگ رہے تھے "اے ہمارے پروردگار تو اپنے پاس سے |
| لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا ۝ فَضَرَبْنَا عَلٰٓى | ہم کو رحمت عطا کر اور ہمارے لیے رشد و ہدایت مہیا کر" پھر |
| اٰذَانِهِمْ فِى الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا ۝ | ہم نے غار میں چند سال تک کے لیے ان کو تھپک کر |
| ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَىُّ الْحِزْبَيْنِ | سلا دیا پھر ان کو اُٹھایا (بیدار کیا) تاکہ ہم جان لیں کہ دونوں |
| اَحْصٰى لِمَا لَبِثُوْٓا اَمَدًا ۝ نَحْنُ | بستی والوں اور غار والوں میں سے کس نے اُن کی مدت |
| نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ ۚ اِنَّهُمْ | کا صحیح اندازہ لگایا۔ ہم تجھ کو ان کا صحیح اور سچا واقعہ بتائے |
| فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنٰهُمْ | دیتے ہیں۔ بیشک وہ چند نوجوان تھے جو اپنے پروردگار |
| هُدًى ۝ وَّرَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ | پر ایمان لے آئے تھے اور ہم نے اُن کو ہدایت کی روشنی |
| اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ | اور زیادہ عطا کر دی تھی اور جب وہ (حاکمِ وقت کے سامنے) |
| وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَا۟ مِنْ دُوْنِهٖٓ | یہ اعلان کرنے پر کمربستہ ہو گئے کہ ہمارا پروردگار وہی ہے جو |
| اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَآ اِذًا شَطَطًا ۝ | آسمانوں اور زمین کا پروردگار ہے اور ہم ہرگز اس کے علاوہ |
| هٰٓؤُلَآءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ | کسی کو خدا نہیں پکار سکتے اور اگر ایسا کریں تو خدا پر بہتان |
| دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً ۗ لَوْلَا يَاْتُوْنَ | باندھیں گے۔ اس وقت ہم نے ان کے دل خوب مضبوط |
| عَلَيْهِمْ بِسُلْطٰنٍۢ بَيِّنٍ ۗ فَمَنْ | کر دیے تھے وہ کہتے تھے کہ یہ ہماری قوم ہے جنھوں نے اللہ |
| اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ | کے ماسوا بہت سے معبود بنا لیے ہیں۔ یہ کیوں کھلی دلیل اپنے |
| كَذِبًا ۝ وَاِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ | معبودانِ باطل (کی صداقت) کے لیے نہیں لاتے پس |
| وَمَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاْوٗٓا | اس سے زیادہ ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹی تہمت |

| | |
|---|---|
| إِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ | لگائے اور اے رفیقو! جب تم ان سے اور ان کی عبادت |
| مِنْ رَحْمَتِهِ وَيُهَيِّئْ لَكُمْ | سے جو اللہ کے سوا وہ باطل معبودوں کی کرتے ہیں علیحدگی |
| مِنْ أَمْرِكُمْ مِرْفَقًا ۝ وَتَرَى | اختیار کرتے ہو تو پہاڑ کے غار میں چلے چلو تمھارا پروردگار اپنی |
| الشَّمْسَ إِذَا طَلَعَتْ تَزَاوَرُ | رحمت نچھاور کریگا اور تمھارے معاملہ میں سہولت کا رپیدا کرے گا |
| عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِينِ | اور اے پیغمبر تم سورج کو دیکھو گے کہ وہ نکلتے وقت ان کے |
| وَإِذَا غَرَبَتْ تَقْرِضُهُمْ ذَاتَ | غار سے داہنی جانب بچ کر نکل جائے گا اور ڈوبتے وقت غار |
| الشِّمَالِ وَهُمْ فِي فَجْوَةٍ مِنْهُ | سے کنترا کر بائیں جانب کو ہو جاتا ہے اور وہ کشادہ غار میں ہیں |
| ذَٰلِكَ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ مَنْ | یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے جس کو وہ ہدایت دے وہی |
| يَهْدِ اللَّهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ وَمَنْ | راہ یاب ہے اور جس شخص کو (اس کی مسلسل سرکشی کی بنا پر) گمراہ |
| يُضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهُ وَلِيًّا | کرے تو اس کے لیے کسی راہ دکھانے والے مددگار کو |
| مُرْشِدًا ۝ وَتَحْسَبُهُمْ أَيْقَاظًا | نہ پائے گا اور تو اُن کو بیدار گمان کرے گا حالانکہ وہ سو رہے |
| وَهُمْ رُقُودٌ وَنُقَلِّبُهُمْ | ہوں گے اور ہم اُن کی کروٹیں بدلتے رہتے ہیں داہنے بھی |
| ذَاتَ الْيَمِينِ وَذَاتَ الشِّمَالِ | اور بائیں بھی اور اُن کا کُتّا اپنے اگلے ہاتھ پھیلائے غار |
| وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ | کے منہ پر بیٹھا ہوا ہے اگر تو ان کو جھانک کر دیکھے تو |
| بِالْوَصِيدِ لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ | ان کی اس شان اور حالت کو دیکھ کر مرعوب ہو جائے |
| لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَلَمُلِئْتَ | اور بھاگ پڑے اور اسی طرح ہم نے ان کو اُٹھا دیا' |
| مِنْهُمْ رُعْبًا ۝ وَكَذَٰلِكَ بَعَثْنَاهُمْ | جگا دیا تاکہ آپس میں پوچھ گچھ کریں' ایک نے اُن میں سے |
| لِيَتَسَاءَلُوا بَيْنَهُمْ قَالَ | کہا تم غار میں کب سے ہو' دوسروں نے جواب دیا |
| قَائِلٌ مِنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ | ایک دن یا دن کے کچھ حصہ سے، پھر انھوں نے کہا |
| قَالُوا لَبِثْنَا يَوْمًا أَوْ بَعْضَ | تمھارا پروردگار ہی خوب جانتا ہے کہ تم یہاں کتنی |
| يَوْمٍ قَالُوا رَبُّكُمْ أَعْلَمُ | مدت سے ہو تو (اب یہ کرو کہ) اپنے میں سے |

| | |
|---|---|
| بِمَا لَبِثْتُمْ فَابْعَثُوْا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ | کسی ایک کو شہر میں یہ سکہ دے کر بھیجو کہ وہ تمھارے لیے |
| هٰذِهٖٓ اِلَى الْمَدِيْنَةِ فَلْيَنْظُرْ | دیکھ بھال کر عمدہ قسم کا کھانا لائے اور اس کو چاہیے کہ |
| اَيُّهَآ اَزْكٰى طَعَامًا فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ | بہت ہی رازدارانہ طریقہ پر جائے اور ہرگز کسی کو اطلاع |
| مِّنْهُ وَلْيَتَلَطَّفْ وَلَا يُشْعِرَنَّ | نہ ہونے دے کہ ہم یہاں مقیم ہیں اس لیے کہ اگر ان پر |
| بِكُمْ اَحَدًا ۝ اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا | تمھارا معاملہ منکشف ہو گیا تو وہ تم کو سنگسار کر دیں گے یا |
| عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ اَوْ يُعِيْدُوْكُمْ | تم کو زبردستی اپنے دین کی جانب لوٹانے پر مجبور کریں گے |
| فِيْ مِلَّتِهِمْ وَلَنْ تُفْلِحُوْٓا اِذًا اَبَدًا ۝ | اور اس وقت تم ہرگز کامیاب نہ رہو گے (نہ دنیا میں اور |
| وَكَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ | نہ آخرت میں) اور اسی طرح ہم نے شہر والوں پر اُن کا |
| لِيَعْلَمُوْٓا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ | معاملہ ظاہر کر دیا تاکہ وہ یہ یقین کر لیں کہ خدا کا وعدہ سچا ہے اور |
| وَّاَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيْهَا | قیامت کی گھڑی ضرور آنے والی ہے اس میں کوئی شک نہیں |
| اِذْ يَتَنَازَعُوْنَ بَيْنَهُمْ اَمْرَهُمْ | ہے ہم نے ان کو اس وقت اس معاملہ کی اطلاع دی جبکہ |
| فَقَالُوا ابْنُوْا عَلَيْهِمْ | وہ قیامت کے وجود و عدم پر آپس میں اختلاف کر رہے تھے |
| بُنْيَانًا ۭ رَبُّهُمْ اَعْلَمُ | پھر وہ کہنے لگے کہ ان اصحاب کہف پر قبہ تعمیر کر دو اُن کا |
| بِهِمْ ۭ قَالَ الَّذِيْنَ | پروردگار ان کے حال کا خوب واقف کار ہے (یعنی ان |
| غَلَبُوْا عَلٰٓي اَمْرِهِمْ | سے کوئی تعرض نہ کرو) ان لوگوں نے جو برسرِ حکومت تھے |
| لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا ۝ | کہا ہم تو ان کے غار پر ایک مسجد (ہیکل) تعمیر کریں گے |
| سَيَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ | اے پیغمبر کچھ لوگ کہیں گے وہ تین آدمی ہیں چوتھا اُن کا |
| وَيَقُوْلُوْنَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ | کُتا ہے کچھ لوگ ایسا بھی کہتے ہیں نہیں پانچ ہیں چھٹا |
| كَلْبُهُمْ رَجْمًۢا بِالْغَيْبِ | ان کا کُتا ہے یہ سب اندھیرے میں تیر چلاتے ہیں، |
| وَيَقُوْلُوْنَ سَبْعَةٌ وَّثَامِنُهُمْ | بعض کہتے ہیں سات ہیں آٹھواں اُن کا کُتا ہے' |
| كَلْبُهُمْ ۭ قُلْ رَّبِّيْٓ اَعْلَمُ | (اے پیغمبر) کہدے ان کی اصل گنتی تو میرا پروردگار ہی |

بِعِدَّتِهِمْ مَّا يَعْلَمُهُمْ
إِلَّا قَلِيلٌ ۗ فَلَا تُمَارِ فِيهِمْ
إِلَّا مِرَاءً ظَاهِرًا وَّلَا تَسْتَفْتِ
فِيهِم مِّنْهُمْ أَحَدًا ۝ وَلَا
تَقُولَنَّ لِشَائٍ إِنِّي فَاعِلٌ
ذَٰلِكَ غَدًا ۝ إِلَّا أَن يَشَاءَ
اللَّهُ ۚ وَاذْكُر رَّبَّكَ إِذَا
نَسِيتَ وَقُلْ عَسَىٰ أَن
يَهْدِيَنِ رَبِّي لِأَقْرَبَ مِنْ
هَٰذَا رَشَدًا ۝ وَلَبِثُوا فِي
كَهْفِهِمْ ثَلَاثَ مِائَةٍ سِنِينَ
وَازْدَادُوا تِسْعًا ۝ قُلِ اللَّهُ
أَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوا ۖ لَهُ غَيْبُ
السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ أَبْصِرْ بِهِ
وَأَسْمِعْ ۚ مَا لَهُم مِّن دُونِهِ مِن
وَلِيٍّ وَلَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ
أَحَدًا ۝ (الکہف پ ۱۵ رکوع ۳)

بہتر جانتا ہے کیونکہ ان کا حال بہت کم لوگوں کے علم میں آیا ہے، اور تو لوگوں سے اس بارہ میں نزاع نہ کر مگر صرف اس حد تک کہ صاف صاف بات میں ہو (یعنی باریکیوں میں نہیں پڑھنا چاہیے کہ کتنے آدمی تھے کتنے دنوں تک رہے تھے) اور نہ اُن لوگوں میں سے کسی سے اس بارے میں کچھ دریافت کر۔ اور ہرگز کسی چیز کے متعلق یہ نہ کہنا کہ میں کل کو یہ ضرور کرنے والا ہوں مگر (یہ کہہ کر) کہ ہوگا وہی جو اللہ چاہے گا اور جب کبھی بھول جاؤ تو اپنے پروردگار کی یاد تازہ کرلو تم کہہ دو امید ہے میرا پروردگار اِس سے بھی زیادہ کامیابی کی راہ مجھ پر کھول دے گا اور کہتے ہیں وہ غار میں تین سو برس تک رہے اور لوگوں نے نو برس اور بڑھا دیے ہیں (اے پیغمبر) تو کہہ دے اللہ ہی بہتر جانتا ہے وہ کتنی مدت تک رہے وہ آسمان و زمین کی ساری پوشیدہ باتیں جاننے والا ہے بڑا ہی دیکھنے والا بڑا سننے والا ہے اس کے سوا لوگوں کا کوئی کارساز نہیں اور نہ وہ اپنے حکم میں کسی کو شریک کرتا ہے۔

---

**کہف و رقیم**

لغت میں کہف پہاڑ کے اندر وسیع غار کو کہتے ہیں مگر رقیم کے معنی میں مفسرین کو سخت تردد ہے اور ضحاک اور سدی جو ہر ایک تفسیری روایت کو حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی جانب ضرور منسوب کر دیا کرتے ہیں اِس مقام پر بھی حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے متعدد اقوال نقل کرتے ہیں (۱) یہ رقم سے مشتق ہے اور رقیم بمعنی مرقوم (مکتوب) ہے چونکہ بادشاہِ وقت نے ان کی تلاش

کے بعد اُن کے نام پتھر کی ایک تختی پر کندہ کر دیے تھے اس لیے اُن کو اصحاب رقیم بھی کہا جاتا ہے، سعید بن جبیر اسی کی تائید میں ہیں اور مفسرین کے یہاں یہی قول مشہور ہے (۲) یہ وادی کا نام ہے جہاں پہاڑ میں وہ غار تھا جس میں اصحاب کہف روپوش ہوئے تھے۔ قتادہ، عطیہ عونی اور مجاہد بھی اسی کی تائید کرتے ہیں (۳) یہ اُس پہاڑ کا نام ہے جس میں غار تھا (۴) عکرمہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو یہ کہتے سُنا ما ادری ما الرقیم کتاب ام بنیان" میں نہیں کہہ سکتا کہ رقیم سے کندہ تختی مراد ہے یا شہر مراد ہے (۵) بروایت کعب احبار، وہب بن منبہ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے منقول ہے کہ یہ ایلہ (عقبہ) کے قریب ایک شہر کا نام ہے، یہ بلادِ روم میں واقع ہے۔

تاریخ اور اثری تحقیقات کے پیش نظر یہ آخری قول ہی صحیح اور قرآنِ عزیز کے بیان کے مطابق ہے اور باقی اقوال محض قیاس و تخمین پر مبنی ہیں۔

اِس اجمال کی تفصیل کے لیے تاریخ اور علم الآثار کے چند اوراق کا مطالعہ ضروری ہے۔ اصل یہ کہ یہ واقعہ بعثت مسیح (علیہ السلام) سے کچھ زمانہ بعد کا ہے اور انباط کے قبیلہ سے تعلق رکھتا ہے، یہ انباط کون ہیں؟ اور اُن کا مسکن و موطن کہاں ہے؟ یہی وہ گتھی ہے جس کے سلجھ جانے پر حقیقت روشن ہو سکتی ہے۔

مؤرخینِ عرب انباط کے متعلق عموماً یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ عجمی النسل ہیں اور اسی لیے وہ نبطی کو عربی کا مقابل قرار دیتے ہیں مگر یہ صحیح نہیں ہے اور عرب مؤرخین کے مختلف تاریخی مقولے اور توراۃ اور رومی و یونانی تاریخیں یہ ثابت کرتی ہیں کہ نبطی خالص عربی اور اسمٰعیلی النسل ہیں مگر بدویانہ زندگی ترک کر دینے اور حجاز سے نکل کر دوسرے علاقوں میں بس جانے کی وجہ سے یہ عربوں کے لیے اجنبی ہو گئے حتیٰ کہ خود بھی یہ بھول گئے کہ عرب سے ان کو کیا نسبت ہے؟ اسی بناء پر حضرتِ فاروق اعظمؓ کا مشہور مقولہ ہے:

| | |
|---|---|
| تعلموا النسب ولا تکونوا کنبط | اپنے نسب کو سیکھو عراق کے نبط کی طرح نہ بن جاؤ کہ جب |
| السواد اذا سئل احدھم عن | ان میں سے کسی سے دریافت کیا جائے کہ تم کس خاندان سے |
| اصلہ قال من قریۃ کذا۔ | ہو تو جواب دیتے ہیں کہ ہم فلاں شہر کے ہیں۔ |

لیکن "انباط" کی بحث کو چھوڑ کر جب مؤرخینِ عرب سے دریافت کیا جائے کہ نبط یا نابت کون ہے

تو وہ بغیر کسی اختلاف کے فوراً یہ جواب دیں گے "ابن اسمٰعیل علیہ السلام" کیونکہ حضرت اسمٰعیل (علیہ السلام) کے بارہ لڑکوں میں سے بڑے کا نام نابت یا نبط ہے۔ چنانچہ ابن کثیر اپنی تاریخ میں نابت کے متعلق تحریر کرتے ہیں:

ثم جميع عرب الحجاز على اختلاف قبائلهم يرجعون في انسابهم الى ولديه نابت وقيدار وكان الرئيس بعده والقائم بالامور الحاكم في مكة والناظر في امر البيت وزمزم نابت بن اسمعيل وهو ابن اخت الجرهميين ثم تغلبت جرهم على البيت طمعاً في بني اختهم فحكموا بمكة وما والاها عوضاً عن بني اسمعيل مدة طويلة فكان اول من صار اليه امر البيت بعد نابت مضاض بن عمرو بن سعد بن الرقيب بن عيبر بن نابت۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۲)

تمام حجازی عرب کے مختلف قبائل کا نسب حضرت اسمٰعیلؑ کے دو صاحبزادوں نابت اور قیدار پر ختم ہوتا ہے اور اسمٰعیل علیہ السلام کے بعد اُن کا جانشین نابت ہوا، وہی تمام امور کا والی مکہ کا حاکم، زمزم اور کعبہ کا متولّی قرار پایا اور یہ بنی جرہم کا بھانجا تھا پس بنی جرہم اس تعلق کی وجہ سے اس کے بعد عرصہ تک مکہ پر حاکم و قابض رہے اور اطرافِ مکہ پر بھی انہی کی حکومت رہی، مدتِ دراز کے بعد نابت کی پانچویں پشت میں سے ایک شخص مضاض نے دوبارہ مکہ کی حکومت اور بیت اللہ کی تولیت کو بنی جرہم کے قبضہ سے نکال کر اپنے ہاتھ میں لیا۔

مگر اس کے آگے عرب مؤرخین عام طور پر اس بارے میں خاموش ہیں کہ جب نابت بن اسمٰعیل علیہ السلام کی نسل کثرت سے بڑھی تو کیا وہ صرف حجاز ہی کے اندر محدود رہی یا اطراف و جوانب میں پھیلی اور اگر اِدھر اُدھر گئی تو اس کا سلسلہ کہاں تک پھیلا۔ البتہ ابن خلدون نے اس سے متعلق معلومات میں کچھ اضافہ کیا ہے، وہ کہتا ہے:-

"نابت بن اسمٰعیلؑ بیت اللہ کا متولّی ہوا اور مکہ میں اپنے بھائیوں کے ساتھ مقیم رہا تا آنکہ اس کی نسل نے اس درجہ ترقی کی کہ وہ مکہ میں نہ سما سکے اور حجاز کے اطراف و جوانب تک میں پھیل گئے۔"[1]

لیکن توراۃ نے اس سلسلہ میں مختلف مقامات پر جو کچھ کہا ہے وہ اصل گتھی کو سلجھانے میں بہت زیادہ مدد و معاون ثابت ہوتا ہے اس نے شروع میں تو حضرت اسمٰعیل (علیہ السلام) کے بارہ بیٹوں کی

[1] البدایہ والنہایہ جلد ۲۔

فہرست دی ہے اور اُس کے بعد اُس نے یہ بتایا ہے کہ خاندان نابت ساعیر (کوہ سراط) یعنی حجاز سے شام کے علاقوں تک پھیلا ہوا ہے اور ایلہ (عقبہ) تک ان کا قبضہ ہے توراۃ میں نابت کا تلفظ بھی مختلف طریقوں سے مذکور ہے کہیں نبیت ہے تو کہیں نبیط اور کہیں نبایوط۔

توراۃ کے حوالجات یہ ہیں:۔

"یہ اسمٰعیلؑ کے بیٹوں کے نام ہیں مطابق ان کے ناموں اور نسبتوں کی فہرست کے اسمٰعیل کا پہلوٹھا نبیت اور قیدار اور ادبئیل اور مبسام اور مسماع اور دومہ اور مسا اور حدد اور تیمہ اور اطور اور نفیس اور قدماہ"[1]

یسعیاہ نبی کی پیشین گوئی میں یروشلم کو مخاطب کرکے کہا گیا ہے:۔

"اور قوموں کی دولت تیرے (یروشلم) کے پاس فراہم ہوگی اونٹوں کی قطاریں اور مدیان اور عیفہ کی سانڈنیاں تیرے گرد آ کے جمع ہوں گی وہ سب جو سبا کے ہیں آئیں گے۔ قیدار کی ساری بھیڑیں تیرے پاس جمع ہوں گی۔ نبیت کے مینڈھے تیری خدمت میں حاضر ہوں گے"[2]

اور حزقیل نبی کے صحیفہ میں ہے:۔

"نبایوط (نابت) کی بھیڑیں نذر لی جائیں گی"[3]

اور سفر تکوین میں خاندانِ نابت کا علاقہ سکونت یہ بتاتے ہیں:۔

"اور وہ حویلہ سے شور تک جو مصر کے سامنے اس راہ میں ہے جس سے آشور کو جاتے ہیں بستے تھے اُن کا قطعۂ زمین ان کے سب بھائیوں کے سامنے پڑا تھا"[4]

ان حوالجات کی تفصیل و تشریح کے لیے اب اگر ان رومی مؤرخین کی شہادات بھی شامل کرلی جائیں جو نبطیوں (انباط) کے معاصر ہیں تو یہ بات بالکل ہی صاف ہو جاتی ہے کہ انباط اور بنو نابت بن اسمٰعیل ایک ہی ہیں اور یہ کہ انھوں نے غیر متمدن زندگی کو چھوڑ کر متمدن زندگی اختیار کرلی تھی

یوسیفوس جو پہلی صدی عیسوی میں ہو گذرا ہے اور انباط کا معاصر بھی ہے لکھتا ہے:۔

---

[1] تکوین باب ۲۵ آیات ۱۳-۱۴ [2] باب ۲۱ آیات ۱۴ [3] باب ۲۵ آیات ۱۸ [4] باب ۲۵ آیات ۱۸۔

ملک بحرِ احمر سے نہرِ فرات تک اسمٰعیلؑ کے بارہ بیٹوں کے قبضہ میں ہے جن کے سبب سے اُن کا نام نبوطینہ (Nabotena) پڑ گیا ہے اس کی سرحد (مغرب میں) مصر اور عرب سنگستان (Petania) مل گئی ہے اور بہت سے بیابانوں اور بلند و فراز زمینوں کو شامل ہے جو مشرق کی طرف خلیجِ فارس تک منتہی ہوتی ہے عموماً اس ملک کے باشندوں کا نام نبایوطِ عرب (Natrayotn) ہے۔[1]

اور ڈائڈروس ۵۰ ق م بیان کرتا ہے :۔

انباط خلیج ایلہ (عقبہ) پر رہتے ہیں"[2]

اور دوسری جگہ لکھتا ہے :۔

"اوپر گذرتے ہوئے تم خلیجِ عقبہ (ایلہ) میں داخل ہو گئے جس کے حدود پر ان عربوں کی بہت سی آبادیاں ہیں جن کو لوگ نبط کہتے ہیں"[3]

اور آثار اور کتبات میں نبط کا نام سب سے پہلے ۶۴۷ ق م میں نظر آتا ہے جب کہ آشور بنی پال شاہ اسیریا کے کتبہ میں وہ اپنے مفتوحین کی فہرست میں نابان شاہ نبط کا تذکرہ کرتا ہے۔[4]

ان تمام تفاصیل کے مطالعہ کے بعد یہ حقیقت بالکل آشکارا ہو جاتی ہے کہ ایلہ (عقبہ) کی خلیج سے شام تک اور سواحلِ مصر سے خلیجِ فارس تک جو قوم مسطورۂ بالا حوالجات میں برسرِ اقتدار نظر آتی ہے وہ نابت بن اسمٰعیلؑ ہی کی نسل سے ہے جو نبط، انباط، نبایوط اور نبیت کے ناموں سے پکاری جاتی رہی ہے۔

البتہ ایک بات طبیعت میں ضرور کھٹکتی ہے اور وہ یہ کہ نابت بن اسمٰعیل (علیہ السلام) کی جس نسل سے توراۃ اور رومی مؤرخین اس تفصیل کے ساتھ واقف ہوں وہ عرصۂ دراز کے بعد اپنے بھائیوں (اہلِ عرب) کی نگاہ میں کیوں اجنبی ہو گئی بلکہ خود نبطی یہ کیوں بھول گئے کہ وہ خالص عربی النسل اور

---

[1] ماخوذ از گولڈ کائنس آف رین ص ۲۲۵ انچ ۱۲ (ارض القرآن ج ۲)؛ [2] ارض القرآن ج ۲ ص ۶۱ ماخوذ از گولڈ کائنس آف رین ص ۲۲۵۔ انچ ۱۲ [3] ایضاً ج ۲ ص ۶۰۔ [4] ایضاً جلد ۲ ص ۶۰۔

اسمٰعیل (علیہ السلام) کی اولاد ہیں سو اس کے متعلق یاقوت حموی کے ایک جملہ سے بآسانی جواب دیا جاسکتا ہے، یاقوت (عربہ) کے عنوان میں بحث کرتے ہوئے یہ بیان کرتا ہے :-

اما النبط فکل من لم یکن راعیا او جندیا عند العرب من ساکن الارضین۔

اہلِ عرب دُنیا کے ہر اُس انسان کو نبطی کہہ دیتے ہیں جو چرواہا یا سپاہی نہ ہو۔

اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ حجاز سے نکل کر مدتِ مدید کے بعد چونکہ نبطیوں نے بدویانہ سپاہیانہ زندگی کو چھوڑ کر متمدن شہریوں کی زندگی اختیار کرلی تھی اس لیے آہستہ آہستہ اہلِ عرب کی نگاہ میں بنی نابت اجنبی ہوگئے اور وہ ان کو بھی عجمی حکمرانوں کی طرح سمجھنے لگے لہٰذا ان کے طریقِ بود وماند، معاشرتی تمدن اور اختلافِ احوال نے ان حجازیوں سے الگ کرکے اُن ہی کے بھائیوں کی نگاہ پر ان کے حجابی پردے ڈال دیئے۔

مؤرخین کے نزدیک انباط کا رقبۂ حکومت تین مختلف العہد قوموں کے دائرۂ حکومت پر حاوی تھا یعنی (۱) ثمود کا ملک "وادیٔ قریٰ" اس کا دارالحکومت مشہور شہر حجر تھا (۲) ملک مدین اس کا دارالحکومت خود شہر مدین ہی تھا (۳) ملک ادوم، اس کا دارالحکومت رقیم تھا۔

انباط کا زمانۂ حکومت ۸۰۰ ق م سے شروع ہوکر ۱۰۶ء تک ختم ہوجاتا ہے۔ اوائلِ صدی عیسوی میں رومیوں نے ان پر لشکر کشی کرکے اور شکست دے کر رقیم اور اس کے پورے علاقہ پر قبضہ کرلیا تھا اور انباط کے پاس صرف حجر کا علاقہ باقی رہ گیا تھا جو ۱۰۶ء میں جب ان کے ہاتھ سے نکل گیا تو انباط کی حکومت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہوگیا رومیوں نے رقیم پر قبضہ کرنے کے بعد جب اس کو اپنی تمدنی، سیاسی اور معاشرتی ترقیوں کا مرکز بنایا تو اس کا پُرانا نام بدل کر پٹرا رکھا۔

یہی وہ رقیم ہے جس کا ذکر اصحابِ کہف کے واقعہ میں قرآنِ عزیز نے کیا ہے "اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا" اور یہی وہ شہر ہے جس کے کچھ سعادتمند انسان بُت پرستی سے نفور ہوکر اور بُت پرست حکمرانوں کے ظلم وجور سے محفوظ رہنے کی خاطر اس شہر کے

---

لہ ادوم کا علاقہ اول عیسو بن اسحٰق (علیہ السلام) کے قبضہ میں تھا جیسا کہ ادوم کے ذکر میں قصص القرآن ج ۱ میں ذکر ہوچکا ہے۔

پہاڑوں کے ایک غار میں چھُپ رہے تھے پس حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) کا یہ ارشاد کہ رقیم "ایلہ" کے قریب شہر تھا اور یہ کہ وہ روم کے علاقہ میں تھا بالکل صحیح اور قرآن اور تاریخ دونوں کے عین مطابق ہے۔ بلا شبہ وہ ایلہ (خلیجِ عقبہ) کے قریب واقع تھا اور چونکہ رومیوں نے اس پر قبضہ کر لیا تھا اس لیے اُس کو روم کے علاقہ میں شمار کرنا قطعاً درست ہے۔

مگر حیرت ہے اس تاریخی انقلاب پر کہ جب رومیوں نے انباط کے اس مرکزی شہر کا نام پیٹرا رکھ دیا تو اس نام نے تھوڑے ہی دنوں میں اس درجہ شہرت حاصل کر لی کہ عرب اور عجم نے اس کے سیناؤں اور فنونِ لطیفہ کی نیرنگیوں سے متاثر ہو کر اس کا اصل نام بالکل فراموش کر دیا اور ان کے لیے چند صدیوں ہی میں رقیم ایک اجنبی اور غیر معلوم نام ہو گیا حتیٰ کہ اہلِ عرب تک بھی اس کو بطرا ہی کے نام سے یاد رکھا اور نتیجہ یہ نکلا کہ جب قرآن نے اس کا اصل نام بیان کیا تو دوسروں کی طرح اہلِ عرب بھی حیران تھے کہ رقیم غار کا نام ہے یا لوہے کی تختی کا یا پہاڑ کا یا شہر کا، لیکن جس نام کو انباط کے بھائیوں (حجازیوں) نے بھلا دیا تھا اس کو توراۃ نے اپنی سند میں محفوظ رکھا تاکہ جب نبی امی وحی کے ذریعہ اصل حقیقت کا اعلان کرے تو وہ اس کی تائید کے لیے خود کو پیش کر سکے[1]

گذشتہ جنگِ عظیم کے بعد آثارِ قدیمہ کی تحقیقات نے جہاں اور بعض جدید انکشافات کیے ہیں ان میں سب سے نمایاں اسی شہر رقیم (پیٹرا یا بطرا) کی دریافت ہے اور اس کے متعلق جس قدر اثری تحقیق کی جا رہی ہے اس سے قرآنِ عزیز کی حرف بحرف تصدیق ہوتی جاتی ہے۔

خلیجِ عقبہ (ایلہ) سے شمال کی جانب بڑھتے ہوئے پہاڑوں کے دو متوازی سلسلے ملتے ہیں ان ہی میں سے ایک پہاڑ کی بلندی پر انباط کا دار الحکومت رقیم آباد تھا۔

اس شہر کی موجودہ زمانہ میں جو اثری پیمائش کی جا رہی ہے اس میں نئے نئے انکشافات کے ساتھ اس کے پہاڑوں کے عجیب و غریب "غار" بھی قابلِ ذکر ہیں، یہ غار بہت وسیع اور دور دور تک چلے گئے ہیں اور اس طرح واقع ہیں کہ دن کی دھوپ اور تپش اُن تک نہیں پہنچتی ایک غار

---

[1] توراۃ سفر عدد اور صحیفہ یسعیاہ میں اس شہر کا نام "راقیم" بیان کیا گیا ہے' دائرۃ المعارف (عرب)

ایسا بھی دریافت ہوا ہے کہ جس کے دہانہ پر قدیم عمارتوں کے آثار پائے جاتے ہیں اور بہت سے ستونوں کے کھنڈر باقی رہ گئے ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ کسی ہیکل کی عمارت ہے۔

اِس صاف اور بے لاگ اثری اور تاریخی شہادتوں کے بعد یہ کہنا بہت آسان ہو جاتا ہے کہ قرآنِ عزیز نے جن اصحابِ کہف کا واقعہ بیان کیا ہے وہ اسی شہر رقیم سے تعلق رکھتا ہے۔

واقعہ | اسمٰعیلی عربوں کے مذہب سے متعلق تاریخ کے صفحات یہ شہادت دیتے ہیں کہ ان میں گو کچھ عرصہ باپ دادا کا دینِ حق "ملتِ ابراہیم" باقی رہا مگر آہستہ آہستہ مصر، شام اور عراق کے صنم پرستوں کے تعلقات نے عمرو بن لحی کے ذریعہ ان میں بت پرستی اور ستارہ پرستی کی داغ بیل ڈال دی اور کچھ عرصہ بعد ان عربوں کو شرک پرستی میں ایسا ید طولیٰ حاصل ہو گیا کہ وہ دوسروں کے لیے پیش رو بن گئے چنانچہ نابت کی اولاد بھی شرک کی گمراہی میں مبتلا تھی اور ان کے مشہور بُت ذوالشریٰ لات، منات، ہبل، کسوہ، عمیانس اور حریش تھے[1] صدیوں تک نبطی بُت پرستی کی اسی گمراہی میں مبتلا رہے کہ مسیحی دور کے اوائل میں دارالحکومت رقیم کے اندر ایک عجیب معاملہ پیش آیا جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

مسیحی مذہب کا ابتدائی دور ہے نبطی حکومت کے اطراف یعنی شام وغیرہ میں عیسائیت کا زور ہے کہ رقیم کی چند نوجوان سعید روحیں شرک سے بیزار اور نفور ہو کر توحید کی جانب مائل ہو جاتی اور دینِ عیسوی کو قبول کر لیتی ہیں شدہ شدہ یہ بات بادشاہِ وقت تک بھی پہنچ جاتی ہے۔ بادشاہ نوجوانوں کو دربار میں بُلانا اور انکشافِ حال چاہتا ہے، نوجوان کلمۂ حق بلند کرنے میں بیباک اور جری ثابت ہوتے ہیں، یہ بات بادشاہ کو ناگوار گذرتی ہے مگر وہ دوبارہ معاملہ پر غور کرنے کے لیے ان کو چند روز کی مہلت دیتا ہے یہ دربار سے واپس آکر آپس میں مشورہ کرتے ہیں، اور طے پاتا ہے کہ خاموشی کے ساتھ کسی پہاڑ کے غار میں پوشیدہ ہو جانا چاہیے تاکہ مشرکوں کے شر سے محفوظ رہ کر عبادتِ الٰہی میں مشغول رہ سکیں۔ یہ سوچ کر وہ ایک غار میں پوشیدہ ہو جاتے ہیں۔ جب وہ غار میں داخل ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان پر نیند طاری کر دیتا ہے اور وہ خواب ہی کی

[1] کتاب الاصنام لدین ابحلی۔

حالت میں کروٹیں بدلتے رہتے ہیں۔ غار کی عجیب کیفیت ہے اندر سے بہت وسیع ہے مگر قدرت نے اس کو ایسا موقع نصیب کیا ہے کہ زندگی کے بقاء کے قدرتی سامان وہاں سب موجود ہیں ایک طرف دہانہ ہے تو دوسری جانب ہوا گذرنے کے منفذ اور سوراخ ہیں جن کی وجہ سے ہر وقت تازہ ہوا اندر آتی جاتی رہتی ہے، غار شمال و جنوب رویہ ہے اس لیے طلوع و غروب کے وقت آفتاب کی تپش اندر نہیں پہنچ پاتی مگر ہلکی ہلکی روشنی برابر پہنچتی رہتی ہے اور ایسی کیفیت پیدا ہوگئی ہے کہ نہ تاریکی ہی ہے کہ کچھ نظر نہ آئے اور نہ اتنی روشنی ہے کہ کھلے میدان کی طرح جگہ روشن ہو جائے۔ اس حالت میں چند انسان اس غار میں خواب آلود ہیں اور ان کا رفیق کتا اپنے اگلے ہاتھ پھیلائے غار کے دہانہ پر باہر کی جانب مُنہ کیے بیٹھا ہے۔

اس مجموعی صورتِ حال نے ایسی کیفیت پیدا کر دی ہے کہ پہاڑوں کے درمیان غار کے اندر جھانکنے والے انسان پر خوف و ہراس کی حالت طاری ہو جاتی ہے اور وہ بھاگ کھڑے ہونے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

برسوں تک یہ نوجوان اسی حالت میں آرام کے ساتھ محفوظ رہتے ہیں کہ شہر میں انقلاب ہو جاتا ہے، رومی عیسائی نبطی حکومت پر حملہ آور ہوتے ہیں اور دشمن کو شکست دے کر اس پر قابض ہو جاتے ہیں اور اس طرح رقیم (پٹیرا) عیسائیت کے آغوش میں آجاتا ہے۔ اب خدا کی مشیت فیصلہ کرتی ہے کہ یہ نوجوان بیدار ہوں، وہ بیدار ہو جاتے ہیں اور آپس میں سرگوشیاں کرتے ہوئے ایک دوسرے سے دریافت کرتے ہیں کہ ہم کتنی مدت سوتے رہے؟ ایک نے جواب دیا کہ ایک دن اور دوسرے نے کہا یا دن کا بھی کچھ حصہ، پھر کہنے لگے کہ ہم میں سے کوئی شہر جا کر کھانا لے آئے اور یہ سکہ لے جائے مگر جو بھی جائے اس طرح لین دین کرے کہ شہر والوں کو پتہ نہ لگ سکے کہ ہم کون ہیں اور کہاں ہیں؟ ورنہ مصیبت آجائے گی۔ بادشاہ ظالم بھی ہے اور مشرک بھی، وہ یا تو شرک پر آمادہ اور بے دینی پر مجبور کرے گا اور یا ہم سب کو قتل کر ڈالے گا اور یہ باتیں ہماری دین و دنیا کو برباد کر دینے والی ثابت ہوں گی۔

اب نوجوانوں میں سے ایک شخص سکہ لے کر شہر گیا وہاں دیکھا تو حالات بالکل بدل چکے ہیں، اور

نئے آدمی اور نیا طور وطریقہ نظر آرہا ہے مگر پھر بھی وہ ڈرتے ڈرتے ایک باورچی کی دوکان پر پہنچا اور کھانے پینے کی چیزیں خریدیں جب قیمت ادا کرنے لگا تو باورچی نے دیکھا کہ سکہ قدیم ہے اس طرح آخر بات کھل گئی، لوگوں کو جب اصل حقیقت معلوم ہوئی تو انھوں نے اس شخص کا خیر مقدم کیا اور اس عجیب وغریب معاملہ سے بہت زیادہ دلچسپی لی۔ کیونکہ عرصہ ہوا کہ یہاں مشرک بادشاہوں کا دور ختم ہو چکا تھا اور یہاں کے باشندوں نے عیسائیت قبول کر لی تھی۔

اس شخص نے جب یہ حال دیکھا تو اگرچہ عیسائیت پھیل جانے سے اس کو بے حد خوشی ہوئی مگر اپنے اور اپنے رفیقوں کے لیے یہی پسند کیا کہ دنیا کے ہنگاموں سے علیحدہ رہ کر یادِ خدا میں گزار دیں اس لیے کسی طرح مجمع سے جان بچا کر پہاڑ کی راہ لی اور اپنے رفقاء میں پہنچ کر سب حال کہہ سنایا۔ اُدھر شہریوں میں ان کی جستجو کا شوق پیدا ہوا اور انھوں نے آخر ان کو ایک غار میں پالیا، لوگوں نے اصرار کیا کہ وہ شہر چلیں اور اپنی پاک زندگی سے اہلِ شہر کو فائدہ پہنچائیں مگر وہ کسی طرح آمادہ نہیں ہوئے اور انھوں نے اپنی عمر کا باقی حصہ راہبانہ زندگی کے ساتھ اسی غار میں گذار دیا۔

جب ان مردانِ خدا راہبوں کا انتقال ہو گیا تو اب لوگوں میں چرچا ہوا کہ ان کی یادگار قائم ہونی چاہیے چنانچہ ان میں جو حضرات ذی اثر اور با اقتدار تھے انھوں نے کہا کہ ہم تو ان کے غار پر ہیکل (مسجد) تعمیر کریں گے، اور غار کے دہانہ پر ایک عظیم الشان ہیکل تعمیر کرا دیا۔

اور حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) کی روایت میں ہے کہ جب اس جوان کے پیچھے بادشاہِ وقت اور پبلک دونوں آئے تو غار کے قریب پہنچ کر وہ یہ نہ معلوم کر سکے کہ جوان کس جانب چلا گیا اور جب بہت جستجو کے بعد بھی اصحاب کہف کا پتہ نہ پا سکے تب مجبور ہو کر واپس ہو گئے اور ان کی یادگار میں پہاڑ پر ایک ہیکل (مسجد) تعمیر کر دیا۔[1]

**واقعہ کی تاریخی حیثیت**

ابن کثیر کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) اور دیگر بزرگوں کی نقول سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی بعثت سے کچھ زمانہ بعد کا ہے یعنی ابتداء دورِ مسیحی کا واقعہ ہے مگر مجھ کو اس قول میں یہ تردد ہے کہ محمد بن اسحٰق کی اس روایت سے جو

[1] فتح الباری ج، حدیث غار ... ۲ سورۂ کہف، البدایہ والنہایہ ج ۲

اس واقعہ کے شانِ نزول سے متعلق ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اصحابِ کہف کے بارے میں قریشِ مکہ کو یہود نے تعلیم کیا تھا کہ وہ دوسرے سوالوں کے ساتھ ایک سوال یہ بھی کریں اور یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ اس واقعہ کے ساتھ یہود کو خاص دلچسپی تھی، پس اگر یہ واقعہ عیسائیت کی ترقی سے متعلق تھا تو یہود کو اس کے ساتھ دلچسپی کے کیا معنی، کیونکہ یہودیت اور عیسائیت تو نبرد آزما اور حریف جماعتیں ہیں اس سے راجح یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ حضرت مسیح (علیہ السلام) سے بہت پہلے یہودی دور سے متعلق ہے۔ [1]

ابن کثیر (رحمہ اللہ) کا یہ سوال اگرچہ اہمیت رکھتا ہے لیکن تاریخی سندات اس کی تائید نہیں کرتیں بلکہ خلاف فیصلہ کرتی ہیں اس لیے کہ یہ مُسَلّم ہے کہ واقعہ زیر بحث شہر رقیم میں پیش آیا ہے اور یہ بھی طے شدہ حقیقت ہے کہ رقیم اپنی آبادی کے وقت سے کبھی یہودیت سے متاثر نہیں ہوا بلکہ نبطی دور میں بُت پرستی کا گہوارہ رہا اور اس کے بعد رومیوں نے جب اس پر قبضہ کر لیا تو وہ عیسائیت کی آغوش میں آگیا۔ چنانچہ رقیم کی تاریخ ان ہی دو عہدوں سے مبنی ہے تو پھر ایک خاص نکتہ کے پیشِ نظر محض ظن وتخمین سے کس طرح اس واقعہ کو یہودیت سے متعلق کہا جا سکتا ہے، اس بات کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ مسیحی مذہب کے ابتدائی دور میں اس قسم کے چند واقعات اور بھی پیش آئے ہیں جن میں مشرک اور بُت پرست بادشاہوں کے خوف سے عیسائیوں نے غاروں اور پہاڑوں میں جا کر راہبانہ زندگی اختیار کی ہے، چنانچہ ایک واقعہ شہر افسُس میں پیش آیا، ایک انطاکیہ میں اور ایک خود رُوم میں پیش آچکا ہے لہٰذا قرآنِ عزیز نے ایک ایسے ہی واقعہ کی خبر دی ہے جو شہر رقیم یا راقیم میں پیش آیا تھا۔

اس بنا پر ابن اسحٰق کی روایت کے متعلق دو باتوں میں سے ایک بات تسلیم کرنی چاہیئے اول یہ کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس روایت میں تین سوالات کا جو ذکر کیا ہے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ دو سوالات تو صرف یہودی علماء کے بنائے ہوئے تھے اور ان سے مشرکینِ مکہ قطعاً ناآشنا تھے مگر تیسرے سوال واصحابِ کہف کا سوال سے متعلق خود قریشِ مکہ کو بھی ایک حد تک علم تھا اس لیے کہ یہ واقعہ ان کے بہت قریب ہی پیش آیا تھا اور اگرچہ وہ رقیم کو بھول گئے تھے لیکن پیٹرا (بطرا) سے

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۳ سورۂ کہف [illegible] و البدایہ والنہایہ ج ۲۔

وہ بخوبی واقف تھے اور شام کی تجارت کی وجہ سے نبطیوں کے ساتھ اُن کا ہر وقت کا واسطہ تھا اور واقعہ بھی کچھ زیادہ طویل عرصہ کا نہ تھا پس ہو سکتا ہے کہ وہ اس واقعہ کی کچھ معمولی باتیں جانتے ہوں اور چونکہ اس کا تعلق اہلِ کتاب سے تھا اس لیے قریشیوں نے آپؐ کی صداقت کے امتحان کے لیے بمشورہ یہود اس کو بھی شامل کر لیا ہو اور چونکہ سوالات بہرحال مشرکین ہی کی جانب سے کیے گئے اس لیے حضرتِ ابنِ عباسؓ نے اختصار کے طور پر ان تینوں کو ایک ہی اسلوب سے نقل فرما دیا۔

یہ احتمال محض اندھیرے کا تیر نہیں ہے بلکہ قرآنِ عزیز کے اسلوبِ بیان سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے کیونکہ زیرِ بحث تینوں سوالات میں سے پہلے اور دوسرے سوالوں کے متعلق قرآن کا اسلوب بیان یہ ہے: "يَسْئَلُونَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ" "يَسْئَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ" یعنی ان دونوں جگہ سوال کی حیثیت کو نمایاں کیا ہے مگر تیسرے مسئلہ میں پیرایۂ بیان اس سے جُدا یہ اختیار کیا گیا ہے: "أَمْ حَسِبْتَ أَنَّ أَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيمِ كَانُوا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا" اِس جگہ اگرچہ خطاب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب ہے لیکن مقصود وہی لوگ ہیں جو سوال کر رہے ہیں اور اس واقعہ کی کچھ حقیقت جاننے کی وجہ سے اُسے ایک عجیب و غریب واقعہ سمجھتے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مزید تفصیلات کے طالب ہیں نیز اسی واقعہ میں قرآن نے یہ بھی کہا ہے کہ جب آپ اس واقعہ کو تفصیل کے ساتھ ان کو بتائیں گے تو آپ ان کی تعداد کے بارے میں مختلف چرچے سُنیں گے "سَيَقُولُونَ ثَلٰثَةٌ" "يَقُولُونَ خَمْسَةٌ" یہ بھی ثبوت ہے اِس امر کا کہ قریش کو ضرور اس واقعہ سے قدرے آگاہ تھے اور اسی لیے "الرَّقِيمِ" کہہ کر قرآن نے اِس جانب ان کو توجہ دلائی کہ تم آج جس کا لفظ کہہ کر ذکر کرتے ہو وہ دراصل تمھارے ہی بھائیوں کی حکومت کا مرکزی شہر "رقیم" ہے جو تم سے فراموش ہو چکا ہے۔

دوسری بات یہ کہ حضرتِ موسیٰ (علیہ السلام) کے زمانہ سے رومیوں کی فتوحات رقیم و حجر تک نبطیوں کے ہاتھوں یہودیوں کو ہر قسم کی تکالیف پیش آ چکی اور ان کے ساتھ سیاسی و مذہبی حریفانہ نبرد آزمائیاں بھی ہو چکی تھیں[1] اس لیے اگرچہ اس واقعہ میں عیسائیت کی صداقت کا ایک پہلو ضرور نکلتا تھا تاہم نبطیوں کی مشرکانہ زندگی اور رومیوں کے ہاتھوں ان کی تذلیل و تحقیر کا پہلو

[1] سفر، وباب ۲۰ آیات ۲۱-۱۰۷ و یسعیاہ۔

بھی کچھ کم نمایاں نہیں ہوتا تھا جو بہرحال اُن کی مسرت کا باعث تھا اور اِسی لیے غالباً یہود نے اس حیثیت کو نظر انداز کر دیا اور دُو سوالوں کے ساتھ اس تیسرے سوال کو بھی خصوصیت کے ساتھ منتخب کیا۔

**تفسیری حقائق**

(۱) اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا ۔ اے پیغمبر کیا تو خیال کرتا ہے کہ غار اور رقیم ہماری نشانیوں میں سے عجیب نشانی تھے؟ یعنی جو لوگ اس واقعہ کو خدا کی نشانیوں میں سے بہت زیادہ نشانی سمجھ رہے ہیں تو اُن پر یہ ظاہر کر دو کہ میرے خدا کے نشان یوں تو کائناتِ انسانی کے لیے بلاشبہ عجیب ہیں لیکن اس کی قدرتِ کاملہ کے پیشِ نظر اس کے دوسرے نشانات کے مقابلہ میں یہ کوئی عجیب وغریب نشان نہیں ہے اس لیے کہ زمین و آسمان کی صناعی، سورج، چاند اور ستاروں کی تخلیق اور ان کا حیرت زا نظامِ کشش، نظامِ فلکی کی یہ بے نظیر ترتیب، انسان پر وحیِ الٰہی کا نزول اور بظاہر اسبابِ حق کی کمزوری اور باطل کی قوت کے باوجود حق کی فتح اور باطل کی شکست ایسے امور ہیں جو اس واقعہ سے کہیں زیادہ تعجب خیز اور حیرت انگیز ہیں پس جن لوگوں کو یہ واقعہ بادی النظر میں عجیب معلوم ہوتا ہے وہ اگر قدرتِ حق کی مسطورہ بالا کار فرمائیوں پر نگاہِ حقیقت آگاہ سے غور کریں تو پھر ان کو بھی اقرار کرنا پڑے کہ بلاشبہ قدرتِ حق کے سامنے یہ واقعہ نہ عجیب ہے اور نہ حیرت انگیز البتہ عبرت زا اور بصیرت افزا ضرور ہے۔ لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ ۔

(۲) امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں اصحابِ کہف پر بھی ایک باب مُعنوَن کیا ہے مگر مسطورہ بالا واقعہ سے متعلق مشہور حدیث اُن کی شرائط کے مطابق ثابت نہیں ہوئی اس لیے انھوں نے سورہ کہف کی آیاتِ زیرِ بحث کی تفسیر اس روایت کے ذریعہ نہیں کی البتہ انھوں نے بنی اسرائیل کے ایک دوسرے واقعہ کے پیشِ نظر جو کہ "حدیث الغار" کے عنوان سے مُعنوَن ہے یہ سمجھا ہے کہ "اصحابِ کہف" اور "اصحابِ رقیم" دو الگ الگ شخصیتیں ہیں اور اصحابِ رقیم وہ حضرات ہیں جن کا ذکر "حدیث الغار" میں کیا گیا ہے اسی بنا پر انھوں نے حدیثِ غار کو "اصحاب الرقیم" کی تفسیر میں نقل فرمایا ہے۔ حدیثِ غار کا واقعہ یہ ہے :-

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم لوگوں سے پہلے بنی اسرائیل میں سے تین شخص سفر کر رہے تھے اثناءِ راہ میں بارش آگئی، وہ تینوں پہاڑ کی کھوہ (غار) میں پناہ لینے کے لیے داخل ہو گئے اتفاقاً پہاڑ کی اونچائی سے ایک بھاری پتھر لڑھک کر غار کے منہ پر آگرا اور اس کو ڈھانپ لیا۔ یہ دیکھ کر تینوں نے ایک دوسرے سے کہا: بھائی اب اس ویرانہ میں اس حادثہ سے نجات کی بظاہر اسباب تو کوئی صورت نظر نہیں آتی، البتہ اگر ہم میں سے ہر ایک شخص اپنی زندگی کے کسی ایسے کام کا ذکر کرکے جو اس نے ریا و نمود سے خالی صرف رضاءِ الٰہی کی خاطر کیا ہو رب العٰلمین کی درگاہ میں دعاء مانگے تو کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ اس مصیبت سے نجات دیدے، تب اُن میں سے ایک نے کہا خدایا تجھ کو خوب معلوم ہے کہ میں نے ایک مرتبہ ایک مزدور سے چند سیر چاولوں پر مزدوری کرائی تھی مگر کام کے بعد مزدور چلا گیا اور اُس کی اجرت میرے ذمہ باقی رہ گئی۔ فصل پر جب میں نے چاول کی کاشت کی تو اس کا حصہ بھی شامل کر لیا اور پیداوار پر اس کے حصہ کے چاولوں سے ایک عمدہ بیل خرید لیا۔ اس عرصہ میں مزدور آیا اور اس نے اپنی مزدوری کا مطالبہ کیا میں نے بیل کی رسی اس کے ہاتھ میں دے کر کہا کہ یہ تیری مزدوری کا حاصل ہے اور اس کو واقعہ سنایا وہ بہت خوش ہوا اور بیل کو لے گیا پس اے خدا اگر تیرے نزدیک میرا یہ عمل صرف تیری خوشنودی اور حقوق العباد کی حفاظت پر مبنی تھا تو اس کی برکت سے ہماری اس مصیبت کو دور کر دے چنانچہ اس کی دعاء کا یہ اثر ہوا کہ بھاری چٹان نے حرکت کی اور غار کے منہ سے کچھ ہٹ گئی اور کشادگی پیدا ہو گئی۔ اب دوسرے نے کہا خدایا تو دانا و بینا ہے کہ میرے والدین بہت ضعیف اور ناتواں تھے اس لیے میرا یہ دستور تھا کہ اپنی بکریوں کا دودھ دوہ کر شام کو سب سے پہلے اُن کو پلاتا اور بعد میں اپنے اہل و عیال کو شکم سیر کرتا ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ مجھ کو جنگل میں دیر ہو گئی دودھ لے کر گھر آیا تو والدین انتظار کرکے سو چکے تھے۔ اہل و عیال بھوک سے مضطرب اور بیتاب تھے اور دودھ کے خواہش مند مگر میں نے کہا کہ جب تک والدین اُٹھ کر نہ پی لیں گے کسی کو دودھ نہیں ملے گا اور والدین کی

نیند خراب نہ ہو اس لیے بیدار کرنا بھی نہیں چاہتا تھا اور تمام شب اسی طرح ان کے سرہانے دودھ لیے بیٹھا رہا کہ شاید درمیان میں بیدار ہوں اور بھوک ستائے مگر وہ صبح کو ہی بیدار ہوئے تب میں نے پہلے ان کو دودھ پلایا اور جب وہ سیراب ہوگئے تو بعد میں اہل وعیال کو دیا۔ پس اے خدا اگر میرا یہ عمل صرف تیری رضاء اور طاعتِ والدین کے ادا حق کے لیے تھا تو ہماری اس مصیبت کو ٹال دے، پتھر میں دوبارہ جنبش ہوئی اور چٹان اس درجہ ہٹ گئی کہ سامنے آسمان نظر آنے لگا، اب تیسرے شخص کی نوبت تھی اس نے کہا! الہٰی تو علیم وخبیر ہے کہ میں اپنی چچازاد بہن پر عاشق تھا اور اس کے وصل کے لیے بیتاب مگر وہ کسی طرح آمادہ نہیں ہوتی تھی بمشکل تمام میں نے اسکو سو درہم دے کر ورغلایا اور عمل بد پر آمادہ کرلیا جب میں اس کے قریب ہوا اور ہم دونوں کے درمیان کوئی حائل نہ رہا تو اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا بندۂ خدا! خدا کے خوف سے ڈر اور ناحق عصمت ریزی پر بے باک نہ بن' یہ سننا تھا کہ مجھ پر تیرا خوف غالب آیا اور میں اس سے الگ ہوگیا اور سو درہم بھی اسی کو بخش دیئے الٰہ العالمین اگر میرا یہ عمل خالص تیری رضا اور تیرے خوف کے پیشِ نظر تھا تو ہماری اس آفت کو دور کر اور ہم کو اس سے نجات دے' اس کے بعد فوراً چٹان حرکت میں آئی اور غار کے دہانہ پر سے لڑھک کر نیچے جا رہی اور وہ تینوں اسرائیلی اس مصیبت سے نجات پاکر مسرت وشادمانی کے ساتھ اپنی منزل پر روانہ ہوگئے۔

اِس روایت کی شرح کرتے ہوئے حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ بزار اور طبرانی نے سند حسن کے ساتھ نعمان بن بشیر سے یہی روایت نقل کی ہے اور اس میں یہ اضافہ ہے کہ نعمان فرماتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو رقیم کا ذکر کرتے ہوئے سُنا آپ غار میں بند رہ جانے والے تین آدمیوں کا واقعہ سُنا رہے تھے غالباً اسی بناء پر امام بخاریؒ نے رقیم کی تفسیر میں یہ حدیثِ غار روایت کی ہے۔[1]

لیکن اس تحقیق کے بعد جو گزشتہ سطور میں زیر بحث آچکی جب کہ قرآن بعض آثار صحابہ اور تاریخ سے یہ پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا کہ رقیم اس شہر کا نام ہے جس کے کسی پہاڑ کے غار میں اصحاب کہف جا چھپے تھے تو اب مسند بزار اور معجم طبرانی کی روایت کے مبہم الفاظ سے اصحاب رقیم کو اصحاب کہف سے

[1] فتح الباری ج ۶ حدیث الغار۔

جُدا سمجھنا صحیح نہیں ہے خصوصاً جب کہ روایتِ نعمان میں یہ احتمال موجود ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اصحابِ رقیم کا ذکر فرما رہے ہوں اور اس کے ساتھ اس واقعہ کا بھی ذکر فرمایا ہو اور بعد کو راوی نے غلطی سے یہ سمجھ لیا ہو کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیثِ غار کا واقعہ دراصل اصحابِ رقیم کی تفسیر میں ارشاد فرمایا ہے نیز جب کہ عربی زبان میں "رقیم" کے معنی "غار" کے کبھی نہیں آتے نہ حقیقۃً نہ مجازاً تو پھر یہ کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ ذاتِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے "رقیم" بمعنی "غار" کہہ کر حدیثِ غار کو اس کی تفسیر بتایا ہو؟ یہ راوی کا وہم ہے اور غالباً اسی لیے بزار اور طبرانی کے علاوہ کسی نے بھی اس اضافہ کو بیان نہیں کیا حالانکہ کتبِ حدیث میں یہ واقعہ بہ کثرت منقول ہے اور خود صحیح بخاری بھی اس اضافہ سے خالی ہے نیز اگر صحیح روایت سے یہ ثابت ہو گیا تھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے "الرقیم" کی تفسیر صاف اور واضح الفاظ میں خود ارشاد فرما دی ہے تو پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ جلیل القدر مفسرین اپنی اپنی تحقیق کے مطابق الرقیم کی تفسیر میں مختلف اقوال نقل فرماتے؟ اور خود حافظ ابنِ حجر عسقلانی بھی یہ جرأت نہ کرتے کہ اس روایت کے خلاف یہ فرمائیں کہ صحیح اور صواب یہ ہے کہ اصحابِ کہف اور اصحابِ رقیم دونوں ایک ہی ہیں، چنانچہ یہ فرماتے ہیں:

| | |
|---|---|
| وقال قوم اخبر اللّٰہ عن قصۃ اصحٰب | اور ایک جماعت نے یہ کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے |
| الکھف ولم یخبر عن قصۃ اصحٰب | اصحابِ کہف کا واقعہ تو ہم کو سنایا ہے مگر اصحابِ رقیم |
| الرقیم (قلت) ولیس کذٰلک بل السیاق | کا واقعہ نہیں بیان کیا (میں کہتا ہوں) یہ بات صحیح |
| یقتضی ان اصحٰب الکھف ھم | نہیں ہے بلکہ قرآن کا سیاق یہ چاہتا ہے کہ اصحابِ |
| اصحاب الرقیم۔ (فتح الباری ج ۶ ص ۲۹۳) | کہف اور اصحابِ رقیم ایک ہی ہیں۔ |

(۳) "فَضَرَبْنَا عَلٰٓی اٰذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا" مولانا آزاد نے "فَضَرَبْنَا عَلَى الْاٰذَانِ" کے معنی یہ بیان فرمائے ہیں "صاف معنی تو یہ ہیں کہ ان کے کان دنیا کی طرف سے بند ہو گئے تھے یعنی دنیا کی صدا ان تک نہیں پہنچتی تھی"[1] آیت کی تفسیر میں یہ قول ضعیف اور شاذ ہے[2]۔ اس کے برعکس مفسرین کے نزدیک مشہور تفسیر یہ ہے کہ ان پر نیند طاری ہو گئی تھی چونکہ نیند کی حالت میں آدمی

[1] ترجمان القرآن ج ۲ - [2] فتح الباری ج ۶ -

کوئی آواز نہیں سُنتا اس لیے اس حالت کو "ضرب علے الآذان" سے تعبیر کیا گیا مگر اس تفسیر کے متعلق مولانا آزاد یہ فرماتے ہیں: "اس تفسیر میں اشکال یہ ہے کہ عربی میں نیند کی حالت کے لیے "ضرب علی الآذان" کی تعبیر نہیں ملتی لیکن وہ (مفسرین) کہتے ہیں یہ ایک طرح کا استعارہ ہے۔ گہری نیند کی حالت کو "ضرب علے الآذان" کی حالت سے تشبیہ دی گئی ہے۔"[1]

ہمارے نزدیک مفسرین کی تفسیر ہی راجح ہے اور یہ استعارہ ہر زبان کے محاورات میں پایا جاتا ہے مثلاً جب ماں گود کے بچے کو لوریاں دے کر سُلاتی ہے تو اس کے کان اور بازو پر ہاتھ رکھ کر تھپکتی جاتی ہے اس لیے اُردو زبان میں بھی "کانوں کو تھپک دینا" نیند طاری کر دینے کے لیے بولا جاتا ہے چنانچہ شیخ الہند (نور اللہ مرقدہٗ) نے اس جملہ کا ترجمہ اسی طرح کیا ہے:[2]

"پھر تھپک دیئے ہم نے ان کے کان اس کھوہ (غار) میں چند برس گنتی کے" (کہف)

علاوہ ازیں عربی زبان میں "ضرب علے اذنہ" کے معنی "منعہ ان یسمع" کے آتے ہیں یعنی اس کو سننے سے روک دیا" اب سننے سے روک دینے کی متعدد صورتیں ہیں: ایک یہ کہ کوئی شخص بستی سے دور جنگل میں غار کی کھوہ میں جا بیٹھا اور اس لیے دنیا کی باتوں سے اس کے کان ناآشنا ہو گئے، دوسری یہ کہ وہ بہرا ہو گیا اور سننے سے معذور کر دیا گیا۔ تیسری یہ کہ وہ سو گیا اور اس کے دیگر حواسِ ظاہرہ کی طرح کان بھی سننے سے معطل ہو گئے۔ لہٰذا "ضرب علی الآذان" کی تعبیر ان سب صورتوں کے لیے یکساں قابلِ استعمال ہے اور استعارہ و تشبیہ ہے تو تینوں معنی کے لیے ہے البتہ مولانا آزاد کی تفسیر میں یہ اشکال ضرور لازم آتا ہے کہ اگر "ضرب علی الآذان" کے معنی یہ ہیں کہ اُن کے کان دنیا کی طرف سے بند ہو گئے تھے" یعنی وہ بحالت بیداری عام زندگی کے مطابق بستی سے دُور پہاڑ کے غار میں راہبانہ زندگی بسر کر رہے تھے تو پھر اس آیت کے کیا معنی ہوں گے؟ "وَكَذٰلِكَ بَعَثْنٰهُمْ لِيَتَسَآءَلُوْا بَيْنَهُمْ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ" اور ہم نے ان کو اٹھایا کہ وہ آپس میں سوال کریں ایک نے ان میں سے

[1] ترجمان القرآن ج ۲۔ [2] ترجمہ حضرت مولانا محمود الحسن نور اللہ مرقدہٗ۔

کہا تم یہاں کتنی مدت ٹھہرے رہے ہو؟ انھوں نے جواب دیا ایک دن یا دن کا کچھ حصہ؟

کیا یہ آیت اپنے صاف معنی میں یہ ظاہر نہیں کرتی کہ "ضرب علی الآذان" کی صاف تعبیر یہاں وہی ہے جو جمہور مفسرین کے نزدیک صحیح اور راجح ہے بلکہ ایسے موقع پر "بعثنٰھم" کی تعبیر کا تقاضا تو یہ ہے کہ مفسرین کی تفسیر کے علاوہ دوسرے معنی لینا قطعاً بے محل ہیں۔

اس جگہ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ قرآن نے اصحابِ کہف کی اس گفتگو کے بعد جو وہاں سوئے رہنے کی مدت سے متعلق ہے ان کی یہ گفتگو بھی نقل کی ہے کہ ان میں سے کوئی شہر جائے اور پوشیدہ طور پر جائے کہ کسی کو خبر نہ ہونے پائے' یہ بھی جمہور کی تفسیر کو قوت پہنچاتی ہے اس لیے کہ غار میں مدتِ قیام پر بات چیت اور پھر فوراً کھانے کی خواہش کا اظہار دونوں باتوں کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑیے تو صاف معنی وہی بنتے ہیں جو مفسرین نے بیان کیے ہیں اور مولانا آزاد کی یہ تفسیر کہ عرصۂ دراز کے بعد ان کو شہر کی حالت معلوم کرنے کا خیال پیدا ہوا اور اس سلسلہ میں ان کے درمیان یہ گفت گو ہوئی" تکلّفِ بارِد ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مولانا آزاد کو شروع سے آخر تک اس واقعہ کی تمام آیات میں تکلفِ بارد اختیار کرنا پڑا ہے مثلاً جب قرآن نے ان کی حالت بیان کرتے ہوئے یہ کہا "وَتَحْسَبُهُمْ أَيْقَاظًا وَهُمْ رُقُودٌ" تو ان کو گمان کرے گا کہ وہ بیدار ہیں حالانکہ وہ خواب میں ہیں" تو مولانا موصوف کو اپنی تفسیر کو صحیح بنانے کے لیے "یقظہ" کے معنی زندہ اور "رقد" کے معنی "مُردہ" کے اختیار کرنے پڑے ہیں حالانکہ اُن کے حقیقی معنی "بیداری" اور "نیند" کے ہیں اور یہ معنی بلا تکلف یہاں صادق آتے ہیں پس مولانا پر بھی وہی بات صادق آتی ہے جو انھوں نے مفسرین کی مسلمہ تفسیر پر لازم کی ہے یعنی "ففی الکلام تجوز بطریق الاستعارۃ" (کلام میں استعارہ کی راہ سے مجاز اختیار کیا گیا ہے)

بلکہ اگر غائر نظر سے دیکھیے تو "حقیقت کے صادق ہوتے ہوئے مجاز اختیار کرنا" مولانا آزاد کی تفسیر پر تو صادق آتا ہے لیکن جمہور مفسرین کی تفسیر پر صادق نہیں آتا۔

مولانا آزاد نے آیاتِ زیرِ بحث کی تفسیر میں اگرچہ مفسرین کے مختار قول کے خلاف ضعیف

قول کو اپنا مختار بنایا ہے تاہم مفسرین کے اقوال کو احتمال کے درجہ میں تسلیم کرتے ہوئے ان کی تائید میں جو جملے ارشاد فرمائے ہیں وہ بلاشبہ ایسے حضرات کے لیے خصوصاً قابلِ مطالعہ ہیں جو اس قسم کے واقعات کو محض تعجب خیز سمجھ کر خلافِ عقل کہہ دینے کے عادی ہیں۔ فرماتے ہیں:۔

"بہرحال اگر یہاں "ضرب علی الآذان" سے مقصود نیند کی حالت ہو تو پھر مطلب یہ قرار پائے گا کہ وہ غیر معمولی مدت تک نیند کی حالت میں پڑے رہے اور ثم بعثنٰھم کا مطلب یہ کرنا پڑے گا کہ اس کے بعد نیند سے بیدار ہو گئے۔

یہ بات کہ ایک آدمی پر غیر معمولی مدت تک نیند کی حالت طاری رہے اور پھر بھی زندہ رہے طبی تجارب کے مسلمات میں سے ہے اور اس کی مثالیں ہمیشہ تجربہ میں آتی رہتی ہیں پس اگر اصحابِ کہف پر قدرتِ الٰہی سے کوئی ایسی حالت طاری ہوگئی ہو جس نے غیر معمولی مدت تک انھیں سُلائے رکھا تو یہ کوئی مُستبعد بات نہیں۔" (ترجمان القرآن ج ۲)

(۴) "ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَیُّ الْحِزْبَیْنِ اَحْصٰی لِمَا لَبِثُوْٓا اَمَدًا" پھر ہم نے انکو (خواب سے) اُٹھایا تاکہ معلوم کریں کہ دو جماعتوں میں سے کس نے اِس مُدت کو محفوظ رکھا جس میں وہ (غار کے اندر) رہے۔

یہاں دُو جماعتوں میں سے ایک اصحابِ کہف کی اور دوسری اہلِ شہر کی جماعت مراد ہے مطلب یہ ہے کہ یہ اس لیے کیا کہ صحیح مدت ظاہر ہو جائے اور یہ معلوم کرنے کے بعد کہ خدائے تعالیٰ نے ان کو برسوں تک بحالتِ خواب زندہ رکھا جب کہ وہ زندگی کی بقاء کے وسائل سے یکسر محروم تھے، لوگوں کو یہ یقین ہو جائے کہ بلاشبہ اسی طرح وہ مخلوق کو مرنے کے بعد بھی زندہ کرے گا اور بیشک قیامت اور بعث بعد الموت کا مسئلہ حق ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے جب اُن کو بیدار کیا اور اُن میں سے ایک نوجوان شہر میں کھانا خریدنے گیا تو اس زمانہ میں بستی والوں کے درمیان "بعث بعد الموت" پر جھگڑا اور مناقشہ جاری تھا ایک جماعت کہتی تھی کہ فقط روح کا بعث ہوگا اور دوسری جماعت قائل تھی کہ روح اور جسم دونوں کو زندہ ہونا ہے یہ تو نصاریٰ کی جماعتیں تھیں اور جو بطی مُشرک

آباد تھے وہ سرے سے بعث بعد الموت ہی کے منکر تھے ایسے نازک وقت میں اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو غار سے بیدار کر کے بھیجا اور اس طرح جب اصحابِ کہف کا واقعہ سب پر ظاہر ہو گیا تو اُس نے علیٰ رؤس الاشہاد یہ نظیر قائم کر دی کہ جس طرح برسوں تک اسبابِ حیات سے محروم رہنے کے باوجود روح کے ساتھ جسم بھی صحیح و سالم باقی رہا اسی طرح "بعث بعد الموت" روح اور جسم دونوں سے تعلق رکھتا ہے اور جس طرح سوتے رہنے کے بعد اصحابِ کہف بیدار کر دیے گئے اسی طرح قبر (عالمِ برزخ) میں سینکڑوں اور ہزاروں برس مُردہ رہنے کے بعد قیامت میں زندہ کر دیے جائیں گے۔" وَكَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوْٓا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيْهَا اِذْ يَتَنَازَعُوْنَ بَيْنَهُمْ اَمْرَهُمْ اور پھر (دیکھو) اسی طرح یہ بات بھی ہوئی کہ ہم نے لوگوں کو اُن کے حال سے واقف کر دیا (ان کی بات پوشیدہ نہ رہ سکی) اور اس لئے واقف کر دیا کہ لوگ جان لیں کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور قیامت کے آنے میں کوئی شبہ نہیں[1]

آیت کی یہ تفسیر عکرمہ کی روایت سے ماخوذ ہے اور اسی کو عام طور پر اختیار کیا گیا ہے لیکن مولانا آزاد نے "لَا رَيْبَ فِيْهَا" کو "اِذْ يَتَنَازَعُوْنَ بَيْنَهُمْ اَمْرَهُمْ" سے جدا کرتے ہوئے آیت کے معنی یہ کیے ہیں: اسی وقت کی بات ہے کہ لوگ آپس میں بحث کرنے لگے ان لوگوں کے معاملہ میں کیا کیا جائے لوگوں نے کہا اس غار پر ایک عمارت بنا دو۔ حضرت شاہ ولی اللہ نوّر اللہ (مرقدہٗ) نے بھی یہی ترجمہ کیا ہے:۔

"دراں وقتیکہ نزاع می کردند مرداں درمیانِ خود در مقدمۂ ایشاں پس گفتند عمارت کنید بر غارِ ایشاں"

یعنی یہ حضرات "يَتَنَازَعُوْنَ" میں قیامت کے متعلق شہریوں کے باہم اختلاف کو مراد نہیں لیتے بلکہ اس گفتگو کو مراد لیتے ہیں جو اصحابِ کہف کے مرقد پر ہیکل تعمیر کرنے کے بارے میں ہوئی۔

(۵) "فَاْوٗٓا اِلَى الْكَهْفِ" ہم نے واقعہ کی جو تفصیلات بیان کی ہیں اور قرآن کی اندرونی اور تاریخ و روایات کی بیرونی شہادتوں سے جن امور کو ثابت کیا ہے ان سے جدا عام مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ واقعہ یہودِ بنی اسرائیل کے قدیم زمانہ کا ہے جو شہر افسس میں ایک مشرک

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۳ ع عکرمہ

بادشاہ دقیانوس کے زمانۂ حکومت میں پیش آیا۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ انھوں نے عیسائیت نہیں بلکہ یہودیت کو قبول کر لیا تھا اور بادشاہِ وقت کے ظلم وجور سے بچ کر غار میں پناہ گزیں ہوگئے تھے۔ لیکن ہم اس پر گذشتہ سطور میں سیر حاصل بحث کر چکے اور ثابت کر چکے ہیں کہ اس واقعہ کا تعلق عیسائی دور سے ہے۔

(۶) سَيَقُولُونَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ وَيَقُولُونَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًا بِالْغَيْبِ" اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ سے متعلق ان حقائق کے اظہار کے بعد جو اس کے مقصدِ تذکیر کے لیے مفید تھے۔ واقعہ کی ان جزئیات کے متعلق جو محض تاریخی حیثیت رکھتی ہیں اور ان کے جان لینے سے کوئی خاص فائدہ مرتب نہیں ہوتا۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ نصیحت فرمائی کہ وہ ان لاحاصل بحثوں سے پرہیز کریں اور ان پر سرسری طور سے گذر جائیں اور بیکار باتوں کے کھوج لگانے کی فکر نہ کریں۔ مثلاً یہ کہ ان نوجوانوں کی تعداد کیا تھی؟ ان کی عمروں کا تناسب کیا تھا؟ وہ غار میں کتنی مدت مقیم رہے؟ مدت کی صحیح مقدار کیا ہے؟ وغیرہ "قُلْ رَّبِّيْٓ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَّا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ ڬ فَلَا تُمَارِ فِيْهِمْ اِلَّا مِرَاۗءً ظَاهِرًا ۠ وَّلَا تَسْتَفْتِ فِيْهِمْ مِّنْهُمْ اَحَدًا" (اے پیغمبر) کہہ دے ان کی اصل گنتی تو میرا پروردگار ہی بہتر جانتا ہے کیوں کہ ان کا حال بہت کم لوگوں کے علم میں آیا ہے" اور جب صورتِ حال یہ ہے) تو لوگوں سے اس بارہ میں بحث ونزاع نہ کر مگر صرف اس حد تک کہ صاف صاف بات میں ہو اور نہ ان لوگوں میں سے کسی سے اس بارہ میں کچھ دریافت کر؟ اس لیے کہ جو بات بھی ہوگی اٹکل سے ہوگی۔

تاہم حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہ) نے یہ فرماتے ہوئے کہ ان قلیل میں سے جن کو ان کی تعداد کا علم ہے ایک میں بھی ہوں، ارشاد فرمایا کہ وہ سات تھے اور آٹھواں اُن کا کتا تھا اور یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے تعداد کے متعلق پہلے دو مقولوں کا ذکر کرنے کے بعد یہ فرمایا کہ یہ باتیں اٹکل کے تیر ہیں" مگر تیسرا قول ذکر کرنے کے بعد ایسی کوئی بات نہیں کہی اس لیے یہی صحیح تعداد ہے۔[1]

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۳۔

(۷) "وَلَبِثُوْا فِیْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِیْنَ وَازْدَادُوْا تِسْعًا" اس آیت کا ترجمہ عام طور پر مفسرین نے اس طرح کیا ہے کہ گویا اللہ تعالیٰ اپنی جانب سے یہ اطلاع دے رہا ہے کہ وہ تین سو نو سال غار میں رہے مگر حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم سے بعض روایات میں جو معنی مذکور ہیں ان کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگوں کا مقولہ ہے اللہ تعالیٰ کا اپنا قول نہیں ہے یعنی وہ آیت "وَلَبِثُوْا" الآیۃ کو اس سے قبل کے جملہ "یَقُوْلُوْنَ" کے تحت میں داخل سمجھتے اور یہ معنی کرتے ہیں کہ جس طرح لوگ (عیسائی) اصحاب کہف کی تعداد کے متعلق مختلف باتیں کہتے ہیں اور کہیں گے اسی طرح وہ یہ بھی کہتے ہوئے پائے جاتے ہیں کہ اصحاب کہف تین سو نو سال تک غار میں رہے چنانچہ قاضی شوکانی اپنی تفسیر فتح القدیر میں نقل فرماتے ہیں:

اخرج ابن ابی حاتم وابن مردویہ عن ابن عباس قال ان الرجل لیفسر الآیۃ ویری انها کذلك فیهوی ابعد ما بین السماء والارض ثم تلا "وَلَبِثُوْا فِیْ كَهْفِهِمْ" ثم قال کم لبث القوم قالوا ثلٰث مائة وتسع قال لو کانوا لبثوا کذلك لم یقل الله قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا ولکنه حکی مقالة القوم فقال

ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے نقل کرتے ہیں انھوں نے فرمایا آدمی آیت کی تفسیر کرتا ہے اور یہ سمجھ لیتا ہے کہ اس نے بالکل صحیح تفسیر کی ہے حالانکہ وہ اس میں فاش غلطی کرتا ہے گویا وہ اس آسمان و زمین سے بھی دور جا گرا۔ حضرت ابن عباسؓ نے یہ فرما کر بعد میں اس آیت کو تلاوت کیا "وَلَبِثُوْا فِیْ كَهْفِهِمْ" اور فرمانے لگے لوگوں نے یہ سوال پیدا کیا کہ اصحاب کہف کتنے عرصہ غار میں رہے اور خود ہی یہ کہنے لگے کہ وہ تین سو نو سال غار میں رہے۔ پھر حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے ارشاد فرمایا کہ اگر اصحاب کہف واقعی اتنے عرصہ ہی غار میں رہے ہوتے تو اللہ تعالیٰ یہ نہ فرماتا "قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا" آپ کہہ دیجیے اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ وہ کتنے عرصہ مقیم رہے" دراصل یہ اللہ تعالیٰ کا مقولہ نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے قول کو حکایت کیا ہے اور ان کی گفتگو کو

له تفسیر ابن کثیر ج ۳ ۔

| | |
|---|---|
| سَيَقُولُونَ ثَلٰثَةٌ اِلٰی قَوْلِهٖ | یہاں سے شروع کیا ہے "سَيَقُولُونَ ثَلٰثَةٌ اِلٰی قَوْلِهٖ رَجْمًا |
| رَجْمًا بِالْغَيْبِ" فاخبرانهم | بِالْغَيْبِ" پھر اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی کہ وہ صحیح تعداد سے |
| لا یعلمون ثم قال سَيَقُولُونَ | واقف نہیں ہیں اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے لوگوں کا دوسرا |
| وَلَبِثُوا فِي كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ | یہ مقولہ بیان کیا کہ وہ کہتے ہوئے پائے جائیں گے۔ |
| مِائَةٍ سِنِيْنَ وَازْدَادُوا تِسْعًا[1] | "وَلَبِثُوا فِي كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِيْنَ وَازْدَادُوا تِسْعًا۔ |

اور ابن کثیر نے تفسیر میں بروایت قتادہ عبد اللہ بن مسعود سے یہ نقل کیا ہے :-

| | |
|---|---|
| قال قتادة وفی قراءة عبد الله | قتادہ۔ کہتے ہیں اور عبد اللہ بن مسعود کی قرارت میں |
| "وقالوا ولبثوا" یعنی انه قاله الناس | یہ ہے "وقالوا ولبثوا" یعنی یہ مقولہ لوگوں کا ہے۔ |
| وهکذا قال قتادة ومطرف[2] | قتادہ اور مطرف کی رائے بھی یہی ہے۔ |

ہمارے نزدیک بھی یہی معنی راجح ہیں کیونکہ قرآن کا سیاق اسی کو ظاہر کرتا ہے اس لیے کہ ان ہی آیات میں قرآن نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت کی ہے کہ وہ اس قسم کی غیر مفید اور اٹکل کی باتوں کے پیچھے نہ پڑیں پس جب کہ "وَلَبِثُوا فِي كَهْفِهِمْ" الآیہ کے بعد یہ کہا گیا "اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوا لَهٗ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" تو اس سے یہ بات صاف ہوگئی کہ غار میں قیام کی مدت کا مسئلہ بھی اندھیرے کا تیر ہے اور اس لیے صحیح طریق کار اس بارے میں بھی یہی ہے کہ اس کو علم الٰہی کے سپرد کر دیا جائے لہٰذا اس صورت میں یہ مقولہ اللہ تعالیٰ کا نہیں بلکہ ان لوگوں کا ہے جو زمانۂ نبوت میں اس واقعہ کی تفصیلات کے سلسلہ میں بے فائدہ اٹکل کے تیر چلاتے رہتے تھے۔

بایں ہمہ ابن کثیر عام مفسرین کے معنی کو ہی راجح کہتے ہیں، اور حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کی روایت کو منقطع اور ان کی قرأۃ کو شاذ ثابت کر کے اس کو ناقابلِ حجت قرار دیتے ہیں مگر حضرت عبد اللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) کی صحیح روایت کا ان کے پاس کیا جواب ہے؟ ابن کثیر یہ بھی فرماتے ہیں کہ

[1] فتح القدیر سورۂ کہف۔ [2] جلد ۳ —— حضرت عبد اللہ بن مسعود کی قرأت سے یہ مراد ہے کہ وہ اس مقام پر بطور تفسیر کے یہ پڑھ دیا کرتے تھے۔ (مؤلف)

اللہ تعالیٰ نے اوّل تین سو سال فرمایا اور یہ شمسی حساب کے مطابق ہے اور پھر وَازْدَادُوْا تِسْعًا کہہ کر نو سال کا اور اضافہ اس لیے کیا تاکہ شمسی حساب قمری حساب کے ساتھ مطابق ہو جائے مگر اوّل نظر میں بآسانی کہا جا سکتا ہے کہ آیت کی یہ تفسیر نہیں بلکہ تاویل ہے اس لیے کہ ایک طرف تو قرآن تذکیر و موعظت کے مقصد سے زائد تفصیلات کو دور از کار کہتا ہے اور دوسری جانب خود ہی ایسی باتوں کے درپے ہوتا ہے جس کا موعظت و بصیرت سے کوئی خاص تعلق نہیں بلکہ خالص علمِ ہیئت کا مسئلہ ہے[1]۔ ابن کثیر کے نزدیک یہ مقولہ اس لیے بھی لوگوں کا نہیں ہو سکتا کہ نصاریٰ کے یہاں قیامِ کہف کی مدّت تین سو سال مشہور ہے اور نو کا اُن کے یہاں کوئی ذکر نہیں پایا جاتا مگر یہ بات بھی صحیح نہیں ہے اس لیے کہ دوسرے مفسّرین نے ان کے دونوں قول نقل کیے ہیں۔ شاید ابن کثیر کی نظر سے دوسرا مقولہ نہیں گزرا۔

(۸) وَتَرَى الشَّمْسَ إِذَا طَلَعَتْ تَّزٰوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ (الیٰ) وَلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا" ان آیات میں قرآنِ عزیز نے اصحابِ کہف کی اس حالت کا ذکر کیا ہے جب کہ وہ شروع میں غار کے اندر جا کر پوشیدہ ہوئے تھے اور یہ اس لیے کہ ان آیات کے متصل ہی جو آیات اس واقعہ پر روشنی ڈال رہی ہیں، ان میں یہ باتیں مذکور ہیں، وہ نیند سے بیدار ہوئے اور انھوں نے ایک رفیق کو کھانا لانے کے لیے شہر بھیجا اُس کی وجہ سے شہر والوں پر حقیقتِ حال ظاہر ہوگئی جملہ معترضہ کے طور پر اللہ تعالیٰ نے لوگوں پر اس حقیقتِ حال کے منکشف کر دینے کی مصلحت بیان کی، وہ دوبارہ غار میں عزلت گزیں ہوگئے اور اہلِ شہر نے اس غار کے دہانہ پر ہیکل تعمیر کر دیا۔ ان واقعات کے بیان کرنے کے بعد ان آیات میں اس کیفیت کو بیان کیا جا رہا ہے جو اصحابِ کہف پر نیند طاری ہونے کی حالت میں گذری یعنی اس غار کی اندر سے کیا حالت تھی، دھوپ اور تازہ ہوا پہنچنے نہ پہنچنے کی کیا کیفیت تھی، ایک طویل مدّت تک خواب کی حالت میں رہنے کی کیا شکل تھی، کیا ایک ہی کروٹ پر سویا کیے یا زندہ انسانوں کی طرح کروٹیں بدلتے رہتے تھے، اُن کا کُتا کس طرح

---

[1] نیز از روئے حساب بھی نو کا اضافہ تطابقِ حساب کے لیے کافی نہیں ہے۔

وفاداری کا حق ادا کر رہا تھا۔ اِس مجموعی کیفیت کا اثر باہر سے جھانک کر دیکھنے والے انسان پر کیسا پڑتا تھا!

جمہور مفسّرین نے یہی تفسیر کی ہے اور آیات کے باہم نظم و ترتیب کے لحاظ سے یہ بہت صاف اور واضح تفسیر ہے مگر مولانا آزاد اِن تمام آیات کو اصحابِ کہف کے دوبارہ غار میں عزلت گزین ہو جانے سے متعلق سمجھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ قرآن یہ تفصیلات اس حالت کی بیان کر رہا ہے جب ان پر موت طاری ہو چکی تھی اور پھر انھوں نے "ایقاظ" میں "یقظ" کے معنی زندگی اور "رقود" میں "رقد" کے معنی موت کے اختیار کر کے کافی تکلّف کیا ہے اور بعض مقدمات کے اضافہ کے ساتھ اپنی تفسیر کو دلچسپ بنانے کی کوشش کرتے ہوئے یہ فرمایا ہے کہ چونکہ مفسّرین نے اِن آیات کو اصحابِ کہف کے پہلی مرتبہ غار میں پوشیدہ ہو جانے سے متعلق کہا ہے اس لیے اُن کو آیات کی تفسیر میں حیرانی پیش آئی ہے مگر اس پوری تفصیل کے مطالعہ سے بآسانی یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ آیاتِ زیرِ بحث کی تفسیر میں مفسّرینِ قدیم کو تو کوئی حیرانی پیش نہیں آئی البتہ خود مولانائے موصوف کو اپنی اختیار کردہ تفسیر کی وضاحت میں ضرور تکلّفاتِ باردہ اختیار کرنے پڑے ہیں اور سچ پوچھیے تو اِس مقام پر ان کی تفسیر تاویل ہو کر رہ گئی ہے۔

(۹) "ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ" یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے۔

یعنی پہاڑ کے اندر غار کی یہ مجموعی کیفیت کہ غار کا دہانہ اگرچہ تنگ ہے مگر اس کے اندر بہت کافی وسعت ہے اس کا جائے وقوع شمالاً و جنوباً ہے کہ جس کی وجہ سے طلوع و غروب دونوں حالتوں میں آفتاب غار کے سامنے سے داہنے اور بائیں کترا کر نکل جاتا ہے اور غار اس کی تپش سے محفوظ رہتا ہے اور دوسری جانب منفذ ہونے کی وجہ سے ہوا اور روشنی بقدرِ ضرورت پہنچتی رہتی ہے گویا جسمانی بقاء کے لیے جو چیز مضر ہے یعنی تپش اس سے حفاظت اور جو بقاءِ حیات کے لیے ضروری شے ہے یعنی روشنی اور ہوا اس کی موجودگی یہ ایسے امور ہیں جو خدائے تعالیٰ کی کھلی نشانیاں کہی جا سکتی ہیں کہ اُن کی بدولت برسوں تک خدا کے نیک بندے دنیا کے علائق سے جدا ہو کر غار میں بحالتِ خواب بسر کر سکے اور ایسی حالت میں بسر کر سکے جب کہ سامانِ خور و نوش

اور بقاءِ حیات کے دیگر وسائلِ دنیوی سے قطعاً محروم تھے۔

(۱۰) عام طور پر مشہور ہے کہ اصحابِ کہف ابھی تک غار میں سورہے ہیں اور زندہ ہیں مگر یہ صحیح نہیں ہے اس لیے کہ حضرتِ ابنِ عباسؓ نے بصراحت یہ فرمایا ہے کہ ان کا انتقال ہوچکا۔

| | |
|---|---|
| قال قتادۃ غزا ابن عباس مع حبیب بن مسلمۃ فمرّوا بکھف فی بلاد الروم فراؤا فیہ عظاما فقال قائل ھذہ عظام اھل الکھف فقال ابن عباس لقد بلیت عظامھم من اکثر من ثلث مائۃ سنۃ۔ (رواہ ابن جریر)[۱] | قتادہ کہتے ہیں: ابن عباسؓ ایک مرتبہ حبیب بن مسلمہ کے ساتھ ایک غزوہ میں تشریف لے گئے، راہ میں بلادِ روم میں اس مقام پر گذر ہوا جہاں پہاڑی غاروں کا سلسلہ ہے وہاں انھوں نے کسی غار کے اندر انسانوں کی ہڈیاں یا ڈھانچے دیکھے تو کسی کہنے والے نے کہا یہ اہلِ کہف کی ہڈیاں معلوم ہوتی ہیں اس پر حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ ان کی ہڈیاں تو تین سو سال سے بھی زیادہ عرصہ ہوا کہ بوسیدہ ہوچکیں۔ |

(۱۱) قرآنِ عزیز اور صحیح روایات سے یہ قطعاً معلوم نہیں ہوتا کہ اصحابِ کہف کے نام کیا تھے بلکہ قرآنِ عزیز نے تو مشرکینِ مکہ یا نبطی اور رومی عیسائیوں کے یہاں اس سلسلہ میں جو اٹکل کی باتیں مشہور تھیں ان پر اعتماد رکھنے اور ان کی تحقیقات میں پڑنے سے روکا ہے البتہ اسرائیلی روایات میں ان کے نام یہ بتائے گئے ہیں مکسلمینا، تملیخا، مرطونس، کسطونس، بیرونس، دنیموس، نطونس اور ان کے کتے کا نام قطمیر یا حمران ہے۔[۲]

(۱۲) وَكَلْبُهُم بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيدِ " کتے نے وفاداری اور جاں نثاری کا ثبوت دیا اور صلحاء کی صحبت پائی تو قرآن نے بھی اس کا ذکرِ خیر کرکے اس کو وہ عزت بخشی کہ انسانوں کے لیے قابلِ رشک بنا دیا۔ شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے کیا خوب کہا ہے:-

سگِ اصحابِ کہف روزے چند — پئے نیکاں گرفت، مردم شد

پسرِ نوح با بداں بنشست — خاندانِ نبوتش گم شد

[۱] ... [۲] ...

(۱۳) "وَلَا تَقُولَنَّ لِشَيْءٍ إِنِّي فَاعِلٌ ذَٰلِكَ غَدًا إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ" اور کسی چیز کے لیے یہ نہ کہو کہ کل میں اس کو ضرور کروں گا مگر (یہ کہہ لیا کرو) یہ کہ خدا چاہے تو۔"

اِس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ تعلیم دی ہے کہ جب مستقبل میں کسی کام کا ارادہ ہو تو دعویٰ کے ساتھ یہ نہیں کہنا چاہیے کہ میں اس کو ضرور کروں گا اس لیے کہ کون جانتا ہے کہ کل کیا ہوگا اور کہنے والا اس کائنات میں موجود بھی ہوگا یا نہیں لہٰذا اُس معاملہ کو خدا کے سپرد کرتے ہوئے "انشاء اللہ" ضرور کہنا چاہیے۔

(۱۴) "وَقُلْ عَسَىٰ أَن يَهْدِيَنِ رَبِّي لِأَقْرَبَ مِنْ هَٰذَا رَشَدًا" تم کہو اُمید ہے میرا پروردگار اس سے بھی زیادہ کامیابی کی راہ مجھ پر کھول دے گا۔"

اِس آیت میں اس جانب اشارہ ہے کہ عنقریب ایسا ہی معاملہ تم کو بھی پیش آنے والا ہے بلکہ وہ اس سے بھی عجیب وغریب ہوگا یعنی اپنا آبائی وطن چھوڑنا پڑے گا۔ راہ میں غارِ ثور کے اندر کئی دن تک پوشیدہ رہو گے۔ دشمن غارِ ثور کے مُنہ پر پہنچ جانے کے باوجود تم کو نہ پاسکیں گے۔ تم بخیر وخوبی مدینہ پہنچ جاؤ گے اور وہاں تم پر فتح وکامرانی کی ایسی راہیں کھول دی جائیں گی جو اس معاملہ سے کہیں زیادہ عظیم وجلیل ہوں گی یہ سورت مکّی عہد کی آخری سورتوں میں سے ہے اس لیے اس کے نزول کے بہت تھوڑے زمانہ بعد ہجرت کا وہ عظیم الشان واقعہ پیش آیا جس نے مسلمانوں کے دورِ حیات میں حیرت زا انقلاب پیدا کردیا اور باطل نے حق کے سامنے سپر ڈال دی۔

(۱۵) "لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِم مَّسْجِدًا" ہم ضرور اُن کے مرقد پر ایک عبادت گاہ بنائیں گے۔ معلوم نہیں کہ اس کہنے سے ان لوگوں کا مقصد کیا تھا؟ یہ کہ واقعی ان کے مرقد پر ہیکل بناکر اس کو سجدہ گاہِ عام وخاص بنائیں گے کیونکہ یہ خدا کے مقبول بندے تھے تب تو ان عیسائیوں کا یہ عمل اسلام کی نگاہ میں قابلِ مذمّت ونفرت ہے اس لیے کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا ہے: "لعن اللہ الیھود والنصاریٰ اتخذوا قبور انبیاءھم مساجد"[1] "اللہ تعالیٰ یہود ونصاریٰ پر لعنت بھیجے کہ انھوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو مسجد (سجدہ گاہ) بنالیا تھا یعنی

[1] رواہ الصحیحین۔

قبروں کو سجدہ کرتے تھے اور پھر ارشاد فرمایا "لاتتخذوا قبری عیدا" لوگو! تم میری قبر کو عید کی طرح تہوار نہ بنا لینا۔

اور اگر ان کا مطلب یہ تھا کہ ان کی یادگار میں غار کے مُنہ پر ایک عبادت گاہ بنائیں گے کہ جس میں صرف خدائے عزوجل ہی کی عبادت ہوا کرے گی تو ان کا یہ فیصلہ بے شبہ محمود اور قابلِ ستائش تھا۔

**نتائج و عبر** (۱) اگر ہم کو کوئی بات اپنی عقل کے مطابق عجیب و غریب معلوم ہو تو یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ اپنی حقیقت کے لحاظ سے بھی واقعی کوئی عجیب بات ہے اور اگر وہ عجیب ہے بھی تو ہمارے لیے ہے نہ کہ خالقِ کائنات کے لیے جس نے کہ کائناتِ ہست و بود کو پیدا کیا اور پھر ایسے محکم نظام پر اس کو قائم کیا کہ عقل حیران ہے مگر آنکھ روزانہ اس کا مشاہدہ کرتی اور قلب ہر لمحہ اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہے کہ "وَمَا ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیْزٍ" خدائے تعالیٰ پر یہ بات کچھ بھاری نہیں ہے۔

(۲) جب شر و فساد اور ظلم و سرکشی اس درجہ بڑھ جائے کہ خدا کے نیک بندوں کے لیے کہیں پناہ نہ رہے تو اگرچہ عزیمت کا مرتبہ یہی ہے کہ کائنات کی رشد و ہدایت کی خاطر ہر قسم کی تکالیف برداشت کرے اور کلمۂ حق پر کوہِ استقامت بنا رہے اور مخلوقِ خدا سے منقطع ہو کر عزلت و کنج نشینی اختیار نہ کرے لیکن اگر حالات اس درجہ نزاکت اختیار کرلیں کہ مخلوق کے ساتھ تعلق رکھنے کی شکل میں یا جان دینی پڑے اور یا دینِ باطل قبول کرنے پر مجبور ہونا پڑے اور حالت یہ ہو جائے "اِنَّھُمْ اِنْ یَّظْھَرُوْا عَلَیْکُمْ یَرْجُمُوْکُمْ اَوْ یُعِیْدُوْکُمْ فِیْ مِلَّتِھِمْ وَلَنْ تُفْلِحُوْٓا اِذًا اَبَدًا" تو اس وقت رخصت ہے کہ جان کی حفاظت اور دین کی صیانت کے لیے دنیا کے علائق سے کٹ کر عزلت نشینی اختیار کرے "گویا یہ اضطراری حالت کا ایک ہنگامی اور وقتی علاج ہے جو صرف تحفظِ دین و ایمان کیلئے کیا جا سکتا ہے لیکن اسلام کی نگاہ میں بذاتہٖ کوئی محبوب عمل نہیں ہے اور اختیاری طور پر اس جوگیانہ زندگی کو اختیار کرنا رہبانیت ہے "ولا رھبانیۃ فی الاسلام" اور اسلام رہبانیت کو ناپسند کرتا ہے۔

عیسائیوں کی مذہبی تاریخ کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی عہد میں بعض سچے عیسائیوں کو اصحاب کہف کی طرح کے چند واقعات پیش آئے جن میں سے ایک روم میں ایک انطاکیہ میں اور ایک شہر افسس میں پیش آنا بتایا جاتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے حالات سے مجبور ہو کر اضطراری طور پر اس جوگیانہ زندگی کو اختیار کیا تھا مگر بعد میں دوسری بدعات کی طرح یہ عمل بھی عیسائیت کا اہم جزء اور محبوب عمل شمار ہونے لگا اور جس طرح ہندوستان کے قدیم دھرم کے مطابق علائق دنیا سے کٹ کر ہندو جوگی پہاڑوں کی کھوہ اور ویرانوں میں یوگ کرنا مقدس عمل سمجھتے ہیں اسی طرح عیسائیوں نے بھی اختیاری رہبانیت کو مذہب کے مقدس اعمال میں شامل کر لیا۔

لیکن قرآن حکیم نے ان کے اس عمل کے متعلق صفائی کے ساتھ ظاہر کر دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بذاتہ یہ عمل کوئی پسندیدہ عمل نہیں ہے بلکہ اہل کتاب کی مذہبی بدعات میں سے ایک بدعت ہے۔ "وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا" اور راہبانہ زندگی کو کہ جس کو ان (عیسائیوں) نے دین میں ایجاد کر لیا ہم نے ان پر فرض نہیں کیا تھا، مگر انھوں نے اختیار کیا تھا اللہ کی رضا جوئی کے لیے، پر اُس کے حق کی رعایت نہ رکھ سکے" مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے یہ طریق دین کے طریقوں میں سے نہیں مقرر کیا تھا بلکہ انھوں نے خود ہی اختیار کر لیا تھا اور اگرچہ ابتداء میں انھوں نے یہ خدائے تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے اختیار کیا تھا مگر بعد میں اس کو نباہ نہ سکے اور رہبانیت کے پردہ میں دنیاداروں سے زیادہ دنیا طلبی اور ہوسناکیوں میں مبتلا ہو گئے۔

حق یہ ہے کہ صاف اور سیدھی راہ اعتدال کی راہ ہے نہ اس میں پیچ و خم ہے اور نہ نشیب و فراز' یہ راہ افراط اور تفریط دونوں سے جدا کر کے منزلِ مقصود تک پہنچا دیتی ہے اور چونکہ اسلام دینِ فطرۃ ہے اس لیے اس نے ہر معاملہ میں اعتدال ہی کو پسندیدہ عمل قرار دیا ہے' اُس کی نگاہ میں جس قدر دنیا میں انہماک بُرا ہے اسی قدر مخلوقِ خدا سے کٹ کر جوگیانہ رہبانیت بھی مذموم ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ اس امت کے لیے رہبانیت" جہاد فی سبیل اللہ" ہے کیونکہ میدانِ جہاد کے لیے

انسان جب ہی قدم اٹھاتا ہے کہ وہ اپنے نفس، اپنے اہل وعیال اور ہر قسم کے دنیوی علائق سے بے نیاز ہوکر صرف خدائے تعالیٰ کی مرضی کو پورا کرنا اپنا مقصد اور نصب العین بنالے۔

(۳) حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے آیۃ "وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْئٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ" کے شانِ نزول کے متعلق یہ روایت کی جاتی ہے کہ جب مشرکینِ مکہ نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اصحاب کہف کے بارے میں سوال کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ میں کل وحی سے معلوم کرکے اس کا جواب دوں گا مگر آپ کو "انشاء اللہ" کہنا یاد نہ رہا اس وجہ سے تقریباً پندرہ روز وحی کا نزول نہیں ہوا اب مشرکین نے چہ میگوئیاں شروع کردیں اور آپؐ اس وجہ سے دل فگار ہونے لگے۔ پندرہ روز کے بعد وحی کا نزول ہوا اور اس نے واقعہ کی ضروری تفصیلات کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا کہ انسان جبکہ فرداسے ناواقف ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ جب کل کے لیے کسی بات کا وعدہ کرے تو خدا کی مشیت کا حوالہ ضرور دیدیا کرے تاکہ یہ بات کبھی فراموش نہ ہونے پائے کہ بندہ نہیں جانتا کہ کل کیا ہوگا۔ میں زندہ بھی رہوں گا یا نہیں اور اگر زندہ بھی رہا تو وعدہ کے ایفاء پر قادر ہوسکوں گا یا نہیں۔

(۴) دین اور ملت خدائے تعالیٰ کی صاف اور سیدھی راہ کا نام ہے اس لیے وہ جبر و اکراہ سے قلب میں نہیں اترتی بلکہ اپنی صادق روشنی سے اندھے دلوں کو روشن اور منور کرتی ہے "لَآ اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ" "دین کے بارہ میں کوئی زبردستی نہیں ہے" مگر اس کے برعکس باطل کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی ہے کہ وہ خدا کی مخلوق پر زبردستی ظلم اور جبر سے اپنا اثر جمائے اور دلیل کی جگہ جبر سے کام لے لیکن خدا کی مشیت انجام کار صداقت (دینِ حق) کو غالب اور باطل کو مغلوب کردیتی ہے اور انجام و نتیجہ حق ہی کے ہاتھ رہتا ہے مگر چونکہ خدا کی گرفت کا قانون اول کافی مہلت دیتا ہے اس لیے ظالم اقوام جہالت سے اس کو اپنی کامیابی سمجھ کر خدا کی بطش شدید سے غافل ہوجاتی ہیں اور اسلیے تاریخ بار بار اپنے سبق کو دہراتی رہتی ہے۔

(۵) تجربہ اس کا شاہد ہے کہ حق و صداقت کی تحریک اور نہ صرف یہ بلکہ ہر انقلابی تحریک جس درجہ

قوم کے نوجوانوں پر اثر انداز ہوتی ہے' عمر رسیدہ افرادِ قوم پر اس سرعت کے ساتھ اثر انداز نہیں ہوتی۔ "علم النفس" (PSYCHOLOGY) کے ماہرین اس کی یہ وجہ بیان کرتے ہیں کہ معمر افراد کا دل و دماغ چونکہ عمر کے بڑے حصہ میں پرانی ریت و رسم کا عادی ہو جاتا اور گذشتہ نظامِ سوسائٹی سے عرصہ تک مانوس رہ چکا ہوتا ہے اور اس کے رگ و ریشہ میں قدیم اثرات راسخ ہو چکے ہوتے ہیں اس لیے ہر وہ تحریک جو قدیم نظام یا فرسودہ رسوم کے خلاف ظاہر ہوتی ہے ان کا دل و دماغ اس کے جدید اثرات سے اذیت و تکلیف محسوس کرتا ہے اور جدید و قدیم محرکات کا تصادم ان کے لیے بار بن جاتا ہے اس لیے وہ جدید انقلاب سے مانوس ہونے کی بجائے اور زیادہ متوحش ہو جاتے ہیں البتہ ان میں سے جو دل و دماغ جذبات کے مقابلہ میں عقل کو اور تاثرات کے مقابلہ میں دلائل کو راہ نما بنا لیتے اور ہر معاملہ میں جدت و قدامت سے قطع نظر متانت و سنجیدگی کے ساتھ اس کی افادیت و مضرت پر غور کرنے کے عادی ہوتے ہیں وہ اس عام اصول سے مستثنیٰ ہیں اور جب انقلابی تحریک کے فوائد کو دلائل کی قوت سے محسوس کر لیتے ہیں۔ تو اس تحریک کے لیے زبردست پشت پناہ ثابت ہوتے ہیں مگر جماعتوں اور قوموں میں عموماً ان کی تعداد کم ہوتی ہے۔

لیکن عمر رسیدہ افراد کے برعکس چونکہ نوجوانوں کے دل و دماغ بڑی حد تک غیر جانبدار ہوتے اور پرانے رسم و رواج کے لیے ابھی تک راسخ نہیں ہوتے اس لیے ان پر جدید نقوش بہت جلد منقش ہو جاتے ہیں اور وہ کسی تبدیلی اور کسی انقلاب کو محض اس لیے کہ وہ جدید محرکات کے داعی ہیں توحش کی نظروں سے نہیں دیکھتے بلکہ دلچسپی کے ساتھ اس کی طرف بڑھتے اور صاف دل و دماغ سے اس پر غور کرتے ہیں۔

اب یہ انقلابی تحریک کی ذمہ داری ہے کہ اگر اس میں صداقت اور حقانیت کارفرما ہے اور جماعتوں اور قوموں کو غلط روی سے نکال کر صراطِ مستقیم کی جانب داعی ہے تو اس کی جانب سرعت کے ساتھ جوق جوق بڑھنے والوں اور پیروی کرنے والوں کی زندگی میں چار چاند لگ جاتے اور ان کا وجود کائناتِ ہست و بود کے لیے رحمت ثابت ہوتا ہے اور اگر معاملہ

اس کے برعکس ہے تو وہ ان تر و تازہ اور صاف دل و دماغ رکھنے والے نوجوانوں کو تباہی اور بربادی کی راہ پر لگا دیتی ہے اور ان کا وجود دنیائے انسانی کے لیے مصیبت اور عذاب بن جاتا ہے۔

پس قرآنِ عزیز نے اس واقعہ کے اظہار میں عبرت و موعظت کے جو پہلو نمایاں کئے ہیں ان میں سے ایک اہم پہلو اسی نفسیاتی مسئلہ کی جانب توجہ دلانا ہے۔

وہ یہ بتانا چاہتا ہے کہ قریشِ مکہ میں سے بوڑھوں اور سن رسیدہ لوگوں کی اکثریت کا اسلام کی مقدس تعلیم سے گریز اور انفرادی و اجتماعی حیاتِ انسانی کے اس جدید انقلاب (اسلام) سے توحش اور ان کے نوجوانوں کی اکثریت کا اس کی جانب تیزی کے ساتھ متوجہ ہونا اور اس کی دعوتِ انقلاب کی کشش سے فوج در فوج اس کے لیے حلقہ بگوش ہو جانا دنیا کا انوکھا مظاہرہ نہیں ہے بلکہ جب کبھی بھی فرسودہ نظام اور باطل رسم و رواج کے خلاف خدا کے پیغمبروں نے حق و صداقت کا انقلاب برپا کیا ہے تو قبولِ حق کے لیے عمر رسیدہ انسانوں سے زیادہ نوجوانوں کے دل و دماغ پر ہی اس کا گہرا اثر پڑا ہے۔



# سبا اور سیلِ عَرِم

## سنہ ۲۰۰ء تخمیناً

تمہید۔ سبا۔ نام یا لقب۔ زمانۂ حکومت۔ سبا اور طبقاتِ حکومت۔ مکاربِ سبا اور ملوکِ سبا
وسعتِ حکومت۔ طرزِ حکومت۔ سبا کی عمارات۔ سبا کا تمدن۔ سدِ مارب۔ جنّتانِ عن یمین
وشمال۔ سیلِ عرم۔ چند تاریخی مباحث۔ تفسیری مطالب۔ نتائج وبصائر۔

**تمہید** سبا اور سیلِ عرم کا واقعہ بھی تاریخی واقعات میں بہت اہمیت رکھتا اور قوموں کے عروج وزوال کی تاریخ میں صد ہزار سامانِ عبرت وموعظت مہیا کرتا ہے۔

قوموں کے عروج وزوال کا پس منظر بخت واتفاق کا رہینِ منت نہیں ہوتا بلکہ قانونِ قدرت کے مقررہ اصول کے مطابق پیش آتا ہے۔ البتہ کبھی اسبابِ عروج وزوال ایسے واضح اور صاف ہوتے ہیں کہ عام طریقہ سے یا مشاہدہ میں آجاتے ہیں اور یا عقل کی سرسری توجہ سے پہچان لیے جاتے ہیں اور کبھی ان کا وجود ایسے اسباب پر مبنی ہوتا ہے جن کا تعلق عام اسباب ووسائل سے جدا خدائے تعالیٰ کی فرماں برداری اور نافرمانی سے وابستہ ہوتا ہے یعنی باسبابِ ظاہر اگرچہ ایک قوم میں مثلاً وہ تمام حالات واسباب پائے جاتے ہوں جن سے کسی قوم کو عروج حاصل ہوتا ہے تاہم وہ قوم اچانک ہلاکت وبربادی کی نذر ہوجاتی اور عالمِ انسانی کے لیے اس کی ہلاکت حیرت زا واقعہ بن جاتی ہے لیکن جب خدا کی جانب سے ان کی سرکشی بغاوت اور احکامِ الٰہی کی پیہم خلاف ورزی کا پردہ چاک ہوجاتا ہے اور وحیِ الٰہی ان کے عمل اور پاداشِ عمل کی تفصیلات کو برسرِعام لے آتی ہے تب اہلِ دانش یہ یقین کرلیتے ہیں کہ جس قوم کی اجتماعی زندگی کے خوب صورت خول میں ایسی مکروہ اور گھناؤنی شکل موجود تھی تو بلاشبہ اس کی ہلاکت وتباہی بخت واتفاق کی وجہ سے نہیں بلکہ ناموسِ الٰہی

کے "قانونِ پاداشِ عمل" کے عین مطابق ہوئی ہے۔

سبا اور قومِ سبا کا وہ عبرت ناک سانحہ اور ان کے عروج و زوال کا وہ بصیرت افروز واقعہ جو سطورِ ذیل میں درج کیا جا رہا ہے قوموں کے عروج و زوال کے اس دوسرے قانون کے ہی زیرِ اثر عالمِ وجود میں آیا تھا اور تاریخ کے صفحات اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ جو قوم خوش عیشی اور رفاہیت کے اونچے درجہ پر بے خوف و خطر زندگی بسر کر رہی تھی وہ یک لخت ہلاکت و بربادی کے قعرِ مذلت میں محض اتفاقِ وقت سے نہیں گر گئی تھی بلکہ اپنے دور رس اعمالِ بد کی پاداش میں اس کو یہ روزِ بد دیکھنا پڑا تھا۔

پس مناسب یہ ہے کہ قرآنِ عزیز نے ان حقائق کو جس انداز میں بیان کر کے سامانِ موعظت و بصیرت عطا کیا ہے تاریخ کی بے لوث شہادت سے ان کی تفاصیل کو نقل کر دیا جائے تاکہ صداقتِ قرآن کا یہ پہلو بھی منکرینِ قرآن کے حق میں حجتِ کاملہ بن سکے۔

**سباء** | سبا، قحطانی قبائل کی مشہور شاخ ہے۔ مؤرخینِ عرب اس کا نسب اس طرح بیان کرتے ہیں: سبا بن یشجب بن یعرب بن قحطان۔

مگر توراۃ میں یہ کہا گیا ہے کہ سبا، قحطان کا بیٹا ہے۔

اور یقطان (قحطان) سے الموداد، سلف، حصار، مادت، ارخ، ہدورام، ازال، دقلاہ، عوبل، ابی مائل، سباہ، خضار موت، اوفیر، حویلہ، یارج، یعرب اور یوباب پیدا ہوئے یہ سب بنی یقطان تھے اور ان کے مکان میسا سے سفار کی راہ میں اور یورپ کے پہاڑ تک[1] تھے۔

قحطان کو یقطان، یقطون، یقطین اور یقطن بھی کہا جاتا ہے۔[2]

زبیر بن بکار کہتے ہیں کہ عربی میں قحطان اور عبرانی و سریانی میں یقطان اور یقطن کہتے ہیں۔

مؤرخینِ جدید توراۃ کے بیان کو صحیح سمجھتے ہیں اس لیے کہ قحطان کی اولاد سے متعلق جو تفصیلات اس نے دی ہیں وہ تاریخی اقوال اور اثری و حجری کتبات سے مطابقت رکھتی ہیں، جدید مؤرخین کی اس تحقیق کے علاوہ یوں بھی ایسے معاملات میں توراۃ کا بیان، دوسری روایاتِ تاریخی کے

[illegible]

مقابلہ میں زیادہ مستند سمجھا جاتا ہے۔

غرض سبا بروایتِ توراۃ، قحطان کا بیٹا تھا اور بروایتِ عرب قحطان کا پوتا اور یعرب بروایتِ توراۃ سبا کا بھائی تھا اور بروایتِ عرب قحطان کا بیٹا۔

اہلِ نسب و تاریخ کا اس پر تو اتفاق ہے کہ قحطان امم سامیہ کی شاخ ہے لیکن اس میں اختلاف رکھتے ہیں کہ وہ عربِ عاربہ میں سے ہے یا عربِ مستعربہ میں یعنی وہ بنی اسمٰعیلؑ میں سے ہے اور عدنانی و قحطانی ایک ہی سلسلہ ہے یا عدنانی تو بنی اسمٰعیلؑ ہیں اور قحطانی اس سلسلہ سے الگ قدیم سلسلہ ہے۔

بعض مورخینِ عرب کا رجحان یہ ہے کہ قحطانی بھی بنو اسمٰعیلؑ ہی ہیں اور تمام اقطاعِ عرب بنی اسمٰعیل کے علاوہ اور کسی نسل سے نہیں ہیں، چنانچہ علماء انساب میں سے زبیر بن بکار اور محمد بن اسحٰق کی یہی رائے ہے[۱] اور امام بخاری بھی اسی جانب مائل ہیں اس لیے کہ انھوں نے بخاری میں ایک باب تحریر کیا ہے "باب نسبۃ الیمن الی اسمٰعیل علیہ السلام۔"

اور اس باب کے تحت ایک حدیث نقل کی ہے جس سے وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ بنی اسلم جو خزاعہ کی شاخ ہیں ان کو نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بنی اسمٰعیل فرمایا ہے اور خزاعہ بنی ازد کی شاخ ہیں اور بنی ازد باتفاق قحطانی ہیں لہٰذا قحطانی بھی بنی اسمٰعیل ہی میں سے ہوئے وہ حدیث یہ ہے:

خرج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علیٰ قوم من اسلم یتناضلون بالسوق فقال ارموا بنی اسمٰعیل فان اباکم کان رامیا۔[۲]

"ایک مرتبہ بنی اسلم کی ایک جماعت پر نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا گذر ہوا دیکھا تو وہ بازار میں تیر اندازی کی مشق کر رہے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا ہاں اے اولادِ اسمٰعیل خوب تیر اندازی کرو اس لیے کہ تمھارے باپ اسمٰعیل بھی تیر انداز تھے۔"

اور کتاب احادیث الانبیاء میں حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے قصہ میں حضرت ہاجرہ کا ذکر کرتے ہوئے حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں:-

تلک امکم یا بنی ماء السماء

اے عرب یہ (ہاجرہ) تمھاری ماں ہیں

حافظ ابن حجر نے اس جملہ کی شرح میں یہ کہا ہے:-

[۱] تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۱۵۰۔ [۲] فتح الباری ج ۶ ص ۳۰۲ باب قول اللہ تعالیٰ واتخذ اللہ ابراہیم خلیلا۔

کہ حضرت ابوہریرہ نے " بنی ماء السّماء " کہہ کر اہلِ عرب کو اس لیے خطاب فرمایا کہ وہ اپنی اور اپنے مویشیوں کی خاطر ایسے مقامات پر خیمے لگاتے پھرتے تھے جہاں بارش کا پانی جمع ہو گیا ہو یا ماءِ سماء سے زمزم مراد ہے اور ان ہر دو معنی کے لحاظ سے یہ جملہ ان لوگوں کے لیے دلیل بن سکتا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ تمام عرب بنی اسمٰعیل ہیں۔

اور بعض اس جملہ کی وجہِ تسمیہ یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ اہلِ عرب کی شرافتِ نسب اور نجابتِ حسب کے لیے بطور تشبیہ کے بولا گیا ہے کہ جس طرح آسمان سے نازل پانی صاف اور بے عیب ہوتا ہے اسی طرح اہلِ عرب بھی حسب و نسب میں بے عیب ہیں۔ پس اگر یہ معنی مراد ہیں تو اس صورت میں یہ جملہ ان حضرات کے لیے دلیل نہیں بن سکتا۔

اور آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں :۔

" عن قریب اس مسئلہ کی مزید تفاصیل ان شاء اللہ تعالیٰ اوائلِ مناقب میں آئیں گی۔ "[1]

اور اس مقام پر پہنچ کر پہلے قول کو تسلیم نہیں کرتے اور آخر قول ہی کو صحیح مانتے ہیں جیسا کہ عنقریب معلوم ہو جائے گا۔

اور محققین کا یہ دعویٰ ہے کہ تمام عرب کے انساب کا منبع دو ہیں۔ عدنان اور قحطان، عدنان، بنی اسمٰعیل اور عرب مستعربہ ہیں اور قحطان عرب عاربہ، گویا ان کے نزدیک قحطانی، بنی اسمٰعیل نہیں ہیں چنانچہ ہمدانی، ابن عبد البر، ابن کثیر، ابن حجر عسقلانی، ابن کلبی اور حضرت عبد اللہ بن عباس اسی کے قائل ہیں :۔

| | |
|---|---|
| قال ھشام ومن زعم ان قحطان لیس | ہشام کہتے ہیں اور جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ قحطان بنی اسمٰعیل ہیں |
| من ولد اسمٰعیل فانہ یقول قحطان | سے نہیں ہیں تو وہ اس کا نسب نامہ یہ بیان کرتے ہیں : |
| ھو یقطون بن عابر بن شالخ بن ارفخشذ | قحطان (یقطون) بن عابر بن شالخ بن ارفخشذ بن سام |
| بن سام بن نوح قال ابو عمر ھکذا قال | بن نوح۔ ابو عمر (ابن عبد البر) کہتے ہیں کہ ابن کلبی نے بھی |
| ابن الکلبی فی العرب العاربۃ ورأیت | عرب عاربہ کی تفصیل کرتے ہوئے اسی طرح بیان کیا ہے اور |

[1] فتح الباری ج ۶ ص ۴۰۳ باب قول اللہ تعالیٰ وَاتَّخَذَ اللّٰہُ اِبْرَاھِیْمَ خَلِیْلًا۔

بخط ابی جعفر العقیلی قال نا محمد بن اسمٰعیل قال نا سلام بن مسکین قال نا عون بن ربیعة عن یزید الفارسی عن ابن عباس قال العرب العاربة قحطان بن الهمیسع والامداد والسالفات وحضرموت هذا حدیث حسن الاسناد وهو اعلی ما روی فی هذا الباب واولی بالصواب۔ (الانباء علی قبائل الرواة ص ۵۸ – ۵۷۔)

میں نے ابو جعفر عقیلی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی یہ روایت دیکھی ہے کہ انھوں نے محمد بن اسمٰعیل سے بسلسلۂ سند یہ سنا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے تھے کہ قحطان بن الہمیسع اور امداد اور سالفات اور حضرموت یہ سب عربِ عاربہ ہیں اور اس حدیث کی سند حسن ہے اور اس مسئلہ میں یہ قول بلحاظِ روایت بھی اعلیٰ درجہ کا ہے اور قرینِ صواب بھی ہے۔

بلکہ ابن کثیر تو یہ کہتے ہیں کہ جمہور کی یہی رائے ہے :-

لکن الجمهور علی ان العرب القحطانیة من عرب الیمن وغیرهم لیسوا من سلالة اسمٰعیل وعندهم ان جمیع العرب ینقسمون الی قسمین قحطانیة وعدنانیة۔[1]

لیکن جمہور کی تحقیق یہ ہے کہ قحطانی عرب خواہ وہ یمنی ہوں یا غیر یمنی حضرت اسمٰعیل کی نسل سے نہیں ہیں اور ان کے نزدیک تمام عرب دو اصل پر تقسیم ہیں، قحطانی اور عدنانی۔

اور جمہور کی جانب سے "بنی اسلم" سے متعلق حدیث کا حافظ ابن حجر نے یہ جواب دیا ہے کہ اس حدیث سے یہ استدلال صحیح نہیں ہے کہ جو قبائل بھی قحطان کی جانب منسوب ہیں وہ سب بنی اسمٰعیل ہیں اس لیے کہ بعض قحطانی قبائل وہ ہیں جن کے متعلق علماءِ انساب میں سخت اختلاف ہے کہ وہ قحطانی ہیں یا عدنانی مثلاً بنی خزاعہ کے بارہ میں یہی بحث ہے، تو یہ ممکن ہے کہ بنی اسلم کے متعلق بھی اسی قسم کا اختلاف موجود ہو (چنانچہ موجود ہے) اور ابن عبد البر نے اسی حدیث کو بروایتِ صحیح نقل کیا ہے اور اس میں یہ اضافہ ہے کہ بنو خزاعہ اور بنو اسلم دونوں تیر اندازی کر رہے تھے تو یہ ہوسکتا ہے کہ خزاعہ کی اکثریت کی وجہ سے آپ نے تغلیباً ایسا فرما دیا ہو۔[2]

لیکن ان جوابات کے علاوہ حافظ ابن حجر نے انسابِ عرب کے مشہور عالم ہمدانی سے یہ نقل کیا ہے کہ یمن کی حکومت کے زوال کے بعد جو قحطانی قبائلِ حجاز میں آکر بس گئے تھے ان کے

[1] تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۱۵۶۔ [2] فتح الباری ج ۶ ص ۴۲۰۔

اور عدنانی قبائل کے درمیان ازدواجی رشتے بکثرت ہونے لگے تھے۔ اس لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہ سبیلِ توسّع ایسا ارشاد فرمایا یعنی پدری سلسلہ کی بجائے مادری سلسلہ سے انکو بنی اسمٰعیل فرمایا ہے۔

ہمدانی کا یہ جواب تاریخی نقطۂ نظر سے بالکل صحیح ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ یمن سے نکلنے کے بعد قحطانی اور عدنانی قبائل کے مابین ازدواجی رشتہ نے ہی یہ صورت پیدا کر دی ہے کہ بعض اہلِ نسب مشہور قحطانی قبائل کو عدنانی اور عدنانی کو قحطانی کہتے نظر آتے ہیں مثلاً انصار (اوس وخزرج) کے متعلق تمام محققینِ علم الانساب کا اس پر اتفاق ہے کہ وہ قحطانی الاصل ہیں مگر اسی ازدواجی رشتہ سے کبھی بہ سبیلِ توسّع ان کو عدنانی بھی کہہ دیا جاتا ہے اور اس سے بعض مؤرخین کو یہ غلط فہمی پیدا ہوگئی کہ وہ قحطانی نہیں بلکہ عدنانی ہیں چنانچہ ابن عبدالبر کہتے ہیں :۔

| | |
|---|---|
| فاول ذالك الازد وهي جرثومة من جراثيم قحطان وافترقت الازد وفيما ذكره ابن عبدة وغيره من علماء الانساب على نحو سبع وعشرين قبيلة فمنهم الانصار[1] | قبائل یمن میں سے پہلا قبیلہ اَزْد ہے اور قحطانی سلسلہ کی شاخ ہے اور ابن عبدۃ وغیرہ علماء انساب کے اقوال کے مطابق اَزْد کی تقریباً ستائیس شاخیں ہیں پس ان ہی میں سے انصار (اوس وخزرج) بھی ہیں۔ |
| قال ابن اسحٰق امهما قيلة ابنته كاهل بن عذرة من قضاعة كانت تحت حارثة بن ثعلبة[2] | ابن اسحٰق کہتے ہیں کہ اوس وخزرج کی والدہ قیلہ بنت کاہل بن عذرہ، بنی قضاعہ میں سے تھی جو حارثہ بن ثعلبہ (قحطانی) کے نکاح میں آئی۔ |
| وروى عن عمر بن الخطاب وعبد الله بن عباس (رضي الله عنهم) ان قضاعة بن معد (بن عدنان)[3] | حضرت عمر بن الخطاب اور حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہم) سے منقول ہے کہ قضاعہ بن معد (بن عدنان) کی نسل سے ہیں۔ |

اسی طرح مصنف ارض القرآن کا وہ قول بھی درست ہے جو انھوں نے اس مسئلہ میں بیان کیا ہے کہ "بعض علماء انساب وحدیث خود قحطان کو اسمٰعیلی کیوں کہتے ہیں" وہ فرماتے ہیں :۔

[1] الانباہ ص ۱۰۶۔ [2] ایضاً ص ۱۰۹۔ [3] ایضاً ص ۶۳۔

اس مُبالغہ میں اصل حقیقت صرف یہ ہے کہ بعض قحطانی اسمٰعیلی ہیں اور یمن میں سکونت کے باعث یا کسی اور سبب سے ان کو قحطانی فرض کر لیا گیا ہے۔[1]

ایک جانب بعض عدنانی قبائل کا یمن میں مقیم ہو جانا اور دوسری جانب سبا کے انتشار سے بعض قحطانی قبائل کا حجاز، شام، عراق، نجد، بحرین میں جا کر وطن بنا لینا اور عدنانی قبائل کے ساتھ ازدواجی رشتے قائم کر لینا یہ وہ امور ہیں جن کی وجہ سے بعض قبائل کے متعلق قحطانی اور عدنانی ہونے میں اختلاف پیدا ہو گیا؛ البتہ اہلِ عرب کو خود قحطان کے متعلق اسمٰعیلی ہونے کا خیال کیوں پیدا ہوا؟ اس کے جواب میں ہم مصنفِ ارض القرآن سے متفق نہیں ہیں کیونکہ جو اہلِ نسب اور علماءِ حدیث قحطان کو بنی اسمٰعیل میں سے سمجھتے ہیں وہ یہ بات اس الجھاؤ کی وجہ سے ہرگز نہیں کہتے کہ بعض عدنانی قبائل یمن میں بس جانے کی وجہ سے قحطانی کہلانے لگے جیسا کہ سید صاحب کا خیال ہے بلکہ یہ تو ایک مستقل نظریہ ہے جو بعض علماءِ نسب و حدیث کے درمیان اس لیے مقبول ہے کہ ان کے نزدیک تمام عرب صرف حضرتِ اسمٰعیلؑ کی اولاد ہیں اور ان کے نزدیک عربِ مستعربہ کے علاوہ عربِ بائدہ اور عربِ عاربہ کی کوئی شاخ عرب میں باقی ہی نہیں رہی۔

حضرتِ اسمٰعیل (علیہ السلام) کا حجاز کعبۃ اللہ اور حرم کے ساتھ جو تعلق ہے اس کی عظمت اور اکثر قبائلِ عرب کے ابوالقبائل ہونے کا جو علاقہ ہے اس کی اہمیت، یہ دو اہم باتیں ہیں کہ جن کی وجہ سے غالباً بعض قحطانی قبائل نے بھی خود کو عدنانی کہنا شروع کر دیا خصوصاً مقیمِ حجاز قبائل نے اس کو زیادہ نمایاں کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جو قبائل خود کو اس پردہ میں نہیں چھپا سکتے تھے انھوں نے اس سے بڑھ کر ایک اور قدم اٹھایا اور یہ کہنا شروع کر دیا کہ خود قحطانی بھی اسمٰعیلی ہے تاکہ عدنانی اور قحطانی کا یہ فرق باقی ہی نہ رہے جو ایک کے اسمٰعیلی اور دوسرے کے غیر اسمٰعیلی ہونے سے باہمی امتیاز و شرف کا سبب بنتا تھا اور اسی بناء پر علماءِ انساب کے درمیان یہ مسئلہ اختلافی بن گیا اور علماءِ حدیث میں سے بعض محدثین نے غالباً اس لیے اس نظریہ کی تائید کی کہ ان کے سامنے چند ایسی صحیح روایات تھیں جن سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ شاید کل عرب بنی اسمٰعیل ہی ہیں مثلاً حدیث کا یہ جملہ:

"تلك امكم یا بنی ماء السماء" میں ایک قسم کا عموم پایا جاتا ہے یا مثلاً بعض ایسے قبائل کے متعلق کہ جن کو قحطانی سمجھا جاتا ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ان کے لیے "بنی اسمٰعیل" فرمانا مگر ان محدثین کا یہ خیال صحیح نہیں ہے جیسا کہ ہم حافظ ابن حجر، ابن عبد البر، ابن کثیر بلکہ حضرت عمر اور حضرت ابن عباس (رضی اللہ عنہم) کے مقالات سے ثابت کر چکے ہیں کہ وہ روایات کے ان الفاظ کا مطلب کیا سمجھتے ہیں بلکہ ابن عبد البر نے اس مسئلہ کو صاف کرتے ہوئے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ اس دعوے کے ثبوت میں بعض مرفوع احادیث بھی پیش کی جاتی ہیں جن میں جرہم، سلف اور ثقیف کو مستثنیٰ کرتے ہوئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے: "العرب کلھا من ولد اسمٰعیل"، معلوم رہے کہ یہ اور اس قسم کی تمام روایات ناقابلِ اعتماد اور ناقابلِ حجت ہیں اور نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جانب ان کی نسبت غلط ہے اور ابن عبد البر کے اس قول سے بھی ہمارے خیال کی تائید ہوتی ہے:

| | |
|---|---|
| قال ابو عمر اکثر الاختلاف المذکور فی کتابنا ھذا و فی غیرہ من اھل النسب تولد من اختلافھم فی نسبۃ جمیع العرب الی اسمٰعیل بن ابراھیم (علیھما السلام) علی ما قدمنا ذکرہ فی کتابنا ھذا فی باب قحطان وغیرہ۔[۱] | ابو عمر (ابن عبد البر) کہتا ہے کہ ہماری اس کتاب میں اور اس کے علاوہ نسب کی دوسری کتابوں میں قبائل کے متعلق جو اختلاف پایا جاتا ہے وہ اس نظریہ کی بدولت پیدا ہوا ہے کہ تمام عرب اسمٰعیل بن ابراہیم (علیہما السلام) کی اولاد ہیں جیسا کہ ہم اسی کتاب میں قحطان اور بعض دوسرے ناموں کے تحت ذکر کر آئے ہیں۔ |

اور ابن کثیر کے اس قول سے بھی:۔

| | |
|---|---|
| قیل ان جمیع العرب ینتسبون الی اسمٰعیل بن ابراھیم (علیھما السلام والتحیۃ والاکرام) والصحیح المشھور ان العرب العاربۃ قبل اسمٰعیل وقد قدمنا ان العرب العاربۃ منھم عاد وثمود وطسم وجدیس وامیم وجرھم و | کہا جاتا ہے کہ تمام عرب حضرت اسمٰعیل بن ابراہیم علیہما الصلوٰۃ والسلام کی نسل سے ہیں اور صحیح اور مشہور قول یہ ہے کہ عرب عاربہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے پہلے عرب کے ساکن ہیں اور ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ عاد، ثمود، طسم، جدیس، امیم، جرہم اور عمالیق ۔۔ اور |

[۱] الانباہ ص ۹۲ "وہی آثار کلھا ضعیفۃ الاسناد" [۲] ایضاً ص ۱۰۶۔

| | |
|---|---|
| العمالیق وامم اٰخرون لا یعلمھم الا اللہ کانوا قبل الخلیل علیہ الصلٰوۃ والسلام وفی زمانہ ایضاً۔ | ان کے علاوہ اور قبائل جن کا حال صرف اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے پہلے سے تھے اور ان کے زمانہ میں عرب میں ان کی نسلیں پائی گئی ہیں۔ |
| ( ابن اثیر ج ۲ ص ۱۵۶ ) | |

پس حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) کے اس ارشاد کے متعلق جو انھوں نے اہلِ عرب کو مخاطب کرتے ہوئے حضرتِ ہاجرہ (رضی اللہ عنہا) کے سلسلہ میں فرمایا یعنی "تلک امکم یا بنی ماء السماء" بآسانی یہ کہا جا سکتا ہے کہ یا تو انھوں نے عدنانی قبائل کی اکثریت کے پیشِ نظر جو حجاز میں آباد تھی تغلیباً یہ فرما دیا اور یا اس لیے فرمایا کہ عرب کے قحطانی قبائل ہوں یا عدنانی پدری یا مادری کسی نہ کسی سلسلہ سے بنی ہاجرہ ضرور ہیں۔

اس کے برعکس اگر حضرت ابوہریرہؓ کے اس مقولہ کا مطلب یہ لیا جائے کہ تمام عرب پدری سلسلہ سے حقیقۃً بنی ہاجرہ بنی اسمٰعیل ہیں تو یہ واقعہ کے بھی خلاف ہوگا اور ان صحیح روایات کے بھی مخالف رہے گا جن سے یہ ثابت ہے کہ عرب کے قبائل کا سلسلۂ نسب قحطانی اور عدنانی قبائل کے علاوہ بنی جرہم اور بعض دوسرے ان قبائل سے بھی تعلق رکھتا ہے جو عرب عاربہ کہلاتے تھے اور توراۃ اور مؤرخین تو اس کے متعدد سلسلے بیان کرتے ہیں۔

**نام یا لقب** سبا نام ہے یا لقب؟ یہ بھی ایک سوال ہے جو اس جگہ زیرِ بحث آتا ہے توراۃ کہتی ہے کہ یہ نام ہے اور مؤرخینِ عرب کہتے ہیں کہ سبا لقب ہے اور نام عمرو یا عبد شمس ہے[1] عصرِ حاضر کے اہلِ تاریخ اسی کو صحیح سمجھتے ہیں۔ پھر عرب کے اہلِ تاریخ سبا کی وجہِ لقب یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ لفظ "سبا" بمعنی "قید" سے ماخوذ ہے چونکہ اس نے عرب میں سب سے پہلے جنگی قیدیوں کا طریقہ رائج کیا اور ان کو غلام بنایا اس لیے سبا لقب پایا اور جدید مؤرخین کہتے ہیں کہ یہ "س، ب، الف مع ہمزہ سے مرکب" ایسے لفظ سے ماخوذ ہے جس کے مفہوم میں تجارت کے معنی داخل ہیں اور سبا اور قومِ سبا چونکہ تاجر پیشہ قوم تھی اس لیے سبا کے نام سے مشہور ہوئی چنانچہ آج بھی لغتِ عرب میں

[1] البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۱۵۸ و تفسیر ابن کثیر ج ۳۔

یہ لفظ شراب کی تجارت کے لیے بولا جاتا ہے "سبا الخمر شراہا ایشربھا وسبی سبلوا الخمر۔ حملھا من بلد الی بلد[1]" ابن کثیر کہتے ہیں کہ اس کا لقب "الرائش" بھی تھا۔ لغت میں ریش یا ریاش کے معنی مال کے آتے ہیں۔ یہ چونکہ بہت بڑا فاتح اور سخی تھا اور لوگوں کو کثرت سے مال و متاع دیتا رہتا تھا اس لیے اس لقب سے مشہور ہوا۔

**زمانۂ حکومت** عام مؤرخین یہ کہتے ہیں کہ سبا نے چار سو چوبیس برس حکومت کی[2] مگر جدید فلسفہ، تاریخ کے لحاظ سے اس کے معنی یہ سمجھے جاتے ہیں کہ یہ خاندانِ سبا کی مدتِ حکومت بیان کی گئی ہے لیکن یہ قاعدہ اس جگہ صحیح نظر نہیں آتا اس لیے کہ اگر قحطان کی تیسری پشت سے اس مدت کو شروع کیا جائے تو یہ تقریباً ۲۵۰۰ء ق م ہو سکتی ہے۔ اس حساب سے سبا کی حکومت کو ۲۰۰۰ء ق م ختم ہو جانا چاہیے حالانکہ ہم حضرت سلیمانؑ کے تذکرہ میں توراۃ سے یہ ثابت کر چکے ہیں کہ ۹۵۰ء ق م میں ملکۂ سبا "بلقیس" نے حاضرِ خدمت ہو کر سلیمان علیہ السلام کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا ہے اور بہت سے تحفے پیش کیے ہیں اور جیسا کہ سورۂ نمل میں ملکۂ سبا کے واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے یہ زمانہ سبا کی حکومت کا زمانۂ عروج ہے چنانچہ زبور میں حضرتِ داؤد (علیہ السلام) کی یہ دعاء مذکور ہے:۔

> اے خدا بادشاہ کو اپنی عدالتیں عطا کر اور بادشاہ کے بیٹے کو اپنی صداقت دے، وہ تیرے لوگوں میں صداقت سے حکم کرے گا ترسیس اور جزیروں کے سلاطین نذریں گذاریں گے اور وہ جیتا رہے گا اور سبا کا سونا اسے دیا جائے گا اس کے حق میں سدا دعا ہو گی۔[3]

حضرتِ داؤدؑ کی یہ دعاء مقبول ہوئی اور ۹۵۰ء ق م میں ان کے صاحبزادے حضرتِ سلیمانؑ کی خدمت میں ملکۂ سبا نے حاضر ہو کر بہت سا سونا اور بیش قیمت جواہرات پیش کیے۔

لہٰذا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو سبا کی عمر کے متعلق مبالغہ سے کام لیا گیا ہے اور یا اس سے سبا کے پورے دورِ حکومت کی مدت نہیں بیان کی گئی بلکہ ان کی حکومت کے دوسرے دور یعنی ملوکِ سبا کی مدتِ حکومت مراد ہے جو کم و بیش چار سو چھتیس سال ہے۔[4]

**سبا اور طبقاتِ حکومت** مؤرخین کہتے ہیں کہ سبا کے دو بیٹے تھے ایک حمیر اور دوسرا کہلان اور تمام

---

[1] اقرب الموارد۔ [2] البدایہ [illegible] [3] زبور ۷۲۔ [4] ارض القرآن۔

قحطانی قبائل ان ہی دو سلسلوں سے وابستہ ہیں اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ عدنانی (اسمٰعیلی) قبائل جو نابت اور قیدار کی اولاد ہیں ان کا اصل وطن شمالی عرب ہے اور قحطانی قبائل کا مسکن جنوبی عرب (یمن ہے)

اور عام اہلِ نسب جب حکومتِ سبا کا ذکر کرتے ہیں تو وہ حمیر کو براہِ راست سبا کا جانشین کہہ دیتے ہیں اور تمام سلسلۂ حکومت کو حمیری حکومت ہی سے یاد کرتے ہیں اور سبا کی حکومت کو مستقل حیثیت نہیں دیتے حالانکہ تاریخی حیثیت سے یہ نظریہ بالکل غلط ہے اس لیے کہ سبا یمن کے دورِ حکومت سے متعلق جو کتبات اثری اور حضری ذرائع سے برآمد ہو رہے ہیں نیز یونانی اور رومی معاصر سیاحوں کی جو تاریخی شہادتیں ہیں ان سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ سبا کی حکومت دو طبقات میں منقسم رہی ہے اور پھر ہر دو طبقات کا زمانۂ حکومت جدا جدا دو دوروں میں تقسیم ہے۔

طبقۂ اولیٰ کا پہلا دور تقریباً سنہ ۱۱۰۰ ق م سے شروع ہو کر سنہ ۸۵۰ ق م پر ختم ہوتا ہے کیونکہ بلحاظِ کتبات سب سے پہلے حکومتِ سبا کا ذکر زبور سنہ ۹۵۰ ق م میں ہوا ہے اور یہ ان کے عروج کا زمانہ قیاس کیا گیا ہے اس دور میں شاہانِ سبا کا لقب "مکاربِ سبا" نظر آتا ہے اور سلیمان علیہ السلام کے زمانہ کی ملکۂ سبا (بلقیس) اسی دور سے تعلق رکھتی ہے اور طبقۂ اولیٰ کا دوسرا دور سنہ ۸۵۰ ق م سے شروع ہو کر سنہ ۱۱۵ ق م پر ختم ہوتا ہے جیسا کہ علم الآثار سے ثابت ہو چکا ہے اور "سیلِ عرم" اور "سبا کا انتشار" اسی دور سے متعلق ہے اس دور کے بادشاہ "ملوکِ سبا" کہلاتے ہیں۔

اور طبقۂ ثانیہ کا پہلا دور سنہ ۱۱۵ ق م سے شروع ہو کر اواخرِ سنہ ۳۰۰ء پر ختم ہو جاتا ہے یہ بادشاہ "ملکِ سبا و ریدان" اور "ملوکِ حمیر" کہے جاتے ہیں اور ریدان ان کے مشہور قلعہ کا نام ہے اور سبا اور حمیر قومیت کو ظاہر کرتا ہے۔ حمیری سنہ اگرچہ غیر معروف رہا ہے لیکن ان کے ایک کتبہ میں حبشہ کے حملۂ یمن اور ذونواس کی موت کا تذکرہ ہے چونکہ یہ واقعہ عرب اور رومی تاریخی روایات کے مطابق سنہ ۶۲۵ء میں پیش آیا ہے اور کتبہ میں سنہ ۶۴۰ حمیری درج ہے لہٰذا اس کو پیشِ نظر رکھ کر سنہ حمیری کی ابتداء سنہ ۱۱۵ ق م سے مطابقت رکھتی ہے اس دور میں سبا کا یہ خاندان صرف یمن

اور اطرافِ یمن کا حکمراں رہا ہے۔

اور طبقۂ ثانیہ کا دوسرا دور سنہ ۳۰۰ء کے اواخر سے شروع ہو کر ۵۲۵ء پر ختم ہوتا ہے اور یہ وہ زمانہ ہے کہ جب آخری مرتبہ اہلِ حبش یمن پر قابض ہو جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ آفتابِ اسلام کی ضیاء یمن تک پہنچتی ہے اور سارا یمن ایک ہی روز مشرف باسلام ہو جاتا ہے۔ اس دور میں حکومت کا تسلسل باقی نہیں رہا بلکہ سنہ ۳۴۰ء کے وسط میں پہلی مرتبہ اکسومی حبشی خاندان نے کچھ عرصہ کے لیے یمن پر فاتحانہ قبضہ کر لیا تھا مگر چند سال کے بعد حمیر پھر اس کو واپس لے لیتے ہیں۔ اس دور میں شاہانِ سبا کا لقب مورخینِ عرب کے نزدیک تُبّع ہو جاتا ہے اور یہ "تبابعۂ یمن" کہلاتے ہیں۔ سامی زبان میں "تبع" کے معنی "سلطان اور قاہر بادشاہ" کے ہیں۔ چونکہ اس دور میں شاہانِ حمیر نے یمن کے علاوہ حضرموت، حبشہ، نجد اور تہامہ تک اپنی حدودِ مملکت کو وسیع کر لیا تھا اس لیے وہ اس لقب سے مشہور ہوئے چنانچہ ان کے دور کے کتبات میں "ملکِ سبا و ریدان و حضرموت" ملکِ سبا وریدان و حضرموت و نجد وغیرہ ملکوں کے نام اضافہ ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور یہی وہ تبع ہیں جن کا ذکر قرآن کی سورۂ دخان اور سورۂ ق میں کیا گیا ہے۔ ریدان کا قلعہ ان کا ابتدائی دارالحکومت رہا ہے اور یہ شہر ظفار کے قریب آباد تھا جو صنعا (موجودہ دارالحکومت (یمن) سے متصل ہے اور جب سبا کے طبقۂ اولیٰ کے انتشار سے اس کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا تو حمیر نے مآرب تک اپنی حکومت کو وسیع کر لیا۔

سبا کے طبقات کی یہ تقسیم مشہور مؤرخ حمزہ اصفہانی کے بیان سے ہوتی ہے:۔

| | |
|---|---|
| واول من ملک اولاد قحطان حمیر | قحطان کی اولاد میں جو پہلا بادشاہ ہوا وہ حمیر بن سبا |
| بن سبا فبقی ملیکا حتی مات هرما و | ہے یہ آخری وقت تک بادشاہ رہا یہاں تک بوڑھا ہو کر |
| توارث ولده الملک بعده فلو يعدهم الملک | مر گیا پھر حکومت اس کی اولاد میں وارثۃً جاری رہی اور |
| حتی مضت قرون وصار الملک الی الحارث | چند صدیوں تک ان کے ہاتھ سے نہیں نکلی پھر حارث |
| وهو تبع الاول فمن ملک اليمن قبل | الرائش بادشاہ ہوا جو پہلا تبع ہے اس سے پہلے |

| | |
|---|---|
| الی اذئش ملکان ملک بسبا و | دو بادشاہ ہوتے تھے: ایک سبا میں اور ایک حضرموت |
| ملک بحضرموت وکان لا یجمع | میں۔ تمام یمنی ایک پر جمع نہیں ہوتے تھے لیکن جب |
| الیمانیون کلھم علیھم الی ان | الرائش بادشاہ ہوا تو اس کی بادشاہی پر سب مجتمع |
| ملک الرائش فاجتمعوا علیہ | ہو گئے اور اس کی اطاعت قبول کر لی اس لیے اس کا |
| وتبعوہ فسمی تبعا[1] | لقب تبع ہوا۔ |

اور مؤرخ و محدث ابن کثیر نے بھی اپنی تاریخ میں یہی بیان کیا ہے:۔

| | |
|---|---|
| وکانت العرب تسمی کل من ملک الیمن | اور عرب اس بادشاہ کو جو یمن کے ساتھ شحر اور حضرموت |
| مع الشحر وحضرموت تبعا کما یسمون | کا بھی بادشاہ ہو تبع کہتے ہیں جیسا کہ اس بادشاہ کو |
| من ملک الشام مع الجزیرۃ قیصر ومن | جو شام اور جزیرہ دونوں کا حکمراں ہو قیصر کہتے ہیں اور |
| ملک الفرس کسریٰ ومن ملک مصر | جو فارس کا بادشاہ ہو اس کو کسریٰ اور ملک مصر کے |
| فرعون ومن ملک الحبشۃ النجاشی | بادشاہ کو فرعون اور حبشہ کے بادشاہ کو نجاشی اور |
| ومن ملک الھند بطلیموس[2] | ہندوستان کے بادشاہ کو بطلیموس کہتے ہیں۔ |

غرض یہ خیال کہ سبا کی حکومت اور حمیری حکومت ایک ہی بات ہے نہ صرف تاریخ ہی کے خلاف ہے بلکہ خود قرآنِ عزیز کی تصریحات کے بھی خلاف ہے اس لیے کہ قرآنِ عزیز نے حکومتِ سبا سے متعلق سورۂ نمل اور سورۂ سبا میں جو دو واقعے بیان کیے ہیں ان کا تعلق سبا کے اس طبقہ سے ہے جو ملوکِ حمیر اور تبابعہ سے قبل گذرا ہے اور اس لیے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حمیر ہرگز سبا کا بلاواسطہ جانشین نہیں ہے بلکہ اس کے اور حمیر کے درمیان بہت زیادہ واسطے ہیں اور حمیر اگرچہ سبا کا بیٹا ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کا اپنا زمانہ اور اس کی نسل میں قیامِ حکومت کا زمانہ ایک ہے بلکہ قیاس یہ چاہتا ہے کہ سبا کے بعد اس کی اولاد میں حکومت کا وہ سلسلہ جو طبقۂ اولیٰ سے تعلق رکھتا ہے بجائے حمیر کی نسل کے کہلان کی کسی قدیم شاخ میں قائم رہا ہے کیونکہ مارب اور سبا کی نوآبادیوں کی تباہی کا اثر ہم بنی کہلان میں زیادہ پاتے ہیں اور مارب تک حمیری حکومت

[1] ص ۱۰۸ مطبوعہ کلکتہ۔ [2] البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۱۵۹۔

کی ابتداء سبا کی بربادی سے شروع ہوتی ہے چنانچہ عام مؤرخین کے خلاف ابن عبدالبر نے یہ تصریح کی ہے کہ سبا کی حکومت صرف حمیر کی نسل ہی میں نہیں رہی بلکہ کہلان کے خاندان میں بھی یہ سلسلہ رہا ہے، وہ فرماتے ہیں :۔

وولد سبا حمیر بن سبا وکھلان بن سبا فمن حمیر وکھلان کانت ملوك الیمن من التبابعة والاذواء۔

اور سبا کے دو بیٹے تھے حمیر اور کہلان اور حمیر و کہلان دونوں ہی کی نسل سے یمن کے بادشاہ تبع اور ذو ہوئے ہیں۔

**مکارب سبا وملوک سبا** | سبا (طبقہ اولیٰ) کے دورِ اول کے حکمراں تاریخ میں "مکارب سبا" کے لقب سے یا "ملوک سبا" کیے جاتے ہیں یہ لفظ "مکا" بمعنی "مذہبی" اور "رب" بمعنی "مالک" سے مرکب ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سبا کا ابتدائی دورِ حکومت مذہبی پیشواؤں یعنی کاہن حکمرانوں سے شروع ہوتا ہے ان بادشاہوں کا دارالحکومت صرواح تھا اور یہ مارب اور صنعاء کے درمیان واقع تھا اور اس کے کھنڈرات بھی موجود ہیں اور ملوکِ سبا (شاہانِ سبا) کا دارالحکومت مارب تھا اور ان کا بادشاہ اس کے مشہور قلعہ "سلحین" میں رہتا تھا۔ ابن علقمہ جاہلی شاعر، مسلمان مؤرخین سے قبل ان دونوں زمانہ ہائے حکومت کو الگ الگ ظاہر کرتے ہوئے کہتا ہے :۔

من یامن الحدثان بعد ملوك صرواح ومارب

صرواح اور مارب کے بادشاہوں کے بعد اب کون حوادث سے محفوظ رہ سکتا ہے۔

اور یہی شاعر قلعہ سلحین کا بھی ذکر کرتا ہے :۔

وقصر سلحین قد عفاه ریب الزمان الذی یریب

اور سلحین کا محل جس کو زمانہ کے حوادث نے فنا کر دیا۔

**وسعتِ حکومت** | حکومتِ سبا کی ابتداء جنوبی عرب "یمن" کے مشرقی حصہ سے ہوتی ہے اس کا دارالحکومت اول صرواح تھا اور پھر مارب ہوا آہستہ آہستہ اس حکومت نے ترقی کی اور ملکی فتوحات کے ساتھ ساتھ تجارتی ذرائع سے بھی بہت زیادہ کامیابی حاصل کی اس لیے اس کا رقبۂ حکومت

وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا اور شمالی عرب اور افریقہ تک اس کے حدود نظر آنے لگے چنانچہ حبشہ میں اذنیہ کا ضلع اسی کے مقبوضات میں تھا اور حکومتِ سبا کی جانب سے معافر کے لقب سے ایک سبائی حکومت کرتا تھا یمن سے براہِ حجاز شام تک جو قدیم تجارتی شاہراہ تھی اور جس کا ذکر قرآنِ عزیز نے سورۂ قریش میں "رِحۡلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيۡفِ" کہہ کر کیا ہے اور دوسری جگہ جس کو "امام مبین" فرمایا ہے وہ بھی ان ہی کے قبضہ میں آگئی تھی اور شام فلسطین اور مدین کے نواح میں بھی ان کے مقبوضات موجود تھے اور اس طرح تقریباً آٹھویں صدی قبل مسیح میں اہلِ یمن پر غلبہ پانے کے بعد سبا کی حکومت عرب کی عظیم الشان متمدن حکومت تھی[1]

**طرزِ حکومت** سبا کے طرزِ حکومت کے متعلق اہلِ تاریخ یہ کہتے ہیں کہ اس زمانہ کے محدود سلسلۂ رسل و رسائل کے پیشِ نظر یہ ضروری سمجھا جاتا تھا کہ دار الحکومت سے فاصلہ پر آباد شہروں اور بستیوں پر آزاد گورنروں کی چھوٹی چھوٹی حکومتیں ہوں اور جو مرکزی حکومت کے تابع اور اس کے نائب کی حیثیت سے حکومت کیا کریں۔ پس اس اصول پر یمن کی حکومت قائم تھی اور اس کی ترتیب و تنظیم اس طرح پر تھی کہ آس پاس کے گاؤں اور قصبوں کے درمیان عموماً ایک قلعہ ہوتا تھا جس پر قلعہ دار رہتا تھا اور وہی ان آبادیوں کا حاکم اور ذو کہلاتا تھا اور اس مجموعۂ آبادی کو "محفد" کہتے تھے۔ یمنی زبان میں ذو کے معنی "آقا" کے ہیں جو عربی میں بھی صاحب و مالک بولا جاتا ہے اور اس کی جمع اذواء آتی ہے اور قلعہ کا جو نام رکھا جاتا تھا اسی کے انتساب سے قلعدار کا لقب قرار پاتا تھا مثلاً ذو غمدان ذو ثعلبان۔

پھر چند محفد مل کر ایک "مخلاف" بنتا تھا اور اس مخلاف کے حاکم کو قیل (صوبہ دار) کہتے تھے قیل کی جمع "اقیال" ہے اور یہ سب اقیال "ملک" (بادشاہ) کے تابعِ فرمان ہوتے تھے، انہی بادشاہوں کو یمن کی تاریخ میں مکارب سبا اور ملوکِ سبا کہا جاتا تھا اور بادشاہ کا بھی ایک زبردست اور محکم قلعہ ہوتا تھا چنانچہ قلعہ "ریدان" اور "سلحین" ان ہی بادشاہوں کے قلعے تھے اور یہ بادشاہ ان ہی قلعوں اور دار الحکومت کے شہروں کے انتساب سے لقب پاتے تھے مثلاً

[1] دائرۃ المعارف للبستانی (سبا) و معجم البلدان (یمن)

ملکِ سبا ذو ریدان" یا "ملک سبا ذو سلحین" مارب کے آثار سے جو سکے حاصل کیے گئے ہیں ان پر یہ نقش کندہ ہے "ضرب بیت سلحین وحفر مارب" یعنی یہ قلعہ سلحین اور شہر مارب میں سکوک کیا گیا۔

یمن کے اسلامی حکومت میں شامل ہونے کے بعد بھی "اذواء" اور "اقیال" کا یہ نظم حکومت باقی رکھا گیا اور یہی وہ اقیالِ یمن ہیں جن کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوتِ اسلام کے لیے نامہ ہائے مبارک تحریر فرمائے اور انھوں نے برضا و رغبت دعوتِ اسلام کو قبول کیا۔

**سبا کی عمارات** ہمدانی جو کہ قدیم مورخین کی طرح جدید یورپ کی نگاہ میں بھی بہت مستند اور سچا مؤرخ تسلیم کیا جاتا ہے اس نے اپنی مشہور کتاب اکلیل میں ایک باب سبا کی عظیم الشان اور عجیب و غریب عمارات کے لیے مرتب کیا ہے اور حکومتِ سبا کے سلسلہ میں جو کتبات پائے گئے ہیں ان میں بھی اکثر ان قلعوں اور بے نظیر عمارات ہی کے کتبے ہیں اور یورپین سیاح بھی ان کھنڈرات کے عجیب و غریب حالات سناتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ قصرِ غمدان بے مثل صناعی کا نمونہ تھا۔ یہ قصر بیس منزل رکھتا تھا اور ہر ایک منزل کا ارتفاع بقدر دس گز معماری تھا اور سب سے اوپر کی منزل نہایت بیش قیمت آبگینوں سے بنائی گئی تھی اور اس قصر میں سو وسیع و عریض کمرے تھے، اسی طرح بے نظیر عمارات کا سلسلہ تھا جو اس زمانہ کے رفیع تمدن اور سبا کی حیرت انگیز ترقی کا آئینہ دار تھا[1]۔

**سبا کا تمدن** گذشتہ سطور میں کہا جا چکا ہے کہ اہلِ سبا ایک تاجر قوم تھی اور یہ وصف ان کا قومی مزاج بن گیا تھا۔ اس لیے وہ حکومت کے وسائلِ ترقی کے لیے بھی اسی کو زیادہ اہم وسیلہ سمجھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے حدودِ حکومت میں جو خزانے مدفون کر رکھے تھے وہ اور زیادہ ان کی اس فطرت کے لیے تائیدِ غیبی بن گئے تھے کیونکہ عرب میں سونے اور جواہرات کی بکثرت

---

[1] یقال ان غمدان قصر بالیمن بناہ یعرب بن قحطان وملکہ بعدہ واختلہ واثلۃ بن حمیر بن سبا ویقال کان ارتفاعہ عشرین طبقۃ۔ البدایہ والنہایۃ ج ۲ ص ۱۶۹۔

کانیں موجود ہیں اور ان کا بیش تر حصہ ان ہی کے رقبۂ حکومت میں موجود تھا۔ مدین میں سونے کے علاوہ دوسری قسم کی معدنیات بھی پائی جاتی ہیں حضرموت اور یمن کا علاقہ خوشبودار اشیا کی پیداوار کے لیے مشہور تھا اور اب بھی ہے، عمان اور بحرین میں موتیوں کے خزانے ہیں جن سے آج بھی تمام دنیا میں بیش قیمت موتی جاتا ہے۔ خود یمن کے ساحل ہندستان اور حبش کی پیداوار کے لیے منڈی تھے اور شام، مصر اور یورپ اور ہندستان، حبش کے درمیان جو درآمد برآمد ہوتی اور تجارتی کاروبار ہوتا تھا اس زمانہ میں سبا ہی اس کے واحد اجارہ دار اور براہِ حجاز ان ملکوں تک سامانِ تجارت پہنچاتے تھے، اسی بناء پر توراۃ میں سبا کی دولت و ثروت اور اس کی وجہ سے ان کے تمدن کی عظمت کے بہ کثرت تذکرے پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ یسعیاہ نبی کی کتاب میں ہے:۔

مصر کے مزدور اور حبش اور سبا کے تجارتی مال اور تن ومند آدمی تیرے پاس آئیں گے اور وہ تیرے ہوں گے [1]

اور اسی کتاب میں دوسری پیشین گوئی ہے:۔

(اے یروشلم) اونٹوں کی قطاریں تجھ پر چھا جائیں گی مدین اور عیفا کی اونٹنیاں (بھی) یہ سب سبا سے آئیں گی اور سونا اور لوبان لے کر آئیں گی [2]

اور یرمیاہ نبی کی کتاب میں ہے:۔

خداوند غصہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کس مقصد کے لیے میرے پاس سبا کا لوبان پیش کرتے ہو [3]

اور حزقیل نبی کی کتاب میں ہے:۔

اور عوام کے ساتھ سبا والے بیابان (عرب) سے لائے گئے جن کے ہاتھوں میں کنگن ہیں اور خوب صورت تاج ان کے سروں پر ہیں [4]

اور دوسری جگہ ہے:۔

اور سبا اور رعمہ کے سوداگر تیرے ساتھ سوداگری کرتے تھے وہ تیرے بازاروں میں ہر قسم

[1] یسعیاہ (۴۵-۱۴) [2] یسعیاہ (۶۰-۶) [3] یرمیاہ (۶-۲۰) [4] حزقیل (۲۳-۴۲)

کے نفیس اور خوشبودار مصالحے اور ہر طرح کے جواہرات اور سونا اور یمن کے شہروں،
حران، قانہ اور عدن اور سوداگرانِ سبا اور اشور اور کلماد تیرے سوداگر ہیں، یہ ہی تیرے
تاجر تھے ہر قسم کی چیزوں کے جو کمخاب اور چوغے اور ارغوانی اور منقش پوشاکیں اور سب
طرح کے بوٹے دار نفیس کپڑے گٹھوں سے کسے ہوئے اور مضبوط بندھے ہوئے
تیری تجارت گاہ میں بیچنے کے لیے لاتے تھے [1]

**سدِ مارب** عرب میں مستقل دریا ناپید ہیں، اکثر بارش کے پانی پر گذر ہے اور کہیں کہیں پہاڑی چشمے بھی ہیں، بارش کا پانی ہو یا پہاڑی چشموں کا تمام پانی بہہ کر وادی کے ریگستان میں جذب ہو کر ضائع ہو جاتا ہے، قومِ سبا نے اس پانی کو کام میں لانے اور باغات و زراعت کو سرسبز و شاداب بنانے کے لیے یمن کے اقطاع و امصار میں ایک سو سے زائد بند باندھے تھے اور ان کی وجہ سے تمام ملک سرسبز و بہارستان بنا ہوا تھا اُن ہی بندوں میں سے سب سے بڑا اور عظیم الشان بند "سدِ مارب" تھا جو دار الحکومت "مارب" میں بنایا گیا تھا۔

اِس سد کے متعلق قدیم و جدید مؤرخوں اور سیاحوں نے جو حالات لکھے ہیں، وہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ سبا کو فنِ انجینئری اور ہندسہ میں بہت بڑا کمال حاصل تھا۔

مارب کے جنوب میں داہنے بائیں دو پہاڑ ہیں جو کوہِ ابلق کے نام سے مشہور ہیں اور انکے درمیان بہت طویل و عریض وادی ہے جس کو وادیٔ اُذنیہ کہتے ہیں جب پانی برستا یا پہاڑی چشموں سے بہہ نکلتا تو وادی دریا بن جاتی۔ سبا نے یہ دیکھ کر سنہ ق م میں ان دونوں پہاڑوں کے درمیان بند باندھنا شروع کیا اور عرصہ تک اس کی تعمیر کا سلسلہ جاری رہا۔

بعض مؤرخینِ عرب کہتے ہیں کہ یہ بند دو میل مربع تھا اور صاحبِ ارض القرآن ایک یورپین سیاح ارناؤ کے مضمون کے حوالہ سے بیان کرتے ہیں کہ یہ ایک سو پچاس فٹ لانبی اور پچاس فٹ چوڑی دیوار ہے جس کا بہت بڑا حصہ منہدم ہو چکا ہے اور ایک تہائی اب بھی باقی ہے اور وہ یہ بھی تحریر فرماتے ہیں کہ اس سیاح نے اس کا بہت عمدہ نقشہ تیار کر کے اپنے مضمون کیساتھ

[1] ۲۷ - ۲۷ - ۲۲ - [2] تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۱۵۹ -

شائع کیا ہے جو فرنچ ایشیاٹک سوسائٹی کے جرنل میں چھپا ہے اور جس کو انھوں نے ارض القرآن میں بھی نقل کیا ہے۔

مؤرخینِ عرب یہ بھی کہتے ہیں کہ سبا نے اس کو اس طرح تعمیر کیا تھا کہ پانی کو روکنے کے بعد موسموں کے اختلافات کے پیشِ نظر آبیاری کے لیے پانی کے اوپر نیچے تین درجے قائم کر دیے تھے اور ہر درجے میں تیس تیس کھڑکیاں رکھی تھیں جن کے ذریعہ پانی کو کھولا اور بند کیا جاتا تھا اور پھر ان کے نیچے ایک بہت بڑا حوض بنایا تھا اس کے دائیں اور بائیں دو بڑے بڑے آہنی پھاٹک تھے جن کے ذریعہ حوض کا پانی تقسیم ہو کر مارب کے دونوں جانب نہروں، گولوں اور رجہوں کے ذریعہ حسبِ ضرورت کام میں آتا تھا۔ اس عظیم الشان بند کی وجہ سے تقریباً تین سو مربع میل تک داہنے اور بائیں چھواروں کے نخلستان، میووں اور پھلوں کے حسین و جمیل باغ، خوشبوؤں کے کھیت اور مرغ زار، دارچینی، عود اور مختلف قسم کے خوشبودار درختوں کے گنجان باغات اس کثرت سے ہو گئے تھے کہ تمام علاقہ چمنستان اور فردوس بنا ہوا تھا۔[1]

ابن کثیر وغیرہ بروایت ابن منبہ یہاں تک مبالغہ کرتے ہیں کہ اگر ایک عورت کسی موسم میں بھی سر پر ٹوکری رکھ کر ان باغات کے اندر گذر جاتی تو ہاتھ لگائے بغیر ہی اس کی ٹوکری پختہ پھلوں کے ٹپکنے سے بھر جاتی ہے۔[2]

یمن کی طبعی خصوصیت کے لحاظ سے خوشبوؤں، پھلوں اور پھولوں کے درختوں کی کثرت، مارب کے بند کی وجہ سے اس میں عظیم الشان اضافہ اور ترقیِ تجارتی کاروبار اور معدنیات کی کثرت کی وجہ سے سونا، چاندی اور جواہرات کی بہتات نے قومِ سبا میں اس درجہ خوش عیشی، رفاہیت فارغ البالی اور اطمینان پیدا کر دیا تھا کہ وہ ہر وقت مسرت و شادمانی کے ساتھ خدا کی نعمتوں سے بہرہ اندوز ہوتے اور شب و روز طمانیت و مرفہ الحالی میں زندگی بسر کرتے تھے۔

اور ملک کے بہارستانوں اور چمنستانوں کی وجہ سے آب و ہوا میں اس درجہ اعتدال تھا کہ اہلِ سبا مچھروں، مکھیوں اور پسوؤں جیسے ایذا رساں کیڑوں سے پاک و محفوظ تھے چنانچہ سبا کے

[1] البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۱۵۸۔ [2] تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۱۵۹۔

معاصر مؤرخ اہلِ سبا کی اس رشک پیدا کرنے والی زندگی کے حالات اس طرح بیان کرتے ہیں (راٹوتھینس (EROTOO THENS) ۱۹۴ سنہ ق م لکھتا ہے:-

"عرب کے انتہائی حد پر سمندر (بحر ہند و عرب) کے پہلو میں سبا کے لوگ ہیں جن کا دارالحکومت مارب (MARLABA) ہے۔ یہ قطعہ ملک مصر کے زیریں پڑا ہے گرمیوں میں بارش ہوتی ہے اور دریا جاری ہوتے ہیں جو میدانوں اور تالابوں میں جاکر خشک ہو جاتے ہیں، اسی سبب سے زمین اس قدر سرسبز و شاداب ہے کہ تخم ریزی وہاں سال میں دو بار ہوتی ہے۔ حضرموت سے سبا کے ملک تک چالیس روز کا راستہ ہے اور معین سے سوداگر شتر دن میں ایلہ (عقبہ) پہنچتے ہیں، حضرموت، معین اور سبا کے ملک خوش و خرم ہیں اور ہیکلوں اور شاہی عمارتوں سے آراستہ ہیں۔

اور یونانی مؤرخ اگاتھر شیڈس (AGATHERSHIDOS) ۱۴۵ سنہ ق م لکھتا ہے:

"سبا عرب آبادان (ARABIAFLER) میں رہتے ہیں جہاں بہت اچھے اچھے بے شمار میوے ہوتے ہیں۔ زمین جو سمندر کے متصل ہے اس میں بلساں اور نہایت خوبصورت درخت ہوتے ہیں جو دیکھنے میں بہت بھلے معلوم ہوتے ہیں، اندرونِ ملک بخورات، دارچینی اور چھوارے کے نہایت بلند درختوں کے گنجان جنگل ہیں اور ان درختوں سے نہایت شیریں بو پھیلا کرتی ہے، درختوں کے اقسام کی کثرت و تنوع کے سبب سے ہر قسم کا نام و وصف مشکل ہے، جو خوشبو اس میں سے اُڑتی ہے وہ جنت کی خوشبو سے کم نہیں، اور جس کی تعریف لفظوں میں ادا نہیں ہو سکتی۔ جو اشخاص زمین سے دور ساحل سے گذرتے ہیں وہ بھی جب ساحل کی طرف سے ہوا چلتی ہے تو اس خوشبو سے محظوظ ہوتے ہیں، وہ گویا آبِ حیات کا لطف اٹھاتے ہیں اور یہ تشبیہ بھی اس کی قوت و لطافت کے مقابل میں ناقص ہے۔"

اور یہی مؤرخ دوسری جگہ لکھتا ہے:-

"سبا میں تمام دنیا میں سب سے زیادہ دولت مند لوگ ہیں۔ چاندی اور سونا بکثرت ہر طرف سے لایا جاتا ہے، بُعد کے سبب سے کسی نے ان کو فتح نہیں کیا ہے اسی لیے خصوصاً ان کے دارالحکومت میں سونے چاندی کے برتن ہیں تخت اور پیش گاہیں ہیں جن کے ستون زرنگار اور نقرئی و طلائی نقش ونگار سے آراستہ ہیں، ایوان اور دروازے زر وجواہر سے منقش ہیں، اس قسم کے زیب وزینت پر وہ نہایت ہنرمندی اور محنت صرف کرتے ہیں۔"

اور مشہور مؤرخ آرٹی میڈوروس (ARTIMIDOR) ۳۰ ق م باشندہ شہر افسس لکھتا ہے:-

"سبا کا بادشاہ اور اس کا ایوان مآرب میں ہے جو ایک پُر اشجار پہاڑ پر زنانہ خوش حالی (عیش وعشرت) میں واقع ہے میووں کی کثرت کے سبب سے لوگ سست اور ناکارہ ہوگئے ہیں، خوشبودار درختوں کی جڑوں میں لیٹے پڑے رہتے ہیں۔ جلانے کی لکڑی کے بدلے دارچینی اور خوشبودار لکڑی جلاتے ہیں، کچھ لوگوں کا پیشہ زراعت ہے اور کچھ ملکی وغیر ملکی سالوں کی تجارت کرتے ہیں، یہ مسالے مقابل کے حبشی ساحل سے لائے جاتے ہیں جہاں سبا کے لوگ چمڑے کی کشتیوں میں بیٹھ کر دریا کے پار چلے جاتے ہیں۔ قرب وجوار کے قبائل سبا سے تجارتی اسباب خریدتے ہیں اور وہ اپنے ہمسایوں کو دیتے ہیں اور اسی طرح دست بدست وہ شام اور جزیرہ تک پہنچتے ہیں[1]"

**جنّتانِ عَن یَمین وَّشمال**

غرض یمن کی طبعی خصوصیات کے علاوہ جو اس ملک کی شادابی اور معتدل آب وہوا کے لیے قدرتی وسائل کی شکل میں موجود تھیں ملک کے اندر اس:

"بندِ آب نے ہمہ قسم کی راحت وعیش وعشرت کی زندگی کے لیے سامان فراہم کر دیے تھے اور ان سب چیزوں پر یہ مستزاد تھا کہ یمن سے شام تک جس مشہور شاہراہ "امام مبین" پر اہلِ سبا کے تجارتی قافلوں کی آمد ورفت تھی اس کے بھی دونوں جانب حسین وخوب صورت بلسان اور دارچینی جیسے خوشبودار درختوں کا سایہ تھا اور قریب قریب فاصلہ سے حکومتِ سبا نے ان کے سفر کو آرام دہ بنانے کے لیے کاروان سرائے بنا رکھی تھیں جو شام کے علاقہ تک ان کو اس آرام

[1] ارض القرآن ج ۲ ص ۲۵۰ - ۲۵۱ -

کے ساتھ پہنچاتی تھیں کہ خنک پانی اور میووں اور پھلوں کی افراط یہ بھی محسوس نہیں ہونے دیتی تھی کردہ اپنے وطن میں ہیں یا دشوار گذار سفر میں حتیٰ کہ جب خوش گوار سایہ اور فرحت بخش ہوا میں ان کا کارواں ان کارواں سراؤں میں ٹھہرتا، میوے اور تازہ پھل کھاتا اور سرد و شیریں پانی پیتا ہوا حجاز اور شام تک آمد و رفت رکھتا تو ہمسایہ قومیں رشک و حسد سے ان پر نگاہیں اٹھاتی اور حیرت و تعجب کے ساتھ ان کے اس عیش و عشرت پر انگشت بدنداں ہو جاتی تھیں جیسا کہ آپ ابھی معاصر مؤرخین کی زبان سے سُن چکے ہیں کہ وہ کن الفاظ کے ساتھ ان کی اس خوش حالی کا تذکرہ کر رہے ہیں اور جس کو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے بے حد ارزاں کر دیا تھا۔

اِن تاریخی تصریحات کے بعد اب ہم کو قرآنِ عزیز کی ان آیات کا مطالعہ کرنا چاہیے جو سبا کی اس خوش حالی کا ذکر کرتے ہوئے اس کو اہلِ سبا پر خدائے تعالیٰ کا عظیم الشان انعام و اکرام اور احسانِ عظیم ظاہر کرتا ہے۔

| | |
|---|---|
| لَقَدْ كَانَ لِسَبَإٍ فِي مَسْكَنِهِمْ | بلاشبہ اہلِ سبا کے لیے ان کے وطن میں قدرتِ الٰہی |
| آيَةٌ جَنَّتَانِ عَنْ يَمِينٍ وَشِمَالٍ | کی عجیب و غریب نشانی تھی دو باغوں کا (سلسلہ) داہنے |
| كُلُوا مِنْ رِزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوا لَهُ | بائیں، اور خدا نے ان کو یہ فرما دیا تھا "اے سبا والو! |
| بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَرَبٌّ غَفُورٌ | اپنے پروردگار کی جانب سے بخشی ہوئی روزی کھاؤ |
| (سبا، پ ۲۲ - ع ۲) | اور اس کا شکر کرو شہر ہے پاکیزہ اور پروردگار ہے بخشنے والا۔ |

ایک مرتبہ گذشتہ تاریخی تفاصیل کو اور مطالعہ کیجیے اور صرف مسلمان مؤرخین کی روایات کی روشنی میں نہیں بلکہ اُن غیر مسلم مؤرخین کی معاصرانہ شہادتوں کی روشنی میں پڑھیے جو اسلام دشمنی میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں اور پھر قرآن کی مسطورہ بالا آیات کا مطالعہ فرمائیے قرآن کہتا ہے کہ: سبا کے اپنے گھر ہی میں خدائے تعالیٰ کی بے نظیر اور عجیب و غریب نشانی موجود تھی، وہ یہ کہ سینکڑوں میل تک ان کے شہر کے داہنے بائیں میووں پھلوں اور خوشبودار چیزوں کے درختوں کا گنجان سلسلہ باغات کی شکل میں موجود تھا، یہ خدائے تعالیٰ کا عطا کردہ رزق تھا جو آس پاس کی قوموں کے

مقابلہ میں دو طرح سے ان کو بخشا گیا تھا۔ ایک ملک کے طبعی خواص کے ذریعہ جو اللہ کی فطرۃ کے ہاتھوں سے معتدل ہوا، سرد و خشک پانی، عمدہ پھلوں اور پھولوں کی خود رو پیداوار اور خوشبودار چیزوں کے درختوں کی طبعی نشو و نما کی شکل میں ظاہر ہوا اور دوسرا آب رسانی کے بہتر طریقوں کی صورت میں جو درحقیقت خالقِ کائنات ہی کی عطا کردہ عقل و خرد اور فہم و ذکا کا نتیجہ تھا۔ پس اہلِ سبا کا فرض ہے کہ وہ اس خوش عیشی اور عافیت کوشی پر جو اُن کو اُن کے وطن ہی میں بے محنت حاصل ہے، اس کے شکر گذار بندے بنیں اگر وہ ان نعمتوں کا شکر ادا کریں گے اور خدا کے رشتہ کو مضبوط کرنے کے لیے اس کی مرضیات پر گامزن رہیں گے تو بلاشبہ انھیں یہ سمجھنا چاہیے کہ ایک جانب اُن کی دنیا کی زندگی کے لیے ان کو ایسا عمدہ اور ہر طرح سے پاک صاف وطن حاصل ہے اور دوسری جانب ان کی حیاتِ اَبدی اور نجاتِ اُخروی کے لیے ان کا پروردگار بہت بخشنے والا ہے۔

**اہلِ سبا اور خدا کی نافرمانی**

اہلِ سبا ایک عرصہ تک تو اس جنتِ ارضی کو خدا کی عظیم الشان آیت و نعمت ہی سمجھتے اور حلقہ بگوشِ اسلام رہتے ہوئے احکامِ الٰہی کی تعمیل اپنا فرض یقین کرتے رہے لیکن تموّل، خوش عیشی اور ہر قسم کے تنعم نے آہستہ آہستہ ان میں بھی وہی اخلاقِ ردیہ پیدا کر دیے جو اُن کی پیشرو گذشتہ متکبر اور مغرور قوموں میں موجود تھے اور یہ یہاں تک ترقی کرتے رہے کہ انھوں نے دینِ حق کو بھی خیرباد کہہ دیا اور کفر و شرک کی سابق زندگی کو دوبارہ اپنا لیا۔ تاہم ربِ غفور نے فوراً گرفت نہیں کی بلکہ اس کی وسعتِ رحمت نے قانونِ امہال (مہلت دینے کا قانون) سے کام لیا اور انبیاء (علیہم السلام) نے ان کو راہِ حق کی تلقین فرمائی اور بتایا کہ ان نعمتوں کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم دولت، ثروت، اور جاہ و حشمت کے نشہ میں چور ہو کر مست ہو جاؤ اور نہ یہ کہ اخلاقِ کریمانہ کو چھوڑ بیٹھو اور کفر و شرک اختیار کر کے خدا کے ساتھ بغاوت کا اعلان کر دو، سوچو اور غور کرو کہ یہ راہ بُری ہے اور اس کا انجام بُرا انجام ہے۔

محمد بن اسحاق بروایت ابن مُنبہ کہتے ہیں کہ اس درمیان میں ان کے پاس خدائے تعالیٰ کے تیرہ نبی حقِ رسالت ادا کرنے آئے مگر انھوں نے مطلق توجہ نہ کی اور اپنی موجودہ خوش عیشی کو

دائمی وراثت سمجھ کر شرک و کفر کی بدمستیوں میں مبتلا رہے۔[1]

آخر تاریخ نے خود کو دہرایا اور اُن کا انجام بھی وہی ہوا جو گذشتہ زمانہ میں خدائے برحق کی نافرمان قوموں کا ہو چکا ہے۔

سَیلِ عَرِم | چنانچہ خدائے تعالیٰ نے ان پر دو قسم کا عذاب مسلط کر دیا جس کی بدولت ان کے جنت مثال باغات برباد ہو گئے اور ان کی جگہ جنگلی بیریاں، خار دار درخت اور پیلو کے درخت اُگ کر یہ شہادت دینے اور عبرت کی کہانی سُنانے لگے کہ خدا کی پیہم نافرمانی اور سرکشی کرنے والی اقوام کا یہ حشر ہوتا ہے۔

پہلی سزا | ہوا یہ کہ وہ "بند" جس کی تعمیر پر ان کو بے حد ناز تھا اور جس کی بدولت ان کے دارالحکومت کے دونوں جانب تین سو مربع میل تک خوبصورت اور حسین باغات اور سرسبز و شاداب کھیتوں اور فصلوں سے یمن گلزار بنا ہوا تھا وہ خدا کے حکم سے ٹوٹ گیا اور اچانک اس کا پانی زبردست سیلاب بنا ہوا وادی میں پھیل گیا اور مارب اور اس تمام حصۂ زمین پر جن میں یہ فرحت بخش باغات تھے چھا گیا اور ان سب کو غرقِ آب کر کے برباد کر ڈالا اور جب پانی آہستہ آہستہ خشک ہو گیا تو اس پورے علاقہ میں باغوں کی جنت کی جگہ پہاڑوں کے دونوں کناروں سے وادی کے دونوں جانب جھاؤ کے درختوں کے جھنڈ، جنگلی بیروں کے جھاندوں اور اُن پیلو کے درختوں نے لے لی جن کا پھل بدذائقہ اور کسیلا پن لیے ہوتا ہے۔

اور خدا کے اس عذاب کو اہلِ مارب اور قومِ سبا کی کوئی قوت و سطوت نہ روک سکی اور بند باندھنے میں انجینئری اور علمِ ہندسہ کی مہارتِ فن کا جو ثبوت انھوں نے دیا تھا وہ اس کی شکستگی کے وقت سب ناکارہ ہو کر رہ گیا اور اہلِ سبا کے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار باقی نہ رہا کہ اپنے وطنِ مالوف اور "بلدۂ طیبہ" مارب اور نواحِ مارب کو چھوڑ کر منتشر ہو جائیں۔

قرآنِ عزیز نے اسی عبرت ناک واقعہ کو بیان کر کے عبرت گاہ اور بیدار قلب انسان کو نصیحت کا یہ سبق سُنایا ہے۔

| | |
|---|---|
| فَأَعْرَضُوا فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ | پھر انھوں نے (قوم سبا نے) ان پیغمبروں کی نصیحتوں |
| سَيْلَ الْعَرِمِ وَبَدَّلْنَاهُم بِجَنَّتَيْهِمْ | سے منہ پھیر لیا۔ پس ہم نے ان پر بند توڑنے کا سیلاب |
| جَنَّتَيْنِ ذَوَاتَيْ أُكُلٍ خَمْطٍ وَ | بھیج دیا اور ان کے دو (عمدہ) باغوں کے بدلے دو ایسے |
| أَثْلٍ وَشَيْءٍ مِّن سِدْرٍ قَلِيلٍ | باغ اگا دیے جو بدمزہ پھلوں، جھاؤ اور کچھ بیری کے |
| ذَٰلِكَ جَزَيْنَاهُم بِمَا كَفَرُوا وَهَلْ | درختوں کے جھنڈ تھے، یہ ہم نے اُن کی ناشکر گذاری کی |
| نُجَازِي إِلَّا الْكَفُورَ | سزا دی اور ہم ناشکر قوم ہی کو سزا دیا کرتے ہیں۔ |

غور کیجیے کہ یہ سیلاب بہ اسبابِ ظاہر کس طرح آیا۔ کیا اس لیے کہ "مارب کا بند" کہنہ اور شکستہ ہو گیا تھا؟ نہیں۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو جس قسم کے مہندسین اور انجنیری کے ماہرین نے اس کو بنایا تھا، سبا میں ان کی اس وقت بھی کمی نہ تھی اور وہ اس کے علاوہ ملک کے مختلف حصوں میں سینکڑوں بند تعمیر کراتے رہے تھے پھر کیا وہ اس کی کہنگی اور شکستگی کا اتنا انتظام بھی نہیں کر سکتے تھے کہ اگر اس کو اپنی طبعی عمر پر ٹوٹنا ہی ہے تو پانی کے زور کو اس طرح کم کر دیا جائے یا اس کے لیے تعمیر میں ایسے اضافے کر دیے جائیں کہ جس سے یہ اچانک شکست ہو کر اس مصیبتِ عظمیٰ کا باعث نہ بن سکتا پھر یہ سیلاب کیوں آیا؟ کیا اس لیے کہ اس حقیقت کے جان لینے کے باوجود کہ یہ بند عن قریب شکستہ ہو کر اس داہیۂ کبریٰ کا باعث بننے والا ہے انھوں نے کاہلی اور سستی سے اس کی پرواہ نہیں کی تو تاریخ کی روشنی میں یہ بھی غلط ہے اس لیے کہ حکومتِ سبا کے متعلق جو معاصرانہ تاریخی شہادتیں مہیا ہیں وہ یہ ظاہر کرتی ہیں کہ وہ اس بند کی مضبوطی، استحکام اور ہر قسم کے حفاظتی امور کے بارے میں بہت مطمئن تھے اور برابر اس سے آبپاشی کا کام لے رہے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ قدیم و جدید تاریخیں اس ہولناک تاریخی واقعہ کے اسباب و علل کے بارے میں قطعاً خاموش ہیں اور اس لیے خاموش ہیں کہ سبا پر یہ عذاب بلاشبہ غیر متوقع اور اچانک آیا جس سے وہ خود بھی حیران و سراسیمہ ہو کر رہ گئے اور وہ اس کے سوا اور کچھ نہ سمجھ سکے کہ یہ جو کچھ ہوا اچانک غیبی ہاتھ سے ہوا کیونکہ "بند" کے استحکامات اور انتظامات میں بظاہر کوئی

خرابی نہیں تھی پھر یک لخت بند کا ٹوٹ جانا اور پانی کا سیلابِ عظیم کی شکل میں پھیل کر تمام جنت نشان علاقہ کو تباہ و برباد کر دینا بجز عذابِ الٰہی کے اور کیا ہو سکتا ہے' انھوں نے جب جائز اور پاک خوش عیشی کو عیاشی اور بداطواری میں بدل دیا، خدا کی دی ہوئی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کی بجائے غرور و تکبر کے ساتھ کفرانِ نعمت کیا، نبیوں اور پیغمبروں کے بار بار رشد و ہدایت پہنچانے کے باوجود شرک و کفر پر اصرار کیا تو اچانک عذابِ الٰہی آکر ان کو تباہ و برباد نہ کرتا تو اور کیا ہوتا:

" فَأَعْرَضُوا فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ " ذَٰلِكَ جَزَيْنَاهُم بِمَا كَفَرُوا وَهَلْ نُجَازِي إِلَّا الْكَفُورَ "

ابن جریرؒ ابن کثیرؒ اور دوسرے اصحابِ سیر نے اس موقع پر ایک اسرائیلی حکایت بیان کی ہے جس کو محمد بن اسحٰق نے وہب بن منبہ سے نقل کیا ہے' وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جب "سد مارب" کو برباد کرنے کا ارادہ کر لیا تو "بند" کی بنیادوں میں بڑے بڑے گھونس پیدا کر دیے اور انھوں نے آہستہ آہستہ اس کی جڑوں کو کھوکھلا کرنا شروع کر دیا، قومِ سبا نے جب یہ دیکھا تو بند کی بنیادوں کے ہر ایک پایہ اور ستون سے بلیاں بندھوا دیں کہ اس خوف سے گھونس جڑوں کو کھوکھلا نہ کر سکیں گے۔

وہب بن منبہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ان کی کتابوں میں یہ پیشین گوئی درج تھی کہ اس سد کی بربادی گھونسوں کے ذریعہ ہوگی اس لیے جب انھوں نے سد میں گھونسوں کو دیکھا تو بلیاں باندھ دیں مگر جب خدائے تعالیٰ کی مشیت کے پورا ہونے کا وقت آیا تو گھونس اتنے منہ زور ہو گئے کہ وہ بلیوں سے گھبرانے کی بجائے ان پر حملہ آور ہونے لگے اور انھوں نے چند ہی روز میں بندِ آب کی جڑیں ہلا دیں اور نتیجہ یہ نکلا کہ بند پانی کا زور برداشت نہ کر سکا اور سیلاب کی صورت میں بہہ نکلا' اس روایت کو بعض راویوں نے بغیر سند کے حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرتِ قتادہ کی جانب بھی منسوب کیا ہے۔

یہ روایت' اسرائیلی حکایت اور اسرائیلی داستان سے زیادہ کوئی وقعت نہیں رکھتی اور اصولِ روایت و درایت کے اعتبار سے ناقابلِ اعتماد ہے' روایت کے لحاظ سے اس لیے

قابلِ احتجاج نہیں کہ اس کے بعض طریقے بے سند ہیں اور بعض منقطع اور درایت کے اعتبار سے اس لیے اعتماد کے قابل نہیں کہ اس روایت میں سیلاب سے متعلق جو واقعہ درج ہے یعنی گھونس اور بلیوں کا معاملہ وہ صرف وہب بن منبہ کی روایت میں مذکور ہے اور وہب اسرائیلی روایات کے مدار ہیں نیز اگر سدِ مارب کی تباہی میں گھونسوں اور بلیوں کا یہ معرکہ بھی کچھ تعلق رکھتا تو قرآن واقعہ کی اس اہم کڑی کو بھی نظر انداز نہ کرتا یا کم از کم کسی صحیح حدیث میں اس تفصیل کا تذکرہ ہوتا۔

علاوہ ازیں جس ملک میں ایسے ماہر انجنیر موجود ہوں جنھوں نے مارب اور اس کے علاوہ یمن کے بہت سے حصوں میں بہترین "بندِ آب" اپنی فنی مہارت کی مدد سے بنائے ہوں ان کے متعلق عقل یہ کیسے باور کر سکتی ہے کہ جب ان کے علم میں یہ بات آئی ہو کہ اس بندِ آب کی بنیادیں گھونس کھوکھلا کر رہے ہیں تو بند کے استحکامات کی تمام ان حفاظتی تدابیر کو چھوڑ کر جو فنِ انجنیری اور استحکاماتِ تعمیرات کے اصول پر ضروری تھیں صرف اس طفلانہ حرکت پر اکتفا کر لیا کہ بند کے ستونوں اور پایوں کے ساتھ بلیاں باندھ دیں پھر گھونس آزاد اور بلیاں مقید، یہ عجیب حفاظتی تدبیر کسی طرح قابلِ قبول نہیں ہے۔

اس روایت کے برعکس قرآنِ عزیز کی صنیع سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سبا پر سیل عرم کا یہ عذاب اچانک آیا اور اس نے اس طرح مارب اور اطرافِ مارب کو تباہ کیا کہ اہلِ مارب کو سنبھلنے اور پیش آمدہ حالات کا صحیح اندازہ لگانے کا بھی موقع نہیں ملا۔ لہٰذا اگر چوہوں یا گھونسوں سے متعلق حکایت کو کسی درجہ میں تسلیم بھی کیا جائے تو واقعہ کی حقیقت صرف اسی قدر ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسے موسم میں جب کہ یمن میں بارش بکثرت برستی ہے "بندِ آب" میں بڑے بڑے گھونسوں کی اتنی کثیر تعداد پیدا کر دی ہو جنھوں نے غیر معمولی طور پر چند ہی دنوں میں اس کو کھوکھلا کر ڈالا اور پانی کے زور نے یک لخت بند کو شکست کر کے سیلابِ عظیم بپا کر دیا۔ اور قومِ سبا اس حال سے ناواقف رہی اور اچانک حادثہ نے ان کو خانماں برباد کر کے اِدھر اُدھر منتشر کر دیا اگرچہ اس تفصیل کا ثبوت بھی

کسی صحیح روایت سے نہیں ملتا۔

قرآنِ عزیز کا سیاق اور اس کا اسلوبِ بیان ان تمام روایات یا حکایات کا بھی انکار کرتا ہے جو محمد بن اسحٰق وغیرہ اصحابِ سیر نے اس سلسلہ میں نقل کی ہیں کہ انصار اور بعض دوسرے قبائل یمن کے بعض بزرگوں کو پرانی کتابوں یا کاہنوں کے ذریعہ "سیلِ عرِم" کے متعلق تفصیلی حالات معلوم ہوگئے تھے اور اس لیے وہ اس حادثۂ کبریٰ کے واقع ہونے سے قبل ہی مختلف حیلوں اور بہانوں سے یمن (مارب) چھوڑ کر یثرب، شام، عراق جیسے مقامات میں جاکر آباد ہوگئے تھے، ابن اسحٰق وغیرہ کی روایات کا خلاصہ یہ ہے :-

عمرو بن عامر لخمی اور بعض دوسرے ابو القبائل کو پرانی کتابوں اور کاہنوں کے ذریعہ سے یہ معلوم ہوگیا کہ شہر مارب پر سد کی شکست کی بدولت سخت بربادی آنے والی ہے اور اس سد کی شکست کا جب وقت آئے گا تو اول اس کی بنیادوں میں گھونس پیدا ہوں گے جو بنیادوں کو کھوکھلا کریں گے اور جب بندِ آب کمزور پڑ جائے گا تب برسات کے موسم میں ٹوٹ کر سینکڑوں میل تک سیلاب آجائے گا اور مارب اور اس کے دونوں جانب میلوں تک حصۂ ملک تباہ و برباد ہو جائے گا، چنانچہ سب سے اول عمرو بن عامر نے یہ دیکھا کہ چوہے یا گھونس "بندِ آب" کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہے ہیں تب اس نے سمجھا کہ اب مارب کی بربادی کا وقت آپہنچا اس لیے اس نے یہ فیصلہ کرلیا کہ اپنی قوم کو اصل حقیقت سے مطلع کیے بغیر کسی حیلہ سے ترکِ وطن کرکے کسی دوسری جگہ آباد ہو جانا چاہیے تاکہ آنے والی مصیبت سے محفوظ رہ سکیں اور بعض روایات میں ہے کہ عمرو کی بیوی بھی کاہنہ تھی اور اس واقعہ کی اطلاع اس نے پہلے سے ہی اپنے شوہر کو دیدی تھی لہٰذا اس نے یہ طے کرلیا کہ یہاں سے ترکِ وطن کردینا چاہیے مگر یہ ایسے طریقہ سے ہو کہ قوم کو کسی طرح علم نہ ہوسکے ورنہ تو معاملہ بگڑ جائے گا، چنانچہ اس نے اپنے چھوٹے بیٹے کو تنہائی میں بلاکر یہ سمجھایا کہ میں ایک خاص ضرورت کے پیشِ نظر یہ چاہتا ہوں کہ کل جب میں کسی میں تجھ سے کسی کام کے متعلق حکم کروں تو انکار کردینا اس پر میں مصنوعی غصہ سے تیرے منہ پر طمانچہ ماروں گا

تجھ کو بھی چاہیے کہ ادب واحترام کو بالائے طاق رکھ کر میرے مُنہ پر انتقامی طمانچہ لگائے اس کے بعد میں جو کچھ کرنا چاہتا ہوں کر سکوں گا۔

لڑکے نے باپ کا یہ انوکھا مشورہ سُنا تو بے حد پریشان ہوا اور اس نے ایسی گستاخی کرنے سے انکار کر دیا۔ لیکن باپ کے پیہم اصرار کے بعد اس کو منظور کرنا پڑا۔ چنانچہ دوسرے روز برسرِ مجلس وہی صورت پیش آئی جو باپ بیٹے کے درمیان مشورہ سے طے پائی تھی۔ عمرو نے جب بیٹے کے ہاتھ سے طمانچہ کھایا تو بے حد مشتعل ہوا اور یہ ظاہر کیا کہ وہ اس کو قتل کیے بغیر نہ چھوڑیگا۔ اہلِ مجلس نے اس کے غصّہ کو فرو کرنے کی بہت کوشش کی مگر اس نے نہ مانا آخر لڑکے کے ماموں دخل انداز ہوئے اور انھوں نے عمرو کو دھمکی دی کہ اگر تو اپنے بیٹے کو قتل کرے گا تو ہم تجھ کو قتل کر ڈالیں گے۔ عمرو نے یہ سن کر انتہائی غم وغصّہ کے ساتھ اہلِ مجلس کو اپنا یہ فیصلہ سُنایا کہ جس مُلک میں ایک باپ کو اپنے بیٹے کی سخت گستاخی کی سزا دینا ناممکن ہو ایسے ملک میں رہنا عبث ہے لہٰذا میں اپنی تمام جائداد اور عمدہ باغات کو ارزاں فروخت کر دینا چاہتا ہوں تاکہ میں ایسی جگہ سے کہیں دور جا بسوں، یہ دیکھ کر لوگوں نے عمرو کی جائداد کو سستے داموں خرید لیا اور وہ مع اپنے اہل وعیال کے ترکِ وطن کر کے چلا گیا اور اسی طرح بعض دوسرے لوگ بھی حادثہ سے قبل ہی حادثہ کے خوف سے ترکِ وطن کر گئے۔

اِن روایات کا اسلوبِ بیان خود بتا رہا ہے کہ یہ ایک فرضی داستان ہے جو داستان گوئی کے طرز پر بنالی گئی ہے نیز مستند تاریخی روایات سے بھی ان واقعات کی تائید نہیں ہوتی اور ان واقعاتؓ کے غیر مستند ہونے کے لیے سب سے اہم بات یہ ہے کہ قرآنِ حکیم کا سیاق ان کے خلاف صاف طور پر یہ ظاہر کرتا ہے کہ سبا کے قبائل اور خاندانوں کا تفرق وانتشار سیلِ عَرِم کے حادثہ کے بعد وقوع میں آیا ہے نہ کہ واقعہ سے قبل۔

پس تعجب ہے مولانا حبیب الرحمان صاحب (مرحوم ومغفور) جیسے ذرّرس عالم پر، کہ انھوں نے "اشاعتِ اسلام" میں سبا اور سیلِ عَرِم پر مفصّل ومدلّل بحث کرتے ہوئے کس طرح ان

داستانوں کو اہم روایات کی طرح بغیر کسی نقد و تبصرہ کے بیان فرما دیا۔

غرض یہ روایات صحیح ہوں یا غلط، یہ بات واضح ہے کہ سبا اپنے غرور و تکبر، عیاشانہ کاہلی، غفلت اور کفر و شرک پر اصرار، سرکشی کے سبب "سیلِ عَرِم" کے ذریعہ اس طرح تباہ و برباد ہوئے کہ فنِ تعمیر اور استحکاماتِ عمارت کی تمام مہارت اکارت اور رائگاں گئی اور وہ خود کو اس عذابِ الٰہی سے نہ بچا سکے اور خدا کی مشیت پوری ہو کر رہی۔

دوسری سزا | مارب کے "بندِ آب" ٹوٹ جانے پر جب شہر مارب اور اس کے دونوں جانب کے علاقے سرسبز کھیتوں، خوشبودار درختوں اور عمدہ میووں اور پھلوں کے شاداب باغوں سے محروم ہو گئے تو ان بستیوں کے اکثر باشندے منتشر ہو کر کچھ شام، عراق اور حجاز کی جانب چلے گئے اور کچھ یمن کے دوسرے علاقوں میں جا بسے مگر عذابِ الٰہی کی تکمیل ہنوز باقی تھی اس لیے کہ سبا نے صرف غرور، سرکشی اور کفر و شرک ہی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو نہیں ٹھکرایا تھا بلکہ ان کو یمن سے شام تک راحت رساں آبادیوں اور کارواں سراؤں کی وجہ سے وہ سفر بھی ناپسند تھا جس میں ان کو یہ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ سفر کی صعوبتیں کیا ہوتی ہیں اور پانی کی تکلیف اور خورونوش کی ایذا کس شے کا نام ہے اور قدم قدم پر میلوں تک دو رویہ خوشبوؤں اور پھلوں کے باغات کی وجہ سے گرمی اور تپش کی زحمت سے بھی ناآشنا تھے۔

انھوں نے ان نعمتوں پر خدا کا شکر ادا کرنے کی بجائے بنی اسرائیل کی طرح ناک بھوں چڑھا کر یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ بھی کوئی زندگی ہے کہ انسان سفر کے ارادہ سے گھر سے نکلے تو یہ بھی نہ معلوم ہو کہ حالتِ سفر میں ہے یا اپنے گھر میں، وہ بھی کیا خوش نصیب انسان ہیں جو ہمتِ مردانہ کے ساتھ سفر کی ہر قسم کی تکالیف اٹھاتے، پانی اور خورونوش کے لیے آزار سہتے اور اسبابِ راحت و آرام کے مہیا نہ ہونے کی وجہ سے لذتِ سفر کا ذائقہ چکھتے ہیں، اے کاش ہمارا سفر بھی ایسا ہو جائے کہ ہم یہ محسوس کرنے لگیں کہ وطن سے کسی دور دراز جگہ کا سفر کرنے نکلے ہیں اور ہم دوریِ منزل کی تکالیف سہتے ہوئے حضر اور سفر میں امتیاز کر سکیں۔

بدبخت اور ناسپاس گذار انسانوں کی یہ ناشکری تھی جس کی تمناؤں اور آرزوؤں میں مضطرب ہو کر خدا کے عذاب کو دعوت دے رہے تھے اور اس کے انجام بد سے غافل ہو چکے تھے۔

سبا نے جب اس طرح کفرانِ نعمت کی تکمیل کر دی تو اب خدائے تعالیٰ نے بھی اُن کو دوسری سزا یہ دی کہ یمن سے شام تک ان آبادیوں کو ویران کر دیا جو نزدیک نزدیک مسلسل چھوٹے چھوٹے قصبوں گاؤں، کارواں سراؤں اور تجارتی منڈیوں کی صورت میں آباد اور ان کے راحت و آرام کی کفیل تھیں اور سفر کی ہر قسم کی صعوبتوں سے ان کو محفوظ رکھتی تھیں" اور اس طرح اس پورے علاقہ میں خاک اُڑنے لگی اور یمن سے شام تک نو آبادیوں کا یہ سلسلہ ویرانہ میں تبدیل ہو کر رہ گیا۔

چنانچہ قرآنِ عزیز کی یہ آیات اسی حقیقت کا اعلان کرتی ہیں:۔

| | |
|---|---|
| وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ الْقُرَى | ہم نے ان کے (ملک) اور برکت والی آبادیوں (شام) |
| الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا قُرًى ظَاهِرَةً | کے درمیان بہت سی کھلی آبادیاں قائم کر دی تھیں اور |
| وَقَدَّرْنَا فِيهَا السَّيْرَ سِيرُوا | ان میں سفر کی منزلیں (کارواں سرائیں) مقرر کی تھیں، |
| فِيهَا لَيَالِيَ وَأَيَّامًا آمِنِينَ | اور کہہ دیا تھا، چلو ان آبادیوں کے درمیان دن رات |
| فَقَالُوا رَبَّنَا بَاعِدْ بَيْنَ أَسْفَارِنَا | بے خوف و خطر، مگر انھوں نے کہا اے ہمارے پروردگار |
| وَظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ فَجَعَلْنَاهُمْ | ہمارے سفروں (منزلوں) کے درمیان دوری کر دے اور یہ |
| أَحَادِيثَ وَمَزَّقْنَاهُمْ كُلَّ | (کہہ کر) انھوں نے خود اپنی جانوں پر ظلم کیا بس ہم نے |
| مُمَزَّقٍ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ | ان کو کہانی بنا دیا اور ان کو پارہ پارہ کر دیا بلاشبہ اس |
| لِكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ ۝ | (واقعہ) میں عبرت کی نشانیاں ہیں صابر اور شکر گذار |
| (سبا۔ پ ۲۲۔ ع ۲) | بندوں کے لیے۔ |

مؤرخین کہتے ہیں کہ سبا کے مقابلہ میں عرصۂ دراز سے رومیوں کی یہ خواہش تھی کہ کسی طرح وہ بھی ہندستان اور افریقہ کے ساتھ عربوں کی طرح براہِ راست تجارت کر کے بیش بہا فائدہ

حاصل کریں مگر عرب کسی طرح ان کو اس کا موقع نہیں دیتے تھے اور ان تجارتی سواحل پر قابض تھے، لیکن پہلی صدی قبل مسیح میں رومیوں نے یکے بعد دیگرے مصر اور شام پر قبضہ کر لیا اور اب ان کو موقع ملا کہ وہ اپنے منصوبہ کو پورا کریں لیکن تجارتی مراکز کے لیے جو شاہراہ امام مبین عربوں نے بنا رکھی تھی وہ خشکی کی راہ تھی اور گذرنے والوں کے لیے عربوں سے واسطہ پڑنا لازمی تھا اور رومی ان پہاڑی راہوں کو عبور کرنے میں ویسے بھی دقت محسوس کرتے تھے اس لیے انھوں نے عربوں کے خوف سے محفوظ رہنے کے لیے یہ کیا کہ ہندستان اور افریقہ کی تجارت کے بری راستہ کو بحری راستہ میں تبدیل کر دیا اور بحرِ احمر میں کشتیوں کے ذریعہ تمام مال مصر اور شام کی بندرگاہ پر اتارنے لگے نتیجہ یہ نکلا کہ اس جدید طریقِ تجارت نے یمن سے شام تک سبا کی تمام نو آبادیوں کو برباد کر دیا اور وہاں چند دنوں میں ہی خاک اُڑنے لگی اور سبا کا یہ خاندان تتر بتر ہو گیا، کسی نے شام کی راہ لی تو کسی نے عمان کی اور کسی نے عراق کا رُخ کیا تو کسی نے حجاز کا اور کوئی نجد پہنچا تو کسی نے بحرین کی راہ اختیار کی اور اہلِ سبا کی حکومت کا شیرازہ اس طرح بکھر گیا کہ وہ حقیقتاً ایک کہانی بن کر رہ گئے اور "فَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ" اور "مَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ" کا صحیح نقشہ آنکھوں کے سامنے آ گیا۔

اگر آپ تاریخ کا بغور مطالعہ کریں گے تو یہ بات حقیقت بن کر آپ کے سامنے آ جائے گی کہ "سیلِ عَرِم" کا واقعہ اور طریقِ سفر کی تبدیلی کی یہ صورت کہ جس کی وجہ سے یمن سے شام تک سبا کی نو آبادیاں برباد ہو کر رہ گئیں زمانہ کے اعتبار سے ایک دوسرے سے زیادہ دور نہیں ہیں اور دونوں قسم کے عذاب کا رشتہ ایک دوسرے کے ساتھ قائم ہے۔

قرآنِ عزیز نے جب اہلِ عرب کو سبا اور "سیلِ عَرِم" کا یہ واقعہ سنایا تو اس وقت یمن کا ہر متنفس اس حقیقت کا بہ چشمِ خود مشاہدہ کر رہا تھا اور وہ تمام خاندان بھی جو حجاز، شام، عمان، بحرین، نجد میں اس حادثہ کی بدولت پناہ گزین ہو گئے تھے اپنے آبا و اجداد کے اس مرکز کی حالتِ زار کو دیکھ اور سُن رہے تھے حتیٰ کہ ہمدانی جو کہ چوتھی صدی ہجری کا سیاح مورخ ہے اپنی کتاب

اکلیل میں یمن کے اس حصہ کے متعلق اپنی عینی شہادت پیش کرتا ہے کہ قرآن نے "جَنَّتَانِ عَنْ يَمِيْنٍ وَّشِمَالٍ" کہہ کر جن باغوں کا ذکر کیا ہے بلاشبہ آج ان کی جگہ اس قدر کثرت سے پیلو کے درخت موجود ہیں کہ اتنی کثرت کے ساتھ اور کہیں نہیں پائے جاتے اور ان ہی درختوں کے ساتھ جھاؤ اور کہیں کہیں جنگلی بیر کے درخت بھی نظر آتے ہیں اور دیدۂ بینا اور گوشِ حق نیوش کو یہ کہہ کر سبا کی عبرت زا داستان سناتے رہتے ہیں ۔

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو ۔ میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہو

مولانا سید سلیمان نے ارض القرآن میں ابرہہ کے زمانہ کے کتبۂ عرم کا ذکر کرتے ہوئے کیا خوب فرمایا ہے :-

"اس عصر تاریخی میں جب ہر غیر معاصرانہ روایت قابلِ شک و اشتباہ ہے خدائے قرآن نے اپنے کلام معجز کی صداقت کا نیا سامان پیدا کر دیا یعنی اس بند کے ٹوٹے ہوئے کھنڈر میں واقعۂ سیلاب کے مشرح حالات کا کتبہ جو ایک عیسائی فاتح یمن کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے مل گیا ہے یہ عیسائی فاتح وہی ہے جو اپنے ہاتھیوں کے بل پر کعبہ کو ڈھانے نکلا تھا لیکن آج اس دشمنِ کعبہ کا سنگی ہاتھ کعبۂ مکرمہ کی کتابِ مقدس کی تصدیق کے لیے بلند ہے[1]"

اس کتبہ میں ان حالات کا بھی تفصیل کے ساتھ ذکر ہے جو سبا کے دور میں سیلِ عرم کی وجہ سے "بندِ آب" کی شکستگی سے تعلق رکھتے ہیں۔

الحاصل سبا کا یہ خاندان جو وسعتِ حکومت میں یمن (جنوبی عرب) اطرافِ شام و حجاز کی نوآبادیوں (شمالی عرب) اور حبشہ (افریقہ) پر حکمراں تھا ۴۵۰ ق م کے پس و پیش حکومت سے بھی محروم ہو گیا اور اس کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا اور حبشہ پر اکسومی (سبا) خاندان نے اور شمالی عرب میں اسمٰعیلی عربوں نے اور خود یمن میں حمیری (سبا) خاندان نے اپنی اپنی حکومتیں قائم کر لیں[2]

اس جگہ یہ بات قابلِ وضاحت ہے کہ "سیلِ عرم" کا سانحہ اور حادثہ سارے یمن پر پیش نہیں آیا تھا بلکہ یمن کے دارالحکومت مارب اور اس کے اطراف میں دونوں جانب سینکڑوں میل تک

[1] ارض القرآن ج ۱ ص ۲۵۸ - ۲۵۷ - [2] تاریخ ابن کثیر ج ۲ و انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (سبا)

اُس کا تباہی خیز اثر پڑا اور اس وقت صرف وہی قبائل ترکِ وطن پر مجبور ہوئے جو ان مقامات میں آباد تھے باقی ملک اور اس کے آباد باشندے یمن ہی میں مقیم رہے البتہ جب دوسرے عذاب نے رونما ہوکر پورے یمن کو اثر انداز کر دیا تب سبا کے باقی قبائل بھی منتشر ہونے پر مجبور ہوئے اور اس طرح ان کے اس مشہور خاندان کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

یہ بات کہ سیلِ عَرِم کے حادثہ کا تمام قبائلِ یمن پر اثر نہیں پڑا تھا عرب اور غیر عرب مؤرخین دونوں کے یہاں مُسلّم ہے چنانچہ ابن کثیر تحریر فرماتے ہیں :۔

"جب سیلِ عرم آیا تو تمام قبائلِ سبا یمن سے منتشر نہیں ہو گئے تھے بلکہ وہی قبائل منتشر ہوئے تھے جو مارب (دار الحکومت) میں مقیم تھے اور جن کے شہر میں مشہور "مارب کا بند" تھا اور عبداللہ بن عباس کی روایت سے جو حدیثِ سابق میں ذکر ہو چکی ہے اس کا منشا بھی یہی ہے کہ ان میں سے چار قبائل شام کے علاقوں میں جا بسے اور چھ قبائل یمن ہی میں مقیم رہے اور یمن میں مقیم قبائل مذحج، کندہ، انمار، اشعر تھے اور انمار کی تین شاخیں تھیں، خثعم، بجیلہ اور حمیر یہی وہ سبائی قبائل ہیں جن میں سے سبا کے نشست وانتشار کے بعد یمن کے حکمراں ملوک اور تبابعہ پیدا ہوئے تا آنکہ ان سے حبشہ کے بادشاہ نے یمن چھین لیا اور اس پر قابض ہو گیا اور پھر حمیری بادشاہ سیف بن ذی یزن نے دوبارہ شاہِ حبشہ سے یمن کو واپس لیا اور یہ واقعہ ولادتِ باسعادت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے تھوڑے زمانہ قبل ہی پیش آیا جس کا تفصیلی ذکر ہم اپنے موقع پر کریں گے۔[1]

10 اور سبا کے جو قبائل وخاندان یمن سے نکل کر اِدھر اُدھر جا بسے تھے اُن کی تفصیل دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :۔

سبا کے قبائل میں سے غسانی قبائل کی ایک شاخ بصریٰ (شام) چلی گئی اور ایک شاخ خزاعہ نے یثرب جاتے ہوئے بطن مر (تہامہ) کو شاداب دیکھ کر وہیں قیام کر دیا اور اوس وخزرج (انصار) یثرب (مدینہ) میں مقیم ہو گئے اور بنی ازد کا ایک حصہ عمان میں اور ایک

[1] تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۱۶۱۔

وادی سراۃ میں جابسا۔ اور اسی طرح سبا کے یہ قبائل اقطاع وامصارِ عرب میں منتشر اور شذر و مذر پراگندہ ہوگئے۔[1]

اور دوسری جگہ فرماتے ہیں :-

شعبی کہتے ہیں کہ غسان شام وعراق میں منتشر ہوگئے اور انصار (اوس وخزرج) یثرب (مدینہ) میں جابسے اور خزاعہ، تہامہ (مکہ) میں اور ازدعمان میں جابسے اور آس پاس منتشر ہوکر رہنے سہنے لگے۔[2]

ابن کثیر یہ بھی کہتے ہیں :-

عرب میں سبا کا یہ تفرق (انتشار اس درجہ مشہور اور عبرت ناک سمجھا جاتا ہے کہ جب اہلِ عرب کسی قوم یا خاندان کے تفرق وانتشار کا ذکر کرتے ہیں تو یہ کہتے ہیں "تفرقوا ایدی سبا وتفرقوا شذر ومذر" ان کا حال سبا کا سا ہوگیا وہ پارہ پارہ ہوکر رہ گئے۔[3]

**چند تاریخی مباحث**

(۱) کتب سیر میں مذکور ہے کہ "مارب کا بند" سبا بن یعرب نے بنایا تھا مگر وہ اس کو پورا نہ کرسکا اور اس کے بعد اس کے بیٹے حمیر نے اس کو مکمل کیا اور بعض کہتے ہیں کہ اس کو ملکہ سبا بلقیس نے تعمیر کرایا تھا لیکن یہ دونوں باتیں حقیقت سے بہت دور محض ظن و تخمین کی پیداوار تھیں، اس لیے کہ ماہرینِ علم الآثار نے سد کے کھنڈرات سے یہ پتہ چلایا ہے کہ اس بندِ آب کے بنانے والوں کے نام سنگی کتبوں پر کندہ اسی بند کی شکستہ دیواروں پر موجود ہیں اور ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس بند کو سب سے پہلے ۸۰۰ ق م میں سمہ علی ینوف (مکارب سبا) نے بنانا شروع کیا تھا مگر اس کے زمانہ میں تعمیر مکمل نہ ہوسکی اور اس کے بعد کے بادشاہوں نے اس کو پورا کیا، یثع امر کے علاوہ جو نام ان کتبوں سے پڑھے گئے وہ یہ ہیں "سمہ علی ینوف بن ذمرعلی (مکارب سبا) کرب ایل بین بن یثع امر (مکارب سبا) ذمرعلی ذرح (ملک سبا) یدع ایل وتار۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۵۳۵ و تاریخ ج ۲ ص ۱۹۱ [2] تفسیر ابن کثیر ص ۵۲۹ [3] ایضاً ص ۵۲۲ [4] تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۱۵۹

اس سے معلوم ہوا کہ یہ سد مکارب سبا کے زمانہ سے شروع ہو کر ملوکِ سبا کے ابتدائی دور تک طویل عرصہ میں تعمیر ہو سکی ہے۔[1]

(۲) ترمذی میں بروایت ابن عباس ایک حدیث ہے جس میں مذکور ہے کہ ایک سائل نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ سبا کسی ملک کا نام ہے یا کسی عورت کا یا کسی مرد کا؟ آپ نے فرمایا کہ ایک مرد کا نام ہے جس کی نسل سے دس قبائل ہیں ان میں سے چار شام میں سکونت رکھتے ہیں اور چھ یمن میں۔ یمنی قبائل مذحج، کندہ، ازد، اشعر، انمار، حمیر ہیں اور شامی قبائل میں لخم، جذام، عاملہ، غسان ہیں۔ ترمذی نے اس حدیث کو حسن غریب[2] کہا ہے اور ابن کثیر نے اس کے مختلف طرقِ روایت کو بیان کر کے بعض طرقِ روایت کو حسن قوی کہا ہے[3]۔ اور ابن عبد البر نے انسابِ عرب پر بحث کرتے ہوئے اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد یہ فیصلہ دیا ہے:-

| | |
|---|---|
| ھذا اولیٰ ما قیل بہ فی ذلک واللہ اعلم[4] | یہ روایت اُن سب اقوال سے بہتر ہے جو اس سلسلہ میں کہے جا چکے ہیں۔ |

اس روایت سے قبائل مسطورۂ بالا کا قحطانی ہونا ثابت ہوتا ہے مگر یہ واضح رہے کہ ان میں سے متعدد قبائل کے متعلق علماءِ انساب میں سخت اختلاف ہے کہ یہ عدنانی ہیں یا قحطانی تاہم انصار (اوس و خزرج) کے متعلق جو بلاشبہ بنی ازد ہیں تمام علماءِ انساب کا اس پر اتفاق ہے کہ وہ قحطانی الاصل ہیں[5] اور بخاری کی وہ حدیث کہ جس سے مصنف ارض القرآن نے ان کو عدنانی ثابت کرنا چاہا ہے بقولِ علامہ ابن حجر عسقلانی ہرگز اس کے لیے دلیل نہیں بن سکتی جیسا کہ ہم گذشتہ صفحات میں بیان کر آئے ہیں اور نہ ہم کو کسی عالم نسب انصاری کا یہ قول نظر آیا کہ اس نے خود کو قحطانی الاصل تسلیم نہ کیا ہو البتہ یہ ممکن ہے کہ چونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عدنانی اسمٰعیلی ہیں اس لیے بعض انصار نے حصولِ شرف و مجد کے جذبہ میں مادری سلسلہ سے خود کو عدنانی (اسمٰعیلی) کہہ دیا ہو۔

یہ بیشک صحیح ہے کہ بعض عدنانی قبائل نے چونکہ یمن میں سکونت اختیار کر لی تھی اس لیے

---

[1] ارض القرآن ماخوذ مضمون از اناؤفرنچ ایشیاٹک سوسائٹی جرنل ۱۸۷۴ء [2] تفسیر ج ۳ [3] الانباہ ص ۲۲ [4] ایضاً ص ۲۰ [5] ایضاً ص ۵۹

بعض قحطانی اور عدنانی قبائل کے درمیان علماء انساب میں اختلاف نظر آتا ہے اور قضاعہ کے عدنانی سے قحطانی بن جانے کا عجیب قصہ تو ابن عبدالبر اور خود شعراء عرب نے بیان کیا ہے کہ کس طرح انھوں نے اپنے بھانجہ خالد بن یزید بن معاویہ کے اس مناقشہ میں جو اس کے اور بنو امیہ کے درمیان پیش آگیا تھا خالد کے کہنے سے اوّل خود کو یمنی قبائل کا حلیف بنایا اور پھر یمنی الاصل (قحطانی الاصل) ہونے کے مدعی بن گئے۔

(۳) قرآن حکیم نے سورۂ سبا میں سبا کی مذہبی حالت پر جو روشنی ڈالی ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سبا کے طبقۂ اولیٰ کی ہر دو شاخوں کا مذہب یا آفتاب پرستی (ستارہ پرستی) رہا ہے اور یا پھر یہودیت (دینِ موسوی) اور طبقۂ ثانیہ کی ہر دو شاخوں میں یا صنم پرستی قومی مذہب رہا ہے اور یا عیسائی (یہودیت) بھی کبھی کبھی ان میں نظر آجاتی ہے، قرآن نے اصحاب اخدود کا جو واقعہ بیان کیا ہے اس سے بھی اس پر روشنی پڑتی ہے اس لیے کہ ذونواس حمیری (یہودی) یمن ہی کا بادشاہ تھا۔

(۴) اہلِ عرب اس کے قائل ہیں کہ تمام قبائلِ عرب بلا استثناء صرف دو شخصوں کی نسل سے ہیں عدنان اور قحطان، مگر یہ صحیح نہیں کیونکہ توراۃ اور تاریخ ان دو سلسلوں کے علاوہ بعض دوسرے سلسلے بھی بیان کرتی ہے بلکہ بعض صحیح روایات میں بنی جرہم کا بھی ذکر موجود ہے جو ان دونوں (قحطانی) اور عدنانی) سلسلوں سے الگ تیسرا سلسلہ ہے پھر علماء انساب کے پاس کونسی دلیل ہے کہ وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ عرب میں ان دو سلسلوں کے سوا سب معدوم ہوگئے اور تمام قبائلِ عرب ان دو ہی سلسلوں میں منحصر ہوگئے ہیں؟

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک ضعیف روایت سے اور حضرت عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عباس، عمرو بن میمون اور محمد بن کعب قرظی سے بروایتِ قوی منقول ہے کہ جب وہ اس آیت کو تلاوت فرماتے ہیں "وَالَّذِيْنَ مِنْ بَعْدِهِمْ لَا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ" اور وہ لوگ جو ان (قوموں) کے بعد ہیں ان کو اللہ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا" تو ارشاد فرمایا کرتے تھے "کذب النسابون"۔

نسب بیان کرنے والے جھوٹے ہیں" یعنی انھوں نے بیچ میں بہت کچھ جھوٹ ملا دیا ہے۔

ابنِ عبدالبر معرفت علمِ انساب کو مفید علم ثابت کرتے ہوئے اس روایت کے متعلق فرماتے ہیں کہ ہوسکتا ہے ان حضرات کا یہ جملہ قریش کے نسب کے لیے مخصوص ہو اور ان کا مطلب یہ ہو کہ اس سلسلہ میں عدنان سے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے درمیان جو کڑیاں ہیں وہ تحقیقی نہیں ہیں اور اس میں نسابین کا جھوٹ شامل ہے مگر ہمارے نزدیک اس جملہ کا ٹھیک مطلب یہ ہے کہ اہلِ نسب کا یہ دعویٰ کہ "وہ بنی آدم کے سلسلۂ انساب کے ماہر اور محقق ہیں اور کوئی سلسلہ ہماری نگاہِ تحقیق سے نہیں چھوٹا" صحیح نہیں ہے اور وہ اپنے اس دعوے میں جھوٹے ہیں:

"لَا یَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ" اللہ کے سوا کون اس کا دعویٰ کرسکتا ہے (انتہیٰ) [1]

ہم ابن عبدالبر کی اس توجیہ کی حرف بہ حرف تائید کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ عرب قبائل میں ایسے سلسلے موجود ہیں جو عدنانی اور قحطانی سے الگ ہیں اور اکثر علماءِ انساب ان میں تمیز کرنے سے قاصر رہے ہیں جیسا کہ ہم ابن کثیر کے حوالہ سے ثابت کرچکے ہیں۔

چند تفسیری مباحث

(۱) مفسرین کو "عَرِم" کے معنی میں بحث ہے اور وہ چند معنی بیان کرتے ہیں:۔ "ہرا پانی" "وادی" "سیلابِ عظیم" "بندِ آب" شاہ عبدالقادر نور اللہ مرقدہٗ نے "سیلابِ عظیم" مُراد لیا ہے" فرماتے ہیں" پس بھیجی ہم نے ان پر رَو زور کی اور مصنف ارض القرآن فرماتے ہیں کہ "جس کو عربِ حجاز "سد" کہتے ہیں اسی کو عربِ یمن "عَرِم" کہتے ہیں" ہمارے نزدیک زیادہ صحیح اور موقع کے مناسب یہی معنی ہیں اور جب کہ لغتِ عرب میں "عرم" کے معنی "بندِ آب" کے آتے ہیں تو دوسرے معانی کی جانب توجہ غیر ضروری ہے "العرمۃ سدٌّ یعترض به الوادیٌ" اس معنی کے دلچسپ اور مناسبِ حال ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس طرح قرآنِ عزیز میں "بندِ آب" کا ذکر ثابت ہوجاتا ہے اور دوسرے معانی اگر مُراد لیے جائیں تو اُن سے صرف یہ لازم آتا ہے کہ کوئی بندِ آب ہوگا جس کو سیلاب بہا کرلے گیا بندِ آب کا ذکر صراحۃً ثابت نہیں ہوتا۔

کسی خطۂ زمین میں باغوں کا ہونا گو خوش عیشی کی دلیل ہے لیکن گذشتہ تفاصیل سے یمن کے

---

[1] القصد والامم لابن عبدالبر ص ۱۹۔ [2] الاشباہ ص ۴۹۔

طبعی خواص اور پھر بندِ آب کے عجیب وغریب طرزِ تعمیر نے سینکڑوں میل تک مارب کے داہنے بائیں مسلسل پھلوں، پھولوں اور میووں کے بے شمار باغات نے جو صورتِ حال پیدا کردی تھی، اس کے متعلق غیر مسلم مؤرخوں کی شہادتیں بھی یہ بتارہی ہیں کہ مارب اور یمن کا یہ علاقہ دنیا میں فردوس نظیر بن گیا تھا اور ان کے ملک کی یہ صورتِ حال خدائے تعالیٰ کے خصوصی کرم کی رہینِ منت تھی اسی لیے قرآنِ عزیز نے اس کو خدا کی نشانی کہا ہے "لَقَدْ كَانَ لِسَبَإٍ فِي مَسْكَنِهِمْ آيَةٌ جَنَّتَانِ عَنْ يَمِينٍ وَشِمَالٍ"۔

(۳) ان آیات میں ہے "بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَرَبٌّ غَفُورٌ" "شہر ہے پاک اور پروردگار ہے بخشنے والا" اور اس کے بعد ہے "فَأَعْرَضُوا" "پس انھوں نے خدا سے روگردانی کی" اِن دونوں جملوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سبا پہلے مسلمان تھے اور احکامِ الٰہی کے مطیع وفرماں بردار مگر آہستہ آہستہ انھوں نے نافرمانی اور کفر اختیار کرلیا جیسا کہ اِس آیت سے بھی ظاہر ہوتا ہے "ذَٰلِكَ جَزَيْنَاهُم بِمَا كَفَرُوا"؛ تو اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلام اور کفر کے یہ دُو زمانے اُن پر کب طاری ہوئے تاکہ ان آیات کی تفسیر واقعاتِ تاریخی کی روشنی میں کی جاسکے۔

اس سوال کا حل یہ ہے کہ سورہ سبا سے قبل سورۂ نمل میں قرآنِ عزیز نے ملکۂ سبا اور حضرتِ سلیمانؑ کے واقعات میں یہ بیان کیا ہے کہ ملکۂ سبا اور اس کی قوم پہلے آفتاب پرست اور مشرک تھی مگر حضرتِ سلیمان (علیہ السلام) کی دعوت وارشاد پر اس نے اسلام قبول کرلیا اور تاریخ سے یہ ثابت ہے کہ وہ اس کے بعد بھی اپنی زندگی میں سریر آرائے سلطنت رہی اور تمام قوم اس کی مطیع وفرماں بردار تھی پس جو اصحابِ بصیرت اس زمانہ کی قوموں کے مذاہب کی تاریخ سے آگاہ ہیں وہ جانتے ہیں کہ اسلام لانے کے بعد ملکہ کا سلطنت پر قائم رہنا اس کی واضح اور روشن دلیل ہے کہ ملکہ کے ساتھ اس کی قوم بھی ایمان لے آئی تھی۔

آپ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان نامہائے مبارک کے ان جملوں کو پڑھیے جو آپؐ نے شاہانِ عالم کے نام دعوتِ اسلام کے سلسلہ میں بھیجے ہیں "فان تولیت فعلیك اثم الیریسین"

"فان، تولیت فعلیك اثم القبط" "فان تولیت فعلیك اثم المجوس" "اے شاہانِ روم و ایران و مصر اگر تم نے خدا کی دعوتِ حق کا انکار کر دیا تو تمھاری رعایا کی گمراہی کا وبال بھی تمھاری گردن پر رہے گا' یہ آپؐ نے کیوں ارشاد فرمایا صرف اس لیے کہ قدیم شخصی حکومتوں کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ ان کی قومی حکومتوں میں جو مذہب بادشاہ کا ہوتا تھا وہی پوری قوم کا مذہب بن جاتا تھا اور بعض اقوام میں تو بادشاہ "خدا کا مظہر" سمجھا جاتا تھا لہٰذا کسی بات کو اس کا قبول کر لینا گویا رعایا کے لیے خدا کے حکم کی برابر تھا۔

بہرحال ۹۵۰ء ق م میں سبا نے حضرتِ سلیمان (علیہ السلام) کے دستِ مبارک پر اسلام قبول کیا اور صدیوں تک انھوں نے اس امانتِ الٰہی کو سینہ سے لگائے رکھا لیکن گذشتہ قوموں کی طرح جب انھوں نے اس سے روگردانی شروع کی اور دوبارہ شرک اختیار کیا تب خدا کے پیغمبروں نے اپنے اپنے زمانہ میں آکر ان کو رشد و ہدایت کی جانب متوجہ کیا۔ غالباً یہ انبیاء بنی اسرائیل ہیں جو بذاتِ خود یا اپنے نائبوں کے ذریعہ ان کو ہدایت کی جانب بلاتے رہے ہیں مگر انھوں نے عیش و عشرت' دولت و ثروت اور حکومت و شوکت کے نشہ میں کوئی پرواہ نہیں کی بلکہ بنی اسرائیل کی طرح خدا کی نعمتوں کو ٹھکرانے لگے تب حضرتِ عیسیٰؑ سے ایک صدی پہلے خدا کی جانب سے سیلِ عرم اور آبادیوں کی تباہی کا عذاب آیا اور اس نے سبا کے خاندان کو پارہ پارہ کر دیا۔

ایک یونانی مؤرخ تھیوفرسٹیسنس جو حضرتِ عیسیٰؑ سے تقریباً تین سو بارہ برس پہلے اور سبا کا معاصر تھا لکھتا ہے :-

"یہ ملک سبا سے متعلق ہے جو بخورات کی بڑی حفاظت کرتے ہیں' ان بخورات کا ڈھیر آفتاب کے ہیکل میں لایا جاتا ہے جو اس ملک میں نہایت مقدس سمجھا جاتا ہے۔"[1]

اور علمائے اسلام میں سے ماہرینِ علم الآثار نے دوسری یا تیسری صدی ہجری میں یمن کے ایک کتبہ میں پڑھا تھا :-

[1] ارض القرآن ج ۱ ص ۳۵۔

هذا ما بنی شمر یرعش سیدة الشمس[1]  یہ شمر یرعش بادشاہ نے سورج دیوی کے لیے بنایا ہے

(۴) سورۂ سبا کی ان ہی آیات میں ہے "وَبَیْنَ الْقُرَی الَّتِیْ بَارَکْنَا فِیْھَا" مفسرین نے ان برکت والی بستیوں کی تفسیر میں مختلف اقوال نقل کئے ہیں ان میں سے صحیح قول یہ ہے کہ اس سے شام کی بستیاں مراد ہیں اس لیے کہ قرآن نے اس سلسلہ میں جو کچھ کہا ہے وہ ان ہی بستیوں پر صادق آتا ہے جن کا تعلق یمن سے شام تک تجارتی شاہراہ سے تھا، مجاہد، حسن، قتادہ، سعید بن جبیر، ابن زید (رحمہم اللہ) وغیرہ یہی تفسیر کرتے ہیں:-

| | |
|---|---|
| یعنی قری الشام یعنون انھم | برکت والی بستیوں سے شام کی بستیاں مراد ہیں۔ |
| کانوا یسیرون من الیمن | یعنی وہ یمن سے شام تک امن و اطمینان کے ساتھ |
| الی الشام فی قری ظاھرة | ان بستیوں میں ہو کر گذرتے ہیں جو اسی غرض سے قریب قریب |
| متواصلة[2]۔ | بنائی گئی ہیں کہ ان کا سفر آسان اور خوش گوار رہے، |

اور ابن کثیر قری ظاھرة کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

| | |
|---|---|
| ای بینة واضحة یعرفھا | یعنی ایسی بستیاں جو مسافروں (تاجروں اور سیاحوں کے |
| المسافرون ویقیلون فی | لیے ہی قریب قریب بنائی گئی تھیں اور جن کو وہ اچھی طرح |
| واحدة ویبیتون فی اخری | پہچانتے تھے کہ ایک بستی میں دوپہر آرام سے گذاری تو |
| (ارض القرآن ج ۱ ص ۲۷۴) | شب باشی کے لیے دوسری بستی میں پہونچ گئے۔ |

(۵) مفسرین (رحمہم اللہ) جب سبا کی ان آیات کی تفسیر کرتے ہیں تو "سیلِ عَرِم" اور "قری ظاھرة" یعنی یمن سے شام تک پھیلی ہوئی سبا کی نو آبادیات کی بربادی دونوں ہی کا تذکرہ کرتے ہیں مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نگاہ تاریخ کے اُس پہلو پر نہیں ہے جو رومیوں کے تجارتی راہ بدل دینے سے سبا کو پیش آیا اور خود سبا کی اِس مانگ پر رَبَّنَا بٰعِدْ بَیْنَ اَسْفَارِنَا خدا نے ان کو اس حالت میں بدل دیا کہ وہ تلاشِ معاش کے لیے دیگر قبائلِ عرب کی طرح سفر کے مصائب جھیلتے پھریں اور ان کو عبرت کی کہانی بنا دیا اور پارہ پارہ کر دیا۔ مگر ہم گذشتہ سطور میں یہ ثابت

[1] تاریخ حمزہ اصفہانی ص ۱۱۰ کلکتہ۔ [2] تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص ۵۳۳۔

کرچکے ہیں کہ چونکہ بری تجارتی شاہراہ سے بحری راہ کی وہ تبدیلی کہ جس کے نتیجہ میں سبا کی نوآبادیاں بہت جلد برباد ہوگئیں اور سبا کا یہ خاندانِ حکومت پارہ پارہ ہوگیا تقریباً اس ہی زمانہ میں پیش آیا جو زمانہ سیلِ عرِم کا تھا خواہ تبدیلِ راہ کی داغ بیل اس سے بہت پہلے یونانیوں کے ہاتھوں پڑی ہو۔ پس مفسرین اگرچہ "قریٰ ظاہرۃ" کی بربادی میں تجارتی راہ کی تبدیلی کا تذکرہ نہیں کرتے مگر وہ یہ بھی مانتے ہیں کہ "سیلِ عرِم" اور یمن سے شام تک کی سبائی آبادیوں کی بربادی دو جدا جدا معاملے ہیں، یہ نہیں ہے کہ بندِ آب کے ٹوٹ جانے سے یہ تمام نوآبادیاں بھی برباد ہوگئی تھیں جیسا کہ ہم ابن کثیر سے سابق میں نقل کرچکے ہیں کہ سیلِ عرِم کے بعد بھی مارب کے علاوہ یمن کے دوسرے حصوں میں قبائلِ یمن آباد تھے۔ لہٰذا قرآن کا فیصلہ مفسرین کے علی الرغم نہیں ہے جیسا کہ مصنف ارض القرآن نے سمجھا ہے۔

**نتائج وعبر** (۱) اللہ تعالیٰ نے قرآنِ عزیز میں موعظت ونصیحت کے چار طریقے بیان فرمائے ہیں (الف) "تذکیر بآلاء اللہ" یعنی خدائے تعالیٰ نے اپنے بندوں پر جن نعمتوں کی ارزانی فرمائی ہے ان کو یاد کرکے خدا کے احکام کی پیروی کی جانب متوجہ کرنا سورۂ اعراف میں ارشاد ہے:۔

فَاذْكُرُوْٓا اٰلَاۗءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۝ — پس اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔

فَاذْكُرُوْٓا اٰلَاۗءَ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ۝ (اعراف پ ع) — پس اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو اور زمین میں فساد کرتے مت پھرو۔

(ب) "تذکیر بایام اللہ" یعنی ان گذشتہ قوموں کے حالات بیان کرکے نصیحت وعبرت دلانا جنھوں نے یا اللہ تعالیٰ کی اطاعت وانقیاد کی وجہ سے کامرانی اور فلاحِ دارین حاصل کی اور یا سرکشی وطغیان کی انتہا پر پہنچ کر ہلاکت وتباہی مول لی اور عذابِ الٰہی کی مستوجب قرار پائیں یا بالفاظِ دیگر قوموں کے عروج وزوال کو پیش کرکے سامانِ عبرت مہیا کرنا۔ سورۂ ابراہیم میں ہے:۔

وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ — اور اے پیغمبر ان کو نصیحت کیجئے قوموں کے عروج وزوال کی تاریخ یاد دلاکر۔

(ج) "تذکیر بآیات اللہ" یعنی مظاہرِ قدرت کی جانب توجہ دلاکر خالقِ کائنات کی ہستی اور

اس کی وحدت کا اعتراف کرانا اور تصدیقِ حق کے لیے اپنی نشانیوں (معجزات آیاتِ قرآنی) کے ذریعہ چشمِ بصیرت وا کرنا۔ سورۂ یوسف میں ارشاد ہے:۔

| | |
|---|---|
| وَكَأَيِّنْ مِنْ آيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ | اور زمین اور آسمان میں خدا کے بہت سے نشانات |
| وَالْأَرْضِ يَمُرُّونَ عَلَيْهَا وَهُمْ | ہیں کہ جن پر وہ بے توجہی کے ساتھ گزر جاتے ہیں |
| عَنْهَا مُعْرِضُونَ ۝ (یوسف پ ع) | اور پرواہ بھی نہیں کرتے۔ |

(د) "تذکیر بما بعد الموت" یعنی برزخ اور قیامت کے حالات سنا کر عبرت دلانا سورۂ ق میں ہے:۔

| | |
|---|---|
| فَذَكِّرْ بِالْقُرْآنِ مَنْ يَخَافُ | پس قرآن کے ذریعہ نصیحت کرو اس شخص کو جو خدا |
| وَعِيدِ ۔ (سورۂ ق پ ع) | کی وعید یعنی بعد الموت کے عذاب سے ڈرتا ہے۔ |

پس قومِ سبا کا یہ واقعہ "تذکیر بایام اللہ" سے تعلق رکھتا ہے اور ہم کو یہ عبرت دلاتا ہے کہ جب کوئی قوم عیش و راحت اور ثروت و طاقت کے گھمنڈ میں آکر نافرمانی اور سرکشی پر آمادہ ہو جاتی ہے تو اول خدائے تعالیٰ اس کو مہلت دیتا اور اس کو راہِ راست پر لانے کے لیے اپنی حجت کو آخری حد تک پورا کرتا ہے پس اگر وہ اس پر بھی قبولِ حق کی دشمن رہتی اور بغاوت و سرکشی کے اس اعلیٰ معیار پر پہنچ جاتی ہے کہ اس کو خدا کی نعمتیں اور عطا کردہ راحتیں بھی ناگوار گذرنے لگتی ہیں اور وہ ان کو ٹھکرانے لگتی ہے تو پھر قانونِ گرفت اپنا فولادی پنجہ آگے بڑھاتا اور ایسی بدبخت قوم کو پارہ پارہ کر دیتا اور ہلاکت و بربادی کے چرخ پر اُتار دیتا ہے اور اُن کا سارا کروفر دُنیا کے سامنے صرف ایک کہانی بن کر رہ جاتا ہے۔

سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِينَ ۝

(اَعَاذَنَا اللّٰهُ مِنْ ذٰلِكَ)



# اصحابُ الاُخدود (یا) قومِ تُبّع

## ۵۲۵ سنہ ع

اخدود، اصحاب اخدود اور قرآنِ حکیم، واقعہ کی تفصیلات، تنقید و تبصرہ، تُبّع عرب کی دو حکایتیں، چند تفسیری نکات، بصائر و عبر۔

**اخدود؟** "خد یا اخدود" کے معنی گڑھے، کھائی اور خندق کے ہیں، یہ مُفرد ہے اور اس کی جمع "اخادید" آتی ہے، چونکہ زیرِ بحث واقعہ میں کافر بادشاہ اور اس کے امراء و اعیانِ سلطنت نے خندقیں اور گڑھے کھدواکر اور ان کے اندر آگ دہکاکر عیسائی مومنوں کو اُن میں ڈال کر زندہ جلادیا تھا اس نسبت سے ان کافروں کو "اصحاب اخدود" کہا جاتا ہے۔

**اصحابِ اخدود اور قرآنِ حکیم** اصحابِ اخدود کا تذکرہ قرآنِ حکیم میں سورۂ بروج میں کیا گیا ہے اور اجمال و اختصار کے ساتھ صرف اسی قدر پر اکتفا کیا گیا ہے جو رشد و ہدایت کے لیے باعثِ موعظت و بصیرت ہے۔

وہ کہتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل ایک مقام پر حق و باطل کا معرکہ پیش آیا، ایک جانب خدا کے مومن بندے تھے جن کے پاس اگرچہ مادی قوت و طاقت نہیں تھی اور وہ اس لحاظ سے ضعیف و کمزور تھے مگر ایمان اور حق و صداقت کی قوت اور خدا کے نام پر ایثار و فداکاری کی طاقت کے مالک تھے، دوسری جانب میں ایمان باللہ اور قبولِ حق سے محرومی تھی مگر مادی شوکت و صولت اور قاہرانہ طاقت کی فراوانی تھی، ان حالات میں کافر و مشرک طاقت نے مومنوں کی ایمانی قوت اور قبولِ حق کی طاقت کو دعوتِ مُبارزت دی کہ یا وہ ایمان باللہ کو ترک کر کے شرک و کفر پر واپس آجائیں ورنہ دُنیا سے فنا ہو جانے کے لیے تیار ہو جائیں۔ مومنینِ صادقین

نے اس دعوتِ مبارزت (چیلنج) کو ایمانی جرأت کے ساتھ قبول کیا اور ایمان باللہ کی روشنی سے نکل کر شرک و کفر کی تاریکی میں داخل ہونے سے انکار کردیا۔

یہ دیکھ کر کافر جماعت کی جانب سے حاکمانہ طاقت اور قاہرانہ جبروت کے ساتھ شہر کے مختلف حصوں میں خندقیں کھودی جارہی ہیں، خندقوں کے اندر آگ دہک رہی ہے، شعلے بھڑک رہے ہیں اور زمین کا اکثر حصہ کرۂ نار بنا ہوا ہے اب مومن جماعت کے غیور اور فداکار انسان کشاں کشاں لائے جارہے ہیں، وہ جگہ جگہ خندقوں کے دہانوں پر کھڑے کردیے گئے ہیں اور کفر و شرک اپنی مادی قوت کے بل پر کہہ رہا ہے کہ یا مجھ کو قبول کرو ورنہ بھڑکتی ہوئی آگ اور دہکتے ہوئے گڑھوں کی نذر کردیے جاؤ گے، یہ سن کر مومن جماعت کہتی ہے جہنم کی آگ کے مقابلہ میں تمھارا آگ کا یہ عذاب ایک کھیل ہے اس لیے ایمان باللہ جہنم کی آگ کے مقابلہ میں بخوشی اس کو قبول کرتا ہے مگر شرک و کفر کو ایک لمحہ کے لیے بھی برداشت نہیں کرسکتا۔ کفر و شرک کی طاقت یہ سن کر لاجواب ہوجاتی مگر غیظ و غضب میں آکر فداکارانِ توحید کو زندہ نذرِ آتش کردیتی ہے اور اس طرح حق کو فتح و کامرانی اور باطل کو شکست و ناکامی ہوجاتی ہے کیونکہ جو دنیا والوں کی نظر میں خندقوں کے اندر دہکتی آگ میں جلادیے گئے وہ جلے اور مرے نہیں بلکہ زندۂ جاوید بن کر ابدی جنت اور سرمدی بہشت سے نوازے گئے اور جو اپنی دنیوی طاقت کے گھمنڈ پر نکوکار انسانوں پر بجھ جانے اور فنا ہوجانے والی آگ دہکا رہے تھے وہ ابدی اور دائمی آگ جہنم کے مستحق قرار پائے انھوں نے دنیا میں آگ کی بھٹی روشن کی اور مومنینِ صادقین کو اس کا ایندھن بنایا خدائے تعالیٰ نے عالمِ آخرت میں ایک ہولناک بھٹی (جہنم) روشن کر رکھی ہے جس کا ایندھن کافر و شرک ہونگے جابر و ظالم ہوں گے، اِن کی بھٹی کو بہ عجلت یا بہ دیر بجھ جانا ہے، فنا ہوجانا ہے۔ لیکن خدا کی دہکائی ہوئی بھٹی کو خلود اور ہمیشگی حاصل ہے وہ نہ بجھے گی اور نہ فنا ہوگی۔ کفر و شرک نے دنیا کی طاقت پر گھمنڈ کیا مگر اس کا نتیجہ "عذاب الحریق" اور "عذاب جہنم" ہے اور ایمان باللہ نے خدا کی طاقت پر بھروسہ کیا تو اس کا نتیجہ "الفوز الکبیر" اور "جنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ" کی صورت

میں ظاہر ہوا۔

غرض سورۂ بروج میں یہ واقعہ معجزانہ اسلوب بیان کے ساتھ اس طرح مذکور ہے :۔

| | |
|---|---|
| بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ | شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے |
| وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ ۝ وَالْيَوْمِ | قسم ہے آسمان کی جس میں برج ہیں اور اُس دن کی |
| الْمَوْعُوْدِ ۝ وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ ۝ قُتِلَ | جس کا وعدہ ہے اور اس دن کی جو حاضر ہوتا ہے اور |
| اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ ۝ النَّارِ ذَاتِ | اس دن کی جس کے پاس حاضر ہوتے ہیں مارے گئے |
| الْوَقُوْدِ ۝ اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ ۝ وَّهُمْ | کھائیاں کھودنے والے آگ ہے بہت ایندھن والی |
| عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ | جب وہ اس پر بیٹھے اور جو کچھ وہ کرتے تھے مسلمانوں |
| شُهُوْدٌ ۝ وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ | کے ساتھ اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے اور ان سے |
| يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۝ الَّذِيْ | بدلہ نہیں لیتے تھے مگر صرف اس بات کا کہ وہ یقین |
| لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاللّٰهُ | لائے اللہ پر جو زبردست ہے تعریفوں کا مستحق ہے |
| عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ | جس کا راج ہے آسمانوں میں اور زمین میں اور اللہ |
| فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ | کے سامنے ہے ہر چیز بیشک جو ایمان سے بچلائے |
| لَمْ يَتُوْبُوْا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ | ایمان والے مردوں کو اور عورتوں کو پھر توبہ نہ کرے تو |
| عَذَابُ الْحَرِيْقِ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا | ان کے لیے عذاب ہے دوزخ کا اور اُن کیلیے عذاب ہے |
| وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتٌ | آگ میں جلنے کا بیشک جو لوگ یقین لائے (اللہ پر) اور |
| تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۝ ذٰلِكَ | انھوں نے بھلائیاں کیں ان کے لیے جنتیں ہیں جن کے نیچے |
| الْفَوْزُ الْكَبِيْرُ ۝ (سورۂ بروج پ ۳۰) | بہتی ہیں نہریں یہ ہے بہت بڑی کامیابی۔ |

**واقعہ کی تفصیلات** مفسرین نے ان آیات کی تفسیر میں متعدد واقعات نقل کیے ہیں مگر ان میں سے دو زیادہ مشہور ہیں ایک کا ذکر امام احمدؒ نے مسند میں امام مسلمؒ نے صحیح میں اور نسائیؒ و ترمذیؒ نے سنن میں کیا ہے وہ یہ کہ حضرت صہیب رومیؓ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا گذشتہ زمانہ میں

ایک بادشاہ تھا اُس کے دربار میں ایک جادوگر تھا جب وہ بہت بوڑھا ہوگیا تو ایک روز اس نے بادشاہ سے کہا میں اب بوڑھا ہوگیا ہوں اور موت کا وقت قریب ہے اس لیے میری خواہش ہے کہ آپ ایک فہیم وزیرک لڑکا میرے حوالہ کردیں تاکہ میں اس کو اپنا یہ فن (سحر) سکھا کر اپنی زندگی ہی میں کامل کردوں چنانچہ بادشاہ نے ایک لڑکے کو اس کے سپرد کردیا اور اس نے ساحر سے سحر کی تعلیم شروع کردی۔ بادشاہ کے محل اور ساحر کے مکان کے درمیان ایک راہب[1] کی کٹی تھی ایک مرتبہ لڑکا اس راہب کے پاس چلا گیا اور اس کی باتوں اور اس کے طریقوں کو دیکھ کر بہت مسرور ہوا اور اس کے پاس آنے جانے لگا۔ یہاں دیر ہونے لگی۔ تو ساحر اور بادشاہ مقررہ آمدورفت میں تاخیر کرنے پر برافروختہ ہوئے، لڑکے نے راہب سے اس کی شکایت کی۔ راہب نے کہا کہ اس معاملہ کے مخفی رکھنے کی صرف یہ صورت ہے کہ جب بادشاہ بازپرس کرے تو یہ عذر کردینا کہ ساحر کے یہاں تاخیر ہوگئی اور جب ساحر ناراض ہو تو یہ کہہ دینا کہ بادشاہ کے پاس تاخیر ہوگئی۔

غرض یہ سلسلہ عرصہ تک یوں ہی جاری رہا کہ ایک مرتبہ لڑکے نے دیکھا کہ راہ میں بہت ہیبتناک اور عظیم الجثہ درندہ لوگوں کی راہ روکے ہوئے ہے اور کسی کو یہ جرأت نہیں ہوتی کہ وہ اس کے سامنے سے گذر جائے، لڑکے نے سوچا کہ یہ بہترین وقت ہے اس بات کا کہ میں جانچ کروں آیا ساحر کا مذہب سچا ہے یا راہب کا (دین) یہ سوچ کر اُس نے ایک پتھر اٹھایا اور کہنے لگا "خدایا! اگر تیرے نزدیک ساحر کے مقابلہ میں راہب کا دین سچا ہے تو میرے اِس پتھر سے تُو اِس جانور کو ہلاک کردے" یہ کہہ کر اس نے جانور کو پتھر مارا پتھر کا لگنا تھا کہ وہ وہیں ہلاک ہوگیا' لڑکا چل دیا اور راہب سے جاکر سارا ماجرا کہہ سُنایا۔ راہب نے کہا صاحب زادے تم مجھ پر فضیلت لے گئے' مجھے ڈر ہے کہ تم آزمائش میں ڈالے جاؤ گے' دیکھو وہ وقت آئے تو میرا ذکر نہ کرنا۔ لوگوں نے لڑکے کی اس جرأت کو دیکھ کر چرچا کیا اور کہنے لگے کہ اس کو عجیب وغریب علم آتا ہے' یہ سُن کر اُس کے پاس اندھے اور جُذامی آنے لگے اور انھوں نے کہا کہ اپنے علم کے زور سے ہم کو اچھا کر' اور وہ خدا کے فضل سے اچھا کردیتا تھا۔ بادشاہ کا ایک درباری مصاحب نابینا ہوگیا تھا اُس نے جو لڑکے کا چرچا

[1] حق پرست عیسائی عابد۔

سُنا تو تحفے تحائف کا بہت بڑا سامان لے کر اس کے پاس آیا اور تحفے پیش کرتے ہوئے بینا کر دینے کی درخواست کی۔ لڑکے نے جواب دیا، میں کچھ نہیں ہوں اور نہ مجھ میں یہ طاقت ہے بلکہ شافیِ مطلق تو خدائے واحد ہے پس اگر تو ایمان لے آئے اور اس واحد ویکتا کے سوا کسی کی پرستش نہ کرے تو میں ضرور تیری سفارش کے لیے دعاء کروں گا' درباری یہ سُن کر خدائے واحد پر ایمان لے آیا اور مسلمان ہو گیا اور اللہ تعالیٰ نے اس کو شفاء عطا فرمائی اور وہ بینا ہو گیا۔ اگلے دن جب وہ بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوا تو بادشاہ نے نابینا کو بینا پایا، تب بادشاہ نے سوال کیا کہ اپنے بینا ہونے کی حقیقت بیان کر اس نے جواب دیا "میرے رب نے مجھ کو شفا بخش دی" بادشاہ نے کہا تیرا رب تو میں ہوں، میں نے تجھ کو اچھا کر دیا؟ درباری نے جواب میں کہا نہیں تیرے اور میرے اور کُل جہان کے پروردگار نے اچھا کر دیا؟ بادشاہ نے (غصہ میں آکر) کہا "کیا میرے سوا بھی کوئی تیرا رب ہے" درباری نے کہا "جی ہاں، اللہ تیرا اور میرا دونوں کا رب ہے" تب بادشاہ نے اس کو طرح طرح کے عذاب میں مبتلا کیا، آخر اُس نے لڑکے کا ماجرا کہہ سُنایا۔ بادشاہ نے لڑکے کو بُلایا اور اس سے کہا "بیٹا مجھے معلوم ہوا ہے کہ تو سحر کے ذریعہ سے اندھوں کو بینا اور مبروص اور جذامی کو شفاء دیتا ہے" لڑکے نے کہا "مجھ میں یہ طاقت کہاں؟ یہ تو اللہ تعالیٰ کے شفاء دینے سے شفایاب ہوتے ہیں" بادشاہ نے کہا "کیا میرے علاوہ بھی تیرا اور کوئی رب ہے؟" لڑکے نے کہا "وہ خدا جو واحد ویکتا ہے تیرا اور میرا دونوں کا رب ہے۔" تب بادشاہ نے اس کو عذاب میں مبتلا کرنا شروع کر دیا، آخر اس نے راہب سے متعلق تمام واقعہ کہہ سُنایا، تب بادشاہ نے راہب کو بُلایا اور اس کو مجبور کیا کہ وہ دینِ حق سے پھر جائے مگر راہب نے کسی طرح اس کو قبول نہیں کیا' تب بادشاہ نے اس کے سر پر آرہ چلوا دیا اور اس طرح اس کو شہید کر ڈالا۔ اب لڑکے سے کہا کہ تو راہب کے دین سے پھر جا' لڑکے نے بھی صاف انکار کر دیا تو بادشاہ نے حکم دیا کہ اس کو پہاڑ کی چوٹی پر لے جا کر وہاں سے گرا دو کہ پاش پاش ہو جائے جب سرکاری آدمی لڑکے کو پہاڑ پر لے کر چڑھے تو لڑکے نے دعا کی "الٰہی تو ان لوگوں کے مقابلہ میں میرے لیے کافی ہو جا' چنانچہ اُسی وقت پہاڑ زلزلہ میں آگیا اور

سرکاری آدمی گر کر ہلاک ہو گئے اور لڑکا صحیح و سالم بچ کر بادشاہ کے سامنے حاضر ہو گیا بادشاہ نے یہ دیکھا تو کہا کہ تیرے ساتھ والے کہاں گئے؟ لڑکے نے کہا خدا نے ان کے مقابلہ میں میری مدد کی تب بادشاہ نے غضب ناک ہو کر حکم دیا کہ اس کو لے جاؤ اور دریا میں لے جا کر غرق کر دو سرکاری آدمی جب اس کو دریا کے بیچ میں لے کر پہنچے تو لڑکے نے پھر وہی دعا کی" خدایا ان سے مجھ کو نجات دے" فوراً ہی دریا میں جوش آیا اور وہ سب غرق ہو گئے اور لڑکا پھر بچ گیا اور صحیح و تندرست بادشاہ کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ بادشاہ نے پھر وہی سوال کیا اور لڑکے نے پھر وہی جواب دیا اور اس مرتبہ وہ کہنے لگا "بادشاہ اس طرح تو ہرگز مجھ پر کامیابی حاصل نہیں کر سکتا البتہ جو ترکیب میں بتاؤں اگر اس کو اختیار کرے تو بیشک تو مجھ کو قتل کر سکتا ہے" بادشاہ نے لڑکے سے وہ ترکیب دریافت کی لڑکے نے کہا: "تو شہر کی تمام مخلوق کو بلند جگہ پر جمع کر جب سب جمع ہو جائیں تو اس وقت مجھ کو درخت پر سولی دینا اور میرے ترکش سے تیر لے کر اور یہ پڑھ کر میرے سینہ پر مارنا" بِسْمِ اللّٰہِ رَبِّ الْغُلَامِ" اللہ کے نام پر جو اس لڑکے کا پروردگار ہے" تب میں مر سکتا ہوں" بادشاہ نے لڑکے کے قول پر عمل کیا اور جب تمام شہر جمع ہو گیا تو لڑکے کو سولی پر لٹکا کر اور لڑکے کی بتائی ہوئی عبارت پڑھ کر اس کے تیر مارا اور لڑکا تیر کھا کر جان بحق ہو گیا، مخلوق نے یہ دیکھا تو سب نے ایک دم بآوازِ بلند نعرہ لگایا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْغُلَامِ، اٰمَنَّا بِرَبِّ الْغُلَامِ" ہم لڑکے کے پروردگار پر ایمان لائے اور سب مسلمان ہو گئے، درباری کہنے لگے "بادشاہ جس بات کا تجھ کو خوف تھا آخر وہی ہو کر رہی اور یہ تمام رعایا مسلمان ہو گئی" بادشاہ یہ دیکھ کر جامہ سے باہر ہو گیا اور اس نے حکم دیا کہ شہر کے ہر ایک محلہ اور گلی کوچہ میں خندقیں کھودو اور ان میں خوب آگ دہکاؤ اور پھر ہر محلہ کے لوگوں کو جمع کر دو اور ان سے کہو کہ وہ اس دین سے باز آجائیں، جو باز آجائے اس کو چھوڑ دو اور جو انکار کرتا جائے اس کو دہکتی آگ میں ڈالتے جاؤ۔ لوگ جوق در جوق جمع ہوتے تھے اور دینِ حق سے باز نہ رہنے کا اقرار کرتے اور دہکتی آگ میں بخوشی ڈالے جاتے تھے اور اس جاں گسل اور ہولناک نظارہ کو بادشاہ اور اس کے مصاحبین مسرت کے ساتھ دیکھ رہے تھے کہ ایک عورت لائی گئی جس کی گود میں شیر خوار بچہ تھا عورت

بچہ کی محبت میں جھجکی، فوراً بچہ نے کہا "ماں صبر سے کام لے اور بے خوف خندق میں کود جا اس لیے
کہ بلاشبہ تو حق پر ہے اور یہ ظالم باطل پر ہیں[1]

اور دوسرا واقعہ صاحب سیرۃ محمد بن اسحاق نے بہ سلسلۂ سند محمد بن کعبؒ سے نقل کیا ہے۔
وہ فرماتے ہیں کہ شام اور حجاز کے درمیان جو بستی نجران کے نام سے مشہور ہے اس کے باشندے
بُت پرست اور مشرک تھے اور ان کے قریب کی آبادی میں ایک ساحر رہتا اور وہ نجران کے
لڑکوں کو سحر کی تعلیم دیا کرتا تھا، کچھ عرصہ بعد نجران اور ساحر کی بستی کے درمیان ایک راہب آکر
خیمہ زن ہوا، وہب بن منبہ کہتے ہیں کہ اس کا نام فیمون تھا نجران کے جو لڑکے ساحر سے سحر کی
تعلیم حاصل کرتے تھے ان میں ایک لڑکا عبداللہ بن تامر بھی تھا ایک روز عبداللہ راہب کے
خیمہ میں چلا گیا۔ راہب نماز میں مشغول تھا، عبداللہ کو راہب کی نماز اور طریقِ عبادت بہت
پسند آیا اور اس کے پاس آنے جانے لگا اور اس سے اس کے دین کو سیکھنا شروع کر دیا، اور
ایمان لے آیا اور راہب سے سچی مسیحیت کی تعلیم حاصل کرکے آہستہ آہستہ عالمِ دین بن گیا۔
اب اس نے راہب سے یہ اصرار کیا کہ مجھ کو اسم اعظم کے متعلق کچھ بتائیے مگر راہب یہ کہہ کر ٹالتا رہا
کہ برادر زادہ مجھے یہ خوف ہے کہ تو اس کو برداشت نہ کر سکے گا کیونکہ میں تجھ کو کمزور پاتا ہوں، لڑکا
خاموش ہو گیا۔ یہاں تو یہ سلسلہ جاری تھا اور اُدھر عبداللہ کا باپ تامر یہ سمجھتا رہا کہ میرا لڑکا ساحر سے
سحر سیکھ رہا ہے۔ کچھ دن خاموش رہ کر لڑکے سے صبر نہ ہو سکا اور اس نے یقین کر لیا کہ راہب بخل
کر رہا ہے اور بتانا نہیں چاہتا، یہ سوچ کر اس نے تیروں کا مُٹھا لیا اور ہر ایک تیر پر خدا کا ایک
ایک نام لکھا اور پھر آگ روشن کی اور ایک ایک تیر کو اس میں ڈالنا شروع کیا، تیر آہستہ آہستہ
آگ کی نذر ہوتے رہے اور جلتے رہے مگر ایک تیر جب آگ میں پہنچا تو فوراً اچھل کر دور جا گرا،
لڑکا سمجھ گیا کہ اس تیر پر اسم ذات کندہ ہے یہی اسم اعظم ہے اور اس کے بعد راہب کو سارا قصہ
کہہ سنایا۔ راہب نے سُنا تو عبداللہ کو نصیحت کی کہ اس کو حفاظت کے ساتھ اپنے پاس رکھنا۔
عبداللہ نے اس کو دینِ حق کی تبلیغ کا ذریعہ بنا لیا، وہ جس کسی کو مریض پاتا تو اس سے یہ کہتا کہ

[1] مسلم، نسائی، ترمذی، مسند احمد

اگر تو خدائے واحد پر ایمان لے آئے اور مومن بن جائے تو میں تیرے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کروں کہ وہ تجھ کو تندرست کر دے اور جب وہ شخص سچے دل سے ایمان لے آتا تو یہ دعا کرتا اور مریض چنگا ہو جاتا' شدہ شدہ یہ بات نجران کے بادشاہ تک پہنچی اس نے لڑکے کو بلایا اور کہا کہ تو نے میری مملکت میں فساد مچایا اور میرے اور میرے باپ دادا کے دین کی مخالفت شروع کر دی اس لیے اب تیری سزا یہ ہے کہ تجھ کو قتل کر دیا جائے۔

لڑکا کہنے لگا "بادشاہ! میرا قتل تیری قدرت سے باہر ہے۔ بادشاہ نے غضب ناک ہو کر حکم دیا کہ اس کو پہاڑ کی چوٹی سے گرا دو' سرکاری آدمیوں نے اس کو پہاڑ کی چوٹی سے گرا دیا مگر قدرتِ الٰہی نے اس کو صحیح سالم رکھا اور وہ بادشاہ کے پاس واپس آ گیا' اب بادشاہ نے حکم دیا کہ اسکو دریا میں لے جا کر غرق کر دو۔ لیکن وہ دریا میں پھینک دیے جانے کے باوجود غرق نہ ہوا اور اس کو مطلق کوئی گزند نہیں پہنچا تب لڑکے نے بادشاہ سے کہا کہ اگر تو واقعی مجھ کو قتل کر دینا چاہتا ہے تو اس کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ تو خدائے واحد کا نام لے کر مجھ پر حملہ کر تو میں مارا جا سکتا ہوں' بادشاہ نے خدائے واحد کا نام لے کر لڑکے پر حملہ کیا تو لڑکا جاں بحق ہو گیا مگر ساتھ ہی عذابِ الٰہی نے بادشاہ کو بھی اسی جگہ ہلاک کر دیا۔

اہلِ شہر نے جب لڑکے اور بادشاہ کے درمیان جنگ کا یہ نظارہ دیکھا تو وہ سب صدقِ دل سے خدائے واحد پر ایمان لے آئے اور مشرف باسلام ہو گئے اور انھوں نے سچائی کے ساتھ حضرتِ عیسٰی (علیہ السلام) اور انجیل کے احکام کی پیروی کو اپنا دین بنا لیا چنانچہ نجران میں نصرانیت کے حقیقی اور سچے دین کی بنیاد اسی واقعہ سے پڑی۔

نجران میں عیسائیت کی ترویج اور لڑکے اور راہب کے واقعہ کا تذکرہ یہودی المذہب شاہِ یمن ذونواس تک بھی پہنچا اس نے سنا تو سخت اشتعال میں آ گیا اور لشکرِ جرار لے کر نجران پہنچا اور تمام شہر میں منادی کرا دی کہ کوئی شخص عیسائیت پر قائم نہیں رہ سکتا یا تو وہ یہودیت قبول کرے ورنہ مرنے کے لیے تیار ہو جائے۔ اہلِ نجران کے قلب میں عیسائیت اس درجہ گھر کر چکی تھی کہ

انھوں نے مرجانا قبول کیا مگر عیسائیت سے منہ نہ موڑا۔ ذونواس نے یہ دیکھا تو غیظ و غضب میں آگیا اور حکم دیا کہ شہر کی گلیوں اور شاہراہوں میں خندقیں اور کھائیاں کھودی جائیں اور ان میں آگ دہکائی جائے۔ جب لشکریوں نے تعمیل کردی تو اس نے شہریوں کو جمع کر کے حکم دیا کہ جو شخص یہودیت قبول کرنے سے انکار کرتا جائے مرد ہو یا عورت یا بچہ اس کو زندہ آگ میں ڈال دو چنانچہ اس حکم کے مطابق بیس ہزار کے قریب مظلوم انسانوں کو جام شہادت پینا پڑا۔

یہی وہ واقعہ ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورۂ بروج میں کیا ہے قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ ؕ

اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد ابن اسحٰق کہتا ہے کہ ذونواس یمن کا مشہور بادشاہ ہے اس کا اصل نام زرعہ تھا مگر سریر آرائے سلطنت ہونے کے بعد یوسف ذونواس کے نام سے شہرت پائی اس کے باپ کا نام تبان اسعد تھا اور ابو کرب کنیت رکھتا تھا، یمن کے ان بادشاہوں کا لقب "تبع" تھا اس لیے کتب تاریخ میں یہ خاندان تبابعۂ یمن کہلاتا ہے۔ ابو کرب وہ پہلا تبع ہے جس نے بُت پرستی چھوڑ کر یہودیت کو قبول کر لیا تھا، اس نے مدینہ پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا تھا مگر بنی قریظہ کے دو یہودی علماء کی تلقین پر سچے دینِ موسوی کو قبول کر کے مدینہ سے واپس چلا آیا اور پھر مکہ معظمہ پہنچ کر کعبہ پر غلاف چڑھایا اور دونوں یہودی علماء کو یمن ساتھ لے آیا انھوں نے یمن میں یہودیت کی تبلیغ کی اور آہستہ آہستہ اہلِ یمن نے یہودیت قبول کر لی۔

الحاصل ذونواس نے ایک دن میں نجران کے بیس ہزار حق پرست انسانوں کو شہید کر دیا مگر ان میں سے ایک شخص دوس ذو ثعلبان کسی طرح جان بچا کر نکل بھاگا اور شام میں مقیم قیصر روم کے دربار میں پہنچ کر نجران کے حادثہ کی ہوش ربا داستان کہہ سنائی اور احتجاج کیا۔ قیصر نے فوراً حبشہ کے بادشاہ "نجاشی" کو لکھا کہ وہ یمن پر حملہ کر کے ذونواس سے اس ظلم کا انتقام لے۔ نجاشی نے اس پر چڑھائی کر دی اور تھوڑے ہی عرصہ بعد اس کو شکست دے کر تمام یمن پر قبضہ کر لیا ذونواس نے دریا کے راستہ فرار ہونے کی کوشش کی مگر غرق ہو گیا اور اس طرح تقریباً ستر سال تک یمن نصاریٰ

کے زیرِ حکومت رہا اس کے بعد حمیری خاندان کے ایک رئیس سیف بن ذی یزن نے کوشش کی کہ اپنے خاندان کے زیرِ نگین ملک پر دوبارہ قبضہ کرے چنانچہ اس سلسلہ میں اس نے کسریٰ فارس سے مدد طلب کی کسریٰ نے حکم دیا کہ مملکت میں جس قدر بھی قیدی ہیں ان کو رہا کر کے اور ان کی فوج بنا کر سیف بن ذی یزن کی مدد کی جائے اور سیف نے سات سو ایرانی اور باقی اپنی فوج کی مدد سے یمن پر حملہ کیا اور نصاریٰ کے ہاتھ سے یمن کو آزاد کرا لیا۔[1]

اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نجران کا بادشاہ بُت پرست تھا۔ پس اگر عیسائی راہب کے ذریعہ نجران میں عیسائیت پھیل گئی تو ذو نواس کو جو کہ یہودی المذہب تھا اس درجہ طیش کیوں آیا؟ اس کا جواب یورپین مؤرخین یہ دیتے ہیں کہ جس زمانہ کا یہ واقعہ ہے اس وقت سیاسی اور تجارتی صورتِ حال ایسی بن گئی تھی کہ رومی (عیسائی) اور حبشی ایک فریق تھا اور حمیری (یہودی) اور ایرانی دوسرا فریق تھا اور دونوں میں زبردست رقابت قائم تھی اس لیے ذو نواس نجران میں عیسائیت کو برداشت نہ کر سکا۔

ہم اس میں اس قدر اور اضافہ کرتے ہیں کہ تاریخ اس بات کو بھی ثابت کرتی ہے کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے واقعۂ صلیب کے اس نظریہ کی بنا پر جو یہودیوں اور عیسائیوں دونوں کے یہاں مسلّمہ ہے اس درجہ آپس میں عداوت اور بغض بڑھ گیا تھا کہ دونوں فریق بُت پرستوں کی ترقی کو برداشت کر سکتے تھے لیکن ایک دوسرے کی مذہبی ترقی ان کے لیے ناقابلِ برداشت تھی اور اس کا مظاہرہ اس درجہ نمایاں تھا کہ جب کبھی یہود کو موقع ملا ہے تو انھوں نے عیسائیوں پر محض مذہب کے نام پر سخت سے سخت مظالم روا رکھے ہیں اور حکومت کے دباؤ سے زبردستی انکو یہودی بنانے کی کوشش کی ہے اور جب کبھی عیسائیوں کو موقع ہاتھ آیا ہے تو انھوں نے یہودیوں پر اسی طرح کے مظالم سے گریز نہیں کیا پس نجران کا واقعہ ایسے زمانہ میں پیش آیا جب کہ مسطورۂ بالا سیاسی اور تجارتی رقابت کی موجودگی میں رومی تاجر سواحل یمن تک پہونچتے اور مالِ تجارت کے ساتھ ساتھ عیسائیت کی تبلیغ کو بھی جاری رکھتے تھے آہستہ آہستہ نتیجہ یہ نکلا کہ نجران جو ساحل یمن پر واقع تھا

[1] تفسیر ابن کثیر [illegible]

رومی تاجروں کا تجارتی اور تبلیغی مرکز بن گیا۔ حمیری بادشاہ یہ دیکھتے تھے اور سخت برہم ہوتے تھے مگر صاف طور سے ظلم کرنے کا بہانہ ہاتھ نہیں آتا تھا کہ حسب اتفاق راہب اور لڑکے کا یہ واقعہ پیش آگیا اور ذونواس نے جب یہ دیکھا کہ بات ریاست و تجارت سے گذر کر مذہب تک پہنچ گئی تو یہودیت کے روایتی تعصب نے قابو سے باہر کر دیا اور پھر جو کچھ پیش آیا گذشتہ سطور میں آپ اس کا مطالعہ کر چکے ہیں۔

ان دو واقعات کے علاوہ مشہور محدث ابن ابی حاتم نے نقل کیا ہے کہ حضرت انس (رضی اللہ عنہ) کے صاحبزادہ ربیع فرماتے ہیں کہ اصحاب اخدود کے متعلق ہم نے سُنا ہے کہ "فترۃ" کے زمانہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اور عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان زمانہ) میں خدائے تعالیٰ کے نیک بندوں کی ایک جماعت نے جب یہ دیکھا کہ زمانہ بہت ہی خراب ہو چلا ہے اور فتنوں اور شرارتوں کا زور بڑھتا جا رہا ہے اور دینِ حق گروہ بندیوں کی نذر ہو کر ہر شخص کی ذاتی رائے کے تابع بن گیا ہے تو انھوں نے باہم مشورہ کر کے عام آبادیوں سے بہت دور ایک چھوٹی سی بستی آباد کر لی اور اس میں سچی عیسائیت کے مُطابق عبادت و صداقت کی زندگی بسر کرنے لگے مگر ان کا یہ معاملہ پوشیدہ نہ رہ سکا اور شدہ شدہ اس زمانہ کے بُت پرست بادشاہ تک پہنچ گیا اس نے آکر بستی کا محاصرہ کر لیا اور ان کو توحیدِ الٰہی کے خلاف بُت پرستی پر مجبور کرنے لگا لیکن ان حق پرستوں پر اس کی سختیوں کا مطلق اثر نہ ہوا اور انھوں نے شرک و بت پرستی سے صاف انکار کر دیا۔ تب بادشاہ نے غضبناک ہو کر خندقیں کھدوانے اور ان میں آگ دہکانے کا حکم دیا اور پھر جو شخص بُت پرستی سے انکار کرتا جاتا تھا اس کو آگ میں جھونک دیا جاتا تھا۔ حق پرست گروہ کے بزرگ پروانہ وار آگ میں کودتے جاتے تھے اور اپنے بچوں اور نوجوانوں کو تسلی دیتے جاتے تھے کہ آج کا دن خوف کھانے کا دن نہیں ہے۔ یہ آگ ہمارے لیے جہنم کی آگ سے محفوظ رہنے کا پیش خیمہ ہے چنانچہ تمام حق پرستوں نے حق پر نثار ہو جانا قبول کیا مگر شرک و بُت پرستی پر آمادگی ظاہر نہ کی۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں بھی ان پر اپنا یہ فضل فرمایا کہ جب وہ آگ میں ڈالے جاتے تو آگ تک پہونچنے اور اس کی تکلیف سہنے سے قبل ہی ان کی

روح قبض کرلی جاتی تھی، مگر خندق اور کھائیوں کی آگ اس درجہ بھڑک رہی تھی کہ ان نیکوکار انسانوں کو کھالینے کے بعد بھی نہ بجھی اور بے قابو ہوکر کچھ اس طرح پھیلتی گئی کہ بُت پرست ظالم بادشاہ اور اس کے تمام لشکری سب کے سب اس کے اندر گھر گئے اور جل کر رہیں خاک سیاہ ہوگئے۔ قرآنِ عزیز کی یہ آیات "قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ" اسی واقعہ کا تذکرہ کر رہی ہیں۔[1]

اور حضرت علی (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ یہ واقعہ فارس میں پیش آیا، جب فارس کے بادشاہ نے دینِ حق چھوڑ کر باطل پرستی اختیار کرلی اور اپنے محارم (ماں بہن، بیٹی وغیرہ) سے نکاح کرنا جائز قرار دے لیا تو اُن کے بعض علماء نے جو ابھی تک دینِ حق پر قائم تھے بادشاہ کو اس بات سے منع کیا، بادشاہ نے حق کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کی بجائے غضب ناک ہوکر یہ حکم کیا کہ کھائیاں کھُدوائی جائیں اور جو شخص نکاحِ محارم کو باطل کہے اس کو کھائی میں جھونک کر زندہ جلادیا جائے چنانچہ اہلِ حق کی جماعت نذرِ آتش کردی گئی اور پارسیوں میں آج تک نکاحِ محارم کو جائز سمجھا جارہا ہے۔

**انتقاد** ان روایات کے مفہوم اور مقصد پر اگر نظر کی جائے اور تفصیلات وجزئیات کو نظر انداز کردیا جائے تو سب کا حاصل ایک ہی نکلتا ہے اور وہ یہ کہ گزشتہ زمانہ میں مشرک یا یہودی بادشاہ نے ایک حق پرست اور توحیدِ الٰہی سے سرشار جماعت کو بُت پرستی یا باطل پرستی پر مجبور کیا اور جب انھوں نے اس کے مطالبہ کو ٹھکرادیا اور ایمان باللہ اور حق پرستی کو ترک کردینے سے انکار کردیا تو ظالم وجابر بادشاہ نے ان کو آگ میں جھونک کر زندہ جلادیا مگر نتیجہ کے اعتبار سے حق پرست جماعت کے حصہ میں ابدی کامرانی اور سرمدی فوز وفلاح آئی اور ظالم وباطل کوش جماعت دنیا میں بھی خائب و خاسر ہوئی اور آخرت میں ابدی جہنم پائی۔

نیز اگر اس حقیقت پر غور کیا جائے کہ نزولِ آیات وسُور میں اصل شے مفہوم ومراد ہے اور شانِ نزول کو ثانوی اور تاریخی حیثیت حاصل ہے جیسا کہ حکیم الاُمّۃ شاہ ولی اللہ (نور اللہ مرقدہ) نے الفوز الکبیر میں تصریح فرمائی ہے تو پھر بآسانی یہ کہا جاسکتا ہے کہ باختلافِ زمانہ اس چرخِ نیلی فام کے نیچے ایسے

واقعات متعدد پیش آچکے ہیں جن کا ذکر مسطورۂ بالا روایات میں کیا گیا ہے. چنانچہ یہ بھی ایک مستقل واقعہ ہے جس کو مسلم نے صحیح میں اور امام احمد نے مسند میں نقل کیا ہے اور وہ بھی جس کو محمد بن اسحاق نے سیرۃ میں بیان کیا اور وہ بھی جس کو ابن کثیر نے بروایت حضرت علی (رضی اللہ عنہ) نقل کیا ہے بلکہ ابن کثیر نے بحیثیت ایک مؤرخ کے یہ ثابت کیا ہے کہ بلاشبہ اس نوعیت کے واقعات متعدد پیش آچکے ہیں، وہ تحریر فرماتے ہیں:-

| | |
|---|---|
| وقد یحتمل ان ذٰلک قد وقع فی العالم کثیراً کما قال ابن ابی حاتم کانت الاخدود فی الیمن زمان تبع وفی القسطنطنیۃ زمان قسطنطین وفی العراق فی ارض بابل بخت نصر الذی صنع الصنم وامر الناس ان یسجدوا لہ۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۴ سورۂ بروج) | اور یہ ممکن ہے کہ ایسے واقعات عالم میں بہت ہو گذرے ہوں مثلاً ابن ابی حاتم کا بیان ہے کہ اخدود کا معاملہ ایک تو یمن میں تبع کے زمانہ میں پیش آیا اور دوسرا قسطنطین کے زمانہ میں قسطنطنیہ میں اور تیسرا عراق (بابل) میں بخت نصر کے زمانہ میں پیش آیا جس نے ایک بت بنا رکھا تھا اور وہ لوگوں کو مجبور کرتا تھا کہ اس کو سجدہ کریں اور جو سجدہ نہ کرتا اس کو آگ میں جھونک دیا جاتا تھا۔ |
| وعن مقاتل قال کانت الاخدود ثلاثۃ واحدۃ بنجران بالیمن والاخریٰ بالشام والاخریٰ بفارس احرقوا بالنار اما التی بالشام فھو انطنانوس الرومی واما الذی بفارس فھو بخت نصر واما التی بارض العرب (نجران) فھو یوسف ذو نواس فاما التی بفارس والشام فلم ینزل اللہ تعالیٰ فیھم قرآنا وانزل | اور مقاتل فرماتے ہیں کہ "اخدود" تین واقعے ہیں، ایک یمن (عرب) کے شہر نجران میں پیش آیا دوسرا شام میں اور تیسرا فارس میں اُن واقعات میں مظلوموں کو دہکتی آگ میں ڈالا گیا تھا اور شام کا واقعہ انطنانوس رومی کے ہاتھوں پیش آیا اور فارس کا بخت نصر (بنوکدنذر) کے ہاتھوں اور نجران کا واقعہ یوسف ذونواس کے ہاتھوں پیش آیا۔ لیکن فارس اور شام کے واقعات کا ذکر قرآن میں نہیں ہے البتہ نجران میں |

فی الملحق کانت بنجران[1]       جو واقعہ پیش آیا اس کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے[2]

بہرحال اگرچہ مسطورۂ بالا روایات بلکہ ان کے علاوہ اسی قسم کے اور واقعات اپنے مفہوم و مراد اور مقصد کے لحاظ سے سب ہی سورۂ بروج کی آیات زیر بحث کا مصداق بن سکتے ہیں لیکن تاریخی اعتبار سے اگر یہ سوال کیا جائے کہ قرآن عزیز نے خصوصیت کے ساتھ کس واقعہ کا تذکرہ کیا ہے تو مشہور تابعی مقاتل کی عبارت سے یہ واضح ہوتا ہے کہ قرآن میں جس واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے وہ نجران اور ذونواس سے تعلق رکھتا ہے اور یہی قول صحیح ہے اور یہ اس لیے کہ مسلم اور مسند کی روایت کے تو کسی ایک جملہ سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس واقعہ کو سورۂ بروج کی آیات کی تفسیر کے سلسلہ میں بیان فرمایا ہے' یہی وجہ ہے کہ امام مسلم نے اس روایت کو کتاب التفسیر میں نقل نہیں فرمایا' البتہ ترمذی نے ایک حسن غریب روایت" میں ضرور اس واقعہ کو دوسرے واقعہ سے مربوط اس طرح بیان کیا ہے کہ گویا یہ سورۂ بروج کی زیر بحث آیات کی تفسیر ہے لیکن ابن کثیر فرماتے ہیں کہ ترمذی کی حدیث سے تو یہ بھی ثابت نہیں ہوتا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس واقعہ کو بیان فرمایا ہے بلکہ یہ قوی احتمال ہے کہ یہ واقعہ راوی حدیث حضرت صہیب رومی کا اپنی

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۴ سورۂ بروج [2] شام و فارس کے واقعات میں شام کے واقعہ سے تو غالباً قسطنطین کا واقعہ مراد ہے وہ یہ کہ جب قسطنطین بانی قسطنطنیہ نے عیسائی مذہب قبول کر لیا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین حق کی بجائے مروجہ مسیحیت کو اپنا دین بنایا اور توحید کی جگہ تثلیث کو عقیدہ کی بنیاد قرار دیا اور صخرہ بیت المقدس سے منحرف کر کے مشرق کو قبلہ بنایا اور تمام قلمرو میں منادی کر دی کہ آباء و اجداد کا دین چھوڑ کر دین عیسوی اختیار کرو اور جو انکار کرے اس کو دہکتی آگ میں جھونک دو۔ اوائل چھٹی صدی عیسوی میں ہزاروں انسان دہکتی آگ میں جھونک دیے گئے اور فارس کے واقعہ سے متعلق ابن کثیر نے ایک اسرائیلی روایت جو کہ دانیال نبی کے صحیفے میں بھی مذکور ہے یہ بیان کی ہے کہ عراق (بابل) میں بخت نصر نے سونے کا ایک بت بنوایا تھا اور تمام رعایا سے اس کو سجدہ کراتا تھا سب نے سجدہ کیا لیکن دانیال (علیہ السلام) اور ان کے رفقاء نے سجدہ سے انکار کر دیا تب بخت نصر نے خندق میں آگ دہکا کر اس میں ان سب کو دھکیل دیا مگر وہ ان پر برد و سلام ہو گئی اور کوئی آنچ نہ آئی اور جن لوگوں نے آگ کی بھٹی میں ان کو ڈالا تھا وہ جل کر خاک ہو گئے۔

جانب سے بیان کردہ ہو کیونکہ وہ اہل کتاب کے قصص و واقعات کے بہت بڑے عالم تھے۔ ترمذی کی حدیث کا ترجمہ یہ ہے:-

ایک مرتبہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عصر کی نماز سے فارغ ہوئے تو آپ نے لب مبارک کو اس طرح حرکت دی گویا کچھ بات فرمانا چاہتے ہیں مگر بیان نہ فرمائی تب کسی نے عرض کیا کہ آپ کچھ ارشاد فرمانا چاہتے تھے مگر فرمایا نہیں، لبوں کو حرکت دے کر رہ گئے؟ آپ نے ارشاد فرمایا کہ انبیاء سابقین میں سے ایک نبی اپنی امت کا حال دیکھ کر ازراہِ فخر کہنے لگے کہ ایسی امت کس نبی کی ہوگی؟ کون اس کے مقابلہ میں اپنی امت پیش کر سکے گا؟ اللہ تعالیٰ کو ان کا یہ انداز پسند نہ آیا اور ان پر وحی نازل ہوئی کہ دو باتوں میں سے ایک بات قبول کر لو، یا امت پر مصیبت کا نزول ہو یا ان پر دشمن کا تسلط ہو، خدا کے نبی نے دشمن کے تسلط پر مصیبت کے نزول کو ترجیح دی، چنانچہ ستر ہزار کے قریب موت کی آغوش میں سلا دیے گئے (اس کے بعد روایت کے الفاظ یہ ہیں) وكان اذا احدث بهذا الحديث حدث بهذا الحديث الآخر اور جب وہ اس واقعہ کو بیان کیا کرتے تھے تو اس کے ساتھ ایک اور واقعہ سنایا کرتے تھے (یہ دوسرا واقعہ وہی ہے جو مسلم میں مذکور ہے)

اس روایت کو نقل کرنے کے بعد ابن کثیر فرماتے ہیں۔

وهذا السياق ليس فيه صراحة ان سياق هذه القصة من كلام النبى صلى الله عليه وسلم قال شيخنا الحافظ ابو الحجاج المزى فيحتمل ان يكون من كلام صهيب الرومى فانه كان عنده من اخبار النصارى[1]

اور روایت کا یہ طریقِ بیان ہرگز اس کی صراحت نہیں کرتا کہ اس دوسرے واقعہ کا تذکرہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے کیا گیا ہمارے استاد ابو الحجاج مزی فرماتے ہیں اس بیان میں یہ احتمال ہے کہ یہ واقعہ صہیب رومی کی جانب سے ہو اس لیے کہ وہ نصاریٰ کے قصص و واقعات کے عالم تھے۔

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے "اصحاب اخدود" کے متعلق کتب تفسیر و سیر میں تین روایات مذکور ہیں

ایک روایت اوپر بیان ہوچکی دوسری روایت میں ہے کہ یہ واقعہ یمن میں پیش آیا ہے اور تیسری روایت میں ہے کہ یہ حبشہ کا واقعہ ہے مگر ان تینوں روایت میں سے کسی ایک روایت کے متعلق بھی ان سے یہ بصراحت مذکور نہیں کہ وہ ان میں سے کسی واقعہ کو تاریخی حیثیت سے ان آیات کی تفسیر سمجھتے ہیں۔

پس جب کہ مسلم کی روایت اس مسئلہ میں خاموش ہے اور ترمذی کی روایت سے بھی اس کے متعلق کوئی بات صاف ثابت نہیں ہوتی اور حضرت علیؓ کی روایات بطور توسع اور مفہوم و مقصد کے پیش نظر تو آیات کا مصداق بنتی ہیں لیکن تاریخی حیثیت سے شانِ نزول پر دلالت نہیں کرتیں تو اس صورتِ حالات میں مقاتل کی صراحت اپنے اندر قوتِ رجحان رکھتی ہے چنانچہ اہل تحقیق کا رجحان اسی جانب ہے کہ قرآن میں مذکور واقعہ ذونواس سے ہی تعلق رکھتا ہے۔ ابن کثیر فرماتے ہیں:

| | |
|---|---|
| وما ذکرہ ابن اسحاق یقتضی ان قصتھم | اور ابن اسحاق نے جو واقعہ نقل کیا ہے اس کا |
| کانت فی زمان الفترۃ التی بین عیسٰی | اقتضاء یہ ہے کہ یہ واقعہ حضرتِ عیسٰی علیہ السلام کے |
| ومحمد علیھما من اللہ السلام وھو اشبہ | اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان زمانہ (فترۃ) کا |
| (تفسیر ابن کثیر ص ۴۹۵) | ہے اور یہی قرینِ قیاس ہے۔ |
| وقد تقدم فی قصۃ اصحاب الاخدود | اور اصحاب اخدود کے واقعہ میں گذر چکا ہے کہ |
| ان ذونواس وکان آخر ملوک حمیر | ذونواس ہی وہ بادشاہ تھا جس نے تقریباً بیس |
| وکان مشرکا وھو الذی قتل اصحاب | ہزار سچے عیسائیوں کو خندقوں میں ڈال کر مار ڈالا |
| الاخدود وکانوا نصاریٰ وکانوا قریبا | تھا یہ بادشاہ مشرک تھا اور شاہانِ حمیر میں سے |
| من عشرین الفا الخ۔ ؎ | آخری بادشاہ تھا۔ |

اور شاہ عبدالقادر (نور اللہ مرقدہٗ) کا رجحان بھی اسی جانب ہے لیکن یہ دونوں بزرگ ذونواس کو مشرک کہتے ہیں مگر تاریخی سند سے ثابت ہوچکا ہے کہ ذونواس اپنے باپ کے دین یہودیت ہی پر قائم تھا۔

علاوہ ازیں قیاس بھی یہ چاہتا ہے کہ قرآن میں مذکور واقعہ نجران اور ذونواس سے ہی تعلق رکھتا ہے اس لیے کہ اس سلسلہ میں بیان کردہ واقعات میں سے یہ واقعہ زمانہ کے لحاظ سے بھی زیادہ قریب ہے اور ملکی اعتبار سے بھی خود عرب کے اندر کا واقعہ ہے اس لیے نزولِ قرآن کے وقت اہلِ عرب اس واقعہ سے ضرور آگاہ ہوں گے لہٰذا حق و باطل کے مختلف معرکوں میں سے موعظت و عبرت کے لیے قرآن نے اس واقعہ کو بیان کر دیا اور اس کے علاوہ دوسرے واقعات یا تو بہت ہی قدیم زمانہ سے تعلق رکھتے ہیں اور یا عرب کے باہر دوسرے ملکوں سے علاقہ رکھتے ہیں اس لیے وہ اس کے مقابلہ میں قابلِ ترجیح نہیں ہو سکتے۔[1]

**تُبّع** "سیلِ عَرِم" کی بحث میں اگرچہ سبا کے ضمن میں "تبع اور تبابعہ" کا تفصیلی ذکر آچکا ہے تاہم مختصر طور پر یہاں بھی یہ سمجھ لینا چاہیے کہ یہ یمن کے حمیری بادشاہوں میں سے ان کا لقب رہا ہے

---

[1] محقق عصر حضرت استاذ علامہ انور شاہ (نور اللہ مرقدہٗ) ارشاد فرماتے تھے کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک آیت کا شانِ نزول تاریخی حیثیت سے متعین ہوتا ہے پھر بھی آیت کے مفہوم و مراد کے لحاظ سے اس میں اتنی وسعت ہوتی ہے کہ اس قسم کی دوسری جزئیات کو خود صاحبِ شریعت صلی اللہ علیہ وسلم اس آیت کا شانِ نزول فرما دیا کرتے ہیں چنانچہ اس کی بہترین مثال سورۂ توبہ کی یہ آیت ہے لَمَسْجِدٌ أُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ أَوَّلِ يَوْمٍ أَحَقُّ أَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ (الآیہ) باتفاقِ جمہور مسجدِ قبا کے بارے میں نازل ہوئی لیکن ایک مرتبہ صحابہ (رضی اللہ عنہم) نے ذاتِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت کے شانِ نزول کے متعلق دریافت کیا تو آپ نے فرمایا "مسجدی ہٰذا" اس آیت کا مصداق میری یہ مسجد (مسجدِ نبوی) ہے چنانچہ تمام محدثین کے نزدیک آپ کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اس آیت میں جن اوصاف کا تذکرہ کیا گیا ہے چونکہ اس کا مصداق مسجدِ قبا سے بھی زیادہ مسجدِ نبوی بنتی ہے اسلیے یہ زیادہ مستحق ہے کہ اس کو شانِ نزول بنایا جائے۔

لیکن آپ کے ارشاد کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تاریخی حیثیت سے آیت کا شانِ نزول مسجدِ قبا سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ مسجدِ نبوی سے رکھتا ہے پس اگر مسئلہ زیرِ بحث میں یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ترمذی کی روایات میں مذکورہ واقعہ کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے سورۂ بروج کی آیات کا شانِ نزول فرمایا ہے تو نقل و عقل سے پیدا شدہ قرائن و دلائل اس بات کو واضح کرتے ہیں کہ آپ کا یہ ارشادِ مبارک مصداق کے توسع کے پیشِ نظر ہے نہ کہ اس حیثیت سے کہ تاریخی بنا پر ترمذی میں مذکور واقعہ ہی آیات کا شانِ نزول ہے۔

جنھوں نے تقریباً ڈھائی سو سال تک یمن کے مغربی حصّہ کو دارالسلطنت قرار دے کر عرب، شام، عراق اور افریقہ کے بعض حصوں پر بڑی شان و شوکت کے ساتھ حکومت کی، جدید تحقیق کے اصول پر حمیر حمرۃ (سُرخی) سے ماخوذ ہے اور اس کے مقابلہ میں سودانی - سواد (سیاہی) سے بنایا گیا ہے چونکہ اہلِ عرب یعنی حمیری حبشیوں کو سیاہ فام ہونے کی وجہ سے "سودانی" کہتے تھے اس کے جواب میں حبشی ان کو احمر (سرخ) کہتے تھے - یہی لفظ آگے چل کر "حمیر" بن گیا اور لفظ "تبع" اصلاً حبشی لفظ ہے یا سامی الاصل ہے؟ اس کے متعلق عرب مؤرخین کی رائے یہ ہے کہ یہ عربی (سامی) لفظ ہے اور تبع سے بمعنی تبوع (سردار) بنا لیا گیا ہے اور جدید اہلِ تحقیق یہ کہتے ہیں کہ یہ لفظ حبشی الاصل ہے اور بمعنی قاہر و غالب آتا ہے یعنی عربی میں "سلطان" اور حبشی زبان میں تبع مرادف ہے۔

قرآنِ عزیز نے بھی تبع کا ذکر دو مقامات سورۂ قٓ اور سورۂ دُخان میں کیا ہے، سورۂ دخان میں مختصر طور پر ان کی مادی قوت و طاقت کا ذکر کر کے یہ بتایا گیا ہے کہ جب خدا کی نافرمانی کر کے وہ ہلاکت سے نہ بچے تو قریش جو اُن کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں وہ سرکشی کر کے کیسے بچ سکتے ہیں اور سورۂ قٓ میں صرف مجرم قوموں کی فہرست میں ان کا ذکر کیا گیا ہے۔

| | |
|---|---|
| اَهُمْ خَيْرٌ اَمْ قَوْمُ تُبَّعٍ وَّالَّذِيْنَ مِنْ | یہ (قریش) بہتر (قوی و طاقت ور) ہیں یا تبع |
| قَبْلِهِمْ اَهْلَكْنٰهُمْ اِنَّهُمْ كَانُوْا | کی قوم اور جو اُن سے پہلے گذر گئیں ہم نے ان کو |
| مُجْرِمِيْنَ ۝ (سورہ دخان پ ع) | اس لیے ہلاک کر دیا کہ وہ مجرم تھیں۔ |
| كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّاَصْحٰبُ الرَّسِّ | ان مشرکینِ مکہ سے پہلے نوح کی قوم نے، |
| وَثَمُوْدُ وَعَادٌ وَّفِرْعَوْنُ وَاِخْوَانُ | اصحاب الرس نے ثمود، عاد، فرعون، اخوان |
| لُوْطٍ وَّاَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ وَقَوْمُ تُبَّعٍ ۔ | لوط اور اصحاب الایکہ اور قوم تبع نے (خدا کے |
| (سورہ قٓ پ ع) | پیغمبروں کو) جھٹلایا ہے۔ |

**عرب کی دو حکایتیں**

ابن کثیر نے مشہور محدث ابوبکر بن ابی الدنیا کے واسطہ سے بروایت محمد بن جعفر بن ابی طالب یہ حکایت نقل کی ہے کہ انھوں نے بعض اہلِ علم سے سنا ہے کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری نے

جب اصفہان فتح کرلیا اور شہر میں فاتحانہ داخل ہو گئے تو شہر پناہ کا ملاحظہ کیا، دیکھا تو ایک جانب میں دیوار شکستہ ہے۔ انھوں نے حکم دیا کہ دیوار کا یہ حصہ درست کر دیا جائے لیکن جب دیوار کو درست کر دیا گیا تو وہ ٹھہر نہ سکی اور یک لخت پھر گر گئی۔ چنانچہ دوبارہ مرمت کی گئی مگر وہ پھر منہدم ہو گئی تب بعض لوگوں کا یہ خیال ہوا کہ اس مقام پر کسی مرد صالح کی قبر معلوم ہوتی ہے۔ یہ سوچ کر جب بنیاد کو کھدوایا گیا تو دیکھا کہ ایک شخص کھڑا مدفون ہے اور اس کے ہاتھ میں تلوار ہے اور تلوار پر عبارت کندہ ہے جس کا حاصل یہ ہے "میں حارث بن مضاض ہوں جس نے اصحاب اخدود سے انتقام لیا" حضرت ابوموسیٰ نے اس کو وہاں سے نکال کر قبرستان میں دفن کرا دیا اور دیوار کی تعمیر کرا دی جو صحیح و سالم رہی[1]

حارث بن مضاض عرب کے خاندان جرہم کا ایک بادشاہ تھا جس نے نابت بن اسمٰعیل (علیہ السلام) کی اولاد سے مکہ کی حکومت لے کر حکمرانی کی تھی اور یہ تقریباً حضرت اسمٰعیل (علیہ السلام) سے پانچ سو سال بعد کا زمانہ ہے، اس اعتبار سے اصحاب اخدود کا واقعہ بہت قدیم زمانہ سے متعلق ہو جاتا ہے مگر یہ روایت سیر کی روایات میں سے ہے اور اس کی سند منقطع ہے اس لیے اس کی حیثیت حکایت اور کہانی سے زیادہ نہیں ہے، علاوہ ازیں اگر یہ واقعہ صحیح تسلیم کر لیا جائے تو ہو سکتا ہے کہ یہ ان مختلف واقعات میں سے ایک واقعہ ہو جن کا ذکر قرآن میں نہیں ہے مگر وہ آیات بروج کے مصداق میں داخل ہیں۔

اسی طرز کی ایک حکایت مشہور محدث محمد بن ابوبکر بن حزم نے بغیر سند کے بیان کی ہے۔ کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطاب (رضی اللہ عنہ) کے زمانہ میں نجران کا ایک شخص زمین کھود رہا تھا، دیکھا تو اس جگہ ایک قبر ہے، اندر جھانک کر دیکھا تو ایک نعش کو اس طرح بیٹھے ہوئے پایا کہ وہ اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑے ہوئے ہے۔ جب لوگوں نے اس کے ہاتھ کو سر سے ہٹایا تو اس سے خون بہنے لگا اور جب ہاتھ کو اسی طرح رکھ دیا تو خون بند ہو گیا۔ اس شخص کے ہاتھ میں ایک انگشتری تھی اور اس کے نگینہ پر یہ عبارت کندہ تھی: "ربی اللہ" اس واقعہ کی خبر فوراً حضرت عمر بن الخطاب (رضی اللہ عنہ) کو دی گئی، حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے جواب میں تحریر فرمایا کہ

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۴۔

اس شخص کو اس کی حالت پر رہنے دیا جائے اور اسی جگہ دفن کر دیا جائے، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ اس زمانہ میں لوگوں میں یہ مشہور تھا کہ یہ نعش عبداللہ بن تامر کی ہے۔

نجران میں چونکہ راہب اور عبداللہ بن تامر کا واقعہ پیش آچکا تھا اس لیے کوئی محلِ تعجب نہیں کہ اس قسم کی حکایات وہاں مشہور رہی ہوں اور عیسائیوں نے اپنی برتری کے لیے انکو خوب آب ورنگ دیا ہو۔

چند تفسیری نکات | (۱) وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ قرآن عزیز کی ان آیات میں "واو" بمعنی قسم ہے اور ان آیات کے علاوہ قرآن کی متعدد سورتوں میں مختلف اشیاء کی قسم کا تذکرہ موجود ہے، عام طور پر ان مقامات کی تفسیر میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ جس طرح ہم آپس میں قسمیں کھاتے ہیں یا ایسی چیز کی قسم کھاتے ہیں جو ہمارے لیے بہت زیادہ عزت و عظمت کے لائق ہے مثلاً باپ، استاد، پیر، پیغمبر اور خدا کی قسم اور یا ایسی شے کی قسم کھائی جاتی ہے جو ہماری نگاہ میں بہت زیادہ محبوب ہو۔ مثلاً اولاد کی یا محبوب کی قسم اسی طرح خدائے تعالیٰ نے بھی قرآن میں قسمیں کھائی ہیں اور یہ سمجھ کر پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا کو قسم کھانے کی ضرورت ہی کیا ہے کیونکہ قسم تو صرف اس لیے کھائی جاتی ہے کہ مخاطب کو اگر ہماری بات میں کوئی شبہ ہے تو ہم جس چیز کی عزت کرتے یا اسے بہت زیادہ محبوب سمجھتے ہیں اس کی عزت و محبت کو واسطہ بنا کر اپنی صداقت کا یقین دلائیں پس جب کہ خدائے برتر کی ذات سے نہ کوئی برتر ہے اور نہ وہ اپنی صداقت کی تائید کے لیے کسی محبوب سے محبوب تر شے کا محتاج تو پھر ان اقسام القرآن کا کیا مطلب ہے۔

نیز جو شخص خدائے تعالیٰ پر ایمان رکھتا ہے وہ تو خود اس کا قائل ہے کہ اس ذاتِ واحد سے زیادہ کوئی سچا نہیں ہے "وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا" اور العیاذ باللہ جو شخص خدا کو نہیں مانتا اس کے لیے یہ سب قسمیں بیکار ہیں۔ لہٰذا قرآنِ عزیز میں مذکور اقسام کے کیا معنی؟

حقیقت یہ ہے کہ قرآنِ عزیز کے ان مقامات میں واوِ قسم یا لفظِ قسم سے متعارف قسم سمجھنا اور

۱؎ تفسیر ابن کثیر ج ۴۔

جن اشیاء کو واوِ قسم یا لفظِ قسم کے بعد بیان کیا گیا ہے ان سے یہ مراد لینا کہ جس طرح عام طور پر ہم باپ یا بیٹے کی یا اپنے سے معظم و محترم یا پیاری شے کی قسم کھاتے ہیں اسی طرح خدا نے بھی قسمیں کھائی ہیں قطعاً غلط اور عربی زبان کے محاورات سے ناواقفیت کی دلیل ہے اور یہ اس لیے کہ عربی محاورات میں اُن مواقع پر بھی واوِ قسم کو استعمال کیا جاتا ہے جہاں کسی شے کو بطورِ تاکیدِ کلام کے یا بطورِ شہادت و استشہاد کے پیش کیا جاتا ہے۔ مثلاً کسی کلام میں ایسی بات کہی گئی ہے جس کے متعلق یہ خطرہ ہے کہ وہ بات جس کے لیے گفتگو شروع کی گئی ہے دل نشین ہو جائے اس صورت میں الواو للقسم، بمعنی الواوٗ للتاکید" ہو جاتی ہے اسی طرح اگر متکلم کی جانب سے کوئی ایسی بات کہی گئی ہے جس کا سمجھنا مخاطب کے لیے اس وقت تک مشکل ہے جب تک اس بات سے متعلق ایسے شواہد پیش کیے جائیں، جو اس بات کو دل نشین بنا سکیں تو ایسے موقع پر واوِ قسم کے ساتھ ایسے امور کو بیان کیا جاتا ہے جو اس مضمون کو تہِ قلب میں اتارنے کے لیے مدد دے سکیں جس کے لیے متکلم مخاطب سے کلام کر رہا ہے اور ایسے موقعۂ استعمال میں الواو للقسم کے معنی "الواو للشہادۃ" کے ہو جاتے ہیں چنانچہ جن مقامات پر واوِ قسم کو "تاکید" یا "شہادت" کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور ان مقامات میں جن چیزوں کو واوٗ یا لفظِ قسم کے بعد بیان کیا گیا ہے ان کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ متکلم کے لیے بزرگ و محترم یا محبوب ہی ہوں بلکہ دنیا و مافیہا کی جو شے بھی متکلم کے مقصد "تاکیدِ مضمون" یا "شہادت و استشہاد" کے لیے مفید اور موقع کے مناسب حال ہو اس کا بیان کیا جانا ضروری ہے۔

پس قرآنِ عزیز میں جن جن مقامات پر "واوِ قسم" یا "لفظِ قسم" سے کلام کی ابتداء کی گئی ہے ان تمام مقامات میں قسم سے متعارف معنی (حلف) مراد لینا قطعاً غلط اور باطل ہیں بلکہ عربی محاورۂ زبان کے مطابق ان میں سے اکثر مقامات میں واو بمعنی شہادت ہے اور بعض مقامات میں بمعنی تاکید ہے: مثلاً سورۂ "والتین" میں یہ بتانا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات ہست و بود میں انسان کو سب سے بہتر مخلوق بنایا ہے مگر ان انسانوں کے علاوہ جو ایمان باللہ اور عملِ صالح کے ذریعہ اپنی انسانیت کے امتیاز کو باقی رکھتے ہیں جن انسانوں نے عقل و شعور کے خصوصی امتیازات کے

قصص القرآن جلد سوم

باوجود اپنے خالق اور پروردگار سے سرکشی کی وہ ذلت ورسوائی کے اسفل سافلین میں پھینک دیے گئے۔

لیکن یہ دونوں باتیں سطحی نظر میں دل لگتی نہیں تھیں اس لیے کہ کائناتِ عالم میں انسان سے زیادہ قوی وطاقت ور اور وسیع وعریض مخلوق موجود ہیں جیسے شمس وقمر کواکب وسیارات اور ارض وسماوات نیز انسان عالم کی ہر شے کا کسی نہ کسی درجہ میں محتاج ہے اور عالم کی کوئی شے اس کی محتاج نظر نہیں آتی لہٰذا یہ کس طرح باور کیا جائے کہ ایک ضعیف البنیان اور ہر شے کی محتاج مخلوق اپنی خلقت کے اعتبار سے کل کائنات سے بہتر ہو اور اگر یہ مان بھی لیا جائے تو پھر احسنِ تقویم کے اعزاز سے معزز ہونے کے بعد اسفل سافلین میں گرا دیے جانے کے کیا معنی؟ اس ادق مضمون کو سمجھانے اور فہم وادراک کے قریب لانے کے لیے قرآن نے اول تین واقعات کو بطور شہادت کے پیش کیا اور پھر اصل مضمون کو واضح کیا اس نے کہا: "وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ" کسی شے کے "احسنِ تقویم" پر ہونے کا معیار اس کی جسمانی طاقت یا طول کی فراوانی اور احتیاج سے استغنا نہیں ہے بلکہ عقل وشعور اور اکات وجذبات کا وجود اس کے لیے صحیح معیار ہیں تاکہ وہ ان کے ذریعہ اپنے اندر ودیعت شدہ متضاد قوتوں کا توازن صحیح رکھ کر تمام کائنات سے ممتاز ومعزز نظر آئے اور یہ وصف صرف انسان ہی کے اندر تخلیق کیا گیا ہے اور دوسری اشیاءِ عالم اس لیے یکسر محروم ہیں اور ان ہی اوصاف کی بدولت وہ بدی اور گمراہی سے محفوظ رہتا اور نیکی اور ہدایت کی راہ پر گامزن ہو کر اپنے خالق کی معرفت حاصل کرتا اور ابدی وسرمدی نجات وفلاح پاتا ہے بلکہ عالم کی راہ نمائی اور کائناتِ الٰہی میں خدا کے پیغاماتِ حق کی پیغمبری کا عظیم الشان اعزاز بھی اسی کیلیے مخصوص ہے۔

تم اگر تاریخ ماضی کے اوراق کا مطالعہ کرو گے تو تم پر بآسانی اس کی صداقت ظاہر ہو جائے گی:

مثلاً شام (بیت المقدس) کا وہ مقام جہاں بکثرت انجیر وزیتون کے درخت اور باغات پائے جاتے ہیں اس بات کے لیے شہادت دے رہا ہے کہ اس جگہ خدا کا وہ سچا ہادی پیدا ہوا جس کا

نام عیسیٰ بن مریم ہے اور جس نے پاک بازی کے ساتھ دنیا کو ہدایت اور راستی کا سبق سکھایا اور اس سے قدیم تاریخ کا مطالعہ کرو تو طورِ سینا اس کا گواہ ہے کہ موسیٰ (علیہ السلام) نے اس پر خدا کے کلام کو کتنی بار سُنا اور خدا کی پیغمبری کا شرف حاصل کر کے بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نجات دلائی اور مساواتِ انسانی کا سبق سُنایا اور دور کیوں جاتے ہو اس بَلدِ امین (مکہ) سے پوچھو وہ شہادت دے گا کہ اس کی آغوش میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جیسی مقدس ہستی اور خدا کے بزرگ ترین پیغمبر نے جنم لیا اور عرب کے بے برگ وگیاہ ریگستان میں کھڑے ہو کر ساری کائنات کو حق وصداقت اور اخوت ومساوات کا سبق سُنایا اور توحیدِ الٰہی کی جانب صحیح راہ نمائی کی۔ کیا یہ تینوں مقدس ہستیاں انسان کے سوا کچھ اور تھیں اور عالم کی راہ نمائی کا جو کام انھوں نے انجام دیا کیا وہ شمس وقمر، آسمان وزمین بلکہ جن وملک انجام دے سکتے تھے؟ نہیں ہرگز نہیں، پس اگر تاریخِ ماضی کی یہ سب شہادتیں صحیح اور حق ہیں تو اب اس اقرار میں پس وپیش کیوں ہو کہ بلاشبہ انسان کو خدا نے بہترین قوام سے مخلوق کیا ہے "لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ" اور جب ایسا ہے تو پھر یہ بھی تسلیم کرنا چاہیے کہ جو انسان ان مقدس ہستیوں کے طریق کار پر کاربند نہیں ہے اور ان کی راہِ ہدایت سے منحرف ہو کر بدی اور گمراہی کو اپنی زندگی بنائے ہوئے ہے وہ یقیناً انسانیت کے معیار سے گر گیا اور وہ اسی قابل ہے کہ انجام کار انتہائی قعرِ مذلت "اسفل السافلین" میں پھینک دیا جائے "ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ"

ہاں جس نے ایمان باللہ اور عملِ صالح کو اختیار کر کے یعنی "اسلام" کو راہِ عمل بنا کر اپنی انسانیت کے شرف وامتیاز کو محفوظ رکھا اس کے لیے خدا کے پاس بے منت اجر وثواب اور نتائج وثمرات کی کامرانی ہے: "اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ"

یہ ہے مطلب قرآن کی قسموں کا جو اس ایک مثال سے ظاہر ہے لہٰذا باقی اقسام القرآن بھی اسی طرح اپنی اپنی سورت میں بیان کردہ مضمون کو دل نشین بنانے کے لیے مناسبِ حال شواہد ونظائر کا کام دیتی اور بعض مقامات پر تاکیدِ مضمون کا حق ادا کرتی ہیں۔

اس تفصیل کے بعد سورۂ بروج کی اَقسام کی تفسیر بہت سہولت کے ساتھ ذہن وفکر میں آسکتی ہے' اس سورۃ میں چند چیزوں کو واوِ قسم کے ساتھ بیان کیا گیا ہے (۱) وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ 'بُرجوں والا آسمان (۲) اَلْیَوْمِ الْمَوْعُوْدِ قیامت کا دن (۳) شَاهِدٍ- جمعہ کا دن یا ہر وہ شخص جو حاضر وموجود ہو (۴) مَشْهُوْدٍ عرفہ کا دن یا ہر وہ شخص جو اس واقعہ سے متعلق ہے اور ان کے بعد یہ کہا گیا "قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ (الآیہ)" یعنی جن باطل پرستوں نے خندقیں کھدوا کر اور اُن میں آگ دہکا کر مومنوں کو خدا پرستی کی بنا پر ایسی حالت میں آگ کے اندر دھکیل کر زندہ جلا دیا کہ خود کناروں پر بیٹھے اپنی اس انسانیت سوز حرکت کا تماشہ دیکھ رہے تھے وہ اپنی اس کمینہ حرکت پر زیادہ دن نازاں نہ رہ سکے اور انجام کے لحاظ سے ہلاکت وبربادی ظالموں کے ہی حصہ میں آئی اور دائمی سرور وکامرانی مظلوموں نے پائی۔

اس واقعہ میں دو باتیں واضح کی گئی ہیں' ایک یہ کہ دنیا کے کسی گوشہ میں ایسا المناک واقعہ پیش آیا۔ دوسری بات یہ کہ نتیجہ اور ثمرہ کے پیشِ نظر ظالم خسارہ میں رہا اور مظلوموں کو فوز وفلاح نصیب ہوئی اور جب کہ پہلی بات گذشتہ تاریخ سے تعلق رکھتی تھی اور دوسری بات بھی یا تو تاریخِ ماضی سے ہی متعلق تھی یا مستقبل سے اس کا تعلق تھا تو ضروری ہوا کہ مخاطب کو یہ دل نشین کرایا جائے کہ ایسا ضرور ہوا اور جب کبھی ایسا ہوا ہے تو اس کا انجام ظالم کے حق میں خسران ہی رہا ہے چنانچہ اظہارِ مقصد سے قبل "واوِ قسم" کے ذریعہ اس طرح کلام کی ابتدا کی گئی کہ بُرجوں والا آسمان اس بات کا شاہد ہے کہ اسی چرخِ نیلی فام کے نیچے ایک المناک واقعہ پیش آیا اور یومِ قیامت بھی گواہ ہے جس میں ہر حق وباطل کا فیصلہ ٹھیک ٹھیک ہو جانے والا ہے' کہ اس المیہ کا انجام ظالم کے حق میں بُرا رہا اور ہر وہ شخص اس کا گواہ ہے جو واقعہ کے وقت موجود تھا اور خود وہ ظالم اور مظلوم گواہ ہیں جن کا اس معاملہ سے تعلق رہا ہے کہ بلاشبہ خندق کھود کر آگ میں انسانوں کو جلانے والے ہی انجام کار ہلاک وبرباد ہوئے یا یوں کہہ لیجئے کہ وہ بُرجوں والا آسمان جو اپنی حیرت زا صنعت اور کواکب ونجوم کے ساتھ زینت پر خدائے واحد کی وحدانیت کا اقرار کر رہا ہے اور وہ قیامت کا دن

جس دن میں خدائے واحد کے سوا کسی کی قوت و طاقت باقی نہ رہے گی اور جہاں "لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ" کا اعلان ہوگا اور وہ جمعہ کا دن جس میں ہر ہفتہ کروڑوں انسان خدا کے سامنے سربسجود ہو کر اس کی وحدانیت کا اعلان کرتے ہیں اور وہ عرفہ کا دن جس میں سال بھر میں تمام خدا پرست دنیا خدائے واحد کی پرستش کا مظاہرہ کرتی ہے یہ سب اس بات کیلیے شاہد اور گواہ ہیں کہ "اصحابِ اُخدود اپنے ظلم کے نتیجہ میں ناکام رہے اور ہلاک و برباد ہوئے اور نہ صرف وہ بلکہ ہر ظالم کا انجام" جہنم" اور ابدی ذلت و رسوائی ہے اور مظلوم کے لیے دنیا و دین دونوں میں فوز و فلاح اور کامرانی ہے اور پھر اس بات کو ثابت کرنے کے لیے چند تاریخی واقعات کو بھی دہرایا گیا اور بتایا گیا کہ تم ثمود اور فرعون کے واقعات پر غور کرو اور تاریخِ ماضی میں محفوظ انکی عبرت ناک داستانوں کا مطالعہ کرو تاکہ تم کو یقین ہو جائے کہ جن حقائق کی جانب سورۂ بروج میں توجہ دلائی گئی ہے ان کا ایک ایک حرف صحیح اور صادق ہے کیا "اصحاب الاخدود" میں طاقت و قوت ثمود اور فرعون سے زیادہ تھی اور کیا جب انھوں نے خدا کے مقابلہ میں سرکشی کر کے مظلوم ایمان داروں پر ہولناک مظالم کیے اور اس کی سزا میں خدائے تعالیٰ کی سخت گرفت نے ان کو بے یار و مددگار بنا کر ہلاک و برباد کر دیا تو دنیا کی کوئی طاقت و قوت یا خود اُن کی قوت و سطوت ان کے کچھ بھی کام آئی اور ان کو تباہی سے بچا سکی؟ هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ الْجُنُودِ فِرْعَوْنَ وَثَمُودَ ۝ بَلِ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي تَكْذِيبٍ ۝ وَاللّٰهُ مِنْ وَرَائِهِمْ مُحِيطٌ ۝

(۲) "ذَاتِ الْبُرُوجِ" میں مفسرین نے برج کی تفسیر کرتے ہوئے تین معنی مراد لیے ہیں۔

(الف) بڑے بڑے نجوم و کواکب مراد ہیں (ب) بروجِ ہیئت مراد ہیں جن کی تعداد بارہ ہے اور بحساب ہیئت قدیم ہر ایک برج میں سورج پورے ایک ماہ میں دورہ کرتا اور چاند دو دن اور تہائی دن میں دورہ کرتا اور دو راتیں مستور رہتا ہے اور اس طرح یہ دونوں مہینے اور سال بناتے ہیں (ج) بروج سے وہ قلعے مراد ہیں جو آسمان پر محافظ فرشتوں کیلیے بنے ہوئے ہیں۔

ہمارے نزدیک قرآنِ عزیز میں دوسرے معنی قطعاً مراد نہیں ہیں اس لیے کہ ہیئت کا

یہ حساب ضروری نہیں کہ صحیح ہو بلکہ آج کی ترقی یافتہ ہیئت نے تو تجربہ اور مشاہدہ کی حد تک یونان کی ہیئتِ قدیم کو تقویم پارینہ بنا دیا ہے اور بطلیموس کا نظامِ فلکی فرسودہ داستان بن کر رہ گیا ہے اور پہلے اور تیسرے معانی میں پہلے معنی راجح معلوم ہوتے ہیں اور اگر یہ ثابت ہو جائے کہ بڑے بڑے کواکب و نجوم ہی محافظ ملائکۃ اللہ کا مستقر ہیں تو پہلے اور تیسرے معنی میں مطابقت ہو جائے گی۔

(۳) "وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ" کی تفسیر میں جلیل القدر صحابہ اور تابعین سے مختلف اقوال منقول ہیں (الف) شاہد سے مراد جمعہ، محمد صلی اللہ علیہ وسلم، انسان یا اللہ تعالیٰ مراد ہے۔ (ب) مشہود سے عرفہ، قیامت یا جمعہ مراد ہے مگر اکثر کا رجحان یہ ہے کہ شاھد سے جمعہ اور مشہود سے عرفہ مراد ہے اس لیے کہ جمعہ کا دن ہر ہفتہ آتا ہے اور دنیا کے ہر گوشہ سے لوگ عرفات میں حاضر ہوتے ہیں۔

ابن جریر طبری نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ایک روایت اسی طرح کی بیان کی ہے:
"قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم الیوم الموعود یوم القیمۃ وان الشاھد یوم الجمعۃ وان المشھود یوم عرفۃ۔ (الحدیث)

(۴) اصحابِ اخدود کو قیامت کے دن جو عذاب ہوگا اس کے متعلق قرآن عزیز نے عذابِ جہنم کے ساتھ "عذاب الحریق" آگ لگنے کا عذاب کا بھی ذکر کیا ہے اس سے یا تو عذابِ جہنم ہی مراد ہے اور "جزاء از جنسِ عمل" کے اصول پر اس کو عذابِ حریق بھی کہدیا گیا ہے یا جہنم میں ہی جلنے کا کوئی خاص قسم کا عذاب مراد ہے حافظ ابن کثیر کی یہی رائے ہے اور شاہ عبدالقادر نور اللہ مرقدہٗ نے یہ معنی مراد لیے ہیں کہ آخرت میں جہنم کا عذاب اور دنیا میں آگ کے اندر جلنے کا عذاب اور اس سے ان کا مقصد غالباً اس واقعہ کی جانب اشارہ کرنا ہے جس کو ہم ابن ابی حاتم کی روایت سے نقل کرائے ہیں۔

بصائر و عبر | (۱) جب انسان انفرادی اور اجتماعی زندگی میں خدا کے خوف سے بے پروا ہو جاتا ہے

اور اس کو دولت وحکومت کا نشہ کبر وغرور کی اس بلندی پر پہنچا دیتا ہے جس پر چڑھ کر اس کی نگاہ میں تمام مخلوق ہیچ اور حقیر نظر آنے لگتی ہے تو اخلاقِ حسنہ اور جذباتِ عالیہ اس سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں اور وہ اپنی ذات اور ذاتی اغراض کے علاوہ اور کچھ نہیں دیکھتا۔ تب یکایک غیرتِ حق کو حرکت ہوتی ہے اور وہ اس کو اس طرح بلندی سے کھینچ دیتی ہے کہ پستی وذلت کے تاریک غار کے علاوہ اس کے لیے اور کوئی جگہ باقی نہیں رہتی اور " اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى " کہنے والا ربِّ حقیقی کی ایسی سخت گرفت میں آجاتا ہے کہ پھر کائنات کی بھرپور طاقت اس کے کام آتی ہے نہ عالمِ ہست و بود کی دولت وحشمت اور اس کو سرنگوں ہو کر یہ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ " اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ "

(۲) انسان " انسانیت کے امتیازات وخصائص " سے بنتا ہے ورنہ حیوان سے بھی بدتر ہے اور انسانیت کا تقاضا یہ ہے کہ جب انسان کو ہر قسم کی دولت وحشمت اور سامانِ عیش میسر ہوں اور سطوت وطاقت بھی بے اندازہ نصیب ہو تو اس وقت بھی خدا اور خوفِ خدا سے ہرگز بیگانہ نہ ہو۔ ظفر مرحوم نے کیا خوب کہا ہے:

ظفر آدمی اس کو نہ جانیے گا وہ ہو کیسا ہی صاحبِ فہم وذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

" وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاۗءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْۜطَةً ۚ فَاذْكُرُوْٓا اٰلَاۗءَ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ " اور اے قومِ عاد وہ وقت یاد کرو جب تم کو قومِ نوحؑ کے بعد اُن کا جانشین بنایا اور تم کو مخلوق میں ہر طرح کی فراخی عطا کی۔ پس اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو اور زمین میں فساد کرتے نہ پھرو۔

" وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ " اور ہم نے بے شبہ تم کو زمین میں قدرت وسطوت عطا کی اور تمہارے لیے ان میں زندگی کے سامان بخشے پھر تم میں بہت کم شکر گذار ہیں۔

(۳) انسان جب خدائے تعالیٰ پر یقینِ محکم کر لیتا اور حلاوتِ ایمانی سے فیض یاب

ہو جاتا ہے تو پھر کائنات کی بڑی سے بڑی طاقت اور عالم کا ہولناک ظلم بھی اس کو حق و صداقت سے متزلزل نہیں کر سکتا اور وہ کوہِ استقامت بن کر ایثار و قربانی کا پیکر ثابت ہوتا ہے، چنانچہ "اصحاب اخدود" کا واقعہ اس کی زندہ شہادت ہے۔

(۴) "جزاء از جنسِ عمل" خدائے تعالیٰ کا قانون ناطق ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ ظالم و متکبر کو ظلم و کبر کے عالمِ وجود میں آتے ہی فوراً سزا مل جائے اس لیے کہ بہ تقاضائے صفتِ رحمت یہاں ساتھ ساتھ قانونِ امہال (مہلت دینے کا قانون) بھی کام کر رہا ہے۔ البتہ جب اچانک گرفت کر لی جاتی ہے تو پھر چھٹکارا ناممکن ہے۔



# اصحاب الفیل

## ۵۷۱ء وسنہ ولادت باسعادت (صلی اللہ علیہ وسلم) عام الفیل

جبش، حکومت، نجاشی، مذہب وتمدن، یمن وحبش کی کشمکش ابرہۃ الاشرم، القلیس، اصحاب الفیل، قرآن حکیم اور اصحاب الفیل، تفسیری مباحث، بصائر وغیرہ

**حبش** سبا کی بحث میں یہ ذکر آچکا ہے کہ حکومت سبا کی حدود مملکت جنوبی عرب سے شروع ہوکر شمال عرب اور افریقہ تک وسیع ہوگئی تھیں۔ مؤرخین کہتے ہیں کہ یمن اور افریقہ کے درمیان بحر احمر اور بحر عرب کے جو گوشے حائل ہیں ان کو بحر حبش کہا جاتا ہے اس لیے یمن کے مقابل بحر حبش عبور کرکے افریقہ کے سواحل پر جو آبادیاں ہیں اور جو دراصل سبا کی تجارتی نوآبادیاں تھیں اس قطعہ کو عرب جغرافیہ داں حبش کہتے ہیں اور یہ یورپین اقوام میں ابی سینیا، یونان میں ایتھوپیا اور خود اہل حبش میں جیز کہلاتا ہے۔ لغت عرب میں "حبش" کے معنی اختلاط و امتزاج کے آتے ہیں[1] چونکہ عرب مؤرخین کے نزدیک حمیر (سبا) اور حبشہ کے اصل باشندوں کے اختلاط سے یہ قوم عالم وجود میں آئی اس لیے انھوں نے ان کا یہ نام تجویز کیا ہے[2]

اور علماء انساب کہتے ہیں کہ جب اہل حبش (اکسوم) نے یمن پر حملہ کرکے قبضہ کرلیا تو سبا کے خاندانوں میں یہ کہہ کر سلسلۂ ازدواج قائم کیا کہ اصلاً وہ طے بن اُدد (بنی کہلان) کی اولاد ہیں اور سبا ہی کی ایک شاخ ہیں[3]

---

[1] حبش الشی، جمعہ والاحابیش، جماعۃ من الناس لیسوا من قبیلۃ واحدۃ۔ [2] دائرۃ المعارف للبستانی و وجدی و دائرۃ المعارف الاسلامیہ (حبش وسبا) [3] القصد والامم ص ۶۶ لابن عبدالبرؒ۔

اور یورپین مستشرقین کی رائے یہ ہے کہ اہلِ حبش (اکسوم) غیر مخلوط سامی الاصل نہیں ہیں بلکہ اصل باشندوں کے ساتھ مختلف اقطاعِ عرب کے مختلف قبائل مل گئے ہیں [1]

بہرحال ان اقوال کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ افریقی قبائل (بنی حام) سبائی عرب قبائل (بنی سام) کے اختلاط سے قوم حبش وجود میں آئی ہے۔

**حکومت** | اس مخلوط سبائی قوم کا دار الحکومت شہر اکسوم تھا جو ملکِ حبش کے صوبہ "تجریئے" میں بجانبِ مشرق واقع تھا۔ اس شہر کے آثار اب تک باقی ہیں اور اہلِ حبش اس کو مقدس شہر سمجھتے ہیں [2]

کہتے ہیں کہ جس زمانہ میں حمیر نے ریدان کے قلعہ میں اپنی حکومت کا پرچم بلند کیا اسی زمانہ میں حبش نے اکسوم میں حکومت کی بنیاد ڈالی جو تقریباً ۱۱۵ء ق م سے چھٹی صدی ہجری تک قائم رہی

**نجاشی** | عرب، حبشہ کے بادشاہ کو نجاشی کا لقب دیتے ہیں دراصل یہ حبشی لفظ نجوس کا معرب ہے، حبش کی زبان میں نجوس کے معنی "بادشاہ" کے ہیں۔ اصحمہ بن ابجر مشہور نجاشی حبش اُن خوش قسمت بادشاہوں میں سے ہے جنھوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کا زمانہ پایا اور اسلام کی دولت سے مشرف ہوئے ان ہی کے زمانہ میں مسلمانوں نے پہلی ہجرت حبشہ کی جانب کی نجاشی نے ان کو باعزت پناہ دی اور قریش کے اس مطالبہ کو ٹھکرا دیا کہ مسلمانوں کو ان کے حوالہ کر دیا جائے اور حضرت جعفر بن ابی طالب (رضی اللہ عنہ) کی اُس تقریر سے متاثر ہو کر جو نجاشی کے دربار میں انھوں نے صداقتِ اسلام اور حقیقتِ اسلام پر کی تھی اُس نے اسلام قبول کر لیا۔ یہی وہ نجاشی ہیں جن کے ساتھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلۂ مراسلت رہا ہے اور یہی وہ نجاشی ہیں جن کے انتقال پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غائبانہ اُن کی نمازِ جنازہ پڑھی اور صحابہ (رضی اللہ عنہم) کو بذریعہ وحی ان کے انتقال کی خبر دی۔

**مذہب و تمدن** | حبش کا مذہب اور ان کا تمدن شروع سے ہی مصر (عرب) کے مذہب و تمدن سے

---

[1] انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (سبا) ج ۲۴ ص ۶۲۸ - [2] ایضاً ایڈیشن ۹ ج ۱ ص ۶۷-۶۶ -

متاثر رہا ہے اس لیے ان کا تمدن قریب قریب عرب ہی کا تمدن ہے اور مذہبی اعتبار سے یہ خاندان شروع میں مصری اور یمنی قبائل کی طرح بُت پرست تھا لیکن جب رومی پادشاہوں کے اثر سے مصر نے عیسائیت کو قبول کرلیا تو اس کا اثر حبش پر بھی پڑا اور ۳۳۰ء میں سب سے پہلے اُذنیہ نجاشی نے عیسائیت کو قبول کیا۔

**حبش و یمن کی کشمکش**

گذشتہ صفحات میں یہ ذکر ہو چکا ہے کہ روم و ایران کی رقیبانہ و حریفانہ کشمکش نے یمن اور حبش کو بھی متاثر کیے بغیر نہ چھوڑا اور سیاسی اور تجارتی رقابت نے ان دونوں کے درمیان بھی کشمکش قائم کردی جس کے نتیجہ میں یمن اور ایران ایک جانب نظر آتے ہیں اور حبش و روم دوسری جانب، پھر عجیب اتفاق یہ ہوا کہ جس زمانہ میں حبش میں عیسائیت کا ظہور ہوا اسی کے قریب یمن میں یہودیت نے قدم جمائے، اگرچہ اس زمانہ میں عیسائیت کو کافی فروغ حاصل تھا مگر نہیں معلوم کن وجوہ کی بنا پر اہلِ عرب عیسائیت کے ساتھ مانوس نہیں تھے اس لیے یمن نے جب تبدیلِ مذہب کیا تو یہودیت کو قبول کیا اور عیسائیت کی جانب رجحان کیا مگر چوتھی صدی عیسوی میں جب اُذنیہ نجاشی حبشہ نے عیسائیت کو قبول کرلیا تو یمن اور حبش کے درمیان مذہبی منافرت کے جذبات نے سابق رقابت کو اور زیادہ مشتعل کردیا اور اسی اشتعال کے نتائج میں "اصحاب اخدود" کا سانحہ پیش آیا اور ذونواس شاہِ یمن کے اس ظلم کی دادرسی کے لیے نجران کے ایک سردار دوس بن ثعلبان نے نجاشی کے توسط سے قیصرِ روم تک فریاد پہنچائی اور قیصرِ روم نے نجاشی حبش کو حکم دیا کہ وہ یمن پر حملہ کر کے حمیریوں سے انتقام لے۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں ہے:۔

> اوائل چھٹی صدی میں حمیر (ذونواس) نے عیسائیوں کو سخت تکلیف پہنچائی، جیسٹنین اول نے شاہِ حبش کالب الاصبح کو لکھا کہ ان کی امداد کرے چنانچہ اس نے حمیر کے ہاتھ سے یمن چھین لیا۔[1]

اور ابنِ کثیر کہتے ہیں کہ دوس نے قیصرِ روم کے پاس براہِ راست فریاد کی اور قیصر نے ایک

[1] ج ۲۱ مضمون ابی سینا

حکم نامہ دے کر اس کو نجاشی کے پاس بھیج دیا۔ دوس جب قیصر کا شاہی فرمان نجاشی کے پاس لے کر پہنچا تو وہ ستر ہزار فوج کے ساتھ یمن پر حملہ آور ہوا، ذونواس بھی فوج گراں لے کر مقابلہ پر آیا، مگر شکست کھا گیا اور گھوڑے پر سوار دریا میں کود گیا کہ پار اتر کر فرار ہو جائے مگر پار نہ ہو سکا اور دریا میں غرق ہو گیا۔[1]

عرب مؤرخین کہتے ہیں کہ یمن کے فاتح کا نام ارباط تھا اور ابرہۃ الاشرم اس کے ہمرکاب تھا مگر یونانی کہتے ہیں کہ اس کا نام اسمیفوس تھا اور اس زمانہ کے نجاشی کا نام الیباس (الاصبح) تھا۔

غرض مؤرخین عرب کی روایت کے مطابق ارباط یمن کا پہلا گورنر بنایا گیا حتیٰ کہ چند سال کے بعد ابرہہ نے اس پر بغاوت کر دی اور اس کو مار ڈالا اور بلا شرکت غیرے یمن پر قابض ہو گیا۔ جب نجاشی الاصبح کو یہ خبر پہنچی تو وہ سخت غضبناک ہوا اور اس نے قسم کھائی کہ ابرہہ کو قتل کر کے اس کے دارالحکومت کو پیروں تلے روند ڈالے گا۔

ابرہہ نے یہ سنا تو بہت گھبرایا اور اپنے جسم سے کچھ خون نکال کر ایک شیشی میں بند کیا اور ایک تھیلی میں یمن کی خاک بھری اور دونوں چیزوں کو قاصد کے ہاتھ نجاشی کے پاس بھیجا اور اس کو لکھا کہ جس طرح ارباط آپ کا تابع فرمان تھا اسی طرح یہ غلام بھی ہمیشہ تابع اور مطیع رہے گا جب میں نے یہ سنا ہے کہ حضورِ والا مجھ سے خفا ہیں اس وقت سے سخت پریشان ہوں اور میں آپ کی قسم کو پورا کرنے کے لیے اپنا خون اور یمن کی خاک بھیج رہا ہوں کہ آپ اس خون کو یمن کی خاک پر ڈال کر پیروں سے روند دیجیے اور اپنی قسم پوری کر لیجیے نجاشی نے ابرہہ کی معافی کو وقت کی مصلحت کے مناسب خیال کرتے ہوئے قبول کر لیا اور یمن پر ابرہہ کی گورنری کو منظور کر لیا اور اس طرح وہ یمن پر مطمئن حکومت کرنے لگا۔[2]

**ابرہۃ الاشرم** ابرہہ کے متعلق مؤرخین کا یہ بیان ہے کہ یہ شاہی خاندان سے تھا اور چونکہ نکٹا تھا اس لیے اہلِ عرب اس کو ابرہۃ الاشرم کہتے ہیں۔ عربی میں "اشرم" نکٹے کو کہتے ہیں۔ اس کی حکومت کا آغاز بعض کے نزدیک ۵۲۵ء اور بعض کے نزدیک ۵۴۳ء سے ہوتا ہے ——

[1] تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۱۶۹ - [2] ایضاً ۱۶۔

صاحبِ ارض القرآن دوسرے قول کو ترجیح دیتے ہیں۔

ابرہہ' ابراہیم کا حبشی تلفظ ہے' یہ عیسائیت میں بہت پُرجوش تھا۔ اس نے تمام قلمرو میں عیسائی مُبلّغ مقرر کیے اور شہروں میں بڑے بڑے گرجا (کنیسا) تعمیر کرائے، ان تمام کلیساؤں میں سب سے بڑا اور مشہور کلیسا دارالحکومت صنعاء میں تیار کرایا جس کو اہلِ عرب "القلیس" کہتے ہیں جو یونانی لفظ "کلیسا" کا معرب ہے۔

القلیس | ابنِ جریر اور ابنِ کثیر بروایت محمد بن اسحٰق کہتے ہیں کہ یہ "کلیسا" بلحاظِ فنِ تعمیر عدیم النظیر تھا اور جب یہ تعمیر ہو گیا تو ابرہہ نے نجاشی کو لکھا کہ میں نے آپ کے لیے صنعاء میں ایسا بے نظیر گرجا تعمیر کرایا کہ اس سے قبل تاریخ نے ایسا گرجا کبھی نہ دیکھا ہو گا۔ اب میری تمنا یہ ہے کہ اقطاع و امصار کے عرب جو مکہ میں کعبہ کا حج کرنے کے لیے جمع ہوتے ہیں ان سب کا رُخ اس "کلیسا" کی جانب پھیر دوں اور کُل عرب کے لیے یہی مقامِ حج بن جائے۔ اہلِ عرب نے یہ سُنا تو ان میں سخت برہمی پیدا ہو گئی [۱]

سُہیلی کہتے ہیں کہ ابرہہ نے اس کی تعمیر میں یمن پر بہت سخت مظالم کیے، اہلِ یمن کو جبراً مزدور بنایا اور یمن کی بے اندازہ دولت اور بیش بہا زر و جواہر کو بے دریغ اس پر صرف کیا۔ یہ بیش قیمت پتھروں کی بہت خوبصورت اور بہت طویل و عریض عمارت تھی اور عجیب و غریب زرکار نقوش سے منقش اور جواہر ریزوں سے مُزیّن تھی اور ہاتھی دانت اور آبنوس کے نہایت حسین و جمیل منقش منبروں اور سونے چاندی کی صلیبوں سے اس کو سجایا گیا تھا۔ [۲]

اصحاب الفیل | تاریخِ عرب اس کی شاہد ہے کہ تمام اہلِ عرب خواہ وہ کسی بھی فرقہ اور کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں کعبہ کی بہت زیادہ عظمت کرنے اور اپنے اپنے عقیدہ کے مطابق اس کا حج کرنا مقدس فرض سمجھتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ خاص کعبہ کے اندر عرب کے مختلف فرقوں کے بُت تین سو ساٹھ کی تعداد میں نصب تھے۔ [۳]

---

[۱] تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۔ [۲] اس کے آثار عباسی خلیفہ اوّل سفاح کے زمانہ تک موجود تھے۔ روض الانف ج ۱ و تاریخ ابن کثیر ص ۱۷۱

[۳] بخاری و مسلم۔

حتیٰ کہ حضرتِ ابراہیمؑ حضرتِ اسمٰعیلؑ حضرتِ عیسیٰؑ حضرتِ مریم (علیہم السلام) کی تصاویر بھی موجود تھیں اور جب فتحِ مکہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فاتحانہ داخل ہوئے ہیں تو آپؐ کے ارشاد پر جس وقت حضرتِ علیؓ اور بعض دوسرے صحابہؓ نے ان بتوں کو کعبہ سے خارج کیا ہے تو اُس وقت بھی یہ تصاویر کعبہ کے اندر موجود تھیں۔ اور ایک روایت میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جب یہ ذکر آیا کہ مشرکین عرب نے حضرتِ اسمٰعیل (علیہ السلام) کی تصویر اس طرح بنائی ہے کہ ان کے ہاتھ میں "پانسے" ہیں تو آپؐ نے ارشاد فرمایا مشرکین جھوٹے ہیں اور اسمٰعیل علیہ السلام کا دامن اس بیہودہ عمل سے پاک ہے۔[1]

بہر حال جب صنعاء میں مقیم کسی حجازی نے یہ سُنا کہ ابرہہ نے "القلیس" کو اس نیت سے بنایا ہے تو اس کو غصہ آیا اور اس نے ایک شب میں موقع پاکر اس کلیسا کو نجس کر دیا۔ ابرہہ کو جب صبح کو یہ معلوم ہوا اور تحقیق کے بعد پتہ چلا کہ یہ کام کسی حجازی کا ہے تو غصہ سے بے قابو ہوگیا اور گرجا کی بے حرمتی دیکھ کر غیظ و غضب میں پیچ و تاب کھانے لگا اور قسم کھائی کہ اب کعبۂ ابراہیمی کو برباد کیے بغیر چین سے نہ بیٹھوں گا، یہ ارادہ کر کے ابرہہ لشکرِ جرار اور ہاتھیوں کی ایک تعداد ساتھ لے کر مکہ کی جانب روانہ ہوا۔ یہ خبر تمام قبائلِ عرب میں ہوا پر سوار ہو کر پہنچ گئی اور تمام عرب میں اس سے ایک ہیجان پیدا ہوگیا۔ سب سے پہلے یمن ہی کے ایک امیر ذو نفر نے یمن سے نکل کر عرب کے مختلف قبائل کے پاس قاصد بھیجے کہ میں ابرہہ کا مقابلہ کرنا چاہتا ہوں آپ کو چاہیے کہ اس نیک مقصد میں میرا ساتھ دیں چنانچہ وہ آگے بڑھ کر ابرہہ کے مقابل آیا اور اس سے جنگ کی مگر شکست کھا گیا اور ذو نفر گرفتار کر لیا گیا۔ اس کے بعد قبیلۂ بنی خثعم کے سردار نفیل بن حبیب سے مقابلہ ہوا اور اس کو بھی شکست اٹھانی پڑی اور وہ بھی گرفتار ہوگیا۔ جب ابرہہ طائف پہنچا تو بنی ثقیف کے سردار مسعود بن معتب نے آگے بڑھ کر ابرہہ کو یقین دلایا کہ مجھ کو اور میرے قبیلہ کو آپ سے کوئی پرخاش نہیں ہے اس لیے کہ ہم کو یقین ہے کہ آپ "بیت اللات" کے انہدام کا ارادہ نہیں رکھتے جس میں ہمارا سب سے معظم و محترم معبود لات نصب ہے۔ ابرہہ نے اُن کو اطمینان دلایا اور خاموشی کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ مسعود ثقفی نے راستہ

[1] بخاری، باب فتح مکہ۔

بتانے کے لیے ایک شخص ابورغال کو راہنما بنا دیا مگر ابورغال وادیِ مغمس پہنچ کر مرگیا۔ کہتے ہیں کہ عرب زمانۂ جاہلیت میں اُس کی قبر کو سنگسار کیا کرتے تھے کہ یہ کعبہ کے انہدام کے لیے راہنما بنا تھا۔

مغمس پہنچ کر ابرہہ نے ایک حبشی فوجی افسر کو جس کا نام اسود بن مقصود تھا حکم دیا کہ وہ مکہ جا کر چھاپہ مارے۔ اسود، مکہ کے قریب پہنچا تو قریش اور دوسرے قبائل کے اونٹوں اور بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کو جو کثیر تعداد میں چر رہے تھے پکڑ کر اپنے لشکر میں لے گیا۔ اُن میں عبدالمطلب کے بھی دو سو اونٹ شامل تھے۔

اس زمانہ میں عبدالمطلب قریش کے سردار تھے۔ یہ حال دیکھ کر قریش، کنانہ، ہزیل اور دیگر قبائل نے آپس میں مشورہ کیا کہ ابرہہ کا مقابلہ کس طرح کیا جائے؟ مشورہ کے بعد یہ طے پایا کہ ہم میں طاقتِ مدافعت نہیں ہے اس لیے ہم کو مکہ چھوڑ کر قریب کی پہاڑی پر چلے جانا چاہیے، ابھی یہ لوگ مکہ ہی میں تھے کہ ابرہہ کی جانب سے حناطہ الحمیری پہنچا اور دریافت کیا کہ مکہ کا سردار کون ہے؟ لوگوں نے عبدالمطلب بن ہاشم کی جانب اشارہ کیا۔ حناطہ نے کہا "میں ابرہہ کی جانب سے آیا ہوں، ہمارے بادشاہ کا یہ حکم ہے کہ آپ تک یہ پیغام پہنچا دوں کہ ہمارا ارادہ آپ لوگوں کو نقصان پہنچانے کا نہیں ہے اور نہ ہم آپ سے جنگ کرنے کے لیے آئے ہیں ہم تو صرف اس گھر (بیت اللہ) کو ڈھانے کے لیے آئے ہیں۔ پس اگر تمہارا ارادہ مقابلہ اور مدافعت کا ہو تو تم جانو اور اگر تم ہمارے اس ارادے میں حائل نہ ہو تو ہمارا بادشاہ آپ سے ملاقات کا خواہش مند ہے۔ عبدالمطلب نے جواب دیا "ہمارا قطعاً ارادہ نہیں کہ ہم تمہارے بادشاہ سے جنگ کریں اور نہ ہم میں یہ طاقت ہے۔ یہ اللہ کا گھر ہے اور اس کے برگزیدہ نبی ابراہیم کی یادگار، پس اگر اللہ اس کی حفاظت کرنا چاہے گا تو وہ کر سکتا ہے اور اگر اس کو اس کی حفاظت مقصود نہیں ہے تو ہم قوتِ مدافعت کے قابل قطعاً نہیں ہیں۔

غرض اس گفتگو کے بعد عبدالمطلب ابرہہ کے لشکر میں پہنچے اور ایک درباری کی جانب سے سفارش و تعارف پر اس کے سامنے پیش ہوئے۔ عبدالمطلب بہت شاندار اور وجیہ و شکیل

انسان تھے، ابرہہ نے دیکھا تو ان کے ساتھ عزت سے پیش آیا اور اپنے برابر اُن کو جگہ دی۔

گفتگو شروع ہوئی تو ان کی طلاقتِ لسانی اور خطابت سے ابرہہ بہت زیادہ متاثر ہوا۔ دورانِ گفتگو میں جب معاملہ پر بات چیت شروع ہوئی تو عبدالمطلب نے شکایت کی کہ آپ کے ایک سردار نے میرے اونٹ گرفتار کر لیے ہیں لہٰذا آپ سے درخواست ہے کہ ان کو میرے حوالہ کر دیجیے، ابرہہ نے یہ سُنا تو کہا "عبدالمطلب! میں تو تم کو بہت فہیم و عقیل سمجھتا تھا لیکن اس سوال پر سخت متعجب ہوں، تم کو معلوم ہے کہ میں کعبہ کو ڈھانے کے لیے آیا ہوں جو تمھاری نگاہ میں سب سے زیادہ باعظمت اور مقدس ہے لیکن تم نے اس کے متعلق ایک جملہ بھی نہیں کہا اور ایسی چھوٹی اور حقیر بات کا ذکر کر رہے ہو؟ عبدالمطلب نے جواب دیا "بادشاہ یہ اونٹ چونکہ میری ملکیت ہیں اس لیے میں نے ان کے متعلق درخواست پیش کی اور کعبہ میرا گھر نہیں، خدا کا مقدس گھر ہے، وہ آپ اُس کا محافظ ہے، میں کون ہوں جو اس کے لیے سفارش کروں؟ ابرہہ کہنے لگا اب اُس کو میرے ہاتھ سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ عبدالمطلب نے جواب دیا "آپ جانیں اور رب البیت جانیں" یہاں پہنچ کر سلسلۂ گفتگو ختم ہو گیا اور ابرہہ نے اپنے لشکریوں کو حکم دیا کہ عبدالمطلب کے اونٹ واپس کر دیے جائیں۔

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ عبدالمطلب کے ہمراہ بنی بکر کا سردار یعمر بن نفاثہ اور بنی ہذیل کا سردار خویلد بن واثلہ بھی تھے، روانگی سے قبل انھوں نے ابرہہ کے سامنے یہ پیش کش کی کہ اگر کعبہ کے انہدام سے باز آجائیں تو ہم تہامہ کا ایک تہائی مال آپ کی خدمت میں حاضر کر دیں گے مگر ابرہہ نے اپنی طاقت کے نشہ میں اس پیش کش کو ٹھکرا دیا اور اپنے ارادہ پر اڑا رہا تب یہ لوگ ناکام واپس آ گئے۔

عبدالمطلب نے واپس آکر قریش اور دوسرے قبائل عرب کو جمع کیا اور اُن کو تمام گفتگو سُنا کر یہ مشورہ دیا کہ اب ہم سب کو قریب کی کسی پہاڑی پر پناہ گزین ہو جانا چاہیے تاکہ اس منظر کو اپنی آنکھ سے نہ دیکھ سکیں۔ جب اہل مکہ پہاڑی پر جانے لگے تو عبدالمطلب کی قیادت میں کعبۃ اللہ میں حاضر ہوئے اور اس کی زنجیر پکڑ کر درگاہِ الٰہی میں یہ دعا کی:

"خدایا ہم اس بارے میں غمگین نہیں ہیں کہ جب ہم اپنی متاع کی حفاظت کرسکتے ہیں، تو اپنی متاع (کعبہ) کی تجھ کو بھی ضرور حفاظت کرنی ہے اور تیری تدبیر پر نہ صلیب کی طاقت غالب آسکتی ہے اور نہ اہلِ صلیب کی کوئی تدبیر، ہاں اگر تو ہی یہ چاہتا ہے کہ ان کو اپنے مقدس گھر کو خراب کرنے دے تو پھر ہم کون؟ جو تیرا جی چاہے سو کر۔"

مؤرخین نے عبد المطلب کے ان اشعار کو بھی نقل کیا ہے جو انھوں نے اپنے خاص اندازِ خطابت کے ساتھ فی البدیہہ درگاہِ الٰہی میں پیش کیے اور جن کا ترجمہ ہم ابھی نقل کرچکے ہیں:

لاھم ان العبد یمـ ـنع رحالہ فامنع رحالك

لا یغلبن صلیبھم و محالھم غدوا محالك

ان کنت تارکھم وقبـ ـلتنا فامر ما بدالك[1]

اس کے بعد عبد المطلب اور تمام قریش مکہ کو خالی کرکے قریب کے پہاڑوں پر چلے گئے اور گھاٹیوں میں پناہ گزین ہو کر حالات کا انتظار کرنے لگے۔

اگلے دن صبح کو ابرہہ نے اپنا لشکر مکہ کی جانب بڑھایا، اگلی قطاروں میں ہاتھی تھے اور ان کے پیچھے لشکرِ جرار، ابھی یہ لشکر مکہ تک نہیں پہنچا تھا کہ راہ میں ہی اچانک پرندوں کے غول کے غول نمودار ہوئے اور لشکر کے سر پر فضا میں چھاگئے، اُن کی چونچ اور اُن کے پنجوں میں سنگریزے تھے، پرندوں نے ان سنگریزوں کو لشکر پر پھینکنا شروع کیا، جس شخص کے سنگریزے لگتے تھے، بدن پھوڑ کر باہر نکل آتے تھے اور فوراً ہی اعضاء گلنے اور سڑنے لگتے تھے، نتیجہ یہ نکلا کہ تھوڑی دیر میں سارا لشکر زیر و زبر ہو کر رہ گیا۔

محمد بن اسحٰق کہتے ہیں کہ کچھ لوگ اسی حال میں لشکر سے فرار ہو کر یمن اور حبشہ پہنچے اور انھوں نے ابرہہ اور اس کے لشکر کی تباہی کا حال سُنایا۔

اور مشہور محدث ابن ابی حاتم بروایت عبید بن عمیر نقل کرتے ہیں کہ جب ابرہہ کا لشکر مکہ کی جانب بڑھا تو تیز ہوا چلی اور سمندر کی جانب سے پرندوں کے غول اُڑتے ہوئے لشکر پر چھاگئے۔

[1] تاریخ ابن کثیر ج ۲۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فضا میں پرندوں کا زبردست لشکر پرے کے پرے باندھے ہوئے ہے، اُن کے منھ اور اُن کے دونوں پنجوں میں سنگریزے تھے انھوں نے اوّل تو آواز کی اور پھر لشکر پر سنگریزے مارنے لگے۔ ساتھ ہی تند و تیز ہوا چلنے لگی جس نے اس سنگ باری کو لشکر کے لیے مصیبتِ عظمیٰ بنا دیا، چنانچہ جس شخص پر یہ سنگریزے گرے بدن پھوڑ کر باہر نکل آئے اور بدن گلنے اور سڑنے لگا اور اس طرح ان سنگریزوں نے سارے لشکر کو چھلنی کر ڈالا۔[۱]

محمد بن اسحاق نے بروایت عکرمہؓ نقل کیا ہے کہ اسی سال عرب میں مرضِ چیچک کا ظہور ہوا۔

**قرآن اور اصحابِ فیل**

قرآنِ عزیز نے اس واقعہ کا سورۂ الفیل میں اپنے معجزانہ اسلوبِ بیان کے ساتھ اس طرح ذکر کیا ہے گویا ذاتِ اقدس محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر خدائے تعالیٰ کا بہت بڑا احسان اور ان کے اعزاز و اکرام کا "عظیم الشان" نشان "ہے :-

---

[۱] کہتے ہیں کہ ابرہہ نے فوج کو حکم دیا کہ وہ مکہ کی جانب بڑھے جب وہ مکہ کے قریب پہنچی ہے تو ہاتھیوں کی قطار میں سے سب سے پہلے اس ہاتھی نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا جس پر ابرہہ سوار تھا۔ فیلبان اگرچہ اس کے آنکس پر آنکس لگا رہا اور زبانی ڈپٹ رہا تھا مگر وہ کسی طرح آگے بڑھنے کا نام نہیں لیتا تھا لیکن جب اس کو یمن کی جانب چلاتے تھے تو وہ تیزی کے ساتھ چلنے لگتا تھا، اس حالت میں اچانک پرندوں کے غول نے آگھیرا۔

گویا قدرت کی جانب سے ابرہہ کے لیے یہ آخری تنبیہ تھی کہ وہ اب بھی سمجھ جائے کہ اس کا یہ ارادہ باطل اور ناپاک ہے اور یہ جرأت دراصل خدا کی طاقت کو چیلنج ہے اس لیے اس کو اس سے باز آجانا چاہیے لیکن اس بدبخت نے اس کی کوئی پرواہ نہ کی اور اپنے کردار کی پاداش کو پہنچ کر رہا۔

بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ جب پرندوں کی سنگساری سے ابرہہ کا لشکر برباد ہو گیا تو اس میں سے بعض آدمی جو بدحالی کے ساتھ فرار ہو کر یمن پہنچے تھے ان میں سے خود ابرہہ بھی اس حالت میں پہنچا کہ اس کے تمام اعضاء گل سڑ کر گر چکے تھے اور وہ صرف ایک مضغۂ گوشت نظر آتا تھا۔

یعنی قدرت نے جس طرح فرعون کو غرق کر دینے کے بعد اس کی نعش کو اس لیے کنارہ پر پھینک دیا تھا کہ وہ مصر کے قبطیوں اور بنی اسرائیل دونوں کے لیے سامانِ عبرت و بصیرت بنے اسی طرح یمن اور حبش کے باشندوں کی عبرت کے لیے ابرہہ کو اس حالت میں یمن پہنچایا کہ وہ یہ غور کریں کہ جس شخص نے اپنی مادی قوت کے گھمنڈ پر خدا کی طاقت کو چیلنج کیا تھا آج قدرت کے زبردست ہاتھ نے اس کا یہ حال کر دیا" فَهَلْ أَنْتُمْ مُنْتَهُوْنَ "

| | |
|---|---|
| أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِأَصْحٰبِ | (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کیا تو نے نہیں دیکھا (تجھ کو |
| الْفِيلِ ۝ أَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ | معلوم نہیں) کہ تیرے پروردگار نے ہاتھیوں والوں |
| فِي تَضْلِيلٍ ۝ وَأَرْسَلَ عَلَيْهِمْ | کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ کیا اُن کے فریب کو ناکارہ |
| طَيْرًا أَبَابِيلَ ۝ تَرْمِيهِم بِحِجَارَةٍ | نہیں بنا دیا اور بھیج دیے اُن پر پرندوں کے جھنڈ |
| مِّن سِجِّيلٍ ۝ فَجَعَلَهُمْ | کے جھنڈ، وہ پھینک رہے تھے اُن پر سنگریزے |
| كَعَصْفٍ مَّأْكُولٍ ۝ (سورۃ الفیل پ ۳۰ ع) | پس کر دیا اُن کو کھائے بھوسہ کی طرح۔ |

اصحابِ فیل کا یہ عجیب و غریب واقعہ ماہِ محرم میں ولادتِ باسعادت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے چالیس یا پچاس روز قبل پیش آیا، اہلِ عرب میں یہ واقعہ اس درجہ اہمیت و شہرت رکھتا تھا کہ انھوں نے اِس سال کا نام عام الفیل "(ہاتھیوں والا سال) رکھ دیا اور اس کے بعد تاریخی واقعات کو اسی سنہ کے حساب سے شمار کرنے لگے جو عیسوی سنہ کے حساب سے ۵۷۰ء اور رومی سنہ کے حساب سے ۸۸۱ سکندری کے مطابق ہوتا ہے۔

روایاتِ عرب اور عرب مؤرخین میں یہ واقعہ اس درجہ مشہور و معروف تھا کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر مکہ کی زندگیِ مبارک میں سورۃ الفیل کا نزول ہوا تو مشرکین، یہود اور نصاریٰ کی اس عداوت کے باوجود جو آپ کی ذاتِ مبارک سے ان کو تھی کسی سمت سے بھی اس سورۃ میں بیان کردہ واقعہ کے خلاف کوئی صدا بلند نہیں ہوئی کہ واقعہ غلط ہے یا اس کی اصل حقیقت یہ نہیں ہے بلکہ دوسری ہے۔

یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ چونکہ یہ واقعہ صرف ذاتِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے نہیں بلکہ تمام عرب خصوصاً قریش کی عظمت و عزت بڑھاتا تھا اس لیے کسی نے اس کے خلاف آواز بلند نہیں کی، یہ بات اس لیے غلط ہے کہ جس وقت یہ سورۃ نازل ہوئی ہے اس وقت عرب میں مذہبی فرقہ بندی کے اعتبار سے عرب کے مختلف حصوں میں عموماً اور نجران کے مشہور شہر میں خصوصاً عیسائیت مشرکینِ مکہ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم دونوں کی حریف و رقیب تھی اس لیے وہ عربی نژاد ہونے کو قطعِ نظر کر سکتے تھے

مگر عیسائیت کی اس توہین کو جو اُن کے زعم میں یا قریشِ مکہ کی عزت کو بڑھاتی تھی اور یا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی عظمت کو ایک لمحہ کے لیے بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے بلکہ وہ اور یہود دونوں ایسے واقعہ کو سننا بھی گوارا نہ کرتے جو اُن کے قبلہ "صخرۂ بیت المقدس" کے علاوہ ایسے مقام "کعبہ" کی صد ہزار عظمت کا اظہار کرتا ہے جس کے قبلہ بننے کو وہ نفرت کی نگاہ سے دیکھتے اور علی الاعلان اس کو جھٹلاتے تھے۔

بہر حال تاریخ کی صاف اور بے لوث شہادت یہ ثابت کر رہی ہے کہ ایک عیسائی معاصر نے بھی اس واقعہ کے خلاف لب کشائی کی جرأت نہیں کی اور ہجرت کے بعد جب آپ کی خدمتِ اقدس میں نجران کا وفد (ڈیپوٹیشن) آیا ہے تو وہ اپنے خیال میں اسلام کے خلاف جس قسم کی نکتہ چینیاں کر سکتا تھا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کی تکذیب میں جو دلائل دے سکتا تھا وہ سب اس نے پیش کیے لیکن اِس واقعہ کے خلاف ایک حرف بھی زبان سے نہیں نکالا اور اگر ایسا ہوا ہوتا تو جس تاریخ نے ساڑھے تیرہ سو برس سے ان تمام اعتراضات کو اپنی آغوش میں محفوظ رکھا ہے جو معاندین کی جانب سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، قرآن اور اسلام پر کیے گئے ہیں وہ کیسے اس اعتراض کو فراموش کر سکتی تھی۔

لہٰذا تعصب سے پاک حقیقت بیں نگاہ کو یہ فیصلہ کرنا پڑے گا کہ یہ واقعہ اپنی تفصیلات کے ساتھ جس طرح عرب روایات اور مؤرخینِ عرب کے یہاں محفوظ اور مشہور ہے وہ قطعاً صحیح ہے اور صحیح نہ ہونے کی آخر کون سی وجہ ہے جب کہ سورۃ الفیل کے نزول کے وقت اس واقعہ کو گذرے صرف بیالیس تینتالیس سال ہی ہوئے اور اس لیے اس واقعہ کو آنکھوں سے دیکھنے والے ہزاروں اور اپنے والدین اور وطنی روایات سے سُننے والے لاکھوں کی تعداد میں تمام اقطاعِ عرب میں موجود تھے۔

لیکن صدیوں کے بعد آج یورپین مؤرخین یہ کہتے ہیں: واقعہ صرف اتنا ہے کہ ابرہہ رومیوں کی مدد کو فوج لے کر نکلا، راہ میں اس کی فوج چیچک کی وبا سے برباد ہو گئی" اور لطف یہ ہے کہ اُن کے

پاس اس دعویٰ کے لیے نہ کوئی تاریخی دلیل ہے اور نہ معاصرانہ شہادت بلکہ صرف عرب مؤرخین (محمد بن اسحٰق وغیرہ) کے اس بیان سے کہ "اسی سال عرب میں چیچک کا ظہور ہوا" یہ فیصلہ کر لیتے ہیں۔

معلوم نہیں کہ تاریخ اور فلسفۂ تاریخ کا یہ کون سا نظریہ ہے کہ ایک روایت کے تمام واقعات کا تو اپنے مخالف سمجھ کر بلا دلیل انکار کر دیا جائے اور اس واقعہ کے ایک ضمنی جملہ کے مفہوم کو بدل کر اور بغیر کسی سند کے اپنی جانب سے اس میں اضافہ کر کے ایک نیا مطلب پیدا کر لیا جائے۔

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ بقول ابن اسحٰق اسی سال عرب میں چیچک کا ظہور ہوا اور غیر اسلامی روایات کے مطابق ہم یہ بھی قبول کیے لیتے ہیں کہ اسی سال یمن اور حبش میں بھی اس مرض نے سر نکالا تاہم اس سے یہ کیسے لازم آجاتا ہے کہ (۱) ابرہہ کعبہ کے ڈھانے کے لیے لشکر لے کر نہیں نکلا تھا جیسا کہ مستند تواریخ سے ثابت ہوتا ہے بلکہ رومیوں کی مدد کو نکلا تھا جیسا کہ یورپین مؤرخین بے دلیل محض اٹکل سے کہہ رہے ہیں (۲) اور یہ کہ ابرہہ کا لشکر ربِّ کعبہ کے حکم سے چڑیوں کی سنگ باری سے تباہ نہیں ہوا جیسا کہ معاصر شہادتوں اور تواتر کے درجہ کی روایاتِ ملکی و تاریخی سے ثابت ہے بلکہ چیچک کی وبا سے برباد ہو گیا جس کے لیے تاریخ میں کوئی ثبوت موجود نہیں ہے۔

یہ بات تو ایک حقیقتِ ثابتہ ہے کہ ابرہہ القلیس کے انتقام میں کعبہ کو ڈھانے نکلا تھا پس اگر سمندر کی جانب سے آنے والی چڑیوں نے سنگریزوں کے ذریعہ سے بحکمِ ربِّ کعبہ چیچک کے ایسے سخت جراثیم پیدا کر دیے کہ انھوں نے حملہ آوروں کو سانس لینے کی بھی مہلت نہیں دی اور سنگریزوں کے لگنے کے فوراً بعد ہی بدن گلنے اور سڑنے لگا اور سارا لشکر زیر و زبر ہو کر رہ گیا تو اس کو کیا کہنا چاہیے؟ اور یہ اگر قادرِ مطلق کی جانب سے ابرہہ اور اس کے لشکر پر عذاب نہیں تھا تو اور کیا تھا فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ۔

حقیقتِ حال یہ ہے کہ یہ "فطرت پرست" "یورپین مؤرخین" یا تو اس واقعہ کو اس وجہ سے مسخ کرنا چاہتے ہیں کہ اس سے کعبۃ اللہ کی عظمت اور وقت کی خود ساختہ عیسائیت کی اہانت کا پہلو بہت صاف اور نمایاں طور پر سامنے آتا ہے اور قدرت کے ہاتھوں حق و باطل کے معرکہ میں حق

کے غلبہ اور باطل کی مغلوبیت کا اعلان ہوجاتا ہے یا محض فطرت پرستی اور مادہ پرستی کے جذبہ میں انھوں نے خدائے تعالیٰ کی غیر محدود طاقت کے مشاہدہ سے آنکھ بند کرلی ہے اور وہ ایسے واقعات کو ناممکن خیال کرلیتے ہیں حالانکہ اسی آسمان کے نیچے تاریخ اقوام و امم نے بارہا ایسے مشاہدے کیے ہیں اور تاریخ نے اُن کو اپنی آغوش میں محفوظ رکھا ہے کہ جب بھی کوئی قوم ظلم و تکبر، طغیان و عصیان اور فساد و سرکشی میں حد سے گذر گئی ہے تو اللہ تعالیٰ نے اجرام ارضی و سماوی میں سے کبھی ہوا کو کبھی برق کو، کبھی باد و باراں کو، کبھی ہولناک چیخ کو اور کبھی حیوانات کی یورش کو اس طرح ان پر مسلط کردیا ہے کہ آنکھوں دیکھتے وہ اور اُن کا زبردست تمدن سب کا سب خاک میں مل گیا، عاد و ثمود، نمرود و فرعون، اصحاب ایکہ۔ اصحابِ اُخدود جیسی قومیں اپنے اپنے زمانہ میں زبردست تمدن و حکومت کی مالک تھیں مگر جب انھوں نے خدا کی زمین میں فساد مچادیا۔ زیردستوں پر ظالمانہ قابض ہوکر ان کو کچل ڈالا۔ شرک و کفر میں بے باک ہوکر خدا کے پیغمبروں کے ساتھ بے رحمانہ سلوک کیا اور انانیت میں آکر بعض نے خدائی کا دعویٰ تک کردیا تو ان ہی عناصر اور مخلوقِ ارضی و سماوی کے ذریعہ جن کا ذکر سطورِ بالا میں ہوچکا ہے، اللہ تعالیٰ نے اُن کو اس طرح ہلاک و برباد کردیا کہ تاریخ کے اوراق کے سوا دنیا میں ان کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔

مگر انسان کی اس غفلت کو کیا کہیے کہ وہ کوتاہیِ عقل سے گذشتہ واقعات کا انکار کرنے پر بہت جلد آمادہ ہوجاتا اور نئے کرشمۂ غیبی کا طالب ہوتا ہے بلکہ بنی اسرائیل کی طرح بیجا جسارت کے ساتھ یہ کہہ اُٹھتا ہے "لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً" اور جب وہ بھی انھوں کی طرح عذاب الٰہی میں گرفتار ہوجاتا ہے تو حسرت و افسوس کرتا ہوا دوسروں کے لیے سامانِ عبرت و بصیرت بن جاتا ہے اور اس وقت کا اعتراف و اقرار اور اس وقت کی حسرت و ندامت اس کے کسی کام نہیں آتی "فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ ○ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا ۭ سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ ۚ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ ○[1] (لہ حاشیہ بر صفحۂ آئندہ نمبر ۳۵۹)

یہی حال آج یورپین مادہ پرستوں اور ان کے کورباطن مقلدوں کا ہے‘ کاش کہ وہ حقیقتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کریں اور حقائق سے انکار اور ان کا استہزا نہ کریں۔ انھیں تاریخ کے دُہراتے ہوئے اس سبق کو کبھی بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ لارڈ کچنر نے اسی زمانہ میں مصر پر جابرانہ مظالم کرتے ہوئے بڑے تکبر کے ساتھ سر بلند کرتے ہوئے یہ کہا تھا "آج میں مصر کا فرعون ہوں" پھر تم نے دیکھا کہ خدائے برتر کے قانون "پاداشِ عمل" نے اس کو وہی جواب دیا جو فرعون کو ملا تھا:

"فَغَشِيَهُمْ مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ" اور اس کی غرقِ دریا نعش کو یورپ کی سائنس جدیدکا کوئی کرشمہ بھی قعرِ دریا سے اوپر نہ لاسکا۔

یہ واقعہ صدیوں کا نہیں ہے‘ ہماری اور تمھاری زندگی کا واقعہ ہے‘ پھر کیا منکرینِ خدا اور منکرینِ قدرتِ خدا نے اس واقعہ سے کوئی سبق حاصل کیا؟ نہیں بلکہ انھوں نے یہ کہہ کر ضمیر کی آواز کو دبالیا کہ یہ توبخت و اتفاق کے واقعات میں سے ایک واقعہ ہے جو ہوگزرا، آخر انھوں نے ایسا کیوں سمجھ لیا؟ قرآن کہتا ہے صرف اس لیے کہ "لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَٰكِن تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ" یعنی یہ بات نہیں ہے کہ وہ کورچشم ہیں‘ وہ خوب دیکھتے ہیں لیکن اُن کے سینوں کے اندر اُن کے دل اندھے ہوگئے ہیں" اس لیے جو کچھ دیکھتے ہیں اس سے عبرت حاصل نہیں کرتے لہٰذا ایسی جماعت کے لیے اس کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے: "فَانتَظِرُوا إِنِّي مَعَكُم مِّنَ الْمُنتَظِرِينَ"۔

**سورۂ فیل اور بعض دیگر تفسیریں**

سطورِ بالا میں سورۂ فیل کی تفسیر سلفِ صالحین (رحمہم اللہ) اور جمہور کے مسلک کے مطابق کی گئی ہے‘ اس تفسیر سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حرمِ کعبہ کی

---

لہ سورۂ مومن "پس جب دیکھا انھوں نے عذاب ہمارا تو انھوں نے کہا ہم ایمان لائے ایک خدا پر، اور جس چیز کو خدا کا شریک ٹھیراتے تھے اس سے منکر ہوئے‘ پس ان کے اس ایمان نے ان کو کوئی نفع نہیں دیا‘ جب انھوں نے ہمارا عذاب آنکھوں سے دیکھ لیا‘ اللہ تعالیٰ کی یہی سُنت ہے جو ہمیشہ سے اس کے بندوں کے ساتھ جاری ہے اور کافروں نے اس موقع پر خسارہ ہی اُٹھایا۔

صیانت وحفاظت کے لیے ابرہۃ الاشرم اور اس کے عظیم الشان لشکر کو اپنے قانونِ تعذیبِ امم کے پیشِ نظر اس لیے معجزانہ طور پر چھوٹی چڑیوں کے ذریعہ کنکریوں کی مار سے ہلاک و برباد کر دیا کہ قریش بہ اسبابِ ظاہر اس لشکرِ جرار کے مقابلہ کی طاقت نہیں رکھتے تھے اور ربِ کعبہ کو بہرحال کعبہ کی حفاظت مقصود تھی۔

یہ تفسیر لغتِ عرب کی مطابقت، سلفِ صالحین سے منقول روایات اور تاریخی تواتر کے پیشِ نظر بغیر کسی رد و انکار کے تیرہ سو سال سے قابلِ قبول رہی ہے۔

لیکن اس تفسیر کے مطابق چونکہ اس واقعہ کا تعلق اللہ تعالیٰ کے اعجازِ قدرت اور معجزانہ فعل کے ساتھ وابستہ ہو جاتا ہے اس لیے گذشتہ پچاس ساٹھ سال کے اندر یورپ کے الحاد سے مرعوب ہو کر بعض حضرات نے سلف کے خلاف یہ سعی فرمائی ہے کہ خواہ حقیقتِ حال نظر انداز ہو جائے مگر کسی طرح اس واقعہ کا عجوبہ پن دور کر دیا جائے چنانچہ انھوں نے اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے "تفسیر بالرائے" سے کام لیا ہے۔ تفسیر بالرائے کے یہی معنی ہیں کہ اس پر نظر کیے بغیر کہ اس بارہ میں قرآن خود کیا کہتا ہے اور ایک خالی الذہن انسان اس سے کیا مطلب اخذ کرتا ہے، اپنی جانب سے پہلے ایک خاص خیال قائم کر لیا جائے اور اس کے بعد آیاتِ قرآنی کی تفسیر اپنے اس اختراعی خیال پر کر دی جائے۔

تفسیر بالرائے کے اصول پر سورۂ الفیل کی پہلی تفسیر سرسید کی جانب سے تہذیب الاخلاق میں کی گئی۔ سید صاحب چونکہ بذاتِ خود عربیت (علومِ لغتِ عرب) اور اُن علوم سے جو قرآنِ عزیز کے حقائق سمجھنے کے لیے ازبس ضروری ہیں بیگانہ تھے اس لیے ان کی یہ تفسیر سرتاسر اغلاط اور لغو تاویلات پر مبنی ہے۔ اور تفسیرِ احمدی کے ان دوسرے مقامات کی طرح جس میں انھوں نے خود قرآنِ عزیز کی دوسری آیات اور نبیٔ معصوم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول صحیح روایات کے خلاف تفسیر بالرائے بلکہ تحریفِ معنوی پر غلط اقدام کیا ہے، اس مقام پر بھی قرآن کی زبان سے وہ کہلانا چاہتے ہیں جس کو قرآن کہنے کے لیے تیار نہیں، اس کے منہ میں وہ بات رکھ دینی چاہتے ہیں جسے

خود اس کی زبان قبول نہیں کرتی۔

سر سید کی تفسیر سورۃ الفیل کی بنیاد اس امر پر قائم ہے کہ آیت "وَاَرْسَلَ عَلَیْهِمْ طَیْرًا اَبَابِیْلَ" میں "طیر" سے "پرند" نہیں بلکہ "بدفالی" مراد ہے اور کنایۃً یہ لفظ "بلا و مصیبت" کیلیے استعمال کیا گیا ہے۔

مگر سید صاحب اس بات سے قطعاً ناآشنا ہیں کہ عربی لغت میں "طیر" کے معنی "بدفالی" کے ہرگز نہیں آتے اور وہ لفظ "طائر" ہے جس کے معنی بدفالی کے آتے ہیں اور جس سے کنایۃً مصیبت و بلاء کا مفہوم مراد ہو سکتا ہے نیز وہ عربیت کے اس قاعدہ سے بھی قطعاً ناواقف معلوم ہوتے ہیں کہ اگر بفرضِ محال "طیر" کے معنی "بدفالی" کے تسلیم بھی کر لیے جائیں تب بھی اس مقام پر یہ معنی اس لیے نہیں بن سکتے کہ لغتِ عرب میں اس معنی کے ہوتے ہوئے اس کی جانب "ارسال" کی نسبت قطعاً غلط اور باطل ہے بلکہ اس کے لیے "اَرْسَلَ عَلَیْهِمْ" کی جگہ "اَنْزَلَ عَلَیْهِمْ" اور "اَلْقٰی عَلَیْهِمْ" بولا جاتا ہے۔

حقائقِ قرآن سے بے بہرہ مگر یورپ کے الحاد و زندقہ سے مرعوب یہ حضرات قرآن کی تفسیر پر جرأتِ بے جا تو کرتے ہیں مگر اس بات کو یکسر فراموش فرما دیتے ہیں کہ قرآن عربی زبان میں نازل ہوا ہے "اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا" اور تمام زبانوں کی طرح عربی الفاظ و تراکیب کے لیے بھی کچھ قواعد اور شرائط ہیں۔ پس اگر کوئی شخص ان کے خلاف اس کے الفاظ اور اس کے جملوں کے معنی اور مفہوم بیان کرتا ہے تو درحقیقت تحریفِ معنوی کا مجرم بنتا ہے بہرحال سید صاحب کی تفسیر اس قسم کی اغلاط کا مجموعہ ہے اس لیے علمی مباحث میں جگہ پانے کے لائق نہیں ہے۔

سلفِ صالحین کے خلاف سورۃ الفیل کی دوسری تفسیر مولانا حمید الدین فراہی (رحمہ اللہ) مصنف نظام القرآن کی ہے، یہ تفسیر سلف اور جمہور کی تفسیر سے قطع نظر کر کے صرف عربیت اور اشعارِ عرب کے پیشِ نظر کی گئی ہے اور یہ اگرچہ مولانائے مرحوم کی علمی دیانت، تقویٰ و طہارت اور درکِ علومِ قرآنی کے پیشِ نظر ان حضرات کی تفاسیر کی فہرست میں شامل نہیں ہے جنھوں نے

محض معجزات کے انکار کی بناء پر تفسیر بالرائے کی مجرمانہ جسارت کی ہے، تاہم واقعہ کے عجوبہ پن کو دور کرنے کے لیے مولانائے مرحوم کی یہ سعی معنوی اسقام کی حامل ہے اور اس لیے ہم مولانائے مرحوم کی خدمتِ قرآن کا احترام کرتے ہوئے اُن کے بعض دوسرے تفسیری مقامات کی طرح اس مقام سے بھی اختلاف کرنے پر مجبور ہیں۔

مولانائے مرحوم کی تفسیر کا حاصل یہ ہے کہ "ترمی" کا فاعل "طیر" نہیں ہے بلکہ "انت" ہے جو "الم تر" کا بھی فاعل ہے اور آیت "وَاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ" اس حقیقت کا اظہار کرتی ہے جو عام طور پر عربوں کا خیال تھا کہ جب کوئی جرار فوج کسی جانب کا رُخ کرتی ہے تو مُردار خوار جانوروں کا غول پرے باندھے ساتھ ہوا میں اُڑتا چلتا ہے مثلاً ابو نواس کہتا ہے "ہمارے ممدوح کی فوج کے ہمراہ پرندے ہیں کیونکہ ان کو اس کے فاتح ہونے کا یقین ہے" یا بصرہ میں جنگ جمل سے جو صورتِ حال پیش آئی اُس کا حال اسی روز اہلِ حجاز کو اس لیے معلوم ہو گیا تھا کہ مُردار خوار جانور انسانوں کے کٹے ہوئے اعضاء پنجوں میں لیے اُڑتے پھرتے تھے۔

اس تفسیر کے پیشِ نظر سورۃ الفیل کی آیات کے معنی یہ ہوں گے:

"تو نے دیکھا کہ تیرے پروردگار نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ کیا اس نے انکی تدبیر کو بیکار نہیں کر دیا؟ اس نے ان پر پرندوں کے پرے کے پرے بھیجے تو اُن ہاتھی والوں کو پتھروں سے مارتا تھا پھر خدا نے اُن کو کھائے ہوئے بھُس کی طرح کر دیا۔"

اِس تفسیر پر حسب ذیل اعتراضات وارد ہوتے ہیں:۔

(۱) اگر "ترمی" کا فاعل "انت" ہے "طیر" نہیں ہے تو "بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ" میں "سجیل" کا اضافہ بے ضرورت بلکہ بے معنی ہوا جاتا ہے۔

(۲) اس صورت میں "وَاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ" کی غرض و غایت یا اس کے فائدہ اور مقصد سے خود قرآن خاموش ہے اور اس طرح سورۃ کی آیات کے باہم ربط باقی نہیں رہتا بلکہ نظم و انسجام میں خلل واقع ہو جاتا ہے۔

(۳) شعراء عرب کے کلام میں فوج کے ساتھ پرندوں کے غول کا چلنا صرف ایک شاعرانہ تخیل ہے اس لیے قرآن کے بیان کردہ حقائق کی تفسیر کو اس خیال سے وابستہ کرنا صحیح نہیں ہے۔

(۴) واقعہ کے معاصر یا کچھ عرصہ بعد کے عرب شعراء جب کہ خود اپنے اشعار میں اقرار کرتے ہیں کہ "ترمی" کا فاعل "طیر" ہے نہ کہ "الم تر کی ضمیر انت" (قریش) تو اس سے عدول کیوں اور کس لیے؟

(۵) فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّأْكُولٍ" میں "فا" ثمرہ اور نتیجہ ہے "ترمی" کا اور "جعل" کا فاعل "رب" ہے تو معلوم ہوا کہ قریش کی سنگ باری سے ہاتھیوں والی فوجِ جرار کا کھائے ہوئے بُھس کی طرح ہو جانا تب ہی صحیح ہو سکتا ہے کہ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اعجازِ قدرت کا عمل بھی ہو، ورنہ بلحاظ اسبابِ عادیہ یہ صورت قطعاً غیر معقول ہے اور اگر اس میں اعجاز کا دخل ہے تو جس عجیب بات سے بچنے کے لیے سلف کے خلاف تفسیر کو اختیار کیا گیا تھا اسی کو تسلیم کرنا لازم آجاتا ہے۔

(۶) عرب کی جنگوں میں "محض بدویانہ سنگ اندازی" کے طریقۂ جنگ کے لیے تاریخی سند مطلوب ہے ورنہ خاص اس موقع کے لیے طریقۂ جنگ کی یہ تفسیر بے سند رہ جاتی ہے اور ناقابلِ قبول ہے۔

اِس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ بلاغت کا تقاضا ہے کہ جب کسی لفظ کے ساتھ متعلقات کا اضافہ ہو تو ضروری ہے کہ اس کا کوئی فائدہ ہونا چاہیے یعنی اس اضافہ کو کسی مقصد کے لیے لایا گیا ہو ورنہ وہ کلام بلاغت سے گر جائے گا اور اس کا اعجازِ بلاغت تک پہنچنا تو معلوم؟ کیونکہ ایسی صورت میں یہ اضافہ بے معنی اور مہمل ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ اشعار کے تنگ میدان میں بھی بے ضرورت اس کو جائز نہیں سمجھا جاتا۔

دوسرا مقدمہ یہ قابلِ توجہ ہے کہ "سجیل" لغتِ عرب میں کنکری کو کہتے ہیں یعنی اگر مٹی کو آگ میں پکایا جائے تو پکنے کے بعد اس میں پتھر کی سی سختی پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی مٹی کی چھوٹی چھوٹی ٹھیکریوں کا نام عربی میں سجیل اور فارسی میں "سنگِ گِل" ہے بلکہ بعض علماء لغت نے تو یہ تصریح کی ہے کہ

سجیل فارسی مرکب لفظ "سنگ و گل" کی ہی تعریب ہے یعنی "مٹی سے بنا ہوا پتھر" اور یہ ظاہر بات ہے کہ مکہ کی پہاڑیوں پر چھوٹے بڑے پتھر تو بہرحال کافی ملیں گے لیکن وہاں سجیل (کنکریوں) کی افراط کے کوئی معنی نہیں۔

پس اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ آیت "تَرْمِيهِم بِحِجَارَةٍ مِّن سِجِّيلٍ" میں قریش کی بدویانہ سنگ باری مراد ہے تو اس صورت میں "بحجارة" کہنا کافی تھا بلکہ "حجارة" کو سجیل کے ساتھ مخصوص کرنا حقیقتِ واقعہ کے خلاف ہو جاتا اور ایک غلط بات کا اظہار لازم آجاتا ہے۔

ممکن ہے کہ جواب میں یہ کہا جائے کہ اس مقام پر سجیل سے پتھر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے یعنی "سنگ ریزے" مراد ہیں تو یہ اس لیے صحیح نہ ہوگا کہ لغتِ عرب میں پتھر کے چھوٹے ٹکڑے کو "الحصی" کہتے ہیں اور اس کی جمع "حصاة" آتی ہے، چنانچہ متداول کتبِ لغت میں بھی بصراحت یہ فرق مذکور ہے "الحصی صغار الحجارة الواحد حصاة"۔ "سجیل الحجارة من الطین الیابس" حتیٰ کہ علماءِ لغت اس فرق کو یہاں تک نمایاں کرتے ہیں کہ جو ٹھیکریاں مٹی کے برتن سے ٹوٹ کر وجود میں آتی ہیں اگرچہ وہ سجیل کہلائی جا سکتی ہیں تاہم دقیق امتیاز کے وقت لغتِ عرب میں ایسی ٹھیکری کے لیے لفظ "خذف"[1] مخصوص ہے اور ہم کو یہ حقیقت بھی کبھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ محققین علماءِ لغت کا یہ دعویٰ ہے کہ لغتِ عرب میں ایک لفظ بھی دوسرے لفظ کا مرادف نہیں ہے اور جو لفظ بھی فصحاء و بلغاءِ عرب کے کلام میں استعمال ہوتا ہے وہ اپنی مستقل حیثیت رکھتا ہے اور جن کو ہم مرادف الفاظ سمجھتے ہیں اُن کے باہم جو نازک اور دقیق فرق ہے ان کی خصوصیات ضرور ملحوظ رہتی ہیں۔

غرض مصنف نظام القرآن کی تفسیر سورۃ الفیل کے مطابق اس مقام پر "سجیل" کا ذکر نہ صرف بے ضرورت بلکہ خلافِ واقعہ اور بے محل ہوا جاتا ہے، اور دوسرے اعتراض کا حاصل یہ ہے کہ اگر "ترمی" کا فاعل "طیر" مان لیا جائے جیسا کہ جمہور نے اختیار کیا ہے تو بغیر کسی خارجی

---

[1] مشہور و متداول کتبِ لغت کا مطالعہ کیجیے۔

مدد کے آیاتِ سورۃ اپنا اپنا مطلب صاف صاف ادا کر دیتی ہیں اور سیاق و سباق کی مطابقت اور کلام کا انسجام اور اس کی ترتیب بحالہٖ باقی رہتی ہے۔

لیکن تفسیر زیرِ بحث کے مطابق اگر "ترمی" کا فاعل "طیر" نہیں ہے بلکہ "انت" ہے تو اس صورت میں "ارسالِ طیر" کی غرض و غایت سے قرآن (سورۃ الفیل) قطعاً خاموش نظر آتا بلکہ ربطِ کلام میں خلل واقع ہو جاتا ہے اس لیے کہ آیت "اَلَمْ یَجْعَلْ کَیْدَھُمْ" اور "تَرْمِیْھِمْ" کے درمیان "وَاَرْسَلَ عَلَیْھِمْ" اپنے مقصد کے لیے قطعاً واضح نہیں ہے اور نہ سیاق و سباق میں اس کی جانب کوئی اشارہ موجود ہے بلکہ یہ کلام اجنبی ہے جو اپنی تصریح کے لیے آپ ہی ذمہ دار ہے اور بغیر تصریح کے باعثِ خللِ کلام ہے اور اگر کلام کی اس اجنبیت کو باہر کی مدد سے حل اور آیت سے پیدا شدہ قدرتی سوال پر اس کی خاموشی کو خارجی تمہید سے دور کیا جاتا ہے تو بلحاظِ بلاغتِ کلام ایسے اِبہام و اِجمال سے کہ جو خصوصی واقعہ کے سلسلہ میں اس طرح کلام میں موجود ہو کہ سیاق و سباق نہ اس کی وضاحت کرتے ہوں اور نہ اس پر دلالت کرتے ہوں، کلام میں نقص لازم آتا اور بے محل ابہام کا الزام وارد ہوتا ہے۔

تعجب ہے کہ "ارسالِ طیر" کی غرض و غایت یا حکمت کا اپنی جانب سے اختراع تو درست سمجھا جائے اور بغیر کسی سند کے یہ کہہ دیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پرندوں کو صحن حرم میں افتادہ مُردہ نعشوں سے پاک کرنے کے لیے بھیجا تھا اور بقاءِ ترتیبِ مضمونِ آیات اور حفاظتِ نقصِ کلام کی خوبیوں کے باوجود خود سورۃ میں ہی جو غایت اور حکمت بیان کی گئی ہے اور جو خارج سے مدد کی قطعاً محتاج نہیں ہے یعنی "ترمیھم" تو اس کو رد کر کے غیر معقول قرار دیا جائے اور خصوصاً ایسی حالت میں کہ مُردہ نعشوں سے صحن حرم کی پاکی کے متعلق صحیح تاریخی روایت میں یہ موجود ہے:

وذکر النقاش فی تفسیرہ ان السیل — اور نقاش نے اپنی تفسیر میں ذکر کیا ہے کہ سیلاب

احتمل جثثھم فالقاھا فی البحر [1] — آیا اور اس نے مُردہ نعشوں کو بہا کر سمندر میں جا ڈالا

اور تیسرے اعتراض کا خلاصہ یہ ہے کہ بالفرض اگر آیت "وَاَرْسَلَ عَلَیْھِمْ طَیْرًا اَبَابِیْلَ"

[1] البدایۃ والنہایۃ ...

کی تفسیر میں صاحبِ نظام القرآن کے اس استشہاد کو صحیح تسلیم کر لیا جائے جو بطورِ تمہید انھوں نے اشعارِ عرب سے کیا ہے اور آیت کی خاموشی کو ختم کرنے کے لیے اصولِ بلاغت کو نظر انداز کر دیا جائے تب بھی یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ ابو نواس یا نابغہ جیسے شعراءِ عرب کے کلام میں اگر یہ تخیل پایا بھی جاتا ہے کہ جب کوئی فوج جنگ کے لیے سفر کرتی تھی تو مُردار خوار جانور جھنڈ کے جھنڈ اس کے ساتھ چلتے تھے تو اس تخیل سے یہ کیسے لازم آیا کہ شعراء کا یہ خیال مبنی بر حقیقت ہے اور محض شاعرانہ تخیل نہیں ہے کہ قرآن کی تفسیر کے لیے استشہاد کا کام دے سکے؟ بلکہ جب ہم عرب کی لڑائیوں کے ان تفصیل حالات کا مطالعہ کرتے ہیں جو اس واقعہ کے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد مسلمانوں اور مشرکوں کے درمیان ہوئیں اور جن کے جزئی جزئی حالات اور معمولی معمولی واقعات تک کی تفصیلات کتبِ سیر و تاریخ میں محفوظ ہیں تو ان میں سے کسی ایک جنگ میں بھی اس حقیقت کا ذکر موجود نہیں ہے کہ مُردار خوار پرندوں کے یہ جھنڈ کے جھنڈ مسلم یا مشرک لشکر کی ابتداء مسافت ہی سے ساتھ ساتھ چل رہے تھے چنانچہ غزوۂ بدر، احد، حنین، احزاب کے حالات اس قسم کے واقعہ سے قطعاً خاموش ہیں بلکہ اس کے خلاف غزوۂ بدر میں اس کا ثبوت تو موجود ہے کہ زعماء قریش کی نعشیں اٹھا کر ایک گڑھے میں ڈال دی گئیں اور یہ ذکر نہیں پایا جاتا کہ مسلمانوں کے یا مشرکینِ مکہ کے لشکر کے ساتھ مُردار خوار پرند شروع ہی سے ہم سفر تھے اور انھوں نے ان مُردہ نعشوں کو فوراً ہی ٹھکانے لگا دیا اسی طرح عرب کے علاوہ دنیا کی اور جنگوں میں بھی کہیں اس واقعہ کا ثبوت نہیں ملتا پس اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ شعراءِ عرب کا یہ کلام شاعرانہ مبالغہ آمیز تخیل سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا، دراصل وہ اپنے ممدوح کی بہادری پر مبالغہ آمیزیاں کرتے ہوئے یہ مبالغہ بھی کرتے ہیں کہ انسان تو انسان مُردار خوار جانور تک اس کی بہادری کا یقین رکھتے اور اس لیے اس کے لشکر کے ہمراہ چلتے ہیں حالانکہ حقیقتِ حال صرف اتنی ہوتی تھی کہ جب اس ممدوح نے دشمن کو شکست دے دی تو شکست خوردہ لشکر کی نعشوں پر گدھ چیل وغیرہ مُردار خوار جانور نوچنے کھانے کو ڈٹ گئے، اس عام بات کو شعراء نے شاعرانہ دقیقہ سنجی کے ساتھ ادا کر دیا ہے، کیا

ابونواس کا یہی شعر جو مفسر صاحب نے بطور استشہاد پیش کیا ہے خود ہی یہ ظاہر نہیں کرتا کہ یہ محض شاعرانہ نکتہ سنجی ہے اس لیے کہ وہ کہتا ہے کہ "میرے ممدوح کے لشکر کے ہمراہ پرندے ہیں کیوں کہ اُن کو اس کے فاتح ہونے کا یقین ہے۔" تو کیا یہ بھی تسلیم کرلینا چاہیے کہ ان مُردار خوار پرندوں کی فراست و کیاست انسانی فراست سے بھی بڑھی ہوئی ہوتی تھی کہ یہ معرکہ جنگ پیش آنے سے پہلے ہی یہ بھی سمجھ جاتے تھے کہ فلاں کو فتح اور فلاں کو شکست ہوگی اور اس لیے فاتح کی فوج کے ہمراہ چلتے تھے نہ کہ مفتوح کی فوج کے ساتھ۔

اور اگر اپنی خیالی تفسیر کی خاطر یہ سب عجیب باتیں تسلیم کرلینے میں کوئی حرج نہیں ہے تو نہ معلوم سلف اور جمہور کی تفسیر ہی کو مان لینے میں کیوں اس قدر جھجک ہے۔

رہا بصرہ میں جنگِ جمل کا ہونا اور حجاز میں پرندوں کے ذریعہ اس طرح اصل کیفیت کا حال معلوم ہوجانا کہ وہ انسانوں کے اعضاء کو پنجوں میں لیے اُڑتے تھے تو اس سے یہ کیسے لازم آگیا کہ یہ مُردار خوار پرندے طرفین کے لشکر یا جو فاتح بننے والا تھا اس کے لشکر کے ساتھ ساتھ چل کر میدانِ معرکہ تک پہنچ کر درختوں اور جھاڑیوں میں خیمہ زن ہوگئے تھے کیا بصرہ میں نسر (گدھ) اور زاغ و زغن نہیں تھے اور کیا جو کچھ آج بھی ہوتا ہے وہی وہاں بھی نہیں ہوا ہوگا کہ جنگ کے نتیجہ میں جب میدان میں نعشیں پڑ گئیں تو فوراً ہی چہار جانب کی بعید مسافت سے مُردار خوار پرند آپہنچے اور کٹے ہوئے اعضاء کو پنجوں میں لے اُڑے اور فضا میں ان کے ذریعہ اہلِ حجاز کو بھی واقعہ کی اصل کیفیت کا پتہ چل گیا چنانچہ گدھ کے لیے تو ماہرینِ علم الحیوانات کا بیان یہ ہے کہ قدرت نے اس کی قوتِ شامہ کو اس قدر حساس بنایا ہے کہ وہ مُردہ نعشوں کی پھیلی ہوئی بُو یا فضا میں پھیلی ہوئی گوشت کی بُو کو بیسیوں میل کی مُسافت سے محسوس کرلیتا اور سُرعتِ رفتار کے ساتھ وہاں پہنچ جاتا ہے۔

الحاصل تفسیر زیرِ بحث میں آیت وَاَرۡسَلَ عَلَيۡهِمۡ طَيۡرًا اَبَابِيۡلَ ۙ کی تفسیر کے لیے خارج سے ان اشعار کی مدد لینا جو صرف شاعرانہ تخیل کی پیداوار ہیں اور صحیح تاریخی حقائق سے اعراض کرنا بلکہ خود قرآن کے سیاق و سباق سے ہی بغیر خارجی مدد کے واقعہ کی جو مکمل تصویر بنتی ہے اس سے

گریز کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہے۔

اس تفسیر پر چوتھے اعتراض کی تفصیل یہ ہے کہ اگر بالفرض یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ "ترمی" کا فاعل "قریش" ہیں تو آیت "فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّأْكُولٍ" میں الفاء للجزاء داخل ہو کر یہ ثابت کر رہی ہے کہ اس کا مدخول (یعنی جس جملہ پر وہ داخل ہے) آیت "تَرْمِيهِم بِحِجَارَةٍ مِّن سِجِّيلٍ" کا ثمرہ اور نتیجہ ہے جس کا مطلب زیرِ بحث تفسیر کے مطابق یہ ہوا کہ جب قریش نے سنگ باری کے ذریعہ ان پر حملہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دشمن کو کھائے ہوئے بھس کی طرح کر دیا یعنی سب وہیں کھیت رہے اور ہاتھیوں اور انسانوں سب کا کچومر نکل گیا۔

تو سوال یہ ہے کہ قریش کی بدویانہ سنگ باری سے کسی فوجِ گراں کا کہ جس میں دیو پیکر ہاتھیوں کی قطاریں بھی ہوں اس طرح بھرکس نکل جانا کہ وہ اگر فرار ہو کر جان بچانا بھی چاہیں تو نہ بچ سکیں۔ اسبابِ عادیہ کے اعتبار سے کیا معقول سمجھا جا سکتا ہے اور کیا عقل یہ نہیں کہتی کہ جب ابرہہ نے یہ دیکھ لیا تھا کہ وہ اور اس کی فوجِ گراں قریش کی سنگ باری کی تاب نہیں لا سکتے تو اس نے کیوں وہاں رہ کر ساری فوج کا بھرکس نکلوا لیا اور کیوں وہ ان ہی وادیوں میں سے ہو کر فرار نہیں ہو گیا جن وادیوں سے ہو کر آیا تھا اور یہ بھی ظاہر ہے کہ قریش کے پاس سنگ باری کے لیے مشینیں نہیں تھیں کہ وہ ابرہہ کے لشکر پر ہزاروں من کی مہیب چٹانیں اس عجلت کے ساتھ لڑھکا دیتے کہ تمام لشکری اور ہاتھی گھوڑے اور اونٹ سب کے سب وہیں دب کر رہ جاتے اور کھائے ہوئے بھس کی طرح سب کا کچومر نکل جاتا۔

اور قریش پر خدائے تعالیٰ کا احسان تو اس صورت میں بھی پورا ہو جاتا تھا کہ اس نے ایسے عظیم الشان لشکر کو بدویانہ سنگ باری سے ہزیمت خوردہ بنا کر فرار پر آمادہ کر دیا۔

البتہ یہ بات اس وقت صحیح ہو سکتی اور باور کی جا سکتی ہے کہ اس کو اسبابِ عادیہ کے عام قانون سے مستثنیٰ قرار دے کر قدرتِ الٰہی کے معجزانہ عمل کے ساتھ وابستہ سمجھا جائے اور یہ کہا جائے کہ عام طریقِ جنگ کے خلاف یہ ایک معجزہ تھا مگر اس صورت میں تفسیر زیرِ بحث کا مقصد فوت ہو جاتا ہے

حقیقتِ حال یہ ہے کہ قرآنِ عزیز کی اس سورۃ کا اسلوبِ بیان از اوّل تا آخر یہ کہہ رہا ہے کہ یہاں جو صورتِ حال پیش آئی ہے وہ اللہ تعالیٰ کے خاص نوامیسِ قدرت کے زیرِ اثر ہوئی ہے اور اسی لیے جن لوگوں نے اس واقعہ کو آنکھوں سے دیکھا یا مشاہدہ کرنے والوں کی زبانی سُنا ہے' وہ اس سے آگاہ ہیں کہ یہ معاملہ کس درجہ عجیب اور کرشمۂ قدرت کے زیرِ اثر کس درجہ حیرت زا ہو گزرا ہے اور یہ سبق ہے اور عبرت و بصیرت ہے قریش کے لیے جو اپنی طاقت کے گھمنڈ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو پیس ڈالنا چاہتے ہیں وہ سمجھیں کہ جس نے کعبہ کی حفاظت کا یہ غیبی انتظام کر دیا وہی آج قبلۂ ابراہیمی "کعبہ" کی صحیح عظمت کے داعی کی حفاظت و صیانت کا ضامن ہے۔

غرض غیر مسلح انسانوں کے ذریعہ چھوٹے چھوٹے پتھروں کی سنگ باری سے دیو پیکر ہاتھیوں اور آہن پوش لشکریوں کو فرار کا موقع نہ دے کر موقع ہی پر کھائے ہوئے بھُس کی طرح کر دینا اسی طرح عجیب ہے جیسا کہ پرندوں کی ماری ہوئی کنکریوں کا بندوق کی گولی کی طرح لگنا یا ایسے مہلک جراثیم کا حامل ہونا جن سے ایک فوجِ گراں کھائے ہوئے بھُس کی طرح ہو کر رہ جائے مگر یہ کہ تسلیم کیا جائے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ایک "معجزانہ نشان" تھا۔

اور اگر اس سے انکار نہیں ہے تو پھر کوئی وجہ وجیہ نظر نہیں آتی کہ سلف اور جمہور بلکہ بلا واسطہ خود آیاتِ قرآنی سے حاصل شدہ تفسیر سے عدول کر کے ایسی تفسیر کیوں اختیار کی جائے جو لغت اور روایات دونوں لحاظ سے اَسقام و نقائص کی حامل ہو۔

پانچویں اعتراض کا مقصد یہ ہے کہ زیرِ بحث تفسیر میں اگر شعراءِ عرب کے اشعار سے استشہاد کرنا اس مطلب کے لیے ضروری سمجھا گیا تو اس کی کیا وجہ ہے کہ اس کے لیے واقعہ سے متعلق مخصوص اشعار کو جن میں اس واقعہ کے معاصر عبدالمطلب کے اشعار بھی شامل ہیں نظر انداز کر دیا گیا بلکہ ان سے اعراض روا رکھا گیا اور شعراءِ عرب کے ایک ایسے تخیل کو بطور استشہاد تسلیم کیا گیا جس کا مبنی برحقیقت ہونا خود محلِ نظر ہے اور جس کے لیے خود آیاتِ قرآنی میں بھی کوئی قرینہ موجود نہیں ہے بلکہ ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس مقام پر موجودگیِ طیر کا معاملہ تمام حالات کی بنا پر

نہیں تھا بلکہ کرشمۂ قدرت نے خاص صورتِ حال کے ساتھ ان کو بھیجا تھا تب ہی تو "ترمیھم" سے قبل کی آیت میں "ارسل" فرما کر اللہ تعالیٰ نے ان کی آمد کو خاص طور سے اپنی جانب منسوب کیا ہے ورنہ ظاہر ہے کہ کارخانۂ عالم میں جو کچھ بھی حرکت و سکون ہے سب اسی کی قدرت کے ہاتھوں سے ہے۔ نیز "ترمی" کے بعد "فجعلھم" کہہ کر یہ ظاہر کیا جارہا ہے کہ "رمی" کا یہ نتیجہ کہ وہ "عصف ماکول" کی طرح ہو گئے ہمارا اپنا فعل تھا جس میں دوسرے کو کوئی دخل نہیں تھا ورنہ اگر پرندوں کا وجود عام حالات کی بنا پر ہوتا اور "عصف ماکول" نتیجہ ہوتا قریش کے عمل سنگ باری کا تو اسلوبِ بیان یہ نہ ہوتا بلکہ یوں کہا جاتا "اُن کے سروں پر پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ منڈلانے لگے جب کہ تو ان پر سنگ باری کر رہا تھا اور ہو گئے وہ اس سنگ باری سے کھائے ہوئے بھُس کی طرح"۔

الحاصل جب کہ عرب قبل از اسلام اور بعد از اسلام دونوں زمانوں میں شعراء عرب کے وہ اشعار موجود ہیں جن میں صاف صاف اس کا اقرار ہے کہ واقعہ کی نوعیت وہی ہے جس کو روایاتِ سلف ظاہر کرتی ہیں تو اُن سے اعراض اور شعراء کے ایک عام تخیل سے استشہاد ہرگز درست نہیں ہو سکتا۔

چنانچہ عبدالمطلب کے وہ اشعار جو اس سے قبل ذکر میں آچکے ہیں اس حقیقت کا صاف صاف اعلان کرتے ہیں کہ قریش نے ابرہہ کے لشکر کے مقابلہ میں طاقتِ مقاومت نہ دیکھتے ہوئے جنگ سے اعراض کیا اور وہ کعبہ کو ربِ کعبہ کے حوالہ کر کے پہاڑیوں پر پناہ گزیں ہو گئے اور حالات کا انتظار کرنے لگے۔ عبدالمطلب کہتے ہیں:

لاھم ان العبد یمنع رحالہ۔ فامنع رحالک

ہم اگرچہ عاجز ہونے کی وجہ سے شہر سے جا رہے ہیں لیکن یہ کوئی غم کی بات نہیں ہے ہر شخص اپنے گھر کی حفاظت کرتا ہے خدایا تو بھی اپنے گھر کی حفاظت کر۔

اور آخر میں دشمن کے مقابلہ سے اپنے عجز اور درماندگی اور بظاہر اسباب کعبہ کی حفاظت سے مایوسی کے اثرات کا ان الفاظ میں اظہار کرتے ہیں:

ان کنت تارکھم وکعبتنا فامر ما بدالک

اور اگر تیرا یہی منشاء ہے کہ وہ ہمارے کعبہ کے متعلق اپنا منشاء پورا کرلیں تو پھر جو تیرا جی چاہے وہ حکم فرما۔

عبدالمطّلب، واقعۂ اصحابِ فیل کے معاصر ہیں، سردارِ قریش ہیں اور اُن کی جانب سے جنگ وصلح کے ضامن ہیں وہ اقرار کررہے ہیں کہ قریش دشمن کے مقابلہ سے عاجز ہوکر کعبہ اور ابرہہ کے معاملہ کو سپردِ خدا کرکے نتیجہ کے منتظر ہیں مگر اس کے برخلاف زیرِ بحث تفسیر اصرار کرتی ہے کہ قریش نے ضرور ابرہہ کے لشکر سے جنگ کی اور ان کو تباہ وہلاک کردیا۔

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا

واقعہ سے متعلق یہ اشعار تمام کتبِ سیر میں بسندِ صحیح مذکور ہیں نیز عام روایات کی طرح اس واقعہ سے متعلق دو رائے تک موجود نہیں ہیں بلکہ صرف ایک ہی قول تاریخی تواتر سے منقول چلا آتا ہے مگر افسوس کہ پھر بھی وہ قابلِ توجہ نہیں سمجھا جاتا۔

علاوہ ازیں اگر فرض کر لیجیے کہ یہ اشعار عبدالمطّلب کی جانب غلط منسوب ہیں تب بھی اِن اشعار سے یہ تو بہرحال ثابت ہوتا ہے کہ جن اہلِ عرب اور اہلِ حجاز کے سامنے قرآن، واقعۂ فیل کو بیان کررہا ہے ان کے یہاں قبل از اسلام اس واقعہ سے متعلق یہی روایت مُسلّم تھی جو اِن اشعار کے ذریعہ ظاہر کی گئی ہے اور اسی کو انھوں نے اپنے بزرگوں کی زبانی سُنا یا واقعہ کا خود مشاہدہ کیا تھا اور اسی لیے عرب بعد الاسلام کے تمام شعراء بھی اپنے اشعار میں بلاخلاف اسی حقیقت کا اظہار کرتے چلے آئے ہیں۔

عبداللہ بن زبعری سہمی اس واقعہ کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

سائل امیر الحبش عنہا ما رأت      فلسوف ینبی الجاھلین علیمھا

ستون الفا لم یؤبوا ارضھم      بل لم یعش بعد الایاب سقیمھا

حبشہ کے سردار سے معلوم کرو کہ اس نے کیا کچھ دیکھا، عنقریب ناواقفوں کو اس واقعہ سے خبردار

لوگ واقف کر دیں گے۔ ساٹھ ہزار لشکریوں میں سے کسی کو وطن لوٹنا نصیب نہیں ہوا، اور اگر کوئی اِکا دُکا زخم خوردہ بھاگ نکلا تو وہ بھی خدائی مار کے زخموں سے نہ بچ سکا۔

اور عبداللہ بن قیس کہتے ہیں:۔

کادہ الاشرم الذی جاء بالفیل فولی وجیشہ مھزوم

واستھلت علیھم الطیر بالجندل حتی کانہ مرجوم

ابرہۃ الاشرم نے یہ تدبیر چلی کہ کعبہ کے گرانے کو ہاتھیوں کو لے کر آیا پس وہ بھاگا اور اس کا لشکر بھی شکست خوردہ ہو گیا جب کہ پرندوں کے لشکر اُن پر کنکریوں کی بارش کرتے ہوئے پرے کے پرے آپہونچے اور سارا لشکر سنگسار ہو کر رہ گیا۔

اور ابو قیس بن اسلت انصاری ابرہہ کے لشکر کی تباہی کے لیے خدائی مدد کا اس طرح ذکر کرتے ہیں:

فلما اتاکم نصر ذی العرش ردھم جنود الملیک بین ساف وحاصب

فولوا سراعاً ھاربین ولم یؤب الی اھلہ ملحبش غیر عصائب

پھر جب عرش والے کے پاس سے تمہارے لیے مدد آپہنچی تو ابرہہ اور اس کے لشکر کا خدائی لشکر (پرندوں کے غول) نے مُنہ پھیر دیا جب کہ وہ ٹھیکریاں اور کنکریاں برسا رہا تھا پس سارا لشکر جلد ہی شکست کھا کر بھاگا۔ اور ان میں سے چند معمولی ٹولیوں کے سوا کوئی بھی حبشہ تک نہ پہنچ سکا اور سب یہیں ہلاک و تباہ ہو کر رہ گئے۔

چھٹے اعتراض کی تفصیل یہ ہے کہ قبل از اسلام اور بعد از اسلام عرب کی مشہور حروب کی تاریخی تفصیلات اشعارِ عرب کتبِ سیرت اور مسلم وغیر مسلم تواریخ میں موجود ہیں جن میں مذہبی ملکی اور قومی ہر قسم کی جنگوں کے تذکرے پائے جاتے ہیں مگر ایک جنگ کے متعلق بھی یہ ثابت نہیں ہے کہ اہلِ عرب یا قریش نے محض بد دیانہ سنگ باری کی جنگ کی ہو بلکہ اس زمانہ کے متداول سلحہ تلوار، تیر اور تبر وغیرہ سے ہی وہ جنگ کیا کرتے تھے جس میں منجنیق (گوپھن) کا بھی استعمال ہو جایا کرتا تھا اور اگر یہ تسلیم نہیں ہے تو اشعارِ عرب اور تاریخِ عرب سے کوئی سند دکھائی جائے کہ محض سنگ باری

کی جنگ کا کون سا مشہور یا غیر مشہور واقعہ تاریخ میں مذکور ہے کیونکہ تاریخ تو آج تک یہی کہتی چلی آتی ہے کہ اہلِ عرب تلوار کے دھنی اور بات بات پر اُن کے درمیان تلوار کا نیام سے نکل آنا روزمرہ کا مشغلہ تھا۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ بدویانہ سنگ باری کا یہ طریقہ اسی خاص واقعہ میں پیش آیا اور اس کے ثبوت کے لیے یہی اوّل اور آخر مثال ہے تو پھر خود اس مخصوص واقعہ کے لیے تاریخی ثبوت چاہیے تاکہ یہ متعین ہو سکے کہ سلف اور جمہور سے منقول تفسیر غلط اور یہ جدید تفسیر ہی صحیح تفسیر ہے حالانکہ اس کے لیے کوئی تاریخی ثبوت موجود نہیں۔

پس اگر نہ خود عرب کے واقعاتِ جنگ میں اس کی مثالیں موجود ہیں اور نہ خاص اس واقعہ کے لیے کوئی تاریخی شہادت پائی جاتی ہے بلکہ اس کے برعکس حجاز کی قومی روایات، تاریخی وقائع اور سلفِ صالحین کی نقول و روایات سے باتفاق یہ ثابت ہوتا ہے کہ ابرہہ کے لشکرِ جرار کے مقابلہ میں قریش نے کوئی جنگ نہیں کی اور وہ تابِ مقاومت سے عاجز ہونے کی وجہ سے کعبہ کو ربِ کعبہ کے بھروسہ پر چھوڑ کر پہاڑی پر پناہ گزیں ہو گئے تھے تو محض عربیت کے پیشِ نظر دو احتمالات میں سے ایسے احتمال کو اختیار کرنا جو بقاعدۂ عربیت بھی اَسقام کا حامل ہے اور تاریخی شہادات اور سلف کی روایات کے بھی خلاف ہے ناقابلِ قبول ہے۔

اِس مقام پر یہ حقیقت بھی آشکارا ہو جانی چاہیے کہ کتبِ تفسیر و سیر میں چونکہ بکثرت ایسی روایات پائی جاتی ہیں جن کی نسبت سلفِ صالحین کی جانب بسندِ صحیح ثابت ہو جانے کے بعد بھی محققین علماءِ تفسیر یہ کہہ کر اس کے قبول و تسلیم کی قیمت گھٹا دیتے ہیں کہ یہ روایت اسرائیلیات میں سے ہے، یعنی گو اس کی نسبت حضرت عبد اللہ بن عباس، عبد اللہ بن عمر، عبد اللہ بن مسعود ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہم) کی جانب بلحاظِ سند روایت صحیح ہے لیکن وہ ان روایت میں سے نہیں ہے کہ جو نبیِ معصوم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و عمل یا تقریر و تثبیت سے تعلق رکھتی اور اس بناء پر سلف کا مسلک قرار دی جا سکتی ہو بلکہ حضرت عبد اللہ بن سلام، وہب بن مُنبّہ اور کعب احبار جیسے بزرگوں کی

ان حکایات واقوال سے ماخوذ ہے جو یہ حضرات متبحر علماءِ یہود میں سے ہونے کی بناء پر اسلام لانے کے بعد مسلمانوں کی مجالس میں بیان کیا کرتے تھے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس اجازت کے پیش نظر کہ مسلمانوں کو توراۃ اور اسرائیلی روایات کی نقل اس حد تک جائز ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے ارشادات کے خلاف نہ ہو، مسلمان روایات کو بطور حکایت نقل کر دینے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے اس لیے سورۂ الفیل کی تفسیر میں بھی کیا یہ امکان ہے کہ "ترمی" کا فاعل "طیر" کو مان کر سلف سے جو روایات منقول ہیں وہ بھی اسی قسم کی اسرائیلی حکایات ہوں کہ جن کے متعلق یہ کہا جاسکے کہ آیات کی یہ تفسیر سلف اور جمہور کا متفقہ مسلک نہیں ہے تو اس کا جواب نفی میں ہوگا اور یہ اس لیے کہ جس زمانہ میں یہ واقعہ پیش آیا اور جس وقت سورۂ الفیل کا نزول ہوا دونوں زمانوں میں اس واقعہ سے کعبہ کی عظمت کے مقابلہ میں عیسائیت کی سخت توہین لازم آتی ہے اور اسی بناء پر جدید یورپین مؤرخین بھی اس توہین سے تلملا کر "جو قدرت کے ہاتھوں عیسائیت کو کعبۃ اللہ کی عظمت کے مقابلہ میں پیش آئی تھی" اس واقعہ کی بے سند اور دور از کار تاویلات کرتے نظر آتے ہیں اور جب کہ یہود اور علماءِ یہود بھی اپنی روایتی حاسدانہ خو کی وجہ سے اس مرکزِ توحید کی عظمت کو برداشت نہیں کر سکتے تھے جو بوڑھے پیغمبر ابراہیم (علیہ السلام) کی اسمٰعیلی شاخ کی اسرائیلی شاخ پر برتری کا باعث بنا ہے تو بے شبہ یہ کہنا مبنی برحقیقت ہوگا کہ جس واقعہ کی اشاعت یہود و نصاریٰ کو ایک لمحہ کے لیے بھی برداشت نہیں ہو سکتی اس سے متعلق روایات کو اسرائیلیات اور اسرائیلی روایات کسی طرح نہیں کہا جا سکتا بلکہ ان روایات کی صداقت کی سب سے بڑی دلیل ہی یہ ہے کہ جس وقت سورۂ الفیل کا نزول ہوا ہے واقعہ کو گذرے ابھی پچاس سال سے زیادہ نہیں ہوئے تھے مگر پھر بھی کسی مخالف جماعت یا فرد کو اس کی تکذیب کی جرأت نہ ہو سکی اور کسی ایک شخص نے یہ تک نہ کہا کہ آیات الفیل کا دعویٰ صحیح ہو یا نہ ہو لیکن قریش میں اس کے متعلق جس قسم کی باتیں مشہور ہیں وہ سراسر غلط ہیں۔ اگر تکذیب کی گئی ہوتی تو تاریخ اس کو اپنے سینہ میں اسی طرح محفوظ رکھتی جس طرح اسلام کے مخالفوں کی ہر قسم کی ہرزہ سرائیوں اور معاندانہ واقعات واحوال کو آج محفوظ رکھا ہے۔

پس ایک منصف مزاج اور طالبِ حق انسان کا فرض ہے کہ وہ اس حقیقت کا اعتراف کرے کہ سورۃ الفیل سے متعلق واقعہ کی تفصیلات جس طرح عرب روایات اور شعرا عرب کے اشعار اور سلف سے منقول تفاسیر میں منقول ہیں وہی صحیح تفسیر ہے۔

سلف سے منقول سورۃ الفیل کی تفسیر اس لیے بھی قابلِ قبول ہے کہ اس کے مطابق وہ اسقام نہیں پیدا ہوتے جو جدید تفسیر کی صورت میں پیدا ہوتے ہیں اور یہ اس لیے کہ اگر ہم خارج کی شرح و تفصیل سے قطع نظر صرف قرآن کی آیات کے معانی ہی میں محدود رہ کر تفسیر کریں تو ربطِ آیات اور ترتیبِ مضمون اور انسجامِ سورہ، یہ سب امور بغیر کسی دقت و تاویل کے قائم رہتے اور آیات کے معنی یہ ہوتے ہیں :۔

"کیا تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے پروردگار نے ہاتھیوں والوں کے ساتھ کیا کیا۔ کیا ان کی شر آمیز تدبیر کو بیکار نہیں کر دیا اور اس نے ان پر پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ بھیج دیے جو اُن پر کنکریاں پھینک رہے تھے، پس کر دیا پروردگار نے ان کو کھائے ہوئے بھُس کی طرح"

آیات کے اِس صاف اور صحیح ترجمہ پر غور فرمائیے کہ کس طرح ایک آیت دوسری آیت کے ساتھ مربوط اور بغیر کسی اضافۂ مضمون کے خود ہی پُوری حقیقت کا اظہار کر رہی ہے البتہ قرآن میں مذکور معجزات کے سلسلۃ الذہب میں ایک کڑی کا ضرور اضافہ کرتی ہے۔

اور قرآن سے باہر عرب روایاتِ نثر و نظم اِس صاف اور واضح حقیقت کے لیے بغیر کسی اضافہ کے صرف تفصیلِ واقعہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

جمہور سلف کے خلاف سورۃ الفیل کی تفسیر ایک جدید مدعیِ تفسیر علومِ قرآن نے بھی کی ہے جدید مفسر صاحب چونکہ نبیِ معصوم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول احادیثِ صحیحہ کو بھی ادلۂ شرعیہ سے خارج سمجھتے اور انکارِ حدیث کو اپنا مسلک بنائے ہوئے ہیں اور خدمتِ مذہب کے نام سے اپنے مضامین میں اس الحاد کو خاص رنگ میں پیش کر کے انکارِ حدیث کی تبلیغ فرماتے رہتے ہیں اس لیے ظاہر ہے کہ اُن کی نگاہ میں سلف صالحین کے مسلک کی کیا پرواہ ہو سکتی تھی۔

سورۂ الفیل کی یہ تفسیر اگرچہ مصنف نظام القرآن ہی کی تفسیر سے ماخوذ ہے مگر چونکہ جدید مفسر صاحب حقیقتاً علوم عربیت اور علوم قرآن دونوں سے ناواقف ہیں اور باایں ہمہ مختلف زبانوں میں قرآن کی تفاسیر بکثرت وجود میں آنے کے باعث ارزاں شہرت حاصل کرنے کے لیے مفسر بننا چاہتے ہیں، اس لیے انھوں نے نظام القرآن میں مسطور تفسیر کے علمی پہلوؤں سے گریز کرتے ہوئے محض خطابیات کے طریقہ پر آیات کے مفہوم و معانی سے جُدا اپنی جانب سے چند ایسے اضافوں کے ساتھ اس کو پیش کیا ہے جن کو دیکھ کر صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ ایسے کلام کی تفسیر کر رہے ہیں جو اُن کے خیال میں خود اپنے اداءِ مقصد میں کوتاہ اور اپنے اسلوبِ بیان میں ناقص ہے اور محتاج ہے ایسے چند اضافوں کا جن کے ذریعہ اس کی تکمیل ہو سکے اور جو اس کے سقم اور نقص کو دور کر سکیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

جزئی تفاصیل میں جانے کے بغیر یوں سمجھو کہ اہلِ مکہ کی ایک مخالف قوت (ابرہہ) نے چاہا کہ قریش پر حملہ کیا جائے لیکن اس انداز سے کہ حملہ اچانک ہو اور قریش کو بے خبر جا پکڑا جائے چنانچہ اس کے لیے اس نے ایسا راستہ اختیار کیا کہ وہ وادیوں میں چھپتا چھپاتا مکہ تک آپہنچے اور فوج کے مہیب ہاتھی انھیں کچل ڈالیں یہ تھی اس کی خفیہ تدبیر (کید) اس تدبیر کے مخفی رکھنے کیلیے اس نے پورا پورا اہتمام کر لیا، لیکن مشیت کا منشا، اہلِ مکہ کا بچانا تھا اس لیے اس مہم میں ایک ایسی کڑی ساتھ جا لگی جس سے یہ تمام اسکیم ناکام ہو کر رہ گئی' جس زمانہ میں بارود اور دم زمین کے ساتھ آسمان کو بھی آتش زار نہیں بنایا کرتے تھے بڑے لاش خور پرندے مثل گدھ، چیل فوجوں کے ہمراہ ہو جاتے جوں ہی کوئی فوج نقل و حرکت کرتی یہ اپنی خداداد فراست سے اندازہ کر لیتے کہ اب رزق کا سامان پیدا ہونے لگا ہے، ہاتھیوں والی فوج نے اپنی نقل و حرکت کو اہلِ مکہ سے چھپائے رکھا لیکن ان پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ طیراً ابابیل کے معنی جھنڈ کے جھنڈ ہیں نہ کہ وہ "ابابیلیں" جو سرِ شام ہمارے ہاں اُڑتی پھرا کرتی ہیں' اس فوج پر منڈلاتے ہوئے ساتھ ہو لیے اور یوں زمین کی مخفی تدبیر کا راز آسمان کے پرندوں نے کھول دیا اہلِ مکہ جانتے تھے کہ اس قسم کے

پرندوں کی پرواز کا کیا مطلب ہوتا ہے اور اس دھوئیں سے نیچے کی آگ کا پتہ پا گئے اور
پہاڑوں پر چڑھ کر ایسا پتھراؤ کیا کہ فوج کا ہاتھیوں سمیت بھرکس نکل گیا۔ قرآن کریم نے
اہلِ مکہ کو اس واقعہ کی یاد دلائی ہے۔[۱]

اِس تفسیر پر جو اعتراضات وارد ہوتے ہیں ان کا تفصیلی ذکر تو مصنفِ نظامُ القرآن کی تفسیر سورۃ الفیل کے سلسلہ میں آچکا اس لیے یہ بر خود غلط مقلدانہ تفسیر قابلِ اعتناء نہیں ہے البتہ اس میں اپنی جانب سے نئے اضافات کر کے قرآن کو جو لقمے دیے گئے ہیں اُن کی خرافت کا اظہار ازبس ضروری ہے۔ مفسرِ جدید نے ان اختراعی اضافات کو اس لیے بیان کیا ہے کہ ان کی گڑھی ہوئی تفسیر کے مطابق آیات کے مفہوم و معنی میں جو سقم پیدا ہو جاتا ہے اس کو دور اور ربطِ آیات میں جو خلا واقع ہو جاتا ہے اس کو پُر کر دیا جائے۔

ایک جانب مصنف نظام القرآن کے تفسیری مطالب کا اپنی جانب انتساب اور دوسری جانب تقلیدی مضمون میں مجتہدانہ غیر علمی اضافات کی اپج ان دونوں باتوں نے مل کر جدید مفسر صاحب کی تفسیر سورۃ الفیل کو طرفہ معجون بنا دیا ہے۔

آپ ایک مرتبہ پھر نشان زدہ عبارت کا مُطالعہ فرمائیں اور ساتھ ہی سورۃ الفیل کی آیات کے سادہ معانی پر بھی توجہ دیتے جائیں تو آپ خود ہی حیرت و تعجب میں پڑ جائیں گے کہ اصحاب الفیل کے واقعہ سے متعلق یہ تمام کرایاں جو جدید مفسر صاحب نے بیان فرمائی ہیں کہاں سے حاصل ہوئیں۔

سورۃ الفیل کی آیات میں تو ان باتوں کا پتہ تک نہیں ہے پھر نہیں معلوم کہ جدید مفسر صاحب نے ان کو کہاں سے اخذ کیا جب کہ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ واقعہ سے متعلق روایات کو غلط اور تِل کے اوٹ پہاڑ" کی طرح سمجھتے ہیں اور جو کچھ کہہ رہے ہیں خود قرآن کے اندر سے کہہ رہے ہیں کیونکہ واقعہ سے متعلق روایات تو مفسر صاحب کے اضافوں کے برعکس یہ بیان کرتی ہیں :

(۱) ابرہہ اپنی فوج گراں لے کر کہ جس میں بہت سے ہاتھی بھی شامل تھے علی الاعلان یمن سے مکہ کے لیے نکلا تھا اور اسی لیے راہ میں بعض قبائلِ عرب نے مزاحمت کی اور ناکام رہے۔ (۲) ابرہہ

[۱] ایضاً

کے اس خروج کی تمام اقطاعِ عرب میں شہرت ہوگئی تھی، (۳) اس لیے ابرہہ کی تدبیرِ جنگ خفیہ نہیں بلکہ علانیہ تھی، (۴) ابرہہ نے حجاز پہنچ کر عبد المطلب سے صاف کہہ دیا تھا کہ مجھے قریش سے کوئی سروکار نہیں میں تو کعبہ کے انہدام کے لیے آیا ہوں (۵) عبد المطلب اور قریش نے تابِ مقاومت نہ رکھتے ہوئے مقابلہ نہیں کیا بلکہ پہاڑی پر چلے گئے، (۶) مشیت کا منشاء کعبہ کی حفاظت تھی نہ کہ قریش کا بچانا کیونکہ ابرہہ کعبہ ہی کو گرانے آیا تھا۔

اب جبکہ نہ قرآن ہی میں ان اضافوں کا ذکر ہے جن کو جدید مفسر صاحب نے بڑے شدومد سے بیان کیا ہے اور نہ اُن کی بیان کردہ تفصیلات کے لیے کوئی تاریخی یا حدیثی سند موجود ہے تو ایسی تفصیلات پر مبنی تفسیر بلاشبہ تفسیر بالرائے اور قطعاً غلط اور مہمل ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ مفسر صاحب کے ان تمام اضافوں کی بنیاد صرف لفظ "کید" ہے جو سورۃ الفیل کی آیت "اَلَمْ یَجْعَلْ کَیْدَھُمْ" میں مذکور ہے اور جس کے معنی انھوں نے "خفیہ تدبیر" کے کیے ہیں۔

لیکن یہ بات بھی لغو ہے اس لیے کہ اول تو فقط لفظ "کید" سے یہ داستانِ طویل کس طرح وجود میں آسکتی ہے تاوقتیکہ اس کے لیے قرآن کے اندر یا باہر سے کوئی سند موجود نہ ہو' دوسرے لغتِ عرب میں "کید" کے معنی "خفیہ تدبیر" کے لیے ہرگز مخصوص نہیں ہیں بلکہ کبھی وہ "شر آمیز تدبیر" کے مفہوم کو ادا کرتا ہے خواہ علانیہ ہو یا خفیہ اور کبھی "مطلق جنگ" کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔

الکید، الحیلہ، المکر، الخبث، الحرب اور ان سب معانی میں "شر آمیز تدبیر" کا مفہوم مشترک ہے بلکہ خود قرآن نے لفظِ کید کو مختلف مقامات پر "مطلق تدبیر" اور "طریقِ کار" کے معنی میں یا "علانیہ تدبیر" کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ سورۂ حج میں ہے :-

| | |
|---|---|
| مَنْ كَانَ يَظُنُّ | جو شخص یہ گمان کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو دنیا اور آخرت میں کوئی مددگار |
| اَنْ لَّنْ يَّنْصُرَهُ | نہیں دے گا (یعنی خدا سے ناامید ہے) تو اس کو چاہیے کہ آسمان کی |
| اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا | بلندی تک رسی کھینچ لے جائے اور جب اس کو پکڑے ہوئے معلق ہو تو |
| وَالْاٰخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ | چاہیے کہ اس کو کاٹ ڈالے پھر دیکھے کہ اس کی تدبیر اور اس کا یہ طریقِ کار |

| | |
|---|---|
| بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَآءِ ثُمَّ | کیا اس چیز کو کھو دے گا جو اس کو غصہ میں لاتی ہے (یعنی خدا سے نا امید |
| لْيَقْطَعْ فَلْيَنْظُرْ هَلْ | ہونا ایسا ہے جیسا کہ کوئی شخص کسی بلندی پر رسی باندھ کر چڑھے اور پھر |
| يُذْهِبَنَّ كَيْدُهٗ مَا يَغِيْظُ۔[1] | بیچ میں پہنچ کر اس کو کاٹ ڈالے۔ |

اس مقام پر "کید" کے معنی فقط "طریقِ کار" اور "مطلق تدبیر" کے ہیں اور خفیہ اور علانیہ دونوں شرطوں سے آزاد۔

اور سورۂ انبیاء میں حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے قصہ میں ہے :-

| | |
|---|---|
| قَالُوْا حَرِّقُوْهُ وَانْصُرُوْٓا | کافروں نے کہا تم اس (ابراہیم) کو آگ میں جلا ڈالو اور اپنے |
| اٰلِهَتَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ۝ | معبودوں (بتوں) کی مدد کرو اگر تم کرنا چاہتے ہو ہم نے کہا |
| قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا | (اللہ تعالیٰ نے کہا) اے آگ تو ابراہیم پر ٹھنڈی ہو جا اور |
| عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاَرَادُوْا بِهٖ | سلامتی کی چیز بن جا اور انھوں نے (کافروں نے) ابراہیم |
| كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ | کے ساتھ بری تدبیر کا ارادہ کیا پس ہم نے ان کو ہی خسارہ |
| (سورۂ انبیاء پ ع) | اٹھانے والوں میں کر دیا۔ |

اور سورۂ والصّٰفّٰت میں ہے :-

| | |
|---|---|
| قَالُوا ابْنُوْا لَهٗ بُنْيَانًا فَاَلْقُوْهُ | انھوں نے (مشرکوں نے) کہا بناؤ اس کے (ابراہیم کے) |
| فِي الْجَحِيْمِ۝ فَاَرَادُوْا بِهٖ | لیے ایک عمارت (یعنی آگ کی بھٹی) پھر ڈال دو اس کو |
| كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَسْفَلِيْنَ | آگ کی بھٹی میں پس انھوں نے اس کے ساتھ بُری تدبیر کا |
| (سورۂ والصفت پ ع) | ارادہ کیا سو کر دیا ہم نے ان کو ذلیل و خوار۔ |

ان ہر دو مقامات کا سیاقِ کلام یہ ہے کہ جب مشرکین ابراہیم علیہ السلام کے واضح اور روشن دلائلِ توحید کے مقابلہ میں لاجواب اور عاجز ہو گئے تو قبولِ حق کی بجائے غیظ و غضب میں آ کر انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ یہ شخص چونکہ ہمارے معبودوں (بتوں) کے حق میں گستاخ ہے اس لیے اس کو آگ کی بھٹی میں ڈال کر زندہ جلا دو؛ ابراہیم علیہ السلام اس فیصلہ کو سن رہے تھے مگر انھوں نے

[1] (الآیۃ - سورۃ الحج -)

مطلق کوئی پرواہ نہیں کی اور اپنے اعلانِ حق پر قائم رہے۔

قرآن نے مشرکین کے اس فیصلہ کو "کید" سے ہی تعبیر کیا ہے حالانکہ وہ خفیہ نہیں تھا' بلکہ علانیہ تھا۔

غرض جب کہ "کید" خفیہ تدبیر کے لیے مخصوص نہیں ہے تو جب تک وضاحتِ کلام یا واضح قرینہ اس کا متقاضی نہ ہو کہ فلاں مقام پر "کید" کے معنی "خفیہ تدبیر" کے ہونے چاہئیں اس لفظ کو اس معنی کے ساتھ مخصوص نہیں کیا جا سکتا۔

اور ظاہر ہے کہ سورۃ الفیل میں اس تخصیص کے لیے نہ کوئی وضاحت موجود ہے اور نہ کوئی واضح قرینہ حتیٰ کہ خود جدید مفسر صاحب کے بیان سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے پاس اپنی بیان کردہ خفیہ تدبیر کی داستان کے لیے لفظ "کید" کے سوا نہ قرآن کے اندر سے کوئی ثبوت موجود ہے اور نہ باہر سے اس لیے انھوں نے ابرہہ کی لشکر کشی سے متعلق داستان بیان کرتے ہوئے بے سند یہ کہنے پر اکتفا کیا ہے "یہ تھی اس کی خفیہ تدبیر "کید" اور یہ بتانے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ "کید" کی یہ تفصیل انھوں نے کہاں سے حاصل کی ہے؟

یہ سوال اس لیے اور بھی اہمیت رکھتا ہے کہ اگر بالفرض یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اس مقام پر "کید" کے معنی خفیہ تدبیر ہی کے ہیں تب بھی تو یہ ضروری نہیں ہے کہ خفیہ تدبیر کی تفصیلات وہی ہوں جو جدید تفسیر میں بیان کی گئی ہیں۔ کیوں کہ "خفیہ تدبیر" کو کسی خاص تفصیل کے اندر محدود کرنے کیلیے دلیل اور سند درکار ہے۔

نیز جب کہ سورۃ الفیل میں "اصحاب الفیل" کا ذکر ایک واقعہ کی حیثیت رکھتا ہے تو اس سلسلہ میں محض احتمالاتِ عقلی بے معنی ہیں بلکہ ازبس ضروری ہے کہ واقعہ کے بنیادی اجزا اور تفاصیل خود قرآن میں موجود ہوں اور مفسرین کے ذہنی اختراع و ایجاد کے محتاج نہ ہوں اور پھر فروعی تفاصیل بھی اگر بیان کی جائیں تو ان کے لیے بھی داخلی یا خارجی سندِ صحیح کا ہونا ضروری ہے ورنہ تو واقعہ واقعہ نہیں رہے گا بلکہ ہر شخص کی دماغی اُپج کا کھلونا بن کر رہ جائے گا۔

جدید تفسیر میں خفیہ تدبیر کی بیان کردہ تفصیلات کے متعلق ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ آیت "وَاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ" میں "ارسالِ طیر" اور "کید" دونوں مل کر اس تفصیل کو ظاہر کرتے ہیں تو یہ کہنا لغو اور بے سود ہے اس لیے کہ اس آیت میں تو صرف یہ کہا گیا ہے کہ "بھیج دیے ہم نے اُن پر پرند جُھنڈ کے جُھنڈ" اور جدید مفسر صاحب یہ فرما چکے ہیں کہ آسمانی فضا میں بارود اور بموں کے استعمال سے قبل مُردار خوار جانور لشکروں کے ساتھ ساتھ اس لیے منڈلاتے ہوئے چلتے تھے کہ ان کی فراست راہنمائی کرتی تھی کہ اب ان کی غذا کا سامان مہیا ہونے والا ہے اور شعرائے عرب کے اشعار سے مصنف نظام القرآن بھی یہ استشہاد کر چکے ہیں کہ جب دو فریق میدانِ جنگ میں نبرد آزما ہونے کے لیے اپنی جگہ سے روانہ ہوتے تھے تو ان کے سروں پر پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ اُڑتے ہوئے چلا کرتے تھے تاکہ مردہ نعشوں سے غذا حاصل کریں۔

تو تفسیرِ جدید کے مطابق ان دونوں باتوں کا حاصل زیادہ سے زیادہ یہ نکل سکتا ہے کہ آیت "وَاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ" یہ ظاہر کرتی ہے کہ عام حالاتِ جنگ کی طرح اس جگہ بھی اللہ تعالیٰ نے ابرہہ کے لشکر پر پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ بھیج دیے کہ وہ اس کی مردہ نعشوں سے غذا حاصل کریں لیکن خفیہ تدبیر کی یہ تفصیلات کہ (۱) قریش پر اس انداز سے حملہ کیا جائے کہ حملہ اچانک ہو اور قریش کو بے خبر جا پکڑا جائے (۲) چنانچہ اس نے ایسا راستہ اختیار کیا کہ وادیوں میں چھپتا چھپاتا مکہ تک آ پہنچے (۳) لیکن مشیت کا منشا چونکہ اہلِ مکہ کا بچانا تھا اس لیے اس میں ایک ایسی کڑی ساتھ جا لگی جس سے یہ تمام اسکیم ناکام ہو کر رہ گئی (وہ یہ کہ) پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ اس فوج پر منڈلاتے ہوئے ساتھ ہو گئے اور یوں زمین کی مخفی تدبیر کا راز آسمان کے پرندوں نے کھول دیا (۴) اہلِ مکہ جانتے تھے کہ اس قسم کے پرندوں کی پرواز کا کیا مطلب ہوتا ہے وہ اس دھوئیں سے نیچے کی آگ کا پتہ پا گئے" نہ آیت "اَرْسَلَ عَلَيْهِمْ" (الآیہ) سے ظاہر ہوتی ہیں اور نہ "کید" سے اور نہ دونوں کو باہم ملا کر مطلب حاصل کرنے سے ان تفصیلات کا ثبوت بہم پہنچتا ہے بلکہ یہ تک ظاہر نہیں ہوتا کہ اصحاب الفیل نے جو کید کیا تھا وہ خفیہ تدبیر کی ہی صورت میں تھا۔

یہی وجہ ہے کہ جدید تفسیر میں بایں ادعاء تردید مسلک سلفِ صالحین (رحمہم اللہ) خفیہ تدبیر کی ان تفصیلات کے لیے کوئی ثبوت بہم نہ پہنچایا جا سکا اور جو کچھ کہا گیا صرف دماغی اختراع سے کہا گیا ہے اور اگر جدید مفسر صاحب کے پاس ان کے لیے کوئی سند داخلی یا خارجی موجود ہے تو اس کے لیے صرف یہی کہا جا سکتا ہے "هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ"

تفسیر زیرِ بحث میں واقعہ سے متعلق تفصیلات کو اپنی جانب سے گڑھ کر جو شکل و صورت دی گئی ہے اس میں جدید مفسر صاحب نے جگہ جگہ اس پر زور دیا ہے کہ اصحابِ فیل کا مقصد قریش پر حملہ کرنا اور ان کو تباہ و برباد کرنا تھا اور مشیت کا منشاء ان کو بچانا تھا اسی لیے وہ سب کچھ ہوا جو سورۃ الفیل میں مذکور ہے لیکن ان تاریخی تفصیلات سے اگر قطع نظر بھی کر لی جائے جو واقعہ سے متعلق کتبِ سیر و تاریخ میں مذکور ہیں اور جو بے تکلف سورۃ الفیل کی آیات کی تفسیر یا تفصیل کرتی ہیں تب بھی بخاری و مسلم (صحیحین) کی احادیث، تفسیرِ جدید کے اس بنیادی مقدمہ کے قطعاً خلاف فیصلہ دیتی ہیں اور یہ ثابت کرتی ہیں کہ "اصحابِ فیل" کی یہ جنگ قریش کی تباہی کے لیے نہیں تھی بلکہ "کعبۃ اللہ" کی بربادی کے لیے تھی اور اس لیے مشیت کا منشاء کعبہ کی حفاظت تھا نہ کہ قریش کو بچانا۔

چنانچہ بخاری نے اپنی صحیح میں حضرتِ مسور بن مخرمہ سے حدیبیہ کے واقعہ سے متعلق جو طویل روایت نقل کی ہے اس میں ہے :-

مسلمان اگرچہ جنگ کی نیت سے نہیں بلکہ زیارتِ بیت اللہ کے مقصد سے مکہ جا رہے تھے مگر مشرکین نے یہ سمجھا کہ جنگ کا ارادہ ہے اس لیے خالد بن ولید (جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے) مقدمۃ الجیش بن کر راہ روکنے کے لیے ایک چھوٹے دستہ کے ساتھ آگے بڑھے۔ صدیقِ اکبر نے یہ دیکھا تو کہا بخدا ہمارا ارادہ کعبہ کی زیارت کے سوا اور کچھ نہیں ہے لیکن اگر مشرکینِ مکہ ہمارے اس نیک مقصد میں حائل ہوئے تو ہم بے شبہ مقابلہ کریں گے تب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ راہ بدل کر چلو تا کہ خالد کو پتہ نہ چلے کہ ہم کس طرف سے ہو کر آ رہے ہیں اور ایک لخت ان کے سر پر پہنچ جائیں، چنانچہ جب مسلمان ثنیۃ المرار (پہاڑی ٹیلہ

پر پہنچے جہاں سے اچانک خالد کے دستہ پر حملہ کیا جا سکتا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی (قصواء) بیٹھ گئی، صحابہ رضی اللہ عنہم نے ہر چند اس کو اٹھانا چاہا مگر وہ نہ اٹھی تب سب کہنے لگے قصواء بھڑک گئی اور بے قابو ہو گئی آپ نے ارشاد فرمایا قصواء نہ بھڑکی ہے اور نہ بے قابو ہوئی ہے اور نہ اس کی یہ عادت ہے بلکہ اس کو اسی خدا نے روک رکھا ہے جس نے ہاتھیوں والوں کو روک دیا تھا (فقال صلی اللہ علیہ وسلم ما خلاءت وما ذاك لها بخلق ولكن حبسها حابس الفيل) اور پھر فرمایا اس ذات کی قسم ہے جس کے قبضہ میں میری جان ہے مشرکینِ مکہ شعائر اللہ کی عظمت کے سلسلہ میں جس بات کے بھی طالب ہوں گے میں اس کو پورا کروں گا اس ارشاد کے بعد اونٹنی کو ڈپٹا اور اونٹنی فوراً کھڑی ہو گئی اور حدیبیہ کے آخری کنارہ پر جا پہنچی[1]

اس روایت میں "حبسها حابس الفيل" فرماکر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو یہ ارشاد فرمایا کہ مشرکینِ مکہ اگر شعائر اللہ کی حرمت کے سلسلہ میں کسی بات کے بھی طالب ہوں گے تو میں اس کو پورا کروں گا" تو یہ ارشادِ مبارک صاف صاف یہ ظاہر کر رہا ہے کہ "حابس الفیل" نے جس طرح پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں سے یہ عہد لینے کے لیے "قصواء" کو چلتے چلتے روک دیا کہ اگر قریش سے جنگ پیش آئی تو وہ حرم اور کعبہ کی عظمت و حرمت کو مطلق کوئی آنچ نہ آنے دیں گے اسی طرح ماضی میں خدائے تعالیٰ نے اصحابِ فیل کو اس لیے برباد کر دیا اور مکہ تک نہ پہنچنے دیا کہ وہ حرم اور کعبہ کو برباد کرنے اور اس کی توہین کرنے آئے تھے چنانچہ خالد کے آمادۂ جنگ ہونے اور صدیقِ اکبرؓ کے ارادۂ مقاومت نے جب صورتِ حال کو جنگ سے قریب کر دیا تو حرم کے قریب پہنچ کر بحکم رب العٰلمین آپ کی ناقہ بیٹھ گئی تاکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے صحابہ رضی اللہ عنہم کی موجودگی میں یہ اعلان کرایا جائے کہ مشرکینِ مکہ سے ارادۂ جنگ ہے لیکن سرزمینِ مکہ شعائر اللہ کا مرکز و محور ہے یہاں کعبۃ اللہ ہے۔ مقامِ ابراہیم ہے، سعی ہے، مسجدِ حرام ہے اور تمام سرزمینِ مکہ حرم ہے اس لیے ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ مشرکینِ مکہ (قریش) سے جنگ کے سلسلہ میں

[1] غزوۃ الحدیبیہ۔

شعائر اللہ کی حرمت و عظمت میں کوئی فرق آنے پائے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ اس حقیقتِ حال کو فراستِ وحی سے سمجھ رہے تھے اس لیے اوّل آپ نے ناقہ (قصواء) کے بیٹھ جانے کی وجہ بیان فرمائی اور اس کے بعد یہ مسطورہ بالا اعلان فرمایا اور اب جب کہ کعبۃ اللہ اور شعائر اللہ کی عظمت و حرمت کا وعدہ منجانب اللہ لے لیا گیا تو اس کے فوراً بعد ہی خدا کے حکم سے قصواء خود بخود کھڑی ہو گئی اور منزلِ مقصود کی جانب گامزن ہوئی۔

اور بخاری و مسلم (صحیحین) کی ایک روایت میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے روز جو خطبہ دیا اُس میں ارشاد فرمایا:

اللہ تعالیٰ نے مکہ کو ہاتھیوں کی یورش سے بچایا تھا اگر اس نے اپنے رسول اور مسلمانوں کو اس پر قبضہ دیدیا تو یاد رہے کہ خدا کے اس حرم کی عظمت اب بھی اسی طرح ہے جس طرح اس سے پہلے تھی جو موجود ہیں ان کو چاہیے کہ غائب تک اس خبر کو پہنچائیں۔

اس روایت میں بھی سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف الفاظ میں یہ ظاہر فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مکہ کو ہاتھیوں کی یورش سے قریش کی خاطر نہیں بلکہ کعبۃ اللہ اور حرم کی عظمت و حرمت کی خاطر بچایا تھا اور پھر مسلمانوں کو اس غلط فہمی سے بچانے کے لیے کہ کہیں وہ فتح مکہ کے زعم میں یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ مکہ میں جنگ کی اجازت نے حرم کی عظمت آج کچھ کم کر دی ہے یہ خطبہ ارشاد فرما کر حقیقتِ حال کو واضح فرمایا اور تاکید فرمائی کہ جو لوگ اس وقت موجود نہیں ہیں موجود حضرات اس بات کو ان تک پہنچا دیں بلکہ امتِ مسلمہ کو ہمیشہ پہنچاتے رہیں۔

قریش کی بقاء اور ان کی حفاظت اور حرم و کعبہ کی بقاء اور اُن کی حفاظت یہ دو جُدا جُدا حقائق ہیں اور خدائے تعالیٰ نے دوسری حقیقت کی حفاظت کو اپنے ذمہ لیا ہے نہ کہ پہلی کو اس کے متعلق فتح مکہ کے وقت بعض صحابہؓ کو یہ غلط فہمی ہو گئی تھی کہ اس خاص وقت میں اللہ تعالیٰ نے شاید نبی معصوم صلی اللہ علیہ وسلم کی کامیابی کی خاطر حرم کی عظمت و حرمت کو بھی نظر انداز کر دینے کی اجازت دیدی ہے۔ یہی غلط فہمی حضرتِ سعد رضی اللہ عنہ کو پیش آئی اور جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو

اس کی خبر ہوئی تو آپ نے بہت سختی کے ساتھ ان کے اس خیال کی تردید فرمائی اور صرف یہی نہیں کیا بلکہ ان کو ان کے لشکر کی سرداری سے بھی معزول کر دیا۔ چنانچہ بخاری نے فتح مکہ سے متعلق حضرت عروہ کی طویل روایت میں اس طرح اس واقعہ کو نقل کیا ہے:

جب حضرت سعد رضی اللہ عنہ پرچم لہراتے ابوسفیان کے پاس سے گذرے تو کہنے لگے ابوسفیان! الیوم یوم الملحمہ الیوم تستحل الکعبۃ" (آج کا دن لڑائی کا دن ہے آج کعبہ کی حرمت کو بھی گزند پہنچ جائے گا) یہ سن کر ابوسفیان نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی کہ سعد یہ کہہ رہے ہیں آپ نے سن کر فوراً فرمایا: کذب سعد ولکن ھذا الیوم یعظم اللہ فیہ الکعبۃ ویوم تکسی فیہ الکعبۃ" (سعد نے جو کہا جھوٹ کہا، آج کا دن وہ ہے جس میں کعبہ کی عظمت کو اللہ تعالیٰ زیادہ بلند کرے گا' آج کا دن وہ ہے کہ کعبہ کی حرمت کے لیے اس پر غلاف چڑھایا جائے گا اور بعض روایات میں اس کے ہم معنی یہ الفاظ ہیں "الیوم یوم المرحمۃ الیوم تکسی الکعبۃ"

اس روایت میں اگرچہ "اصحاب فیل" کا کوئی حوالہ نہیں ہے مگر فتح مکہ کے دوران میں اس واقعہ کے پیش نظر آجانے سے یہ حقیقت بہرحال اور زیادہ روشن ہوگئی کہ جنگ و صلح ہر دو حالات میں اللہ تعالیٰ کو ہمیشہ قریش کی حفاظت نہیں بلکہ کعبہ اور حرم کی حفاظت مقصود رہی ہے۔

فتح مکہ میں آخر قریشِ مکہ پر بھی ان کی بدعہدی کی وجہ سے چڑھائی ہوئی اور اگرچہ قریش کے فرار سے جنگ کی صورت پیدا نہیں ہوئی تاہم جن قریشیوں نے تھوڑی بہت مزاحمت کی وہ قتل بھی ہوئے مگر حابس الفیل نے ان کی کوئی مدد نہیں کی بلکہ مسلمانوں کو ہی کامیاب کر دیا، کیوں؟ صرف اس لیے کہ مسلمانوں کا اعلانِ جنگ قریش کے لیے تھا اور وہ اس طرح کعبہ اور حرم کی حقیقی عظمت و حرمت کو واپس لانا چاہتے تھے اور اصحاب الفیل کو تباہی اور بربادی سے اس لیے واسطہ پڑا کہ اہل کتاب ہونے کے باوجود وہ مشرکینِ مکہ (قریش) کے خلاف نبرد آزما نہیں ہوئے تھے بلکہ مرکزِ توحید کعبۃ اللہ کو برباد کرنے کے ارادہ سے آئے تھے۔

ہم نے جدید مفسر صاحب کی مفروضہ داستان کے خلاف نبی معصوم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح احادیث سے اگرچہ مسکت اور فیصلہ کُن شواہد پیش کر دیے ہیں مگر ہم یہ بھی خوب جانتے ہیں کہ ان کی نگاہ میں اپنی من گھڑت داستان کے سامنے احادیث کی یہ شہادات اسی طرح قابلِ مضحکہ اور لائقِ تمسخر ہیں جس طرح وہ اپنے مزعومہ اسلامی رسالہ میں بخاری اور مسلم کی بعض دوسری احادیث کا مذاق اڑا چکے اور ان کو ناقابلِ اعتماد قرار دے چکے ہیں۔ والی اللہ المشتکیٰ۔

الحاصل جس طرح موثق دلائل وشواہد کی روشنی میں تفسیرِ جدید کا یہ بنیادی مقدمہ یا اختراعی تفاصیل کا یہ اہم حصّہ بے بنیاد اور باطل ہے اسی طرح باقی حصص کو بھی بمصداق : ع

" قیاس کن زگلستانِ من بہارِ مرا " سمجھ لیجیے کہ ان کی حقیقت کیا ہے کہ ان کے لیے نہ قرآن کے اندر کوئی سند موجود ہے اور نہ باہر تاریخ واحادیث سے کوئی ان کو تائید حاصل ہے۔

مگر تفسیر بالرائے پر جدید مفسر صاحب کی یہ جسارت کس درجہ حیرت زا ہے کہ وہ اپنی خودساختہ تفسیر کے مقابلہ میں سلف سے منقول تفسیر پر جو کہ احادیثِ صحیحہ، عرب روایات اور تاریخی تواتر سے ہے " تل کے اوٹ پہاڑ " کی پھبتی کسنے سے بھی نہیں چوکتے (اناللہ وانا الیہ راجعون)

اگر مفسر صاحب نے باقی تفسیرِ قرآن میں بھی یہی گل کاریاں کی ہیں اور اسلامی خدمت کے لیے اسی پیمانہ کو معیار بنایا ہے تو ہم اس خدمتِ دین کے لیے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہہ سکتے ؎

گر ہمیں مکتب است و ہم مُلّا     کارِ طفلاں تمام خواہد شد

**چند تشریحی مطالب**

(۱) آیت " وَاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ " میں ابابیل پرندوں کی جماعت کو کہتے ہیں اور اس کے مفہوم میں " جماعت اور تتابع " دونوں ایک ساتھ داخل ہیں یعنی وہ پرند مراد ہیں جو پرے کے پرے بن کر اڑتے ہوئے ایک دوسرے میں گھسنے کی کوشش کرتے ہوں۔

چنانچہ لغت میں ہے " الابابیل " الفرق طیرا ابابیل متتابعۃ مجتمعۃ اور حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں " ابابیل " ای تتبع بعضھا بعضا " اور یہی مجاہد سے منقول ہے اور

ء طفوش سدرہ۔

پرے کے پرے بن کر اس طرح اڑنا کہ ایک دوسرے کے پیچھے لگا ہوا ہے طبعاً اور فطرۃً بعض چھوٹے پرندوں کا خاصہ ہے۔ بعض علماء لغت کہتے ہیں کہ "ابالۃ" کی جمع ہے اور اکثر کا قول یہ ہے کہ یہ ایسی جمع ہے جس کے لیے کوئی واحد نہیں ہے "الابابیل" جمعٌ لا واحد لہٗ "۔

(۲) "حجارۃ من سجیل" میں حجارۃ کو "سجیل" کے ساتھ مقید کیا ہے یہ اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ اس سے وہ شے مراد ہے جس کو فارسی میں "سنگ گل" اور اردو میں "کنکر" کہتے ہیں اور یہ کہ سنگ اور سنگریزوں کو "سجیل" نہیں کہا جاتا بلکہ ان کے لیے حجر پتھر اور حصٰی (سنگریزہ یا پارہ ہائے سنگ) بولا جاتا ہے۔

اہل لغت، پتھر اور پتھر سے مشابہ اشیاء کے درمیان جو فرق بیان کرتے ہیں اس کا حاصل بھی یہی ہے یعنی الحجر پتھر، حصٰی سنگریزہ یا پارۂ سنگ، سجیل کنکر یا سنگ گل، الخذف مٹی کے برتنوں کے شکستہ ٹکڑے یا ٹھیکری۔

لہٰذا جس شخص نے "حجارۃ من سجیل" کے معنی سنگ یا پارۂ سنگ سمجھ کر "ترمیھم" کا ترجمہ "سنگ باری کر رہے تھے" کیا ہے غلط کیا ہے کیوں کہ یہ لغت اور محاورات عرب دونوں کے خلاف ہے اور اس لیے اس معنی پر مبنی تفسیر بھی صحیح نہیں ہو سکتی اور اگر یہ کہا جائے کہ قرآن نے حصٰی کو مجازاً "سجیل" کہا ہے تو ثابت کرنا چاہیے کہ قرآن نے حقیقت کو چھوڑ کر کس لیے اس مقام پر مجاز استعمال کیا ہے؟

اور اگر "سجیل" کے حقیقی معنی مراد ہیں تو یہ بتانا چاہیے کہ مکہ کی اس پہاڑی پر جہاں چڑھ کر قریش نے کنکر مارے یہ کنکر کہاں سے آ گئے تھے جب کہ پہاڑیوں پر سنگریزے یا پارہ ہائے سنگ تو ہوتے ہیں مگر کنکر نہیں ہوتے؟

(۳) آیت "فجعلھم کعصف مأکول" اس بات کے لیے نص ہے کہ ایسی فوج گراں کا جس میں ہزارہا مسلح لشکریوں کے علاوہ دیو پیکر ہاتھی بھی تھے کنکروں کی مار سے کھائے ہوئے بھس کی طرح ہو جانا اور فرار ہو کر جان بچا لینے کی ہمت تک نہ ملنا قدرت کے اعجاز ہی کے ذریعے

وقوع پذیر ہوا اور اسبابِ عقلی وعادی کے ماتحت عمل میں نہیں آیا۔

بصائر وعبر | مذاہب کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قانون تعذیبِ اقوام وامم" بہ تقاضائے حکمت دو دور میں منقسم رہا ہے۔

(۱) جب تک پیروانِ دینِ حق اور متبعین پیغمبرانِ خدا کی تعداد معاندین اور مخالفین کے مقابلہ میں اس قدر قلیل رہی ہے کہ عام حالات میں وہ دشمن کے مقابلہ سے معذور رہے ہیں تو اس پورے دور میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے زمین و آسمان یعنی اجرامِ ارضی وفلکی کے ذریعہ ان کی نصرت وحمایت کا سامان ہوتا رہا اور تسلیمِ حق وصداقت سے سرکش اور متمرد قوموں پر قدرت بالواسطہ مختلف قسم کے زمینی اور آسمانی عذاب نازل کرتی رہی ہے چنانچہ قوم نوح (علیہ السلام) عاد، اصحابِ ایکہ، فرعون وقوم فرعون وغیرہ اقوام وامم سب اسی قسم کے عذاب سے ہلاک وبرباد کی گئیں، یہ دور حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ختم ہو جاتا ہے۔

(۲) جب جاں نثارانِ حق وصداقت کی تعداد اس درجہ پر پہنچ گئی کہ وہ اگرچہ معاندین کے مقابلہ میں تھوڑے بھی رہے ہوں تب بھی اپنی تعداد کی اکثریت کے لحاظ سے دشمن کے مقابلہ میں سینہ سپر ہونے کے قابل ہیں تو پھر "سنۃ اللہ" یہ رہی ہے کہ خود فدا کارانِ حق اور مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ میدانِ کارزار میں نکل کر دشمنانِ خدا کا مقابلہ کریں اور اپنی جان کی بازی لگا کر ملتِ بیضاء اور دینِ حق کی حمایت کے لیے سینہ سپر بنیں اور ساتھ ہی سچے رسولوں کے ذریعہ یہ وعدہ بھی دیا جاتا رہا کہ ثمرہ اور نتیجہ میں فتح ونصرت تمہارا ہی حصہ ہے" وانتم الاعلون ان کنتم مؤمنین" اور یہ نصرت وفتح کبھی ملائکۃ اللہ کی معیتِ جہاد سے پوری کی جاتی ہے اور کبھی اس کی بھی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔

غرض جن قوموں نے بھی حق وصداقت کے ظاہر ہو جانے اور خدائے برتر کے سچے پیغمبروں کی صداقت کو جان لینے کے بعد از راہِ عداوت وغرور تعلیمِ حق سے نہ صرف منہ موڑا بلکہ اس کو مٹانے کی سعیِ ناکام کی تو اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ ان کو پاداشِ عمل کے چرخ پر کھینچ کر اور مختلف قسم کے عذاب چکھا کر صفحۂ ہستی سے مٹا دیا اور اگرچہ ان کی تعذیب کا قانون عام طور سے ان ہی دو دوروں کے اندر منحصر رہا

تاہم اللہ تعالیٰ کی حکمت کسی خاص طریق کار کے دائرہ میں محدود نہیں ہے اس لیے ہوسکتا ہے کہ ہماری اس تقسیم میں بعض مستثنیات بھی موجود ہوں البتہ تتبع اور استقراء کے پیشِ نظر یہ تقسیم ضرور صحیح ہے۔

(۲) کعبۃ اللہ کے خلاف اصحابِ فیل کی لشکرکشی اگرچہ قانون تعذیبِ امم کے دوسرے دور میں پیش آئی لیکن ایسے حالات اور ایسے زمانہ میں پیش آئی جو دورِ اوّل کے ساتھ مطابقت رکھتے ہیں یعنی "فترۃ وحی" (انقطاعِ وحی) کا زمانہ جس میں نہ کوئی رسول ہے اور نہ کوئی نبی اور نہ وقت کے سچے دین کے حامل ہی نظر آتے ہیں اور اگر ہیں بھی تو منتشر افراد ہیں نہ کہ بااثر جماعت کہ وہ کعبۃ اللہ کی حفاظت کے لیے سینہ سپر ہو بلکہ ایک مدعیِ دینِ مسیحی ہی کعبۂ ابراہیمی اور مرکزِ توحید کو برباد کرنے کے درپے نظر آتا ہے۔

اور مشرکینِ مکہ شرک و کفر کے باوجود اگرچہ "بیت اللہ" کی عظمت کے قائل ہیں مگر ایسی فوجِ گراں کے مقابلہ میں تابِ مقاومت نہیں رکھتے کہ جس کے ساتھ دیوہیکل ہاتھی بھی ہیں اور کعبہ کو ربِ کعبہ کے بھروسہ پر چھوڑ کر پہاڑ کی گھاٹیوں میں پناہ گزیں ہو جاتے ہیں تو ایسی حالت میں دو ہی صورتیں ہوسکتی تھیں ایک یہ کہ ابرہہ اور اس کا لشکر (اصحابِ فیل) کامیاب ہو اور بیت اللہ برباد کر دیا جائے اور دوسری صورت یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرتِ کاملہ کا ایسا نشان (معجزہ) ظاہر کرے جو اسباب و وسائل سے بالاتر ہو کر اس مرکزِ دین اور قبلۂ عالم "کعبہ" کی عظمت و حرمت کی حفاظت کا ضامن ہو اور ابرہہ اور اس کے لشکر (اصحابِ فیل) کو قانونِ تعذیبِ امم کے پہلے دور کے مطابق ہلاک و برباد کر دے تاکہ یہ واقعہ کائناتِ انسانی کے لیے باعثِ عبرت و بصیرت ہو چنانچہ حضرتِ حق کی جانب سے یہی دوسری صورت رونما ہوئی اور اس کے اعجازِ قدرت نے "اصحابِ فیل" پر جو عذابِ سماوی نازل کیا تھا سورۃ الفیل میں اسی کو بیان کیا گیا ہے ـــــــ "ذٰلک ھو الحق" "وما ذٰلک علی اللہ بعزیز"

(۳) یہ واقعہ ولادت باسعادت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے چند روز[1] قبل پیش آیا یہ وہ

[1] کتب سیر میں اصح قول یہ ہے کہ یہ واقعہ ولادت باسعادت سے پچاس روز قبل پیش آیا۔

وقت تھا جب کہ کائنات کا گوشہ گوشہ خدا پرستی اور توحیدِ الٰہی کے نغموں سے محروم ہو چکا تھا، خدا کی بھیجی ہوئی سچی تعلیم کے مدعی ہر جگہ موجود تھے مگر سچی تعلیم معدوم ہو چکی تھی اور ادیان و ملل کے اصل خد و خال اور ان کی حقیقی شکل و صورت کو تحریف و تبدیل کے مرض نے مسخ کر دیا تھا ہر جگہ شرک و کفر کا دور دورہ تھا، کہیں اصنام پرستی ہو رہی تھی تو کسی جگہ کواکب پرستی کا شور تھا، کہیں آتش پرستی مقصدِ عبادت تھی تو کسی مقام پر عناصر پرستی دین کا نصب العین بن چکی تھی، کہیں تثلیث نے جگہ پا کر حضرتِ یسوعؑ کو "مسیح بن اللہ" بنایا تھا تو کسی گروہ نے عزیر بن اللہ کہہ کر مذہب کے نام کا سہارا لیا تھا غرض ساری کائنات میں یا خدا کا انکار کارفرما تھا اور یا پھر اصنام پرستی، عناصر پرستی، کواکب پرستی، حیوانات پرستی نے فلسفیانہ تخیل کی آڑ لے کر شرک و کفر کو نمایاں کیا تھا۔ اس لیے یہاں خدا پرستی کے علاوہ اور سب کچھ موجود تھا اگر مفقود تھی تو وہ فقط خدائے واحد کی پرستش ہی تھی۔

اِن حالات کے پیشِ نظر غیرتِ حق کا یہ فیصلہ ہوا کہ اب وہ نورِ ہدایت روشن اور وہ آفتابِ رسالت جلوہ گر ہو جو کسی ایک خاص خطۂ دنیا کو ہی نہیں بلکہ تمام عالم اور ساری کائنات کو راہِ مستقیم دکھائے اور کائنات پرستی سے ہٹا کر خدا پرستی سکھائے۔ وہ گم کردہ راہ انسانوں کو راہ بتائے اور بھٹکے ہوئے غلاموں کو حقیقی مالک و آقا سے ملائے، ٹوٹے ہوؤں کا رشتہ جوڑے اور جاہلیت کی زنجیروں کو توڑے وہ دعائے خلیل اور نویدِ مسیح کا حاصل ہو اور اس مرکزِ توحید "کعبہ" کی حقیقی عظمت و حرمت کا داعی جو خدا پرستی کے لیے سب سے پرانا اور مقدس گھر ہے اور جس کی تعمیر کا شرف ابراہیم و اسمٰعیل (علیہما السلام) جیسے پیغمبروں کو بخشا گیا۔ آج اسرائیل کے خاندان سے "دعوتِ حق کی امانت" واپس لے لی گئی کیونکہ انھوں نے خیانت کی اور اپنے بزرگوں کی وصیت کو فراموش کر دیا "اَنْ نَّعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ" آج اسمٰعیل کا خاندان نوازا گیا اور خدا کی پاک امانت سلالۂ اسمٰعیلی کو عطا کر دی گئی۔ وقت آ رہا ہے کہ رسالت و نبوت کا یہ چاند عنقریب غارِ حرا سے طلوع ہو کر

اور آفتابِ حقیقت بن کر دنیا پر چمکے' اس کی ملت "ملتِ ابراہیمی" کہلائے اور دنیا میں خدا کا سب سے پہلا گھر (کعبہ) پھر قبلۂ عالم اور مرکزِ کائنات بنے۔

اِدھر حضرتِ حق کا یہ فیصلہ ہو چکا ہے مگر دوسری جانب دنیا کی ایک حقیر ہستی یمن اور حبشہ کی فانی حکومت کے زعم میں یہ چاہتی ہے کہ مرکزِ توحید۔ اور کعبۂ ملتِ حق "بیت اللہ" کو برباد کرکے اور صفحۂ ہستی سے مٹا کر مرکزِ تثلیث صنعاء کے "القلیس" کو کائناتِ انسانی کا قبلۂ مقصود اور کعبۂ محمود بنائے اور اس طرح توحیدِ خالص کی جگہ تثلیث کی شرک پرستی کو فروغ دے وہ سمجھتا ہے کہ میری فوجِ گراں اور شوکت و ہیبت کے مقابلہ سے سارا عرب عاجز و درماندہ ہے اور وہ یقین رکھتا ہے کہ مہیب ہاتھیوں کا یہ لشکر جب کعبۃ اللہ کو منہدم کرنے کے لیے آگے بڑھے گا تو خدا کے اس گھر کو کوئی نہ بچا سکے گا اس لیے وہ کروفر اور ہیبت و عظمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے یمن سے چلتا ہے اور راہ میں جو قبائل مزاحمت کرتے ہیں اُن کو پامال کرتا ہوا آگے بڑھتا ہے سردارِ قریش عبد المطلب جب اس کے سامنے پیش ہوتے ہیں تو وہ اپنے غرور و نخوت کے ساتھ یہ ظاہر کر دیتا ہے کہ ہمارا مقصد قریش سے نبرد آزما ہونا نہیں ہے بلکہ کعبہ کا انہدام و فنا مقصود ہے۔ عبد المطلب اچھوتے اور عبرت آموز انداز میں اپنی بے چارگی اور تابِ مقاومت سے معذوری کا اظہار کرکے کعبہ کو ربِ کعبہ کے سپرد کرکے قریش سمیت ابرہہ کی راہِ مزاحمت سے ہٹ جاتے ہیں۔

اب مقابلہ انسانوں کا انسانوں سے نہیں ہے بلکہ فرعون صفت اور ہامان نمط انسانی طاقت خدا کی طاقت سے ٹکرانا چاہتی ہے یہاں انسانی مقاصد' دوسرے انسانوں کے مقاصد سے متصادم نہیں ہیں بلکہ حضرتِ حق کے مقصدِ پاک سے ایک ناپاک ہستی کا ارادۂ ناپاک تصادم چاہتا ہے' پھر نتیجہ کیا نکلا وہی جو ہونا چاہیے تھا کہ خدا کی معجزانہ قدرت۔ کے سامنے انسانی قوت پاش پاش ہو کر رہ گئی اور اصحاب الفیل کا مقصدِ شر حضرتِ حق کے مقصدِ خیر کے مقابلہ میں خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةَ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ کا مصداق بن کر رہ گیا۔

آج نہ اصحاب الفیل کا نام و نشان باقی ہے اور نہ القلیس صنعاء کا، اور نہ وہ قریش مکہ ہی باقی ہیں جن کی آنکھوں نے وہ منظر دیکھا تھا لیکن قبلۂ توحید اور مرکزِ صداقت "کعبۃ اللہ" اسی طرح اپنی عظمت و جلالت کے ساتھ قائم و دائم ہے اور آج بھی قرآنِ عزیز اس کی رفعتِ شان کا بانگِ دہل یہ اعلان کر رہا ہے "اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِىْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ بے شک سب سے قدیم وہ گھر جو انسان کی خدا پرستی کے لیے بنایا گیا۔ یقیناً وہ ہے جو مکہ میں ہے جو سر تا سر مبارک اور جہانوں کے لیے (مرکز) ہدایت ہے۔

(۴) سورۃ الفیل کے مطالعہ سے دو باتیں صاف طور پر سمجھ میں آجاتی ہیں :۔

ایک یہ کہ اس سورۃ میں ایک متمرد اور سرکش جماعت کی ہلاکت کا عبرت آموز واقعہ مذکور ہے

دوسرے یہ کہ اس واقعہ سے منجانب اللہ کعبۃ اللہ کی حرمت و عظمت کی حفاظت کا بصیرت افروز نتیجہ نکلتا ہے۔

اب رہا یہ امر کہ اس واقعہ کے بیان کرنے سے جو غرض و غایت ہے وہ اپنے اندر کیا اسرار و حِکَم محفوظ رکھتی ہے تو اگرچہ خدا کی حکمتوں کا احاطہ انسانِ فانی کے حیطۂ امکان سے باہر ہے تاہم بنظرِ استحسان دو حکمتیں نمایاں نظر آتی ہیں :۔

(الف) یہ واقعہ ولادتِ باسعادت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لیے ایک زبردست "نشان" کی حیثیت رکھتا ہے اس لیے کہ نظامِ قدرت کے اُبھرے ہوئے نقوش ہم کو یہ خبر دیتے ہیں کہ اس کارگہِ عالم میں جب بھی کوئی عظیم انقلاب بپا ہوتا ہے تو اس کے وجود سے قبل ضرور ایسے آثار اور ایسی علامات ظاہر ہوتی ہیں کہ جن کو دیکھ کر عبرت نگاہ اور حقیقت آگاہ انسان آنے والے انقلاب کا اندازہ کر لیتا ہے اور انسان ہی نہیں بلکہ حضرتِ حق نے حیوانات تک میں احساسِ جزئیات کا ایسا ملکہ ودیعت کیا ہے کہ وہ طوفانِ باد و باراں اور بھونچال جیسے حوادث کا پتہ صرف علامات و آثار سے پالیتے اور وقت سے قبل ہی اپنے اضطراب و کرب کے ذریعہ دور رس انسانوں کو ان حقائق کا علم کرا دیتے ہیں۔

دُور نہ جائیے روزانہ ہونے والے انقلاب ہی کو دیکھیے اور اس سے اِس حقیقت کی صداقت کو وزن کیجیے شبِ دیجور کی حیاتِ چند ساعت کا جب پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے اور طلوعِ آفتابِ عالمتاب کی وجہ سے اس کو پیامِ مرگ مل جاتا ہے تو یہ نہیں ہوتا کہ رات کے آخری کنارہ پر پہونچ کر وہ کائنات کو اپنے رُخِ روشن کا جلوہ دکھا دیتا ہو بلکہ ہوتا یہ ہے کہ اوّل افقِ مشرق میں سپیدۂ صبح نمودار ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ تاریکی کو روشنی سے بدلتا جاتا ہے اس وقت ہر ذی ہوش یہ سمجھ جاتا ہے کہ خورشیدِ خاور کی تنویر کا وقت آپہنچا گو نیند کے ماتے شبِ تاریک کی مرگِ ناگہانی اور سپیدۂ صبح کی منادی طلوعِ آفتاب سے غافل سوئے پڑے رہتے ہیں لیکن مردِ با ہوش اس علامت کو دیکھ کر روزِ روشن کی آمد کا پتہ لگا لیتے اور خوابِ غفلت سے بیدار ہو جاتے ہیں تاکہ آفتابِ عالمتاب کی ضو افشانی سے قبل ہی خود کو اس کے خیر مقدم کے لائق بنا سکیں۔

عالمِ مادی کے اس انقلاب کی طرح عالمِ روحانیات میں بھی "سنۃ اللہ" اسی طرح جاری وساری ہے کیونکہ تمام عالمین کا "رب" ایک ہی "وحدہٗ لاشریک لہٗ" ہستی ہے اس لیے ہر عالم کے لیے اس کے نوامیس و قوانین میں بھی وحدت اور یکسانیت جلوہ گر ہے۔

کائناتِ روحانی میں عالمِ مادی کے وجود ہی سے یہ انقلاب تو ہوتا ہی رہا کہ جونہی توحیدِ الٰہی کی روشنی پر کفر و شرک کی تاریکی نے غلبہ پایا ناموسِ الٰہی نے کسی روشن ستارہ یا قمر یا لیلۃ القدر کے ذریعہ اس ظلمت کو کافور کر دیا لیکن ابھی عالم ایسی روشنی کا طلب گار تھا کہ اس کے طلوع کے بعد روشنی اور تاریکی کا فرق اس طرح نمایاں ہو جائے کہ پھر کبھی ظلمتِ کفر نورِ توحید پر اس طرح نہ چھا سکے کہ سَراب اور آبِ حیات کے درمیان امتیاز مشکل ہو جائے ہاں اگر روزِ روشن کی موجودگی میں بھی کسی شپرہ چشم کو آفتاب کی روشنی نظر نہ آئے تو یہ ایک جدا بات ہے کہ قصور کس کا ہے آفتاب کا یا شپرۂ چشم کا؛

غرض جب وہ وقت قریب آپہنچا کہ نبوّت و رسالت کا آفتابِ عالمتاب (محمد صلی اللہ علیہ وسلم)

طلوع ہو اور شرک وکفر کے پردہ ہائے ظلمت "ظلمات بعضها فوق بعض" چاک کر دیے جائیں تو آسمان وزمین میں سپیدۂ صبح سعادت کے ایسے آثار وعلائم نمودار ہونے لگے کہ چشمِ حق بیں اور دلِ حق آگاہ نے یہ محسوس کر لیا کہ عنقریب عالمِ روحانیت میں عظیم الشان انقلاب بپا ہونے والا اور وہ وقت آنے والا ہے کہ داستانِ شب سرد پڑ جائے گی، اور حقیقت کا آفتاب چمک اُٹھے گا اور دل وزبان یہ کہنے پر مجبور ہو جائیں گے :-

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیثِ خواب گویم ۔۔۔ چو غلامِ آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم

عالمِ روحانیات کا یہ سراجِ منیر[1] ظاہر ہے کہ سرزمینِ مکہ سے طلوع ہونے والا تھا اور اس کی دعوتِ عام کا محور ومرکز یہی مقدس مقام بننے والا تھا جہاں عبادتِ الٰہی کا سب سے پرانا گھر "کعبۃ اللہ" قبلۂ عالم وعالمیان تھا پس ایسے عظیم الشان انقلاب کے وقت کفر وشرک کی ظلمتِ شب نے ایک آخری سہارا لیا اور نورِ آفتاب پر غالب آنے کی کوشش کی یہی وہ منظر تھا جو ابرہہ اور اس کے لشکر اصحابِ فیل کی بدولت دنیا کے اس پردہ متحرک پر نظر آیا کہ کسی طرح مرکزِ توحید "کعبۃ اللہ" کو برباد کر کے مرکزِ تثلیث "القلیس" کو مرجعِ خلائق اور مرجعِ عبادت بنا دیا جائے تاکہ ظلمتِ شرک ایسا فروغ پائے کہ طلوعِ آفتاب کی نوبت ہی نہ آنے پائے۔

مگر قدرت کے منشاء کو کوئی طاقت نہیں روک سکتی اور خدا کے ارادہ پر کوئی ہستی غالب نہیں آسکتی لہٰذا دنیا نے دیکھا کہ یہ منظر بہت جلد ہی آنکھوں کے سامنے سے غائب ہو گیا اور موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا اور تھوڑے سے عرصہ کے بعد ہی رسالت ونبوت کے آفتابِ عالمتاب نے روشن ہو کر ساری کائناتِ الٰہی کو منوّر کر دیا۔

تو اب کہنا چاہیے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادتِ باسعادت سے قبل جو "نشان" ظہور میں آئے اور صبحِ سعادت کے لیے آثار وعلامات کہلائے ان ہی میں سے "اصحابِ فیل" کا واقعہ بھی ایک زبردست "نشان اور عظیم المرتبت" علامت ہے۔

---

[1] قرآن نے مادی آفتاب کو بھی "سراج" ہی کہا ہے وجعل الشمس سراجا " اس لیے روحانی آفتاب کو بھی سراجِ منیر کہا۔

(ب) اس واقعہ کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ نے قریش کو اپنا بہت بڑا احسان یاد دلایا ہے کہ وہ یہ نہ بھول جائیں کہ جس وقت وہ "کعبہ" کی عظمت کے قائل ہونے کے باوجود ابرہہ (اصحابِ فیل) کے اس مقابلہ سے عاجز رہے تھے جس میں اس نئے "کعبہ" کی بربادی کا بیڑا اٹھایا تھا اس وقت ہم نے اپنی قدرتِ کاملہ کے "نشانِ اعجاز" سے وہ کر دکھایا کہ دشمن کی شر آمیز تدبیر اور اس کا ارادۂ بد دونوں خاک میں مل کر رہ گئے۔

کیا تم نے اس عبرت زا واقعہ سے یہ سبق حاصل نہیں کیا کہ یہ سب کچھ تمہاری خوشنودی کے لیے نہیں تھا جب کہ تم شرک کی تاریکیوں میں غرق اور کفر کی آلودگیوں میں ملوّث تھے بلکہ "کعبہ" کی اس عظمت کی بقاء کے لیے تھا جس کی تعمیر بوڑھے پیغمبر ابراہیم (علیہ السلام) اور جواں پیغمبر اسمٰعیل (علیہ السلام) کے مقدس ہاتھوں سے ہوئی اور جس کے متعلق انھوں نے یہ فرمایا "رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنتُ مِن ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِندَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ" (اے میرے پروردگار میں نے بسایا ہے اپنی بعض اولاد کو بن کھیتی کی سرزمین میں تیرے باعزت وحرمت گھر کے پاس)

اور اس حرمِ مقدس کی خاطر جس کے لیے ابراہیم (علیہ السلام) نے یہ دعاء کی "وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَٰذَا الْبَلَدَ آمِنًا وَاجْنُبْنِي وَبَنِيَّ أَن نَّعْبُدَ الْأَصْنَامَ" (وہ وقت یاد کر جب ابراہیمؑ نے کہا: اے میرے پروردگار تو اس شہر "مکہ" کو امن والا کر دے اور مجھ کو اور میری اولاد کو اس بات سے بچا کہ ہم بُت پرستی میں مبتلا ہوں)

آج پھر وہ وقت ہے کہ خدا کا پیغمبر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کعبہ کی حقیقی عظمت قائم کرنا اور اس کو بتوں اور بت پرستی کی تلویث سے پاک کرنا چاہتا ہے مگر تم ان کو اور مسلمانوں کو ضعیف اور کمزور سمجھ کر اور اپنی قوت کے غرور اور گھمنڈ میں اکڑ کر آڑے آرہے ہو تو کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ جس ذات نے "اصحابِ فیل" کے کبر و غرور کو خاک میں ملا دیا تھا وہ تمہارے غرور کا بھی یہی حشر نہیں کر سکتا؟

سمجھو اور معاملہ کی حقیقت پر غور کرو اور پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت سے باز آجاؤ۔

اس بات کی تائید سورۃ الفیل سے متصل سورۃ القریش سے بھی ہوتی ہے اس لیے کہ اس سورۃ میں قریش کو یہ توجہ دلائی گئی ہے یا ان پر اپنے اس احسان کو ظاہر کیا گیا ہے کہ عرب قبائل کے باہم بات بات پر جنگ وجدل اور معمولی معمولی معاملہ پر حرب وضرب کے باوجود وہ حرم مکہ میں کس طرح مامون ومحفوظ ہیں اور نہ صرف یہ بلکہ اس کی خدمت کے انتساب کی وجہ سے حرم سے باہر بھی سردی اور گرمی دو موسموں میں اپنے محبوب تجارتی سفروں میں شام اور یمن تک بے خوف وخطر آتے جاتے ہیں اور کوئی آنکھ اٹھا کر بھی ان کی جانب دیکھنے نہیں پاتا تو کیا وہ اس احسان کے شکر گذار نہیں ہوتے اور حرم اور کعبہ کی حقیقی عظمت کو سربلند کرنے کے لیے خدا کا آخری پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) تم کو جس صداقت کی جانب بلاتا ہے اس پر لبیک کہنے کو تیار نہیں ہوتے ان کے لیے یہ بات ہرگز زیبا نہیں دیتی: فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هَٰذَا الْبَيْتِ الَّذِي أَطْعَمَهُم مِّن جُوعٍ وَآمَنَهُم مِّنْ خَوْفٍ (پس ان کو چاہیے کہ وہ اس گھر کے پروردگار کی سچی پرستش کریں کہ جس نے ان کی بھوک کے لیے سامانِ رزق بہم پہنچایا اور ان کو خوف وخطر سے مامون ومحفوظ کر دیا۔)

(۵) ابرہہ مذہباً عیسائی تھا اور اس لیے وہ بیت اللہ "کعبہ" کی عظمت کو کسی طرح برداشت نہیں کرتا تھا اور اس کا وجود گویا ایک خار تھا جو کانٹے کی طرح اس کے دل میں کھٹک رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ "کعبہ" معمولی پتھروں کی ایک سادہ عمارت ہے اگر اس کے مقابلہ میں ایک ایسی خوبصورت اور بے نظیر عمارت بشکل کلیسا (گرجا) تیار کی جائے جو بیش قیمت پتھروں اور جواہرات سے مزین ہو تو اس طرح میں سارے عرب کی توجہ کعبہ سے ہٹا سکوں گا اور اس جدید معبد کو مرجعِ خلائق بنا سکوں گا یہ سوچ کر ایک طرف اس نے یمن کے دار الحکومت صنعاء میں ایک بے نظیر گرجا "القلیس" بنوایا اور دوسری جانب ایک معمولی واقعہ کو حیلہ بنا کر کعبہ کی بربادی کا تہیہ کیا

نتیجہ جو کچھ ہوا مفصل مذکور ہو چکا۔ لیکن اس واقعہ میں اس جانب اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی تمام قوموں میں سب سے زیادہ عیسائیوں کو ہی اس بیت اللہ "کعبہ" کے ساتھ عداوت رہے گی، اور وہ اپنے غیر متمدن اور متمدن ہر زمانہ میں اس کے خلاف اپنی عداوت کا اظہار کرتے رہیں گے اور ہمیشہ اس مرکزِ توحید کے درپے رہیں گے، چنانچہ تاریخِ ماضی اس کی شاہد ہے کہ جب کبھی نصاریٰ کو اس کا موقع میسر آیا انھوں نے عملاً اپنی عداوت کا اظہار کیے بغیر نہ چھوڑا اور اگرچہ خدائے تعالیٰ نے اس سلسلہ میں ہمیشہ ان کے ارادوں کو ناکام رکھا مگر وہ بہرحال اپنے قلبی بغض و حسد کا ثبوت دیے بغیر نہیں رہے۔

(۶) "کعبہ" بیت اللہ یعنی "خدا کا گھر" کہلاتا ہے اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ "العیاذ باللہ" اللہ تعالیٰ کسی گھر میں ساکن ہے یا وہ گھر کا محتاج ہے بلکہ حقیقتِ حال یہ ہے کہ اس نے اپنی خالص عبادت کی غرض سے اقطاع و امصار کے مسلمانوں اور سچے عبادت گذاروں کے لیے کعبہ کو مرکز و محور بنایا ہے اور یہ اس لیے کہ جب کہ خدائے تعالیٰ جہات سے وراء الوراء اور پاک ہے اور انسان اپنے ہر کام میں جہات میں سے کسی جہت کا محتاج تو از بس ضروری تھا کہ تمام کائنات کے پیروانِ توحید اور عبادت گذاران رب العٰلمین کی عبادت اور ان کی حیاتِ ملی و دینی کے لیے ایک مرکز ہو تاکہ وہ انتشار اور تفرق و تشتت سے محفوظ رہیں اور وحدتِ اجتماعی کا سبق سیکھیں۔

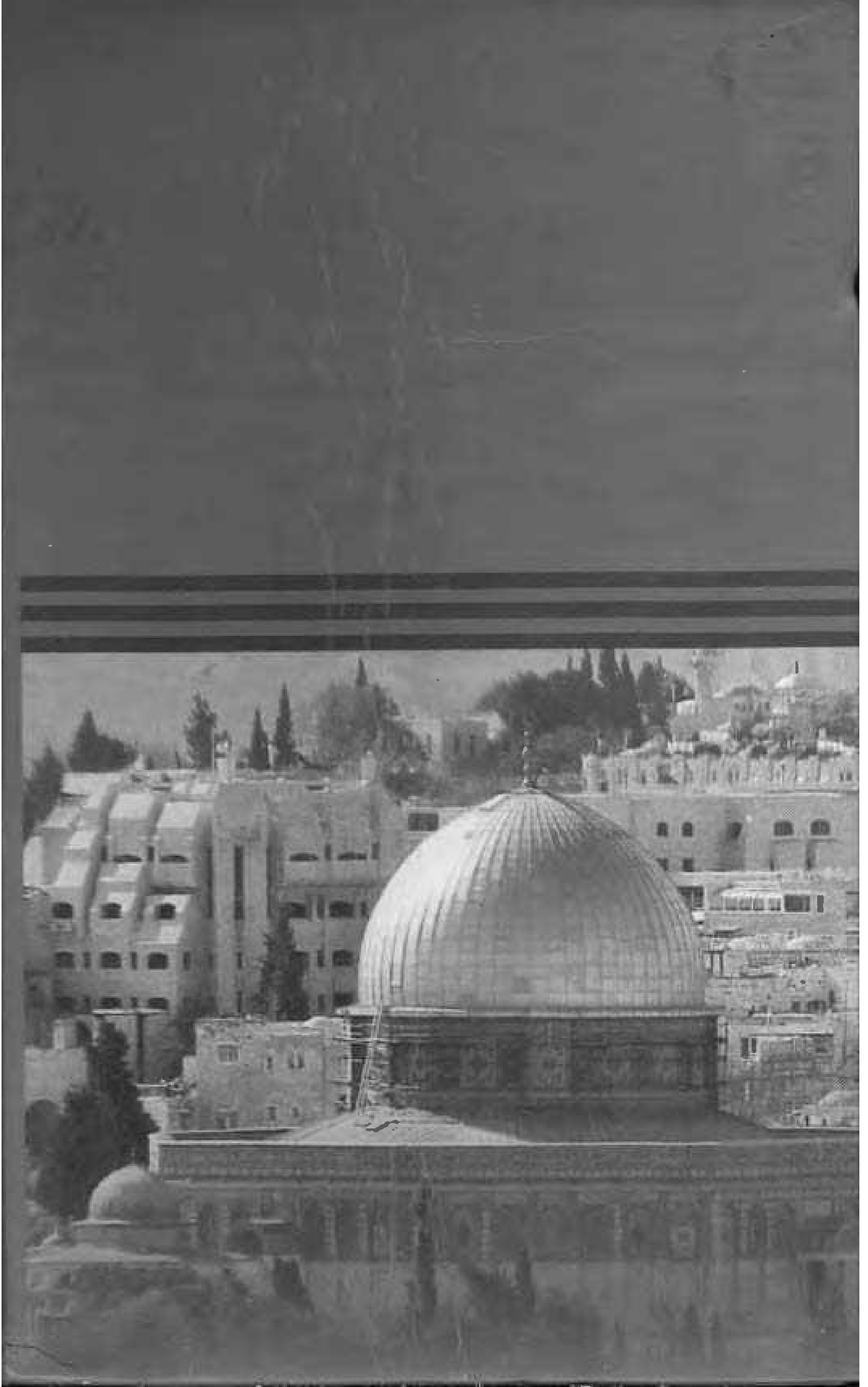
لہٰذا اس کے لیے وہ مقدس عمارت "شعائر اللہ" قرار دی گئی جس کو مجددِ انبیاء و رسل ابراہیم (علیہ السلام) اور ان کے مقدس بیٹے اسمٰعیل (علیہ السلام) نے دنیا میں سب سے پہلے صرف خدائے واحد کی پرستش کے لیے تعمیر کیا تھا اور جو توحید کے اعلان کی سب سے پرانی یادگار تھی وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ "(جو لوگ اللہ کی نشانیوں کی عظمت کریں گے تو یہ ان کے دل کی پرہیزگاری کی دلیل ہے۔)

پس کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کعبہ کی اس لیے عظمت کرے کہ وہ "صنم" ہے

یا خود قابلِ پرستش ہے اس لیے کہ جو ایسا سمجھے گا وہ مسلمان نہیں بلکہ مشرک کہلائے گا۔ بلکہ اس کی حرمت صرف اس لیے ہے کہ وہ "شعائرُ اللہ" ہے اور مرکزِ توحید، چنانچہ اسی حقیقت کو ایک عارف باللہ نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے: ع

"قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں"

فَاعْتَبِرُوْا يَآ اُولِي الْاَبْصَارِ



## Custom Scan



### Input

Scanner: Panasonic KX-MB2010SX | Options...

Sides: Both Sides

Color Mode: Autodetect

Resolution: 300 DPI

Paper Size: Custom

Width: 135 mm Height: 218 mm

☑ Prompt for scanning more pages

### Output

◉ New PDF Document

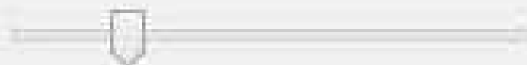
☐ Multiple files | More Options...

○ Append to existing file or portfolio

Select: C:\Users\Salman\AppData\Local\Ter | Browse

### Document Settings

☑ Optimize Scanned PDF

Small Size  High Quality | Options...

☐ Make Searchable (Run OCR) | Options...

☐ Make PDF/A-1b compliant ☐ Add Metadata

Help | Defaults | Scan | Cancel